جدید ایڈیشن اہم اضافوں کے ساتھ

شرق اوسط کی ڈائری

حجاز مقدس، مصر، شام، فلسطین، لبنان، سوڈان کے دعوتی سفر کے مشاہدات، عالم اسلام کی ممتاز شخصیات اور علمی و دعوتی مراکز کے ذمہ داروں سے ملاقات، ایک دلچسپ، معلومات افزا روداد اور روح پرور تذکرہ

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ

ترجمہ از عربی

مولانا شمس الحق ندوی

(مدیر: تعمیر حیات، لکھنؤ)

ناشر

مکتبۃ الشباب العلمیہ - مکتبہ فردوس، لکھنؤ

جملہ حقوق محفوظ

بار سوم

جمادی الاخریٰ ۱۴۳۹ھ　　مارچ ۲۰۱۸ء

نام کتاب: ..... شرق اوسط کی ڈائری

صفحات: ۵۳۶

کمپوزنگ: ..... حامد خوشنویس

تعداد اشاعت: ۱۱۰۰

قیمت: ۳۵۰

ناشر

مکتبۃ الشباب العلمیہ - مکتبہ فردوس، لکھنؤ

فہرست عناوین

عرض ناشر	۲۹
عرض مترجم	
مقدمہ	
حجاز مقدس کا سفر اور حرمین شریفین کا قیام (۱۳۶۶ھ-۱۹۴۷ء) از: کاروانِ زندگی	
۱۹۴۷ء کے سفر حجاز کی ڈائری کے چند اوراق از: مولانا سید محمد ثانی حسنیؒ	
۱۹۵۰-۵۱ کے حج وزیارت کی کچھ یادیں از: مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی	
حجاز مقدس سے مصر میں	
حجاز سے روانگی:	۸۹
سفر کے ساتھی	۹۰
سنی نہ مصر وفلسطین میں وہ اذاں میں نے:	۹۱
جہاز کے مسافر	۹۲
جہاز کا ماحول:	۹۳
مصر کا اشتیاق:	۹۴
ساحل مصر پر	۹۵
سوئیس سے قاہرہ کو روانگی:	۹۶

ہندوستانی دارالاقامہ میں ایک جلسہ اور تقریر	۱۰۰
میری تقریر کا خلاصہ ولبّ لباب یہ تھا کہ:	۱۰۰
ڈاکٹر احمد امین سے ملاقات:	۱۰۲
ڈاکٹر احمد امین کے بعض منفرد خیالات	۱۰۴
ڈاکٹر احمد امین کی نظر میں عربی طرز فکر اور مغربی طرز فکر کا فرق	۱۰۵
الجمعية الشرعية کی مسجد میں میری تقریر	۱۰۶
جمعیۃ کی مسجد	۱۰۸
جمعیۃ اور اس کے بانی	۱۰۸
تحریکوں کی زندگی کا انحصار زمانہ کی نبض شناسی پر ہے	۱۱۰
عالم عربی کا زوال	۱۱۱
عشق خود ایک سیل ہے سیل کو لیتا ہے تھام	۱۱۲
شیخ حامد الفقی سے ملاقات	۱۱۳
شیخ الازہر سے ملاقات	۱۱۴
ہندوستان کا دینی طرز تعلیم اور علماء کی تربیت میں اس کا نمایاں حصّہ	۱۱۵
شیخ الازہر	۱۱۶
شیخ حامد فقی کے درس میں شرکت	۱۱۶
اخوانی نوجوانوں کے ساتھ	۱۱۸
استاد سعید رمضان کے ساتھ	۱۱۹
محمد بن ابراہیم آل شیخ سے ملاقات	۱۲۰
جمعیۃ الشبان المسلمین کے مرکز عام میں	۱۲۲
جنرل محمد صالح حرب سے ملاقات	۱۲۲
دارالجمعیۃ کی زیارت	۱۲۲
انصار السنۃ میں میری تقریر	۱۲۳

ہندوستان میں دینی داعیوں اور مجاہدین کی چند مثالیں	۱۲۴
مادی دعوت اسلامی دعوت کی حریف	۱۲۶
ڈاکٹر احمد امین سے ایک ملاقات	۱۲۷
''زعماء الاصلاح فی العصر الحدیث'' پر میری رائے	۱۲۷
ازہر و جامعہ فواد کے بارے میں احمد امین کی رائے	۱۲۹
دین اور سیاست کی تفریق کے بارے میں احمد امین کی رائے	۱۲۹
کیا مسلمان موجودہ تمدن اور دینی روح کے جمع کرنے میں ناکام رہے۔	۱۲۹
ناکامی کے اسباب اور علاج ڈاکٹر احمد امین کی نظر میں	۱۳۰
''ضحیٰ الاسلام'' پر میرا تبصرہ اور معتزلہ کے بارے میں میری رائے	۱۳۰
شیخ احمد محمد شاکر سے ملاقات	۱۳۱
ازہر اور کالج کے نوجوانوں کے ساتھ	۱۳۲
دنیا کے دو روپ ہیں، نوجوانوں میں میری تقریر	۱۳۲
ان خود ساختہ منتظمین کا دور ختم ہوا۔	۱۳۴
اس عالم کی از سر نو تعمیر وہی ہاتھ کر سکتے ہیں جنھوں نے حرم تعمیر کیا	۱۳۵
مجاہد نوجوانوں کی چند مثالیں	۱۳۵
ڈاکٹر احمد امین سے مسئلہ یوگ اور تصوف پر گفتگو	۱۳۶
حکیم اور عارف کا فرق	۱۳۷
کثرت سے وحدت کی طرف	۱۳۸
علم کا صحیح سرچشمہ وحی الٰہی اور علم نبوّت ہے	۱۳۸
شیخ جمال الدین اور محمد عبدہٗ کے بارے میں کچھ معلومات	۱۳۹
تعلیم اور عہدۂ قضا کا فرق	۱۴۰
جمعیۃ الشبان المسلمین کے ڈاکٹر عبدالحمید ہال میں	۱۴۰
معاشرہ میں دینی شعور و روحانی بیداری	۱۴۱

مصری دیہات کی سیر	۱۴۲
معیارِ زندگی میں بہت زیادہ فرق ایک بڑا خطرہ ہے	۱۴۲
دیہات میں مسلم مہمان کے ساتھ اچھا برتاؤ	۱۴۳
کچا مال جو ضائع ہو رہا ہے	۱۴۳
جامع ازہر کی زیارت	۱۴۴
ازہر کے دفتر میں	۱۴۴
استاذ محمد فرید وجدی سے باتیں	۱۴۵
انگریزی اور فرانسیسی تعلیم کا فرق	۱۴۵
استاذ محمد فؤاد عبدالباقی سے ملاقات	۱۴۶
جامع ازہر کے دارالاقامہ کے بارے میں میرا تأثر	۱۴۶
شیخ علاّمہ محمد زاہد کوثری سے ملاقات	۱۴۷
فوجداری عدالت کی سیر اور اخوان کے مقدمے میں حاضری	۱۴۸
استاذ سعید رمضان کی صفائی اور اس کا تأثر	۱۴۹
اخوان المسلمین کے بانی امام حسن البنا کے والد شیخ احمد بن عبدالرحمٰن کے ساتھ	۱۵۰
شیخ حسن البنا کے والد اپنے قابلِ فخر فرزند کا قصہ سناتے ہیں	۱۵۰
علوبہ باشا سے گفتگو	۱۵۵
ہندوپاک اور انڈونیشیا کے مسلمانوں کے بارے میں علوبہ باشا کی رائے	۱۵۵
شیخ محمد الغزالی سے مُلاقات	۱۵۶
جشنِ میلاد سیدنا حسین رضی اللہ عنہ	۱۵۷
شیخ صالح عشماوی سے ملاقات	۱۵۸
رسالہ الفتح اور اس کے ایڈیٹر سے غائبانہ تعلق و تعارف	۱۵۸
استاذ محبّ الدین خطیب سے ملاقات	۱۵۹
جشنِ میلاد حسینؓ کی تفریح	۱۶۱

تکلیف دہ صورت حال	۱۶۲
شیخ محمد الغزالی کے ساتھ	۱۶۳
ازہر کا طرز تعلیم	۱۶۵
خالص دینی دعوت کو مذہبی اختلافات سے آزاد رہنا چاہئے	۱۶۵
پردے کے بارے میں شیخ محمد الغزالی کی معتدل رائے	۱۶۵
دینی جوش اور قربانی کے جذبہ کو کس طرح باقی رکھا جاسکتا ہے	۱۶۶
ایک سن رسیدہ فلسطینی بزرگ سے ملاقات	۱۶۶
ڈاکٹر محمد غمرادی سے باتیں	۱۶۷
بعض ادیبوں کے دین سے منحرف ہونے کا سبب	۱۶۸
اس ملک کا ادبی رجحان غیر دینی ہے	۱۶۸
ادب کو دینی فکر کی طرف کیسے موڑا جاسکتا ہے	۱۶۹
ازہر کے لئے تجویز	۱۶۹
مشرقی اسلامی ممالک میں سائنسی علوم کی کمی ہے	۱۷۰
طبعی علوم حاصل کرنے کا طریقہ	۱۷۰
مصر کی تقلید سے انتباہ	۱۷۰
ازہر کے مستقبل کے بارے میں گفتگو	۱۷۱
قلعہ اور اس کی مسجد کی سیر	۱۷۱
قلعہ کا کتب خانہ	۱۷۲
فوجی میوزیم	۱۷۲
مسجدوں اور مقبروں کی سیر	۱۷۲
مقبروں کے متعلق صحیح اسلامی موقف اور اس کی حکمت	۱۷۳
شہر فسطاط اور مسجد عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی سیر	۱۷۳
مسجد سیدنا عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ میں ہمارا احساس	۱۷۳

لغویات	۱۷۴
مصر قدیم میں	۱۷۴
حقائق تصورات سے مغلوب نہیں ہوتے	۱۷۵
استاذ محمد علی طاہر سے گفتگو	۱۷۶
فلسطین کا المیہ اور اس میں عرب ملکوں کی کوتاہی	۱۷۷
حمام میں افسوسناک منظر	۱۷۸
اخبارات کی بے حیائی	۱۷۸
اہرام کی سیر	۱۷۹
ظالمانہ بیگار کی یادگار	۱۷۹
ازہر اور اس کے قرب و جوار کی سیر	۱۸۰
ازہر کے کتب خانہ میں	۱۸۰
مدرسہ منصور قلاؤون میں	۱۸۱
سخیمی کے مکان میں	۱۸۲
یمنی حکومت کے وزارت خارجہ کے سکریٹری سے گفتگو	۱۸۲
یمن دوراہے پر	۱۸۳
اسلامی ملکوں میں زندگی کے دوستون	۱۸۴
شام کے طلبہ میں تقریر	۱۸۵
''العالم العربی'' کے دفتر میں	۱۸۶
مسئلہ فلسطین میں ناکامی سے متعلق گفتگو	۱۸۶
استاذ علی الغایاتی کے ساتھ	۱۸۹
بلادِ عربیہ اور ہندوپاک کی مثال	۱۸۹
منبر الشرق کے متعلق گفتگو	۱۹۰
دارارقم میں	۱۹۱

فحش وعریاں ادب کے خلاف طاقتور جہاد کی ضرورت ہے	۱۹۲
جامع ازہر میں جمعہ	۱۹۳
اخوان المسلمین سے میری امید	۱۹۵
تین اہم نکات	۱۹۵
داعیوں اور مردان کار کی تربیت	۱۹۶
قلب وروح کو غذا پہنچانے کی ضرورت	۱۹۶
امام حسن البنا کی شخصیت اور ان کی خداداد صلاحیتیں	۱۹۷
جماعت کی تربیت کی فکر	۱۹۷
مطبعۃ السنۃ المحمدیۃ میں.....	۱۹۸
''انصار السنۃ'' کے دفتر میں	۱۹۹
علاّمہ محمد خضر حسین صاحب سے مُلاقات	۱۹۹
علاّمہ خضر حسین اور جامعہ '' زیتونہ '' کے بارے میں کچھ معلومات	۲۰۰
آثار قدیمہ کی سیر	۲۰۰
استاذ احمد حسن زیات سے ملاقات	۲۰۱
محمد فرید عبدالخالق کی دعوت میں	۲۰۳
تصوّف عارضی اور محدود علاج ہے	۲۰۴
استاذ احمد شرباصی اور ان کا محاضرہ (لکچر)	۲۰۵
دارالکتب المصریہ میں	۲۰۶
شیخ حسنین محمد مخلوف سے ملاقات	۲۰۶
ڈاکٹر احمد امین سے گفتگو	۲۰۷
ادب کے اصول اربعہ کے بارے میں ان کی رائے	۲۰۷
احمد امین ابوحیان کو جاحظ پر فوقیت دیتے ہیں	۲۰۸
حماسہ کی شرحیں	۲۰۸

اندلسی ادب	۲۰۸
سیّد قطب کے ساتھ	۲۱۰
سیّد قطب کی زندگی میں موڑ کا راز	۲۱۱
سیّد قطب کی تصنیفات	۲۱۲
تصوّر و حقیقت کا فرق	۲۱۳
کتاب ''معرکۃ الاسلام والرأسمالیۃ''	۲۱۳
حسین یوسف کے ساتھ	۲۱۳
کلیۃ الادب کی سیر	۲۱۴
یونیورسٹیوں اور کالجوں میں مخلوط تعلیم	۲۱۶
اخوان المسلمین کے جلسہ میں میری تقریر	۲۱۶
افراد کی مہم سازی	۲۱۷
آنے والی نسلوں کی ذمہ داری	۲۱۸
استاذ بہی الخولی اور شیخ محمد الغزالی کی تقریر	۲۱۸
استاذ علی الغایاتی کے ساتھ	۲۱۹
شیخ حسن البناء شہید کے دوست اور ساتھی بہی الخولی کا اعتراف حقیقت	۲۲۰
مولانا عبیداللہ بلیاوی کی شیخ حسن البناء سے ملاقاتوں کا بہی الخولی کا استعجاب و تاثر	۲۲۱
جمعیۃ الشبان المسلمین میں میری تقریر	۲۲۳
احمد الشرباصی کی تعارفی تقریر اور میری گفتگو	۲۲۳
تاریخ انسانی اپنے پھیلاؤ اور پیچ و خم میں نیل کی طرح ہے	۲۲۴
یونانیوں کے عہد سے بازنطینیوں کے عہد تک	۲۲۴
بعثت محمدی سے یورپ کی قیادت تک	۲۲۵
مغربی قیادت کا افلاس	۲۲۵
دنیا دوراہے پر	۲۲۶

تقریر کے بارے میں میرا خیال	۲۲۶
مُقررین کے تبصرے	۲۲۶
امیر عبدالکریم خطّابی سے باتیں	۲۲۷
امیر عبدا کریم کے جہاد سے متعلق کچھ معلومات	۲۲۷
احمد الشرباصی اور احمد محمد شاکر کی کرم فرمائیاں	۲۲۹
ہندوستان میں دعوت اسلامی کے پانچ دور	۲۳۰
پہلا دور (حضرت مجدد الف ثانیؒ کا دور)	۲۳۰
دوسرا دور (شاہ ولی اللہ صاحبؒ کا دور)	۲۳۲
تیسرا دور (حضرت سید احمد شہیدؒ اور ان کے رفقاء خلفاء کا دور)	۲۳۳
چوتھا دور (مدارس اسلامیہ کا دور)	۲۳۳
پانچواں دور (تبلیغی جماعت اور دوسرے دعوتی کام)	۲۳۳
فرانس کے ظلم و بربریت کی المناک خبر	۲۳۵
بنہا کا سفر	۲۳۵
مصری دیہات کا نظارہ	۲۳۵
مسجد میں میری تقریر	۲۳۶
عام انسانی زندگی اور ایمانی زندگی کا فرق	۲۳۶
اپنے اوپر مسلمانوں کی ستم ظریفی	۲۳۷
ازہر کے اخوانی طلباء میں تقریر	۲۳۸
دینی امانت کی حفاظت	۲۳۹
جنرل صَالح حرب باشا کی گفتگو	۲۴۰
مصر اور مشرق وسطی کی اہمیت	۲۴۱
معنوی طاقت کی اہمیت	۲۴۲
جنرل صَالح حرب کی نظر میں قوم کا سب سے بڑا روگ	۲۴۳

''ہندوستان میں علم حدیث'' کے موضوع پر محاضرہ	۲۴۳
فنّ حدیث میں ہندوستان کی خدمات کی تعریف	۲۴۵
فرانسیسی ظلم واستبداد کے خلاف جمعیۃ الشبان المسلمین کے جلسہ میں شرکت	۲۴۶
جنرل محمد صالح حرب سے گفتگو	۲۴۹
دَارالشبان المسلمین میں	۲۵۱
استاد محمود محمد شاکر کے ساتھ	۲۵۱
شیخ محمد حسنین مخلوف	۲۵۲
'' جمعیۃ مکارم اخلاق '' میں	۲۵۳
تبلیغی جماعت کا تعارف علماء کی مجلس میں ان کی زبان سے	۲۵۳
میری گفتگو	۲۵۴
ہندوستان اور عرب ملکوں کی مثال	۲۵۴
کچھ مشترک ومختلف باتیں	۲۵۵
عہد حاضر میں مسلمانوں کا پیغام	۲۵۵
عُلماء ہند کے مناقب کا اعتراف	۲۵۷
استاذ عبدالعزیز کامل کے سَاتھ	۲۵۸
ڈاکٹر محمد یوسف موسیٰ سے باتیں	۲۵۹
ازہر کے لئے ان کی تجویز	۲۶۰
شیخ احمد الشرباصی کے سوالات	۲۶۱
احمد لطفی السّید سے باتیں	۲۶۱
عہد ماضی اور عہد حاضر کے اخلاق کا فرق	۲۶۳
کیا یونیورسٹیاں اخلاقی تربیت میں کوتاہی کررہی ہیں؟	۲۶۴
نقص نظام تعلیم میں ہے	۲۶۵
استقبالیہ جلسہ میں	۲۶۶

جلسہ میں میرا مقالہ	۲۶۶
علامہ اقبال کے فکر و پیغام کی عالم عربی میں اشاعت کرنے میں کوتاہی	۲۶۸
دینی مدارس کے طلبہ کس طرح کام کریں؟	۲۶۹
علماء مصر و علماء ہند میں علمی روابط پیدا کرنے کی تنظیم	۲۶۹
شیخ عبدالوہاب خلاف سے باتیں	۲۷۲
مصر میں اخلاقی گراوٹ کے اسباب	۲۷۲
شیخ عبدالوہاب شیخ محمد عبدہ کے طریقۂ درس کو بیان کرتے ہیں	۲۷۲
وہ اساتذہ جن سے شیخ عبدالوہاب متاثر ہوئے	۲۷۳
امام لیث بن سعد کا مذہب کیوں باقی نہ رہا؟	۲۷۳
مصر میں مذہب شافعی کیسے پھیلا	۲۷۴
علماء کا مرض	۲۷۴
عجائب گھر کی سیر	۲۷۵
قویسنا میں میری تقریر	۲۷۷
شیخ حسنین محمد مخلوف کے گھر میں	۲۷۹
اندھی تقلید جنون سے کم نہیں	۲۸۰
شیخ محمد صادق مجدّدی کے ساتھ	۲۸۱
استاذ مصطفیٰ مومن سے ملاقات	۲۸۲
کلّیۃ الشریعۃ میں	۲۸۳
دارالعشیرۃ المحمدیۃ میں جماعت کی تشکیل	۲۸۶
استاد بہی خولی	۲۸۷
ازہری طلبہ کے ساتھ	۲۸۷
''قناطر خیریہ'' کی سیر	۲۸۸
نکلہ میں جماعت کے ساتھ کچھ وقت	۲۸۹

''الدعوۃ'' کے دفتر میں	۲۸۹
نوجوان مشائخ کے ساتھ	۲۹۱
مولانا عبیداللہ بلیاوی	۲۹۳
سید محمود حافظ کی روح پرور قرأت	۲۹۳
سید قطب کا ''اسمعی یا مصر'' پر تاثر	۲۹۴
ڈاکٹر اقبال پر میرا مقالہ	۲۹۴
جامع قادریہ میں	۲۹۶
ازہر کا پیغام کیا تھا؟	۲۹۶
عزیزیہ میں	۲۹۸
سیّد قطب کے سَاتھ	۳۰۰
ازہر کے ترک طلباء سے باتیں	۳۰۱
عبدالرحمٰن عزام (سکریٹری جنرل عرب لیگ) سے مُلاقات	۳۰۴
فلسطینی طلبہ کے جلسہ میں	۳۰۵
مسلمان لیڈروں پر تنقید	۳۰۵
ہم فلسطین کو دشمن کے پنجے سے کیسے چھڑائیں	۳۰۶
ترک طلبہ کے ساتھ	۳۰۶
عوام پڑھے لکھے طبقہ سے بیک وقت رابطہ قائم کریں	۳۰۷
دیہات کا سفر	۳۰۸
انڈونیشین یونین کے دفتر میں	۳۰۹
اسلامی ممالک کی رہنمائی میں نوجوانوں کا کردار	۳۰۹
المحلۃ الکبریٰ کا سفر اور ایک ناخوشگوار واقعہ	۳۱۱
یوسف القرضاوی کا تعلق	۳۱۲
کلیۃ الاداب میں میرا مقالہ	۳۱۳

مسئلہ فلسطین سے متعلق کچھ حقائق	۴۳۲
عرب رہنماؤں کی پست کرداری	۴۳۲
فلسطین ہی سے متعلق ایک بات	۴۳۳
عالم اسلام بحر عروض کی طرح ہے	۴۳۳
اخلاقی انحطاط بھی	۴۳۴
مسجد اقصیٰ میں میرا احساس	۴۳۴
فلسطینی مسلمان	۴۳۴
حقیقتاً اہل دل ہی لوگوں پر حکومت کرتے ہیں	۴۳۵
عید کی نماز مسجد اقصیٰ میں	۴۳۶
پھیکی عید	۴۳۶
ایک اچھی دعوت	۴۳۶
افغانی بغاوت کی کہانی شیخ مجدّدی کی زبانی	۴۳۶
ملک شریف حسین کی ندامت	۴۳۷
قدس اور خلیل کے درمیان	۴۳۸
مسجد خلیل میں	۴۳۸
شیخ محمد علی الجعبری کے دولت خانے پر	۴۳۹
مسجد کے بارے میں میرے تأثرات	۴۳۹
مسجد اقصی	۴۴۰
زاویۃ الہنود میں	۴۴۰
مسجد اقصیٰ کے آثار کی زیارت	۴۴۱
الهيئة العلمية الاسلامية کے اجتماع میں	۴۴۲
جلسہ میں میری تقریر	۴۴۲
الهيئة العلمية الاسلامية کے متعلق کچھ معلومات	۴۴۳

کتب خانہ کے نادر مخطوطات	۴۱۷
سلطان صلاح الدین کی تربت پر	۴۱۸
قبۃ النسر	۴۱۹
امام نووی کے دارالحدیث میں	۴۱۹
استاذ بہاء الدین امیری کے ساتھ	۴۲۰
استاد محترم شیخ تقی الدین مراکشی یاد آئے	۴۲۱
استاد محمد المبارک کی نظر میں چار منتخب کتابیں	۴۲۱
شیخ احمد کفتارو کے ساتھ	۴۲۲
اصلاح کے بارے میں شیخ کفتارو کی رائے	۴۲۳
دمشق کے غوطہ میں	۴۲۴
سوریہ میں ردّ و بدل اور حادثات	۴۲۴
شام میں قضیہ فلسطین کے بارے میں احساس	۴۲۶
جامع اموی میں جمعہ	۴۲۶
استاد محمد کمال سے ملاقات	۴۲۷
استاد عبدالوہاب صلاحی	۴۲۸
عمان و دمشق کے میدان	۴۲۸
عمان سے قدس	
بحر المیت	۴۲۹
دریائے اردن	۴۲۹
مسجد اقصیٰ میں	۴۳۰
محترم شیخ محمد صادق کی ضیافت میں	۴۳۰
مولانا محمد علی جوہر کی قبر پر	۴۳۱
شیخ محمد صادق مجددی کے معتکف میں	۴۳۱

اخوانی محبین کے ساتھ	۳۹۶
اسکندریہ	۳۹۷
مصر کو الوداع	۳۹۸
ملک شام میں	
ایک براعظم سے دوسرے براعظم تک	۴۰۲
دمشق میں	۴۰۲
جامع شیخ محی الدین میں	۴۰۳
جامع اموی میں	۴۰۴
شیخ احمد کفتارو کے درس میں	۴۰۴
علامہ محمد بہجۃ البیطار	۴۰۶
شیخ ابوالخیر میدانی سے ملاقات	۴۰۶
اخوان المسلمین کے مرکز میں	۴۰۷
جامع الدقاق میں	۴۰۸
سوریہ کی پارلیمنٹ میں	۴۰۹
دوحۃ الاداب کا جلسہ	۴۰۹
استاد محمد المبارک کی تقریر	۴۱۱
پارلیمانی بحث کے لئے زور بیانی کی ضرورت اور اس کا اظہار	۴۱۲
علمائے دمشق سے مُلاقات	۴۱۳
شیخ ناصر الدین البانی سے ملاقات اور علمی گفتگو	۴۱۳
شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے بارے میں باتیں	۴۱۳
دمشق میں فرانسیسی حکومت کی یادگاریں	۴۱۵
المجمع العلمی میں	۴۱۶
کتب خانہ ظاہریہ میں	۴۱۶

سوڈان کی قدرتی، جغرافیائی، سیاسی اور دینی حالت	۳۸۵
سوڈان قدرتی اعتبار سے تین حصّوں میں منقسم ہے	۳۸۵
نظام حکومت	۳۸۶
سوڈان کے ضلعے	۳۸۶
اہم شہر	۳۸۷
عطبرہ	۳۸۷
الابیض	۳۸۷
سوڈان کی اقتصادی زندگی	۳۸۷
صنعت وتجارت	۳۸۸
اخلاقی حالت	۳۸۸
دینی حالت	۳۸۸
سوڈان کوالوداع	۳۸۹
دوبارہ مصر میں	
جہاز کی مصیبت	۳۹۰
مسلم اور غیر مسلم کا فرق	۳۹۰
شلال سے قاہرہ	۳۹۱
مصر کی طرف لوٹنے کی خوشیاں	۳۹۲
عجیب احساس	۳۹۲
شبان المسلمین کے مرکز عام میں	۳۹۳
ازہر کے دفتر میں	۳۹۴
بلاد اسلامیہ کے طلبہ افطار کی دعوت پر	۳۹۴
شیخ بہی الخولی کی عنایات	۳۹۵
ہندوستانی سفیر سے ملاقات کی ناکام کوشش	۳۹۶

مصر کی کشش	۳۷۲
استاذ اسماعیل بک ازہری سے باتیں	۳۷۲
سرکاری علماء کے بارے میں ان کی رائے	۳۷۳
سید میر غنی کے بارے میں ان کی رائے	۳۷۳
افریقہ میں اسلامی دعوت کی ضرورت	۳۷۴
شیخ شوقی اسد سے ملاقات	۳۷۶
شیخ محترم سیّد میر غنی سے جماعت تبلیغ کا تعارف اور بانی کا تعارف	۳۷۶
سیّد میر غنی کے بعض خیالات	۳۷۸
تعلیم کو اس کے مزاج وعُیوب سے الگ نہیں کیا جاسکتا	۳۷۸
اسلامی ممالک ترکی کے نقش قدم پر	۳۷۹
ترجمہ کے ذریعہ علوم کو پڑھانا ناکام کوشش ہے	۳۷۹
مصر پر ادبی رنگ غالب ہے	۳۷۹
مصری رسائل کا گھٹیا معیار	۳۸۰
دوستانہ گفتگو	۳۸۰
سوڈانی طرز کی مہمانی	۳۸۰
دعوت میں میری تقریر	۳۸۰
جامعہ کے فارغین کے سامنے میری تقریر	۳۸۱
شبان میر غنی کے جلسہ میں	۳۸۲
جلسہ میں میری تقریر	۳۸۲
ترانہ جو ہم لوگوں کو پسند نہ آیا	۳۸۲
سیّد میر غنی کا شوق مطالعہ اور حالات سے باخبری	۳۸۳
سلیمان موسیٰ کی دعوت	۳۸۴
سیّد میر غنی صاحب سے رخصتی ملاقات	۳۸۴

افغانی سفارتخانہ کے جشن آزادی میں شرکت	۳۵۷
ایک کویتی دوست کے ساتھ	۳۵۸
شیخ الازہر کے ساتھ گفتگو	۳۵۹
سعودی سفارت خانہ میں	۳۶۰
شیخ محمود شلتوت کے ساتھ	۳۶۰
سیدنا امام شافعیؒ کے مزار پر	۳۶۱
استاذ منصور فہمی باشا	۳۶۱
ڈاکٹر یوسف موسیٰ کی تجویز	۳۶۲
مصری آثار قدیمہ کے میوزیم کی سیر	۳۶۲
سُوڈان	
قاہرہ سے مولانا عبید اللہ بلیاوی کی رفاقت میں	۳۶۳
فراعنہ کے پایۂ تخت میں	۳۶۴
ریلوے کا قابل تقلید نظام	۳۶۵
جہاز میں	۳۶۵
استقبال رمضان	۳۶۶
پہلا روزہ وافطار	۳۶۷
الخرطوم البحری میں	۳۶۷
تقریر سے معذرت	۳۶۸
سیّد میر غنی باشا	۳۶۹
سیّد میر غنی پاشا کے ساتھ	۳۷۰
سیّد میر غنی کی مقبولیت	۳۷۱
انگریزوں سے ناراضگی	۳۷۱
سوڈان کے تین پایہ تخت	۳۷۱

مولانا عبیداللہ صاحب کے ساتھ کچھ اہم باتیں	۳۳۷
مصر میں جشن شم النسیم	۳۳۸
جامع ظاہر بیبرس جاشنگیر میں	۳۳۹
نقشبندی بزرگ شیخ تمام نقشبندی کی زیارت	۳۴۰
مفتی امین الحسینی کی تصنیف ومحبت اوران کی روحانی بلندی	۳۴۰
مفتی رجب کا دعوت نامہ	۳۴۱
محترم مفتی امین الحسینی کی ضیافت	۳۴۳
محترم صاحب سے گفتگو حسن البناء کی تعریف اوراخوانیوں کی قربانیوں کا اعتراف	۳۴۳
سوڈانی وفد کے جلسۂ استقبالیہ میں	۳۴۵
سوڈانی وفد کی ملاقات	۳۴۷
مولانا محمد صادق مجددی سفیر افغانستان کی تشریف آوری	۳۴۷
سفر سوڈان کا نظم	۳۴۸
شیخ حامد فقی کی تنقید اور میرا جواب اور شیخ کا اطمینان	۳۴۸
سوڈانی سفارت خانہ میں	۳۵۰
شیخ احمد الشرباصی کا خطبہ جمعہ	۳۵۰
مولانا ابوالکلام آزاد سے ملاقات	۳۵۰
نئی کتابوں کے بارے میں مولانا کی رائے	۳۵۱
جدہ کی ممتاز شخصیت	۳۵۲
وزارتِ داخلہ میں عجیب تجربہ	۳۵۲
علامہ زاہد کوثری کا ہدیہ یہ کتب	۳۵۳
سفارت خانوں کی آمدورفت	۳۵۳
سیّد قطب اپنی زندگی کے اتار چڑھاؤ بیان کرتے ہیں	۳۵۵
شیخ عبدالرزاق حمزہ سے ملاقات	۳۵۶

زندگی کا ایک تلخ تجربہ اور سبق	۳۱۴
دارالمنار اور اس کے مالک	۳۱۶
دارالہلال کی سیر	۳۱۷
شیخ حسنین محمد مخلوف کی عیادت	۳۲۰
اریٹریوں میں ہماری تقریر	۳۲۱
ترکوں کے جلسہ میں	۳۲۱
سنتریس میں	۳۲۲
جبہۃ علماء ازہر میں	۳۲۳
بعض شخصیات کے بارے میں ڈاکٹر احمد امین سے باتیں	۳۲۴
بچوں کی تعلیم کے بارے میں گفتگو	۳۲۵
المحلۃ الکبریٰ کا سفر	۳۲۵
نبروہ میں جماعتوں کی تشکیل	۳۲۶
تبلغی جماعت میں یوسف القرضاوی کی مناسب تقریر	۳۲۷
مولانا عبیداللہ بلیاوی کا مستورات میں بیان	۳۲۷
مصر کی کاٹن مل کی سیر	۳۲۷
منصور فہمی پاشا سے باتیں ان کی ابتدائی زندگی کے حالات	۳۳۰
ڈاکٹر فہمی میں دینی رجحان پیدا ہونے کے اسباب	۳۳۱
ڈاکٹر فہمی کا ادبی مقام	۳۳۱
یوم اقبال کے جلسہ میں عباس محمود عقاد سے ملاقات	۳۳۳
طبیعت کی ناسازی اور علاج و معالجہ	۳۳۴
شیخ صبری عابدین کی قیام گاہ پر	۳۳۵
میرا اور مولانا عبیداللہ صاحب کا بے چینی اور اضطراب کا حال	۳۳۶
امام و خطیب حرم مکی شیخ عبدالرزاق حمزہ سے ملاقات	۳۳۷

عمان میں	۴۴۴
مجددی صاحب کی ملاقات	۴۴۴
الحاج ابوقورۃ کے مکان پر	۴۴۵
ملک عبداللہ کی طرف سے بلاوا	۴۴۵
ملک کے ساتھ باتیں	۴۴۶
شاہی دسترخوان پر میری گفتگو	۴۴۶
تحصیل مال وتبلیغ کا فرق	۴۴۷
شاہ کا جواب	۴۴۷
فلسطین کے بارے میں کچھ حقائق	۴۴۸
محمد الامین الشنقیطی سے مُلاقات	۴۴۹
پناہ گزینوں کی بدحالی ایک آگاہ کرنے والا خطرہ ہے	۴۴۹
الکلیۃ العلمیۃ الاسلامیۃ کی سیر	۴۵۰
مقالہ کی تیاری	۴۵۰
شاہ عبداللہ کی ضیافت میں	۴۵۲
ماذا خسر العالم کے بارے میں گفتگو اور شاہ کا تأثر	۴۵۲
مسجد اقصیٰ کے بارے میں شاہ سے تبادلۂ خیال	۴۵۳
ماذا خسر العالم پر محاضرہ	۴۵۳
شیخ عبدالوہاب صلاحی کے مکان پر	۴۵۴
شیخ احمد اکفتارو، شیخ محمد النمر اور شیخ بہجۃ البیطار سے ملاقاتیں	۴۵۴
استاد سعید رمضان اور شیخ مصطفیٰ سباعی سے ملاقات	۴۵۴
ریاض الصلح بک کا اچانک قتل اور شام میں اس کا ردّعمل	۴۵۵
استاد محمد المبارک کی گفتگو	۴۵۶
شیخ حسن حبنکہ کی ملاقات	۴۵۶

دینی مدارس اوران کے ردّ وبدل کے بارے میں گفتگو	۴۵۷
دینی دعوت کا اثر عوام میں	۴۵۸
ایک اہم مشغولیت اور مقالہ کی تیاری	۴۵۸
استاد محمد علی الحومانی کے ساتھ باتیں	۴۵۹
بزرگ عالم شیخ محمد علی ظبیان سے شرف ملاقات	۴۵۹
فلسطین سے متعلق میرے مقالہ کے عناصر	۴۶۰
استاد تیسیر ظبیان	۴۶۱
شاہ عبداللہ کے قتل کی خبر	۴۶۲
کچھ معزز احباب	۴۶۳
استاذ ادیب خاں کے ساتھ	۴۶۴
الجمعیۃ الغراء اور النادی العربی کی سیر	۴۶۴
جمعیۃ التمدن الاسلامی میں	۴۶۵
دمشق یونیورسٹی میں میرا مقالہ	۴۶۶۶
شیخ محمد علی ظبیان کی دعوت میں مشائخ دمشق کا تذکرہ	۴۶۸
سیدنا زید بن ثابت اور سیدنا زید بن ارقم رضی اللہ عنہما کے مرقد پر	۴۶۹
الجمعیۃ الغراء میں میری تقریر	۴۶۹
شرق اردن کی خبریں	۴۷۰
شیخ عالم جلیل حسن حبنکہ کی ضیافت	۴۷۰
استاد محمد عزت دروزہ سے مسئلہ فلسطین پر گفتگو	۴۷۰
”مضایا“ میں	۴۷۱
بلودان کانفرنس کی یاد	۴۷۲
مرکز اخوان میں میری تقریر	۴۷۲
دمشق یونیورسٹی کی مسجد میں خطبۂ جمعہ اور حدیث سوال کی تشریح	۴۷۴

اشرفیہ کے گرمائی مستقر میں شیخ مصطفیٰ سباعی کے ساتھ	۴۷۶
دینی جوش وخروش بوڑھوں سے زیادہ جوانوں میں	۴۷۷
مشہور صاحب قلم علاّمہ محمد کرد علی سے ملاقات	۴۷۸
شیخ الاسلام ابن تیمیہ، علامہ ابن قیم اور علامہ ابن کثیر کے مرقد پر	۴۷۹
ملوکِ عرب پر شیخ کامل قصاب کا تبصرہ	۴۸۰
دمشق سے حمص کو	۴۸۱
بچپن کی یادیں اور صمصام الاسلام کا تذکرہ	۴۸۱
شامی فتوحات کی تاریخ اور عالم اسلام پر اس کے اثرات	۴۸۲
عالم اسلام کو کسی سیف اللہ کی ضرورت ہے	۴۸۳
سیدنا خالد بن ولیدؓ کے مرقد پر	۴۸۳
ایک مخلص دوست کی ملاقات	۴۸۴
مفتی حمص سے ملاقات	۴۸۴
مسجد دحیہ کلبیؓ اور مسجد نورالدین زندگی میں	۴۸۴
مرکز اخوان المسلمین میں شیخ عمر بہاء الامیری سے ملاقات	۴۸۵
سیّدنا عمر بن عبدالعزیز کی قبر پر	۴۸۵
شہر حماۃ کو روانگی	۴۸۶
گیلانی خاندان	۴۸۶
جلسہ میں میری تقریر	۴۸۷
اہل شام کی ذمہ داری	۴۸۷
حماۃ کے رہٹ	۴۸۸
حماۃ کے تاریخی آثار	۴۸۹
ابوالفداء حموی	۴۸۹
ثانویہ ابن رشد میں	۴۹۰

آل العظم کا محل	۴۹۰
مولانا عبید اللہ بلیاوی اور.....	۴۹۰
القلعۃ الخیریۃ میں	۴۹۱
دوسرے آثار	۴۹۱
معرۃ النعمان میں	۴۹۲
ابوالعلاء معری کی قبر پر علامہ میمنی کی یاد	۴۹۲
سیف الدّولہ کے پایۂ تخت میں	۴۹۳
استاذ مصطفیٰ الزرقاء	۴۹۴
حلب کے جلسہ میں میری تقریر	۴۹۴
عہد ماضی میں اس وقت کی دنیا پر عربوں کے غلبہ کا راز	۴۹۴
عرب اپنے عالمی مرکز کی طرف کیسے لوٹ سکتے ہیں؟	۴۹۵
فقہ اسلامی ہفتہ کی تقریب میں اسلامی قوانین کی فوقیت و برتری کا اعتراف	۴۹۶
استاذ زرقاء اور ڈاکٹر دوالیبی کی جامعیت	۴۹۷
شیخ محمد نبہان سے ملاقات	۴۹۷
علماء حلب کے ساتھ	۴۹۷
حلب کے کتب خانہ میں	۴۹۸
علوم شرعیہ کے ادارہ میں	۴۹۸
شیخ عبدالفتاح ابوغدہ کے ساتھ ناشتہ اور عارم گاؤں کی سیر	۴۹۸
حلب کے قلعہ کی سیر	۴۹۹
سیف الدولہ کی یادگاریں مٹ گئیں	۴۹۹
حلب سے دمشق	۵۰۰
دمشق میں	۵۰۰
استاد امین المصری کے ساتھ	۵۰۲

غیر عرب ملکوں میں عربی زبان کی نشر واشاعت کے طریقۂ کار کے بارے میں میری رائے	۵۰۲
مدرسہ دیر یاسین کی سیر	۵۰۳
شام پر ایک اجمالی نظر	۵۰۳
رقبہ وآبادی	۵۰۳
سوریہ کی انتظامی تقسیم	۵۰۴
تعلیم یافتہ طبقہ کا تناسب اور اقتصادی حالت	۵۰۴
نظام تعلیم	۵۰۴
سوریہ کی تعلیم تین مراحل پر منقسم ہے	۵۰۵
تحریر وعبارت کے علاوہ جو اسباق پہلے سال میں پورے ہو جائیں حسب ذیل ہیں:	۵۰۵
دوسرا مرحلہ ثانوی اور اس سے متعلق تعلیم ہے	۵۰۵
اور درمیانی مرحلہ کی مختلف قسمیں ہیں وہ یہ ہیں	۵۰۶
دینیات کے علاوہ جو مضامین پڑھائے جاتے ہیں وہ یہ ہیں	۵۰۶
درمیانی تعلیم کا مقصد	۵۰۶
اعلیٰ تعلیم کی منزل (یہ ثانوی تعلیم کا دوسرا جزو ہے)	۵۰۶
یونیورسٹی کی تعلیم	۵۰۷
سوریہ یونیورسٹی کے کالج درج ذیل ہیں	۵۰۷
خلاصہ	۵۰۸
سوریہ کے ادیان اور پارٹیاں	۵۰۸
ملکی سیاسی پارٹیاں	۵۰۹
خالص سیاسی پارٹیاں	۵۱۰
سوریہ کی خوبیاں اور خامیاں	۵۱۰
اموی پایہ تخت دمشق سے مرکز وحی خلافت مدینہ منورہ کی طرف	۵۱۴
جزیرۃ العرب کے سامنے مصر وشام وسوڈان کے سفر کی رپورٹ وروداد	۵۱۵

ضمیمہ	
تین دن لبنان میں	۵۲۳
سوریہ کا سفر	۵۲۳
سوریہ سے لبنان	۵۲۳
لبنان میں	۵۲۴
ایک پیکر دعوت شخصیت شیخ ابو عمر لبنانی کا کچھ تعارف	۵۲۶
استاذ توفیق حوری سے ملاقات	۵۲۷
مفتی جمہوریہ لبنانی مجد کے ساتھ	۵۲۸
چیف جسٹس شفیق یموت سے ملاقات	۵۲۸
لبنان کا موجودہ تمدن	۵۲۸
میرا تاثر	۵۲۹
امام اوزاعی کے مرقد پر	۵۲۹
مشہور مغربی مصنف سابق لیوپولڈ ویس محمد اسد سے ملاقات	۵۳۱
طرابلس الشام میں	۵۳۲
کچھ طرابلس کے بارے میں	۵۳۴
بیروت کو الوداع اور تحریک عباد الرحمٰن سے متعلق رائے	۵۳۵

عرض ناشر

بسم الله الرحمن الرحيم

الحمد لله رب العالمين والصلوة والسلام على خاتم النبيين سيد المرسلين وعلى اٰله الطيبين الطاهرين واصحابه الغرالميامين وعلى من تبعهم باحسان ودعا بدعوتهم الى يوم الدين اما بعد!

عالم عربی میں دعوت کے کام کے متعلق حضرت مولانا کو اس کی بڑی آرزو تھی جو آخر وقت تک قائم رہی کہ اگر ہندوستان کا کام کچھ جم جائے تو آپ اپنے چند مخصوص رفقاء کے ساتھ اسلام کے اصل مرکز میں جا کر اس کام کی دعوت دیں اور وہاں اس کو شروع کریں کہ یہ وہیں کی سوغات ہے، اور وہاں کے رہنے والے اس کے سب سے زیادہ مستحق ہیں کہ ''بضا عتنا ردت الینا'' کہہ کر اس کا استقبال کریں۔ پھر ان کے ذریعہ سے یہ دولت عالم اسلام میں گھر گھر بٹے۔ (کاروان زندگی جلد اول ۲۳۶)

۱۹۴۴ء میں حضرت حضرت مولانا محمد الیاس صاحب کا سانحہ ارتحال پیش آ گیا۔ چنانچہ ان کے فرزند و جانشین حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ نے ۱۹۴۵ء ہی سے جماعت کے بعض خواص کو حجاز روانہ کیا اور ۱۹۴۶ء میں حضرت مولانا الیاسؒ کے خاص معتمد مولانا عبید اللہ صاحب بلیاوی کو حجاز کے قیام اور وہاں کے کام پر متعین فرما دیا، مولانا نے بہت جلد عرب عوام کو اس دعوتی کام سے روشناس اور ایک حد تک مانوس کر دیا تھا لیکن اس کے ساتھ انہوں نے اس حقیقت وضرورت کو محسوس کیا کہ اہل علم واہل اقتدار طبقے میں مؤثر طریقے سے اس دعوت کے تعارف کی ضرورت ہے تبھی یہ کام زیادہ توجہ کا مستحق ہو سکے گا، انھوں نے پہ در پہ

خطوط اس ضرورت کا احساس دلانے کے لئے حجاز سے مرکز نظام الدین حضرت مولانا محمد یوسفؒ کو لکھے، اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے نام کا بھی اشارہ کیا کہ اس کے لئے وہ زیادہ مفید وموزوں ہوں گے، بالآخر حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی کے مشورہ سے یہ طے پایا کہ وہ حج وتبلیغ ودعوت کی نیت سے حجاز کے لئے شدرحال کریں، چنانچہ ۱۹ر شعبان ۱۳۹۶ھ مطابق ۹ر جولائی ۱۹۴۷ء کو کراچی سے حجاز مقدس روانہ ہوئے اور ان کے ہمراہ افراد خاندان میں والدہ صاحبہ خیر النساء بہتر مرحومہ، اہلیہ محترمہ سیدہ طیب النساء مرحومہ، ہمشیرہ محترمہ سیدہ امۃ اللہ تسنیم (عائشہ بی) مرحومہ اور بھانجے مولانا سید محمد ثانی حسنی ساتھ تھے، جنوری ۱۹۴۸ء میں چھ ماہ کی مدت گذار کر ہندوستان واپس آئے، پھر دوسرا سفر اسی مقصد وکام سے ۱۹۵۰ء میں اپنے شیخ ومرشد حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری قدس سرہ کی سرپرستی میں کیا، جس کا تقاضہ ایک سال قبل ۱۹۴۹ء میں حضرت مولانا محمد یوسف صاحب کی طرف سے تھا، اور حج کا موقع دوسری بار حاصل ہورہا تھا، یہ بات کسی سے مخفی نہیں کہ پہلے حج کے بعد دوسرے حج کا اشتیاق وانتظار اور بڑھ جاتا ہے مگر کسی حکمت ومصلحت سے ان کو ان کے استفسار پر ان کے شیخ ومربی حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری نے یہ فرما کر سفر نہ کرنے کا اشارہ دیا کہ اگر میں روک دوں تو طبیعت پر کوئی اثر تو نہ پڑے گا؟ مولانا نے اپنے شیخ کی منشا کو ترجیح دی پھر اگلے سال حضرت رائے پوری نے خود حج کے سفر کا ارادہ کیا اور حضرت مولانا کو ساتھ چلنے کا اشارہ کیا اور ایک موقع سے کہا کہ یہ سفر میں نے تمہارے لئے کیا ہے (۱) جس کے لئے حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی نے اپنی مرحومہ صاحبزادی کی طرف سے حج بدل تجویز کیا اور مزید نظام الدین مرکز دھلی سے کچھ ایسے افراد کو بھی ساتھ لینے کی بھی ہدایت ہوئی جو دعوت کے کام میں وہاں کے قیام میں معاون ہوسکیں، ندوۃ العلماء سے مولانا معین اللہ صاحب ندویؒ، مولانا عبداللہ عباس ندوی، مولانا محمد رابع حسنی ندوی، مولانا سید محمد طاہر منصور پوری، مولانا عبدالرشید ندوی اعظمی، مولانا حافظ سید رضوان علی ندوی پر مشتمل افراد ساتھ ہوئے، اور حجاز میں مولانا سعید احمد خاں مکی، مولانا عبیداللہ بلیاوی، مولانا مفتی زین العابدین لائل پوری اور دوسرے حضرات

(۱) کاروان زندگی جلد اول۔ صفحہ ۲۵۴۔۲۵۵

پہلے سے سرگرم عمل تھے، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ حج کے بعد حجاز سے مولانا عبید اللہ صاحب بلیاوی، مولانا معین اللہ ندوی اندوری اور مولانا عبدالرشید صاحب ندوی کے ساتھ مصر میں کام کرنے اور کام کو متعارف کرنے کے لئے تشریف لے گئے، حضرت مولانا کی کتاب ''ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین'' سامنے آچکی تھی اور ان کی اس کتاب کا علمی وثقافتی حلقوں میں اچھا استقبال ہوا تھا اور اس کے ذریعہ ان کا تعارف ہو چکا تھا، اس لئے کام کرنے اور اس کے خواص وعوام میں تعارف کرانے میں آسانی ہوئی اہل فکر ودعوت اتنے مانوس ہو گئے تھے کہ اس کو ''الدعوۃ الندویہ'' کہنے لگے تھے، جماعتیں بھی تشکیل پاتیں اور لوگ اس میں نکلنے لگتے تھے مصر سے سوڈان، اور پھر فلسطین، اردون شام اور واپس مصر اور حجاز مقدس ہو کر ہندوستان واپسی ہوئی، اور اس میں ایک سال سے زیادہ عرصہ لگا، لیکن یہ دورہ بہت مفید ہوا، اور روزنامچہ لکھنے کا بھی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے اہتمام کیا، اور مولانا عبید اللہ بلیاوی نے بھی جو ان تمام مقامات پر برابر ساتھ رہے تھے، اور ایک جان دو قالب کی طرح پوری محبت وتعلق کے ساتھ رہے تھے، مذکرات لکھنے کا اہتمام کیا تھا، ان دونوں یادداشتوں کو سامنے رکھ کر جو یادداشت تیار ہوئی اس نے مذاکرات سائح فی الشرق العربی'' کا کام پایا، اور وہ مصر میں شائع ہو کر مقبول ہوئی، مزید اس کے ایڈیشن بھی نکلے اور پھر اس کے بعض مضامین کو اردو میں منتقل کرنے کا کام مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی مدظلہ العالی نے الفرقان لکھنؤ میں کیا لیکن باقاعدہ اس کا کتابی ترجمہ اردو میں مدیر تعمیر حیات مولانا شمس الحق ندوی استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء نے کیا جو 'شرق اوسط کی ڈائری' کے نام سے مکتبہ فردوس مکارم نگر لکھنؤ سے مخدومی حضرت مولانا ڈاکٹر سعید الاعظمی ندوی نے متعدد بار شائع کیا، اس حقیر کے لئے یہ بڑی سعادت کی بات ہے کہ انھوں نے از راہ کرم اس کی اشاعت کا حق اسے عطا کیا اور اب اس کی اشاعت مکتبۃ الشباب العلمیہ لکھنؤ کی طرف سے پہلی بار ہونے جارہی ہے، شرق اوسط کا یہ سفر ممبئی سے ۴ ستمبر ۱۹۵۰ء کو شروع ہو کر اکتوبر ۱۹۵۱ء کو پورا ہوا جس میں دو حج ملے اس طرح شروع وآخر کا قیام حجاز مقدس میں رہا۔

اس اشاعت کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں وہ حصہ شامل کر دیا گیا ہے جس کے بغیر

اب تک اس کی اشاعت عربی اور اردو میں ہوتی رہی تھی وہ حجاز مقدس کے مبارک ایام کا حصہ ہے، جو ان کے جانشین مخدوم ومربی حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم کے قلم سے ہے جو انہوں نے راقم کی فرمائش پر از راہ شفقت اس جدید ایڈیشن کے لئے تجویز فرمایا اور چونکہ اس سے قبل حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ سفر حجاز میں ان کے بڑے بھانجہ مولانا سید محمد ثانی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ تھے اور انہوں نے بھی روزنامچہ لکھنے کا اہتمام کیا تھا، اس کے سب اوراق تو محفوظ نہ رہ سکے البتہ جو تعمیر حیات میں ۱۹۸۴ء میں شائع ہوئے تھے، وہ ان کے نواسہ برادر عزیز مولوی سید محمود حسن حسنی ندوی کی فکر وتوجہ سے حاصل ہوئے، اسے بھی اس اشاعت جدید میں محفوظ کر دیا گیا ہے، مزید اس پہلے سفر حجاز سے متعلق حضرت مصنف علیہ الرحمہ کی کاروانِ زندگی کی تحریر بھی شامل ہے۔ یہ کتاب کلمۂ مترجم کے بغیر شائع ہوتی رہی تھی طبع جدید میں مترجم کتاب مولانا شمس الحق ندوی مدظلہ مدیر تعمیر حیات لکھنؤ نے بھی اپنی بات تحریر فرمائی ہے، اس طرح سے یہ کتاب اہم اضافوں کے ساتھ ہدیہ قارئین کی جارہی ہے، چونکہ اس کی طباعت قدیم کتابت کی تھی اس کو کمپوزنگ کے مرحلہ سے گذارا گیا جس کے لئے پروف تصحیح کے بھی مراحل تھے اس میں اپنے جن دوستوں کا تعاون حاصل ہوا اُن کے ہم تہہ دل سے شکر گذار ہیں، خصوصا مولوی محمد رضوان نستار ندوی بھٹکلی، مولوی ریان ندوی بھٹکلی وغیرہ، آخر میں پروف کی تصحیح میں استاذ محترم مولانا ابوالمعظم نذر الحفیظ ندوی ازہری عمید کلیۃ اللغۃ العربیۃ وآدابہا دارالعلوم ندوۃ العلماء نے جو رہنمائی فرمائی وہ انہی کا حق تھا اس لئے کہ وہ شرق اوسط خصوصاً مصر کی شخصیات ومقامات سے واقف بھی ہیں اس لئے کہ وہ وہاں کئی سال گزار چکے ہیں اور مترجم کتاب مولانا شمس الحق ندوی کے رفیق ودوست ہونے کے ساتھ مصنف کتاب کے بڑے معتمد اور کاتب ومعاون رہے ہیں اور آخری مرحلہ میں جناب حامد صاحب خوشنویس نے بھی تعاون دیا اللہ تعالیٰ ان سب کو جزائے خیر عطا کرے اور حقیقی تعریف اللہ تعالیٰ کی جس نے توفیق دی اور اسی سے دعا ہے کہ وہ قبول بھی فرمائے اور نافع بنائے، آمین

سید ہاشم نظام الدین ندوی

۱۲/ربیع الاول ۱۴۳۹ھ مکتبۃ الشباب العلمیۃ، لکھنو

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرض مترجم

الحمد لله وكفى وسلام على عباده الذين اصطفى اما بعد

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے ۵۰۔۱۹۵۱ء میں اپنے کئی شاگردوں مولانا معین اللہ ندوی، مولانا عبداللہ عباس ندویؒ مولانا عبدالرشید اعظمی ندوی، مولانا سید محمد طاہر منصور پوری، مولانا سید رضوان علی ندوی اور اپنے عزیز بھانجہ مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کے ساتھ دعوتی وتبلیغی مقصد سے حجاز مقدس کا سفر کیا تھا، اس سفر سے حجاز مقدس کے علماء اور اہل علم ودانش حلقوں میں حکیمانہ انداز سے دعوت کا کام شروع ہوا کچھ عرصہ وہاں گذار کر حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ بانی جماعت تبلیغ کے معتمد خاص مولانا عبید اللہ بلیاوی اور اپنے رفقاء سفر میں دو عزیز شاگردوں مولانا معین اللہ ندوی اور مولانا عبدالرشید اعظمی ندوی کے ساتھ حجاز مقدس سے مصر کا سفر کیا اور وہاں کی چوٹی کی دینی دعوتی علمی فکری شخصیات سے ملاقات، تبادلہ خیال مذاکرات اور جلسوں میں خطبات کے ذریعہ گہرا اثر ڈالا، چوں کہ اس وقت حضرت مولانا کی معرکہ آراء کتاب ''ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین'' مشہور مورخ ومصنف ومحقق ڈاکٹر احمد امین بک کے مقدمہ کے ساتھ طبع ہوکر آئی تھی، اور اس کا علمی دعوتی حلقوں میں زبردست استقبال ہوا تھا اور اس سے حضرت مولانا کا اچھا تعارف بھی ہو رہا تھا، آگے حضرت مولانا نے سوڈان، فلسطین وشام وغیرہ کے بھی سفر کئے اور پھر حجاز مقدس میں مزید تین چار مہینہ قیام کر کے ہندوستان واپس ہوئے، چونکہ روز نامچہ لکھنے کا اہتمام فرمایا تھا اس لئے یہ روز نامچہ ایک

بامقصد کتاب کے طور پر سامنے آگیا، اور طبع بھی ہوا، حضرت مولانا کے اس سفر میں حکام وسربراہان مملکت سے ملاقاتیں کی تھیں، اور مختلف دینی وعلمی موضوعات اسلامی مسائل، اصلاحی تحریکات، اور تعلیمی منصوبوں پر گفتگو کرنے کا موقع ملا تھا، اگرچہ حضرت کی عمر اس وقت صرف ۳۶۔۳۷ سال کی تھی لیکن حضرت کے بڑے بھائی حضرت مولانا ڈاکٹر حکیم سید عبدالعلی حسنی (فاضل دارالعلوم ندوۃ العلماء ودارالعلوم دیوبند وایم بی بی ایس) جو اس وقت ندوۃ العلماء کے ناظم تھے نے اپنے چھوٹے بھائی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی جس انداز میں علمی فکری اور دینی تربیت کی تھی اس سے حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی دینی اٹھان کے ساتھ علمی فکری سطح بھی اتنی بلند ہوچکی تھی کہ بڑی سے بڑی علمی فکری ادبی اور جدید تعلیم یافتہ شخصیتوں سے پورے اعتماد کے ساتھ گفتگو کرتے اور اپنی دینی، علمی وفکری صلاحیتوں سے ان پر اثر ڈالتے، چنانچہ وہاں کے سبھی حلقوں نے مولانا کے خیالات کو توجہ کے ساتھ سنا، حضرت مولانا کا یہ سفر ایک سال سے زائد عرصہ کا تھا جس میں ان کو دوبارہ حج بیت اللہ کی سعادت بھی حاصل ہوئی، اور اس طرح اس عظیم دعوتی سفر کا اول وآخر حصہ حجاز مقدس میں گذرا تھا، لیکن حجاز مقدس کے احترام وتقدس میں اس کی روداد دوسرے مقامات کے ساتھ شامل نہیں کی، البتہ اس کی اہمیت کے پیش نظر اور یہ کہ دوسرے مقامات کے سفر اسی مقام مقدس کے طفیل میں تھے، ان کے بھانجے حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی دامت برکاتہم (ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ) نے اسی کتاب کے جدید ایڈیشن کے لئے جامع اور مختصر سفرنامہ تحریر فرمایا جو ان کے شرق اوسط کے روزنامچہ ''مذکرات سائح فی الشرق العربی'' کے اردو ایڈیشن کی جدید طباعت میں شامل کیا جارہا ہے۔

چونکہ اسی دعوتی تبلیغی مقصد سے اس سے تین سال قبل حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کا حجاز مقدس کا سفر ۱۹۴۷ء میں ہوا تھا اور جنوری ۱۹۴۸ء میں ہندوستان واپسی ہوئی تھی جو چھ ماہ پر مشتمل تھا، اور والدہ ماجدہ، اہلیہ محترمہ اور ہمشیرہ صاحبہ سیدہ امۃ اللہ تسنیم اور بھانجہ

مولانا سید محمد ثانی حسنی ساتھ تھے، اس کا روزنامچہ ان کے ان صاحب دل اور ولی صفت بھانجہ مولانا سید محمد ثانی حسنی کے قلم سے ان کی وفات کے بعد تعمیر حیات لکھنو میں شائع ہوا تھا، اب شرق اوسط کی ڈائری کے جدید ایڈیشن کا آغاز بھی اسی سے کیا جارہا ہے۔

مذکرات سائح فی الشرق العربی کے اردو ترجمہ کی سعادت راقم سطور کو حاصل ہوئی تھی اور یہ ترجمہ بالاقساط تعمیر حیات کے شماروں میں شائع ہوا تھا، یہ میرے لئے بڑی عزت وشرف کی بات تھی کہ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو پسند فرمایا، اور اس کے لئے مقدمہ بھی تحریر فرمایا پھر یہ شرق اوسط کی ڈائری کے نام سے مکتبہ فردوس مکارم نگر لکھنؤ سے شائع ہوا، اور اب اس کا تیسرا ایڈیشن مکتبۃ الشباب العلمیہ اور مکتبہ فردوس کے اشتراک وتعاون سے دو حجازی سفرناموں کے اضافوں کے ساتھ جن کا اوپر ذکر ہوا شائع ہورہا ہے جس کے لئے مترجم عزیز القدر مولوی سید محمود حسن حسنی ندوی سلمہ اللہ تعالی کا شکر گذار ہے کہ وہ اس اضافہ کا ذریعہ بنے، اور نئی کمپوزنگ اور طباعت جدید کی انہوں نے نگرانی کی، اللہ تعالیٰ قبول فرمائے اور بہتر بدلہ عطا فرمائے۔

جہاں تک اس ڈائری کا تعلق ہے وہ جس عہد کی ہے اس عہد کی اکثر شخصیات اپنا کام پورا کر کے اس کا حقیقی صلہ پانے کے لئے اپنے مالک حقیقی کے حضور حاضر ہوچکی ہیں۔ اور جن شخصیات کا سایہ ہمارے سروں پر قائم ہے وہ اس وقت عالم اسلام کی قائد شخصیات میں نمایاں مقام کی حامل ہیں، رفقائے سفر میں حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کی ذات گرامی اور شرق اوسط میں جن شخصیات سے ملاقات وتعارف ہوا اور جو استفادہ کے لئے حاضری کا التزام رکھتی تھی، ان میں علامہ شیخ یوسف القرضاوی کا نام اور کام سب سے روشن ہے جن کی نیازمندانہ حاضری واستفادہ کا حال قارئین کتاب میں ملاحظہ کریں گے۔ انہی قابل ذکر لوگوں میں ترکی کے شیخ امین سراج حفظہ اللہ بھی ہیں جو حضرت مولاناؒ سے دینی وفکری توجیہات اور دعوتی وتعلیمی حکمت عملی لینے کا اہتمام کرتے تھے اور اس کے ذریعہ انہوں نے ترکی میں خاموش انقلاب لانے میں بڑا کردار ادا کیا۔

جہاں تک کتاب کی علمی وادبی حیثیت کا تعلق ہے قارئین اس روزنامچہ میں شخصیات کے حقیقی خدوخال کو نمایاں دیکھ سکیں گے، اوران کے سامنے وہ ماحول جس میں یہ روزنامچہ لکھا گیا ہے دینی فکری اوراجتماعی اضطراب وبے چینی کے عنصر کے ساتھ نظر آئے گا۔

اور بقول وقائع نگار کے:

''یہ ایک زندہ انسان کی تصویر کشی اور منظر نگاری ہے جس کا رشتہ ماضی، حال اور مستقبل تینوں سے وابستہ ہے اور وہ اپنے کو ان کے خاندان کا ایک فرد تصور کرتا ہے، جو ان کے مسرت وغم اور کامیابی وناکامی ہر چیز میں شریک اور حصہ دار ہے۔ (از مقدمہ)

حضرت مولانا کو اللہ تعالیٰ نے جو عالم گیر دینی علمی ملی اور امت مسلمہ کی فکر ودرد عطا فرمایا تھا، حضرت مولانا قدس سرہ اس کو پورے جوش، اخلاص اور دل کی تڑپ وبے کلی کے ساتھ پیش فرماتے تھے، اوراس میں خودنمائی یا ادنی سے ادنی کسی ذاتی غرض وفائدہ کا اثر نہیں محسوس ہوتا تھا، اس لئے مسافر کی بات ہر حلقہ میں پورے ذوق وشوق کے ساتھ سنی گئی، عملی طور پر داعی کے اندر ''ان اجری الا علی اللّٰہ'' کا مشاہدہ ہوا۔

یہ سفرنامہ ان تمام باتوں کی جیتی جاگتی اور بولتی تصویر ہے جو اوپر عرض کی گئیں، اہل علم وادب اور جذبہ دعوت واصلاح رکھنے والے سبھی حضرات کو یہاں حاصل ہوسکتی ہے۔

یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ حضرت مولانا نوراللہ مرقدہ نے حجاز مقدس کا روزنامچہ تو نہیں لکھا تھا، لیکن اپنے پہلے سفر حجاز (جس میں ان کے افراد خاندان والدہ، اہلیہ بہن بھانجہ وغیرہ ساتھ تھے) کے متعلق سفرنامہ بیت اللہ ودیار حبیب اوراس کی دینی کیفیات پر مشتمل بڑا اثر انگیز مضمون لکھا تھا جو پہلے الفرقان لکھنؤ میں اس کے مدیر حضرت مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ نے شائع کیا اور پھر اپنی کتاب ''آپ حج کیسے کریں'' کا حصہ بنایا جو بعد میں کتابی شکل میں الگ سے بھی شائع ہوا، اوراس کے ایڈیشن نکلتے رہتے ہیں، بہت سے اہل خیر حج پر جانے پر جانے والوں کو بطور تحفہ پیش کر کے اظہار دعا کرتے ہیں۔ اس میں انہوں

نے جن کیفیات وتاثرات کو پیش کیا ہے وہ سفر نامہ ہی ہے اور حرمین شریفین سے محبت وعقیدت کا منارہ نور بھی، اس سفر میں جوان کا دیار نکہت ونور دیار محبت وشوق کا پہلا سفر بلکہ پہلی حاضری تھی حج بیت اللہ اور دربار نبوت کی حاضری کے ساتھ جن جن مقامات مقدسہ پر اپنی خاص قلبی کیفیات کے ساتھ حاضر ہوئے ہیں اس کتاب میں مولانا کے دل کی دھڑکن اور پرنم آنکھیں صاف سنائی اور دکھائی دیتی ہیں، مزید دربار نبوت کی حاضری کے شوق کو مہمیز کرنے والی کتاب ''کاروان مدینہ'' بھی ایسی کتاب اور وہاں کے قیام اور مقام کی بہترین تصویر کشی کرنے والی اور ذات نبوی سے عشق ومحبت بڑھانے والی کتاب ہے، کہ بعض صاحب دل بزرگوں نے ان دونوں کے تعلق سے کہا کہ انھیں پڑھ کر دل کو تھام نہ سکا آنکھ کو روک نہ سکا، قارئین اگر حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے قلم سے حجاز مقدس کے قیام کی کیفیات سے بہرہ ور ہونا چاہتے ہیں تو ان کے لئے ان کی ان کتابوں ''اپنے گھر سے بیت اللہ تک'' اور ''کاروان مدینہ'' کا مطالعہ مفید اور اثر انگیز ہوگا۔ مزید حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ اپنی خودنوشت سوانح حیات کاروان زندگی جلد اول میں اس تفصیل کا اجمال پیش کر دیا ہے اسے بھی ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔ 'شرق اوسط کی ڈائری' کے اس جدید ایڈیشن میں ان کے افراد خاندان کے قلم سے اس خلا کو پُر کرنے کی کوشش کی گئی۔ اور کاروان زندگی کے اس حصہ سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے نفع کو عام فرمائے اور اپنی رضا کے حصول کا ذریعہ بنائے۔ آمین

شمس الحق ندوی

۹ ربیع الاول ۱۴۳۷ھ

دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنو

مقدمہ

الحَمْدُ لِلّٰهِ وَ الصّلوٰة وَ السَّلَام عَلیٰ رَسُوْلُ اللّٰهِ وعلیٰ من والاهُ وبعد!

عربی کتب خانہ میں (بشمول قدیم وجدید) سفرناموں اور سیر وسیاحت کی کتابوں کی کبھی کمی نہیں رہی، عرب اور مسلمان کثرت اسفار میں ہمیشہ دوسری قوموں سے ممتاز رہے خطر پسندی اور مہم جوئی ان کی فطرت میں شامل تھی۔ ان میں بڑے بڑے سیاح اور حوصلہ مند انسان پیدا ہوئے۔ ان سفرناموں میں ابن جبیر اندلسی (م ۶۱۴ھ) اور ابن بطوطہ مغربی (م ۷۷۶ھ) کے سفرنامے سب سے زیادہ شہرت رکھتے ہیں۔ اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان دونوں سفرناموں نے اس وقت عالم اسلام اور اسلامی معاشرہ کی پوری تصویر ہمارے لئے محفوظ کردی ہے۔ اور اپنے زمانہ کی شخصیات کا سَراپا ہمارے سامنے پیش کردیا ہے۔ یہ وہ تصویریں اور خاکے ہیں جن سے وہ کتابیں بالعموم خالی ہوتی ہیں جن کا تعلق سرکار، دربار، رزم وبزم کے افسانوں، سیاسی انقلابات اور خانہ جنگیوں سے ہوتا ہے، تذکرے کی ان کتابوں میں بھی جو علماء ومشائخ اور مناقب وفضائل سے تعلق رکھتی ہیں، زندگی کا یہ عنصر بہت کم ملے گا۔

ایسی کتابیں بہت کم ہیں جن میں قلبی واردات اور احساسات وخیالات کی صحیح ترجمانی کی گئی ہو، اس سلسلے میں دو کتابیں ضرور قابل ذکر ہیں، جن میں انسانی احساسات اور نازک خیالات کی پوری عکاسی موجود ہے، اور ان میں خفی سے خفی احساس اور روزمرہ کی زندگی کے تجربات کو ریکارڈ کیا گیا ہے، ان میں ایک امام غزالیؒ (م ۵۰۵ھ) کی کتاب " المنقذ مِن الضّلال " اور دوسرے ابن جوزی (م ۵۹۷ھ) کی کتاب " صید الخاطر " ہے۔

قدیم سفرناموں کی علمی قیمت وافادیت اور ان کے مصنفین کے علم وفضل کے

اعتراف کے باوجود اس حقیقت کا اظہار ضروری ہے کہ جس زندگی اور جس معاشرہ اور ملک کی انھوں نے آئندہ نسلوں کے لئے تصویر کشی کی ہے وہ ایک سادہ، محدود، اور پرسکون زندگی تھی، جس میں کوئی وسعت، تنوع، پیچیدگی اور دشواری نہ تھی، اس میں موجودہ زندگی کا تجدد وتنوع نہ تھا، یہ پورا دور فکری تحریکات، سیاسی انقلابات، متنوع اداروں اور جماعتوں، برسرِ پیکار فلسفوں اور متضاد شخصیتوں سے نا آشنا تھا۔ ان کے عہد میں زندگی کا صرف ایک رنگ، ایک آہنگ اور ایک تصویر پائی جاتی تھی، اس لئے ان کا کام آسان تھا، جس میں ایک اسلوب کو چھوڑ کر دوسرا اسلوب اختیار کرنے اور ایک فضا سے دوسری فضا میں منتقل ہونے یا نیا راستہ اختیار کرنے کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ دوسری بات یہ کہ یہ کتابیں ان اسفار اور مشاہدات وتاثرات کے بہت زمانہ بعد یا کسی امیر یا وزیر کی فرمائش پر لکھی یا املا کی گئیں، اگر واقعات کو قلمبند کرنے اور مقامات کی تعیین میں حافظہ کی قوت تسلیم بھی کر لی جائے (اگرچہ بعض ناقدین کو ان تفصیلات کی صحت پر شبہ ہے) تب بھی اس میں شبہ نہیں کہ ان تاثرات (جو سایۂ دیوار یا موجِ آب کی طرح ناپائیدار ہوتے ہیں) پر پورا اعتماد نہیں کیا جا سکتا، انسان بروقت اپنے کسی تاثر کو قلمبند کر سکتا ہے، لیکن کچھ عرصہ گذر جانے کے بعد محض اپنے حافظہ کی مدد سے اس کی تجدید اور مسرت والم اور انقباض وانشراح کی جو کیفیات اس پر گذر چکی ہیں اس کو ریکارڈ کرنا اس کے لئے آسان نہیں، تیسری بات یہ ہے کہ روزنامچہ لکھنے کا طریقہ پہلے زمانہ میں زیادہ رائج نہ تھا۔ اس کا رواج ان سیاحوں اور مصنّفوں کے بہت بعد ہوا یا اگر کہیں ایسا ہوا بھی تو وہ قارئین کے ہاتھوں میں نہ پہونچ سکا۔

موجودہ زمانے میں نشر واشاعت کی سہولتوں، سفر کی آسانیوں، سیر وسیاحت کی ہمّت افزائی اور اسباب ووسائل کی فراوانی کی وجہ سے سفرنامے بڑی تعداد میں لکھے گئے لیکن یہ سفرنامے زیادہ تر علمی وجغرافیائی فوائد ومعلومات پر مشتمل تھے، وقت گذاری اور تفریح کا مواد اس میں خاصا موجود تھا، اور باوجود اس کے کہ اس سے زندگی کے بعض پہلوؤں پر روشنی پڑتی تھی، تاہم ان کا مرکزی نقطہ سیر وسیاحت، آثار قدیمہ وقابل دید مقامات کی عکاسی رہا، اور

اگر زندگی کے کسی پہلو کی اس میں عکاسی ملی بھی تو بہت واجبی حد تک اور صرف اتنی جو مصنف کے دائرہ ذوق میں آتی ہو، یا اس کے سفر کے ساتھ ہم آہنگ ہو مثلاً اگر یہ سیاح ادیب تھا تو اس نے مشاہیر ادب کے تذکرے یا اس ملک کی ادبی سرگرمیوں کے ذکر پر اکتفا کی۔ اور اگر یہ مذہبی آدمی تھا تو اس نے دینی حالات کی پوری تفصیل سے کام لیا۔ اگر وہ کوئی سیاسی یا منتظم تھا تو اس نے سیاسی شخصیتوں کے تذکرہ اور سیاسی تحریکوں اور مکاتب خیال کی تصویر کشی میں سفر نامہ کا بڑا حصہ صرف کر دیا۔

اس کے علاوہ اکثر یہ کتابیں جذبہ اور عقیدہ سے خالی اور لطیف احساسات سے عاری ہوتی ہیں۔ اور ان کے مصنف ان میں کیمرہ یا ریکارڈ کا کردار ادا کرتے ہیں۔ واقعات و مشاہدات پر خود کوئی تبصرہ نہیں کرتے۔ اس میں ان کے دل کی کوئی دھڑکن اور ان کے ضمیر کی کوئی سرگوشی نہیں سنی جا سکتی، چنانچہ اگر کتاب کے سرورق پر ان کے نام کے بجائے کسی ایسے مصنف کا نام لکھ دیا جائے جس کا اس معاشرہ کے ساتھ نہ ثقافت کا کوئی تعلق ہو، نہ عقیدہ اور مذہب اور جذبہ اور وجدان کا کوئی اشتراک ہو تو اس سے صورت حال میں کوئی فرق واقع نہ ہوگا، ہو سکتا ہے کہ بعض لوگ اس کو وجہ فضلیت و کمال سمجھتے ہوں، لیکن بہت سے علماء اَدب اس کو عیب اور نقص قرار دیں گے اس لئے کہ جس تحریر سے قاری کو مصنف کے زمان و مکان کا بھی پتہ نہ لگ سکے، نہ مصنف کا عقیدہ اور مذہب و مسلک اس کو معلوم ہو سکے، نہ اس کی محبوب قدروں اور آئیڈیل شخصیتوں کا اسے علم ہو، نہ اس کی گرمجوشی اور قوت مدافعت کا اندازہ ہو، اس کی ان تحریریوں میں حزن والم کی تلخ کامی اور مسرت وشادمانی کی حلاوت محسوس نہ ہو وہ ایک مصنوعی اور بے جان تحریر ہے، جو نہ کسی کے دل پر اثر کر سکتی ہے اور نہ زندہ رہنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

مصنف کتاب کو ۱۹۵۱ء کے آغاز میں شرق اوسط کے سفر کا موقع ملا، اور ان ممالک کی دینی علمی واجتماعی حالات کا مطالعہ کرنے وہاں کی اہم شخصیتوں سے ملنے اور ان کے ساتھ مختلف دینی و علمی موضوعات، اسلامی مسائل، اصلاحی تحریکات اور تعلیمی منصوبوں پر

گفتگو کرنے کی نوبت آئی، اس نے ان سے اپنے ملک ہندوستان کا تعارف کرایا جس پر ناواقفیت کے دبیز پردے پڑے ہوئے تھے اور جو ایک طویل زمانہ سے عالم عربی سے منقطع تھا، نیز دعوت واصلاح کے وہ تجربے ان کے سامنے پیش کئے جو ہندوستان میں عہد آخر میں کئے گئے، اور بہت کامیاب رہے، اس کو عالمی عربی کے افکار ونظریات، اصلاحی تحریکات اور اہم شخصیات سے استفادہ اور وہاں کے فکری وادبی مکاتب خیال اور نئے نئے مسائل کو سمجھنے اور فائدہ اٹھانے کا موقع ملا۔ خدا کی توفیق سے ان ممالک کے سفر سے پہلے مصنف کا علمی وادبی اور ذہنی سانچہ بن چکا تھا اس کی ثقافت ہمہ رنگ اور متنوع تھی۔ اس کی شخصیت مختلف عناصر سے مرکب تھی، اس کو ادب، شعر وشاعری، تاریخ، علوم اجتماعی، تہذیب وتمدن اور فلسفۂ حیات جیسے مضامین سے دلچسپی تھی، اور علمی زندگی کا بھی تجربہ تھا، درس وتدریس اور تصنیف وتالیف دونوں چیزوں سے اس کا اشتغال رہا تھا، مصر وشام کے مختلف مدارس فکر اور دبستان ادب سے اس کی شناسائی تھی، اس لئے ان ممالک کا سفر علی وجہ البصیرت اور پوری واقفیت پر مبنی تھا، اور گویا صرف ملاقات کی کسر تھی، اسی کے ساتھ اللہ کی مشیت یہ ہوئی کہ یہ سفر مصنف کی سب سے مشہور کتاب ''ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین'' کی اشاعت کے بعد ہوا، جس کی وجہ سے مصنف کا اسلامی حلقوں میں اچھا تعارف ہو چکا تھا۔ یہ سب باتیں تھیں جن کی وجہ سے نووارد سیاح کو وہاں کے دینی وعلمی ماحول میں داخل ہونے کا پورا موقع ملا۔ اس نے وہاں پر ہر چشمۂ علم سے فیض اٹھایا، رجال کے ہر طبقہ سے تعلق رہا، ہر علمی بحث میں پورا حصہ لیا، ہر موضوع پر کھل کر گفتگو کی، اس نے فائدہ اٹھایا بھی، اور فائدہ پہونچایا بھی، لیا بھی اور دیا بھی۔

اس نے اس سفر میں اس کا التزام کیا کہ ہر گفتگو، ملاقات، تاثر ومشاہدہ کو زیادہ تر روز کے روز قلمبند کر لیا جائے۔ اور نقل واقتباس اور روایت میں اس کا خاص خیال رکھا جائے، اور اس کا اہتمام کیا جائے کہ جو الفاظ اور جو صیغے متکلم نے استعمال کئے وہی الفاظ حتی الامکان باقی رکھے جائیں، اس لئے اس کتاب میں مقامی اسالیب وادب کا پورا عکس آ گیا ہے، جس

سے مؤرخین ادب بعد میں استفادہ کر سکتے ہیں، کتاب کے قارئین اس روزنامچہ میں بہت سی شخصیات کے حقیقی خدوخال کو نمایاں دیکھ سکیں گے اور ان کے سامنے وہ ماحول (جس میں یہ روزنامچہ لکھا گیا ہے) اپنی پوری کشمکش اور تلاطم سا تھ آجائے گا جس میں نفسیاتی، فکری اور اجتماعی اضطراب و بے چینی کا عنصر نمایاں تھا بلکہ اس میں ان واقعات کی بھی عکاسی یا پیشین گوئی ملے گی جن کی صرف علامات نظر آرہی تھیں، ان شخصیات کو بھی دیکھا جاسکے گا جو ابھی پردے کے پیچھے تھیں اور ان دوررس تبدیلیوں کو بھی جن کے دھندلے اشارے افق پر ظاہر ہورہے تھے، اس لحاظ سے یہ روزنامچہ زندہ اور بولتی ہوئی تصویروں کا البم ہے جس کے ذریعہ قاری ایک ایسے دور میں کچھ وقت گذار سکتا ہے جو اب واپس آنے والا نہیں۔

اس میں مصنف نے اس بات کا بھی التزام کیا ہے کہ ملاقات، گفتگو اور مشاہدہ کے تذکرے کے سلسلے میں اپنے افکار و خیالات اور تاثرات بے کم و کاست بیان کردے۔ اور اس واقعہ کا جو ردعمل یا نفسیاتی تاثر اس پر پڑا ہے اس کو بغیر کسی ابہام و احتیاط اور بغیر کسی مروت اور تکلف کے صاف اور واضح طریقہ پر قلمبند کردے، یہ ایک زندہ انسان کی تصویر کشی اور منظر نگاری ہے جو اپنے سینے میں دل رکھتا ہے، جس کے کچھ عقائد، اصول اور اقدار ہیں، جن پر وہ عقیدہ رکھتا ہے، جس کو ان ملکوں سے محبت بھی ہے، جو ان کے ماضی، حال اور مستقبل تینوں سے وابستہ ہے، اور اپنے کو ان کے خاندان کا ایک فرد تصور کرتا ہے، جو ان کے مسرت والم اور کامیابی و ناکامی ہر چیز میں شریک اور حصہ دار ہے، جس کے نزدیک اسلام (جس سے اللہ تعالیٰ نے ان ملکوں کو سرفراز فرمایا اور دنیا میں اس کی اشاعت کے لئے ان کا انتخاب کیا) ہر چیز کا اصل پیمانہ اور معیار ہے اور اعمال، اخلاق، اور شخصیات سب کو اسی پیمانہ سے ناپنا چاہئے، یہ کتاب کی وہ خصوصیت ہے جس کے لئے مصنف کو کسی معذرت کی ضرورت نہیں، پھر ان ملکوں سے جدا ہوتے وقت وہ ان پر ایک وداعی اور اجمالی نظر ڈالتا ہے، اور اس کے محاسن اور کمزور پہلو دونوں کو اجاگر کرتا ہے، جو چیزیں اس کو اچھی معلوم ہوتی ہیں اور جو چیزیں اس کو رنجیدہ کرتی ہیں، جن چیزوں کو وہ ملک کے لئے خطرناک سمجھتا

ہے یا جن سے اس کی طبیعت متنفر ہوتی ہے، وہ سب اس میں بے کم وکاست پوری امانت داری کے ساتھ بیان کر دیتا ہے قطع نظر اس کے کہ یہ باتیں اس کے دوستوں اور محبین کو پسند آئیں گی یا ان کی ناپسندیدگی و ناراضگی کا باعث بنیں گی، اس لئے کہ ایک عرب شاعر نے پہلے ہی کہہ دیا ہے کہ:

و فی العتاب حیاۃ بین اقوام

"شکوہ اور اظہار ناگواری قوموں کی زندگی اور زندہ دلی کی علامت ہے"۔

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۹۵۴ء و ۱۳۷۳ھ میں "مذکرات سائح فی الشرق الاوسط" کے نام سے جماعۃ الازھر للتالیف و الترجمہ والنشر کی طرف سے شائع ہوا اس کا مقدمہ مصنف کے فاضل دوست اور ازہر کے رکن رکین ڈاکٹر محمد یوسف موسیٰ نے لکھا۔ اور مکتبۂ وہبہ قاہرہ نے اس کو شائع کیا لیکن یہ ایڈیشن طباعت کے اغلاط سے پُر تھا۔ اور اس کی طباعت وتصحیح کا کچھ زیادہ اہتمام نہیں کیا گیا تھا، مصنف کی ہر کتاب کے کئی کئی ایڈیشن نکلے سوائے اس کتاب کے جس کا اب تک صرف ایک ہی ایڈیشن نکل سکا ہے۔ اس درمیان مصر میں بہت سی سیاسی تبدیلیاں واقع ہوئیں، جن کے وجہ سے وہاں اس کی اشاعت کی نوبت نہ آسکی، جب مصنف کو علم ہوا کہ بعض ناشر اس کو دوبارہ چھاپنا چاہتے ہیں تو اسے شبہ تھا کہ اب کتاب کی افادیت باقی بھی ہے یا نہیں، اس کو اندیشہ تھا کہ اتنا پرآشوب زمانہ گذرنے کے بعد اس کی اہمیت وافادیت اور زندگی ختم یا کم ہو چکی ہوگی، لیکن جب مصنف نے کتاب کو دوبارہ اس نظر سے دیکھا تو اس کو اندازہ ہوا کہ یہ کتاب دراصل ایک تاریخی دستاویز ہے جو بجائے خود بڑی قیمت کی حامل ہے اس لئے کہ دستاویزات کی قیمت واہمیت مرور زمانہ سے گھٹتی نہیں بلکہ بڑھتی ہے۔ اس لحاظ سے جتنا زمانہ گذرے گا اور وہ ماحول ہم سے جتنا دور ہوگا جس میں یہ روزنامچہ قلمبند کیا گیا اسی کے بقدر ان معلومات اور نقوش وتاثرات کی قیمت میں اضافہ ہوتا رہے گا۔ اس میں ناظرین کو انسانی چہروں کے وہ خدوخال اور پیشانیوں کی وہ تحریریں صاف نظر آئیں گی جو اس کو تاریخ کی کسی کتاب میں

دستیاب نہیں ہوسکتیں، اس کو اس میں مشاہیر عالم، ارباب فکر ودانش، مصلحین اخلاق، ماہرین علوم اور صاحب طرز ادیبوں کے وہ اعترافات وبیانات ملیں گے جو اس کو خود ان کی تصنیفات اور روزنامچوں میں نہیں مل سکتے، ہوسکتا ہے کہ کسی اسکالر اور مؤرخ کو صدیوں کے بعد اس سے کوئی ایسی کڑی دریافت ہو جس سے واقعات کی پوری زنجیر مکمل ہو جائے اور وہ خلا پر ہو جائے جس نے اس کو اپنے کام سے مایوس کر دیا تھا۔ مؤرخ بظاہر ان غیر اہم واقعات، گفتگوؤں، ملاقاتوں اور مشاہدات سے بعض اوقات وہ نتائج اخذ کر سکتے ہیں اور ان سے وہ استفادہ کر سکتے ہیں جو تراجم وتذکرے کے ہزاروں صفحات اور جرائد ومجلات کی ضخیم فائلوں کی ورق گردانی سے ان کو حاصل نہیں ہوسکتا اس بنیاد پر مصنف نے کتاب کی دوبارہ اشاعت کی منظوری دے دی، قارئین، کتاب کی ان شخصیات کے بارے میں جواب پردۂ خفا میں چلی گئی ہیں یا جن کو سیاسی انقلاب نے گوشۂ گمنامی میں پہونچا دیا ہے، صحیح اور بے لاگ رائے قائم کر سکتے ہیں۔ نیز ان شخصیتوں کو جنھیں (بعض اہل قلم اور ادباء ومصنفین نے ضرورت سے زیادہ حق دے رکھا ہے یا جن کو پروپیگنڈے کے زور سے شہرت حاصل ہوگئی ہے) اپنی صحیح اور اصل جگہ پر دیکھ سکتے ہیں اور بہت تھوڑی فرصت میں ان سے ضروری فائدہ اٹھا سکتے ہیں اس لئے کہ انسانی زندگی کے جو تجربے ان کو حاصل ہوئے اور جن نتائج تک ان کی رسائی ہوئی وہ انسانیت کی دولتِ مشترکہ ہے جس سے ایک کے بعد ایک دوسری نسل برابر فائدہ اٹھاتی رہی ہے، چنانچہ حدیث میں ہے کہ ''حکمت مومن کا گمشدہ مال ہے جہاں بھی وہ اس کو ملے وہ اس کا سب سے زیادہ حقدار ہے''۔

آخر میں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ مصنف کو اس دورہ میں لبنان جانے کا موقع نہ مل سکا، یہ سفر ۱۹۵۶ء میں مقدر تھا اس میں بھی اس نے گذشتہ دورہ کی طرح روزنامچہ لکھنے کا التزام کیا اور یہ روزنامچہ '' ثلاثه ايام في لبنان '' کے عنوان سے ندوۃ العلماء کے عربی ماہنامہ '' البعث الاسلامی '' میں شائع ہوا، سفر کے اختتام کے طور پر یہ مختصر مقالہ کتاب کے آخر میں شامل کر دیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس کتاب سے نفع عام

حاصل ہو جس کے لئے مصنف نے سفر کی صعوبتیں برداشت کیں اور تنگی وقت اور شدید مصروفیت کے باوجود معلومات وتاثرات کو فکر واہتمام اور دلچسپی کے ساتھ قلمبند کیا۔

مصنف کو بڑی مسرت ہے کہ عزیزی مولوی شمس الحق صاحب ندوی استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء نے بڑے ذوق وشوق اور محنت وسلیقہ سے اس کتاب کے اردو ترجمہ کا بیڑا اٹھایا ان کا ترجمہ عرصہ تک بالاقساط ''تعمیر حیات'' میں شائع ہوتا رہا، اور ذوق وشوق سے پڑھا جاتا رہا پھر متعدد اہل ذوق نے اس کی اشاعت کی تحریک کی تاکہ کتابی شکل میں اس کا افادہ عام ہو، ترجمہ میں سلاست اور دل آویزی ہے اور اس کے پڑھنے سے اصل کتاب کے مطالعہ کا لطف آتا ہے، مکتبہ فردوس نے اس کی ذمہ داری قبول کی اور اب اس کی دوسری اشاعت کی نوبت آرہی ہے۔

ابوالحسن علی ندوی

۱۷ر جمادی الاول ۱۳۹۱ھ

۱۱ر جولائی ۱۹۷۱ء

حجاز مقدس کا سفر اور حرمین شریفین کا قیام

(۱۳۶۶ھ۔ ۱۹۴۷ء)

۲۶ر جون ۱۹۴۷ء کو لکھنو سے روانگی ہوئی، لاہور کے اسٹیشن پر کئی گھنٹے ٹھہر کر کراچی کے لئے گاڑی بدلی، فرقہ وارانہ فسادات اس وقت شباب پر تھے (کہ تقسیم ملک میں مشکل سے ایک ہی مہینہ باقی تھا) اس لئے لاہور میں ہوتے ہوئے بھی حضرت مولانا احمد علی صاحب کی خدمت میں حاضر نہ ہو سکے، کراچی گیارہ دن قیام رہا، اور حاجی عبدالجبار صاحب اور ان کے برادر محترم حاجی عبدالستار صاحب اور ان کے صاحبزادوں اور ان کے گھر والوں نے میزبانی اور مہمان نوازی میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔

غالباً ۱۹ر شعبان ۱۳۶۶ھ (۹ جولائی ۱۹۴۷ء) کو کراچی سے مغل لائن کے اسلامی جہاز سے جدہ روانگی ہوئی، محترمی محمد شفیع صاحب قریشی کی تاکید و اصرار سے (جو قریبی زمانہ میں حج کو گئے تھے) دو ٹکٹ فرسٹ کلاس کے خرید لئے جس کی وجہ سے ایک پورے کیبن کی سہولتیں ہم کو حاصل ہو گئیں، ہمارے کیبن سے متصل ہی برطانوی قنصل جنرل متعین جدہ شاہجہاں امیر کبیر (برادر بزرگ مسٹر ہمایوں کبیر سابق وزیر تعلیم ہند) کا کیبن تھا، ان سے تعارف میر غلام علی تالپور وزیر سندھ کی ایک دعوت میں ہو گیا تھا، اس سفر میں میں نے اپنی ضعیف والدہ اور ان کے ہمراہیوں اور خدام کے لئے راحت و آرام کے غیبی انتظامات اور تیسیر و تسہیل کے ایسے واقعات دیکھے جو اللہ تعالیٰ کے لطف خاص کا نتیجہ معلوم ہوتے تھے، فرسٹ کلاس کے کیبنوں کے قریب لائبریری ہال میں خواتین کا اجتماع ہونے لگا اس میں ایک

مرتبہ ہمیشرہ صاحبہ نے جن کے قلم سے ریاض الصالحین کا ترجمہ زادسفر کے نام سے نکل چکا تھا کوئی مضمون پڑھ کر سنایا اس سے حج کو جانے والی خواتین ومستورات کے حلقہ میں ان کو عقیدت واحترام کی نظر سے دیکھا جانے لگا، ہمارے کیبن سے ملے ہوئے کیبن میں بمبئی کے ایک بڑے میمن تاجر (جو کھلونوں کی تجارت کے بادشاہ سمجھے جاتے تھے) حاجی احمد صاحب اپنے خاندان کے ساتھ سفر کررہے تھے، ان کے پورے گھر کو بالخصوص ان کی اہلیہ اور والدہ صاحبہ کو ہمشیرہ سے ایسا ربط وتعلق پیدا ہوگیا کہ وہ ہر وقت ان کی خدمت اور دلبستگی کی فکر میں رہتی تھیں اس خاندان کے کراچی منتقل ہوجانے کے بعد تک سالہا سال یہ رابطہ باقی رہا۔

ہم لوگ ۲۹ رشعبان ۱۳۶۶ھ (۱۹ رجولائی ۱۹۴۷ء) کو جدہ پہنچے، اس وقت جدہ کی بندرگاہ پر قدم رکھتے ہی وہ سرور کیف حاصل ہوا، جو بہت سے خوش نصیبوں کو حرمین شریفین میں حاصل ہوتا ہے، والدہ صاحبہ کی تو قلبی کیفیت ومسرت کا عجیب حال تھا، ابھی چونکہ حج کے ایام بہت دور تھے، اور پورے تین مہینے باقی تھے، اسلئے ہم نے یہ درمیانی مدت مدینہ طیبہ میں گزارنے کا فیصلہ کرلیا تھا اس میں حضرت شیخ الحدیث کے ایماء وذوق کو بھی دخل تھا ہم نے رمضان المبارک کا چاند جدہ ہی میں دیکھا اور دو روزے بھی وہاں رکھے، یاد آتا ہے کہ میں اور عزیزی محمد ثانی چاندرات کو سحری کا سامان لینے بازار کی طرف گئے ایک خوانچہ والا ایک خاص لہجہ میں آواز دے رہا تھا ''تمر تمر یا صائم، تمر تمر یا صائم'' اس وقت اندازہ ہوا کہ بعض اہل دل پر شوق انگیز اشعار سننے پر کیسے وجد وحال کی کیفیت طاری ہوجاتی تھی دوسرا روزہ تھا کہ عین تراویح کے درمیان (جو جدہ میں ہی ایک کھلے میدان میں پڑھا رہا تھا) مدینہ لے جانے والی بس آگئی، ہم لوگ اپنے ہمراہیوں (مرادآباد ومیوات کے تبلیغی حجاج) کے ہمراہ روانہ ہوگئے، ایک روز اور دو راتوں کے اس سفر اور راستہ کے ذوق وشوق اور کیفیت ومسرت کو الفاظ میں نہیں ادا کیا جاسکتا، کچھ اندازہ راقم کے مضمون ''اپنے گھر سے بیت اللہ تک (۱) اور مضمون ''حضور سرور'' (۲) سے

---

(۱) مکتبہ اسلام لکھنؤ نے کچھ اضافوں کے ساتھ کتابی شکل میں شائع کی ہے اور حجاج کرام کو دی جاتی ہے۔ (محمود حسن حسنی ندوی)
(۲) مضمون شامل کتاب ''کاروان زندگی''

ہوسکتا ہے یا ان خطوط سے جو حضرت شیخ کو لکھے گئے اور جن کے سننے سے حضرت شیخ کی رمضان المبارک میں وہ کیفیت ہوتی کہ جسم ایک ایک بالشت اچھلتا اور رقت وجوش روئیں روئیں سے ابلتا تھا، گرمی کا رمضان تھا لوز وروں پر چل رہی تھی، منھ میں روزہ دل میں جوش، آنکھوں میں آنسو، زبان پر درود وشوقیہ ونعتیہ اشعار بقول اقبال:

چہ خوش صحرا کہ دروے کارواں ہا　　درودے خواند و محمل براند
بہ ریگ گرم او آور سجودے　　جبیں راسوز تاداغے بماند
امیر کارواں آں اعجمی کیست　　سرود او بآہنگ عرب نیست
زندآں نغمہ کزسیرابی او　　خنک دل در بیابانے تواں زیست

یہاں پر اردو کے صرف دو شعر لکھے جاتے ہیں، جو بے اختیار زبان پر جاری ہوگئے تھے۔

باد نسیم بہت مشکبار ہے　　شاید ہوا کے رخ پہ کھلی زلف یار ہے
وہ ایک بار ادھر گئے مگر اب تک　　ہوائے رحمت پروردگار آتی ہے

مدینہ طیبہ کے قیام کے دنوں کا کیا ذکر کیا جائے کہ۔ ع

ہر روز روز عید ہے ہر شب شب برات

جگہ بھی بالکل مسجد نبوی کے زیر سایہ ملی، اور ع

گدا بسایۂ دیوار شہ خفت است

کا خیالی مضمون حقیقت بن گیا۔

مولانا مدنی نے اپنے بھتیجے مولانا سید حبیب صاحب کے نام ایک تعارفی خط لکھ دیا تھا، جس کے حوالہ کرنے کی نوبت نہیں آئی، مولانا کے بردرخورد (اور بذات خود بزرگ) مولانا سید محمود احمد صاحب نے بڑی خصوصیت برتی اور مدرسہ شرعیہ کا ایک پورا مکان ہم لوگوں کے حوالے کردیا جو مسجد سے چند قدم پر تھا حرمین شریفین میں دونوں جگہ، اور حجاز کے

اس طویل قیام میں حضرت شیخ کی اصابت رائے اور دور اندیشی کا تجربہ ہوا، کہ عزیزی محمد ثانیؒ حسنی کی رفاقت نے مجھے بالکل فارغ البال کردیا، وہ پانچوں وقت مستورات کو مسجد لے جاتے، جہاں وہ مستورات کے حصہ میں نماز ادا کرتیں، اور مواجہ شریف پر صلوۃ وسلام پڑھواتے باب جبرئیل سے چند قدم پر قبلہ کی دیوار کے بالکل زیر سایہ شیخ الاسلام عارف حکمت کا مشہور کتب خانہ ہے جو مخطوطات ونوادرات کا بہت بڑا مخزن سمجھا جاتا ہے، اس کے مہتمم ایک ترکی النسل فاضل شیخ ابراھیم خربتلی تھے، جو کچھ عرصہ پہلے ہندوستان آئے تھے ندوہ اور دارالمصنفین میں چند دن قیام کیا تھا، بھائی صاحب سید صاحب اور مولانا مسعود علی صاحب سے اچھے مراسم ہوگئے تھے، انہوں نے ایک دن ہمارے پورے قافلہ کی دعوت کی، فرمایا کہ یہ کتب خانہ جس مکان میں ہے، یہ مکان آپ کے جد امجد سید حسن مثنی ابن سبط اکبر سیدنا حسن ابن علی کا مکان ہے اور یہ بات تاریخی طور پر ثابت ہے، آپ ایک رات یہاں رہیئے، ہم لوگوں نے یہ کریمانہ پیش کش قبول کی، والدہ صاحبہ اور ان کے ہمراہی زنان خانہ میں رہے، مجھے اور محمد ثانی کو چھت پر جگہ ملی، اس کے اور گنبد خضرا کے درمیان چند گز کا فاصلہ تھا، ہم گنہگاروں اور دور افتادوں کے لئے اتنا قرب بھی غنیمت نہیں بلکہ نعمت تھا۔

چہ مبارک سحرے بود چہ فرخندہ شبے

ایک رات مولانا سید محمود صاحب کے اس مکان میں گزری جو احد کی شہادت گاہ سے متصل تھا، وہاں سیدنا حمزہ کے مرقد مبارک کے قریب ترکوں کی بنائی ہوئی جو مسجد تھی (۱) وہاں میں نے ''زاد المعاد'' کے اس حصہ کی تلخیص کی جو واقعہ احد سے متعلق تھا، میں بولتا تھا اور محمد ثانیؒ لکھتے تھے۔

۲۰/ذی قعدہ کو یہ قافلہ حج قران کا احرام باندھ کر مکہ معظمہ روانہ ہوا، پہلی مرتبہ بیت اللہ شریف پر نظر پڑنے اور باب السلام سے حرم میں قدم رکھنے کی جو کیفیت ہوئی (بالخصوص ہمشیرہ مرحومہ کی) اس کا اندازہ وہی کرسکتا ہے جس کو وہاں کی حاضری نصیب

(۱) اب وہ مسجد وہاں نہیں ہے۔

ہوئی ہو، ایام حج تک قیام محلّہ شامیہ رباط ٹونک میں رہا، جس کا حرم شریف سے خاصا فاصلہ ہے، اور اونچا زینہ طے کر کے وہاں آنا جانا پڑتا تھا، والدہ صاحبہ ضعیف تھیں لیکن قوت ایمانی اور ذوق وشوق پیری میں جوانی کی طاقت پیدا کر دیتے ہیں، عزیزی محمد ثانی ان سب کو پانچوں وقت حرم شریف لے جاتے، طواف کراتے، میں دعوتی کاموں کی مصروفیت وملاقاتوں میں رہتا ۱۴ ذی الحجہ کو منی سے واپسی پر بس والے نے مکہ معظّمہ کے حدود شروع ہوتے ہی اس قافلہ کو اتار دیا، معلوم نہیں کس طرح والدہ صاحبہ وہاں سے پیدل رباط ٹونک تک گئیں زینہ طے کیا، اتر کر حرم شریف گئیں۔

اللہ تعالیٰ نے یہ مشکل اس طرح آسان کی کہ ایک حیدرآبادی دوست مولوی قربان محی الدین جو ۱۳۴۹ھ (۱۹۳۰ء) میں پریشان حال ہو کر لکھنو پہنچے تھے، اور بھائی صاحب نے ان کو گھر ٹھرالیا تھا، اور ان کی مدد کے خیال سے ان کو نقل وکتابت کا کچھ کام سپرد کر دیا تھا، رباط آئے اور اصرار کر کے ہم لوگوں کو مدرسہ فخریہ عثمانیہ کی پرانی عمارت میں جو عین باب ابراہیم پر تھی اور جس کے وہ مہتمم یا نائب مہتمم تھے لے آئے اور کتب خانہ جس ہال میں تھا وہ ہمارے سپرد کر دیا، اس سے متصل ایک کمرہ تھا، جو باورچی خانہ بن گیا، اب بالکل گویا ہم حرم شریف ہی میں تھے حرم کی صفیں (حجاج کی کثرت کی وجہ سے) اس کی دیوار سے آ کر اس طرح مل جاتی تھیں کہ اوپر متصلاً جماعت کے ساتھ نماز پڑھی جا سکتی تھی، غرض حج کے بعد قیام کی طویل مدت جو تین مہینے سے کم نہیں تھی، گویا حرم میں گذری اور وہیں سے جنوری ۱۹۴۸ء میں ہندوستان کے لئے روانگی ہوئی، بجائے کراچی کے بھائی صاحب کی ہدایت پر بمبئی اترنا پڑا، کہ کراچی سے ٹرین سے ہندوستان کا سفر ممکن نہ تھا، بمبئی سے بھی مسلح پولس کی رفاقت میں سفر طے ہوا، جو اس زمانے میں ریل پر چلا کرتی تھی۔(۱)

---

(۱) کاروان زندگی جلد اول۔ صفحہ از: ۳۳۰ تا ۳۳۵، مطبوعہ مکتبۂ اسلام لکھنؤ

۱۹۴۷ء کے حج وزیارت کی کچھ یادیں

از: مولانا سید محمد ثانی حسنی ندویؒ

''۱۹۴۷ء میں حج کے لئے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ مع اپنی والدہ گئے تھے ان کے ہمراہ مولانا محمد ثانی حسنی رحمۃ اللہ علیہ بھی تھے، اس موقع پر مولانا محمد ثانیؒ نے سفرنامۂ حج تحریر کیا تھا، اس کے چند اوراق جو محفوظ رہ سکے پیش خدمت ہیں۔'' از شمس الحق ندوی

۱۶ر شوال المکرّم ۱۳۶۶ھ دوشنبہ

مزار سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ

تھوڑی دیر کے بعد میں اور خال محترم مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ''زاد المعاد'' کاغذ قلم اور دوات لے کر سیدنا حمزہؓ کے مزار پر روانہ ہوئے، لُو بہت تیز ہے، دھوپ کی شدت بار بار پیاس کو تیز کرتی ہے، دامن احد میں ایک ہوٹل میں کچھ کھایا اور ٹھنڈا پانی پی کر سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ کے مزار پر پہونچے، سامنے سیدنا حمزہؓ کا مزار ہے، ہم لوگ فاتحہ میں مشغول ہیں، پہلے حضرت حمزہؓ کا مزار، جبل رماۃ جو جبل احد کے قریب ہی ایک چھوٹی پہاڑی ہے اس کے کنارے تھا، مگر سیلاب کی وجہ سے نقش مبارک ظاہر نہ ہوتا تھا، اس وجہ سے تقریباً چالیس سال بعد موجودہ جگہ منتقل کی گئی۔

حضرت حمزہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہیتے چچا اور سید الشہداء ہیں ان کی شہادت پر رسول اللہ ﷺ کو بہت رنج ہوا، کفار نے بری طرح ان کو شہید کیا اور مثلہ کیا گیا، آپ جنگ احد شوال ۳ھ میں شہید ہوئے۔

بکت عینی و حق لها بکاء ها　　وما یغنی البکاء ولا العویل
علی اسد الا لٰہ غداۃ قالوا　　أ حمزۃ ذاکم الرجل القتیل
أ صیب المسلمون به جمیعا　　هناك وقد اصیب به الرسول
ابا یعلی لك الارکان هدت　　وانت الماجد البر الوصول
علیك سلام ربك فی جنان　　مخالطها نعیم لایزول
الا یاهاشم الأخیار صبرا　　فکل فعالکم حسن جمیل

''میری آنکھ رو پڑی اور اس کا رونا حق بجانب ہے، لیکن اسد اللہ پر آنسو بہانا اور واویلا مچانا بے سود ہے، موتوں نے پوچھا کیا وہ مقتول حمزہ ہیں جن کی شہادت سے مسلمانوں کو تکلیف پہنچی ہے، بلکہ رسول بھی اس سے رنجور ہیں، اے ابا یعلی! آپ کی شہادت سے بنیادیں ہل گئی ہیں، آپ بڑے بزرگ، نیکوکار اور صلہ رحمی کرنے والے تھے، جنات نعیم میں آپ پر سلامتی ہو، جہاں ایسی نعمتیں ہوں گی جو لافانی ہوں گی اے چنندہ آل ہاشم صبر و کرو تمہارے سارے اعمال اچھے ہی اچھے ہیں۔''

شہداء احد

مزار حمزہ رضی اللہ عنہ کے مغربی جانب جبل احد کے قریب دو جگہ شہداء کے مزار ہیں اور دونوں میں فاصلہ چالیس پچاس گز ہے دونوں کے الگ الگ احاطے بنے ہوئے ہیں اور قبروں کے نشان نہیں ہیں، دروازہ بند، بڑے بڑے جلیل القدر صحابہ کرام مدفون ہیں۔

مسجد

فاتحہ وغیرہ کے بعد مزار حمزہ کے قریب ہی مسجد میں نماز ظہر ادا کی، اتفاق سے میں نے اذان دی اور مولانا علی میاں نے نماز پڑھائی، اور غزوہ احد کا پورا واقعہ عجیب شوق و ذوق سے لکھا گیا اور لڑائی کا پورا نقشہ سامنے آ گیا ہے اور محسوس ہونے لگا کہ سامنے میدان میں جنگ کا میدان کارزار ہے، رسول اللہ ﷺ مع صحابہ کرام کے موجود ہیں، حضرت حمزہؓ اپنے تیر و کمان سمیت آ رہے ہیں دماغ میں برابر یہی خیالات موجزن ہیں اور جوش و ولولہ کے طوفان اٹھ رہے ہیں،

جی چاہتا ہے کہ ہمارے ہاتھ میں سامان جنگ ہو اور اسی طرح صرف اللہ کے لئے لڑتے ہوئے شہادت نصیب ہو یا میدان ہاتھ ہو۔

بہر حال جبل احد سر پر ہے اول وقت نماز ادا کی، ہم لوگ مسجد میں عملی نہ سہی کاغذی تیر وکمان سے ہی جہاد کر رہے ہیں، مجاہدین اور اسی مبارک جگہ کے مجاہدین اور شہداء کے مقدس کارناموں کو لکھ رہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس کو قبول کرے اور ان کی اتباع کی توفیق عطا فرمائے۔

مدینہ منورہ کا نظارہ

عصر کے قریب پورا واقعہ ختم ہو گیا، عصر کی نماز پڑھ کر ہوٹل سے کچھ خرید کر قیام گاہ کے لئے روانہ ہو گئے بعد نماز مغرب جبل احد دوسری بار آئے اور عشاء کی نماز بستی والوں کے ساتھ ادا کی اور گھر واپس گئے، یہاں سے حرم شریف (مسجد نبوی) نظر آ رہا ہے، مناروں پر روشنی جلوہ گر ہے، اور معلوم ہوتا ہے کہ ایک بہت بڑا شہر آباد ہے۔

۱۷ر شوال المکرّم ۱۳۶۶ھ بروز منگل

جبل احد پر

صبح کا سہانہ وقت ہے، اول وقت نماز ادا کی اور سب عورتوں کو لے کر تیسری بار حضرت امیر حمزہ کے مزار پر گئے، سورج نکل رہا ہے پہاڑوں کی پشت سے نکلتا ہوا کیسا بھلا معلوم ہوتا ہے، تھوڑی تھوڑی خنکی ہے اور ہم لوگ حضرت امیر حمزہؓ کے مزار پر کھڑے ہیں، عورتوں کو آگے جانے کی اجازت نہیں ہے، عورتوں کو مسجد میں بٹھلایا اور ہم لوگ جبل احد پر چڑھے۔

جبل رماۃ

جبل احد کے قریب مشرق کی طرف ایک چھوٹی سی پہاڑی ہے جس کو جبل رماۃ کہتے ہیں اسی پہاڑی پر رسول اللہ ﷺ کے وہ پچاس تیز انداز مقرر تھے جو پیچھے سے آنے والے دشمن کی دیکھ بھال کے لئے مقرر ہوئے تھے، اس پہاڑی پر مکانات بنے ہیں اور غالباً اپنی اصلی حالت پر

بھی نہیں ہیں دیواریں کٹ کٹ کر چھوٹی چھوٹی رہ گئی ہیں، مکانات غیر آباد ہیں، ایک طرف پولیس چوکی بنی ہے اور جابجا مسجدوں کی شکلیں۔

جبل رماۃ کے شمالی جانب حضرت حمزہؓ شہید ہوئے تھے اور جبل رماۃ کے شمالی کونے کی پشت پر سے ہی حضرت حمزہ کے قاتل نے نیزہ مارا تھا اور ادھر ہی سے دشمن کا دستہ حملہ آور ہوا تھا۔

میدان احد باہر سے وسیع میدان ہے لیکن جبل احد سے ملا ہوا گول نعل کی طرح بنا ہوا ہے، اس کے اندر بھی ایک چھوٹا سا گھرا ہوا میدان ہے جس میں لشکر اسلام کا پڑاؤ تھا اور باہر میدان میں جنگ ہوئی تھی لشکر اسلام جبل احد سے متصل تھا اور کفار جبل احد اور رماۃ کے مغربی جانب تھے۔

اس وقت میدان اونچا نیچا اور چھوٹے بڑے پتھروں سے بھرا ہے۔

مغار النبی ﷺ

اسلامی فوج کے پڑاؤ والے میدان سے متصل پہاڑ پر وہ غار ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مرہم پٹی ہوئی تھی، آپ ﷺ اس جنگ میں زخمی ہو گئے تھے، آپ ﷺ کا خود سر مبارک میں گھس گیا تھا اور دندان مبارک شہید ہوئے تھے، ہم لوگ بھی اس غار میں چڑھے، چڑھائی آسان نہیں ہے، باوجود اس کے کہ آج کل ٹوٹی پھوٹی جیسی بھی ہوں سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں، رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں سیڑھی نہ تھی ان جوڑ پتھر تھے، پھر آپ ﷺ زخمی تھے، جسم مبارک پر دو زرہیں تھیں آپ ﷺ کے ہمراہ حضرت فاطمہؓ و حضرت علیؓ بھی چڑھے اور مرہم پٹی کی، دشمن کے بچاؤ کے لئے آپ ﷺ نے یہ جگہ پسند فرمائی اور محفوظ بھی تھی۔

غار اتنا لمبا ہے کہ ایک آدمی لیٹ جائے اور چار پانچ آدمی دائیں بائیں بیٹھ جائیں۔

محل راحۃ النبی ﷺ

پہاڑ کے نیچے دامن میں ایک جگہ ہے جہاں حضور ﷺ نے ٹیک لگا کر آرام فرمایا تھا، پتھر میں گول دائرہ بھی گہرا سا بنا ہے کہتے ہیں کہ اس جگہ سر مبارک مس ہوا ہے مگر یہ یقین سے نہیں کہا جا سکتا۔

مدفن دندان مبارک

مزار حمزۃ کے قریب حضور ﷺ کے دندان مبارک کا مدفن ہے پہلے گنبد تھا لیکن سعودی حکومت نے اس کو ڈھا دیا۔

بیٹری ٹوٹ گئی

مدفن ثنایا کے قریب ہم لوگ گھڑے ہو کر بات کر رہے تھے بیٹری ہمارے ہاتھ میں تھی تھوڑی دیر کے بعد بیٹری گری اور اوندھی گری شیشہ ٹوٹ گیا، عجیب بات ہے کہ کئی بار گری مگر کہیں نہ ٹوٹی اس جگہ گر کر ٹوٹ گئی۔

واپسی

تقریباً دو بجے دن کو واپسی ہوئی گاڑی والا حسب وعدہ آ گیا اور ہم سب مزار حمزہؓ ہی سے سوار ہو کر سیدھے مدینہ منورہ آ گئے، ارادہ تھا کہ قبلتین اور مساجد خمسہ بھی دیکھتے چلیں مگر گاڑی والا بگڑا ہوا تھا مجبوراً مدینہ منورہ ہی سیدھے آنا ہو گیا اور اس گاڑی والے کو بجائے سات ریال کے نو ریال دینے پڑے۔

۱۸ر شوال ۱۳۶۶ھ بروز بدھ

ہم سب کی طبیعتیں اچھی ہیں گرمی بھی کم ہو گئی دن کو معمولی گرمی پڑتی ہے مگر دھوپ میں سختی ویسی ہی تپش بھی زائد ہے، رات کو خنکی ہوتی ہے صبح کا وقت بہت ہی پر لطف اور سہانا ہوتا ہے۔

آج ارادہ تھا کہ جو تبلیغی جماعت پرسوں ایک قریب کے گاؤں گئی ہے اس سے جا ملیں، تمام سامان وغیرہ کر کے گاڑیوں کے اڈہ پہونچے مگر گاڑی کے نہ ملنے سے نہ جا سکے یہ میرے نکلنے کا پہلا موقع تھا، وہ بھی ہاتھ سے نکل گیا، اللہ کی مرضی یفعل مایشاء

بھائی عبدالحمید کو بچھو نے کاٹا

بعد نماز ظہر آج بھائی عبدالحمید کرنال کے بچھو نے کاٹ لیا، سخت بے چینی ہو رہی ہے، تکلیف حد سے زائد ہے تعجب ہے کہ بچھو نے کیسے کاٹ لیا، سنا ہے کہ یہاں جانور بھی ایذا

نہیں پہنچاتے، بہر حال تکلیف بڑھتی جارہی ہے، مغرب تک یہ بے چینی اور تکلیف زور پر رہی، مغرب بعد کسی کے بتانے سے مٹی کا تیل اور نمک لگانا مفید ثابت ہوا، اور یہ بڑھتی ہوئی تکلیف یک دم رک گئی دردو کرب ختم ہو گیا، اللہ تعالیٰ موذی انسانوں اور حیوانوں سے محفوظ رکھے۔

۱۹ رشوال المکرّم ۱۳۶۶ھ بروز جمعرات

بعد والے جہاز بھی پہونچ گئے حجاج کی آمد روز بروز بڑھتی جارہی ہے مختلف ملکوں مختلف زبان والوں کا ایک اچھا خاصا اجتماع بھی ہونے لگا، مسجد نبوی کی شان بڑھتی جارہی ہے، مسجد نبوی کے اندر اور باہر ہر جگہ مختلف حلقے بنے ہیں، کوئی اکیلا بیٹھا ہے کہیں مجمع کی شکل ہے، کوئی بلبلا بلبلا کر رو رہا ہے کوئی تلاوت قرآن ایک عجب انداز میں کر رہا ہے، اگر کوئی نوافل میں مست ہے تو کوئی وظائف میں سرشار، عاشقان رسول جو نہ معلوم کہاں کہاں سے محبت رسول میں کھنچے چلے آئے ہیں کبھی تو سجدہ ریزی کرتے ہیں اور خداوند عالم سے بلک بلک کر مانگ رہے ہیں اور آستانہ رسول پر سلام وصلوۃ ذوق وشوق سے عرض کر رہے ہیں ایک بے خود اور مست مجمع ہے، کبھی در اقدس پر حاضری دیتا ہے تو کبھی بارگاہ خداوندی میں پیشانیاں رگڑتا ہے میں حسرت ورشک سے ان مبارک مجمعوں اور مقدس افراد کو ان کی آہ وزاری پر نظر ڈالتا ہوں اور اپنی کاہلی پر افسوس کر رہا ہوں، اے اللہ جس طرح تیرے یہ بندے تیرے اور تیرے رسول کی خاطر دور دراز سے آئے ہیں، اسی طرح تیرا یہ بندہ بھی حاضر ہوا ہے اے اللہ مجھے محروم نہ لوٹائیو! جس لطف وکرم سے تو اس مقدس آستانہ پر لایا ہے اسی لطف وکرم سے نیز میری لاچارگی پر ترس کھا کر دامن کو اپنی محبت کے موتیوں سے بھر دے تیرا خزانہ وہ خزانہ نہیں جو خالی ہو جائے یا اس میں کمی ہو جائے۔

۲۰ رشوال المکرّم ۱۳۶۶ھ بروز جمعہ

حجاج کا ہجوم

آج جمعہ کا مبارک دن ہے سڑکیں، گلیاں، مکانات، رباطیں حجاج اور زائرین سے

بھر چکی ہیں اور برابر بھرتی چلی آرہی ہیں کچھ حاجی آتے ہیں اور کچھ مکہ مکرمہ چلے جاتے ہیں۔

صرافوں کی نیز رومال ٹوپیوں، مدینہ منورہ کے تبرکات کی دکانیں مسجد نبوی کی دیوار کے نیچے سڑکوں اور گلیوں میں لگی ہیں، کہیں باہری طلبہ اور مہاجرین اپنی دوکانیں سجائے بیٹھے ہیں اور دور تک تکرونی عورتیں زمین پر چھوٹی چھوٹی جھبیاں اور خود ساختہ کڑھی ہوئی ٹوپیاں خاص قسم کے مدنی دسترخوان رکھے بیٹھی ہیں، غرض کہ مسجد نبوی کے سامنے جو خالی دنوں میں میدان بنا رہتا ہے کیسا اجاگر ہے کوئی آرہا ہے کوئی جارہا ہے جیسے کوئی میلہ لگا ہو، کوئی خیرات دینے والا آپہونچا تو فقراء سینکڑوں کی تعداد میں جمع ہوگئے اگر کوئی شرطی نہ ہوتو دینے والے کو بجائے دینے کے لینے پڑ جائیں، فقراء کے ہجوم سے اس کا بچ نکلنا ہی کمال ہے اگر شرطی موجود ہوا تو اس نے سب کو انتظام سے قطار در قطار بٹھا دیا۔

روضہ جنت میں جگہ نہیں

جمعہ کی وجہ سے اشراق کے بعد ہی لوگوں کا ریاض جنت میں جمگھٹا ہونے لگا، ہر شخص اسی کی کوشش میں ہے کہ اسے پہلی صف میں جگہ مل جائے مقابلوں تک کی نوبت آجاتی ہے کوئی اگر بعد اذان پہنچا تو وہ پیچھے جگہ تلاش کرے اور ریاض جنت سے ہاتھ دھوئے۔

اذان اول کے بعد پہونچنے والے کو دھوپ میں رملہ پر یا باب الرحمۃ والے پچھلے دالانوں میں جگہ مل سکتی ہے آگے نہیں۔

سندھ کے ایک پیر صاحب

آج مولانا ابوالحسن صاحب ندوی کے پیر بھائی اور سندھ بھاولپور کے ایک بڑے پیر بھائی صاحب تشریف لائے ہیں ان کے ہمراہ سو آدمی ہیں جو ان کے حلقہ ارادت میں شامل ہیں ان کا قیام میری پرانی قیام گاہ میں ہے۔

۲۱ رشوال المکرّم ۱۳۶۶ھ بروز سنیچر

آج رضوانی جہاز جو بمبئی سے روانہ ہوتا ہے اس کے مسافر مدینہ منورہ پہنچ گئے ہیں،

ایک بات بڑی افسوسناک ہے کہ جتنے حجاج آئے ہیں الا ماشاء اللہ اپنی لاعلمی اور غفلت سے زیادہ تر بیکار وقت سیر وسیاحت میں صرف کر ڈالتے ہیں، خصوصاً ہمارے ہندی حجاج ان میں بھی خاص طور پر بنگالی حجاج تو نہ معلوم کیا کیا کرتے ہیں، یا تو اپنی خوش اعتقادی میں اگر اعتدال سے بھی بڑھ کر در و دیوار کو چومنے چاٹنے لگتے ہیں اور خلاف شریعت بہت سے افعال کر گزرتے ہیں یا تو اپنی بے تربیتی اور مسائل سے نابلد ہونے کی وجہ سے خلاف ادب افعال کے مرتکب ہو جاتے ہیں، یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ عام جگہ بیٹھے ہیں یا سرکار دو عالم ﷺ کے دربار میں اور مسجد نبوی جیسی پاک اور مقدس جگہ میں اور سب سے زائد افسوسناک بات یہ ہے کہ ان کے پڑھے لکھے علماء بھی ان کو نہیں بتاتے ہیں، انہیں تمام کاموں کے لئے الحمدللہ تبلیغی جماعت پورے انہماک اور خلوص سے ان کی خدمت کر رہی ہے، ہر سنیچر کو ایک ہندوستانی اجتماع مقرر کیا ہے۔

عصر بعد ہندی حجاج سے خوشامد کر کے ایک مکان میں مجتمع کیا جاتا ہے، اور ان کو یہاں آنے کا صحیح مقصد بتایا جاتا ہے، دین کی خدمت کی درخواست کی جاتی ہے، اور اس پر زور دیا جاتا ہے کہ کم از کم وہ یہاں کے اوقات کو دین کی تعلیم حاصل کرنے میں گزاریں اور روزانہ ایک وقت اپنی اپنی جگہ جمع ہو کر تعلیم میں گزاریں۔

آج بھی اس قسم کا ایک اجتماع ہوا الحمدللہ ہندوستانی حجاج کافی جمع ہو گئے تھے اور ان پر اثر بھی ہوا۔

فارغ الہند کی آمد

آج گرمی ہے، فارغ الہند صاحب تشریف لائے ہیں، فارغ الہند کے متعلق معلوم ہو چکا ہے کہ یہاں کی اصطلاح میں وہ بادل ہے جو ہندوستان سے برس کر خالی آئے اور یہاں نہ برسے اس سے گرمی بڑھ جاتی ہے، ہوا رک جاتی ہے۔

آج بہت سے حجاج آئے اور بہت سے گئے اگر مسجد نبوی کا ایک کونہ خالی ہوتا ہے تو دو کونے بھر جاتے ہے ہیں، پنج وقتہ نماز کے بعد مواجہ شریف سے لے کر کر باب السلام تک

ہزاروں عاشقان رسول ﷺ کا جوش مارتا ہوا سمندر ہوتا ہے، صلوۃ وسلام کی آوازیں ایسی گونجتی ہیں کہ جیسے لاکھوں شہد کی مکھیاں بھنبھنا رہی ہوں۔

ترکی حجاج سے ملاقات

نماز عشاء کے بعد نو وارد ترکوں میں جانا ہوا، یہ بے چارے ترک بیس پچیس سال بعد کنج قفس سے چھوٹے ہیں اور سب نے محبوب اور پیارے چمن میں بڑی آرزو کے بعد قدم رکھا ہے اس کا اس سال آنا نیک فال ہے، اللہ تعالیٰ ہر سال ان کی تعداد بڑھائے اور ظالم صیاد کے زہریلے پنجوں سے چھڑائے۔

ماموں جی مولانا ابوالحسن علی ندوی (رحمۃ اللہ علیہ) نے عربی میں ایک مدلل اور پر مغز اور پر تاثیر تبلیغی تقریر کی یہ حضرات عربی سے ناواقف ہیں جس کی بنا پر ایک ترکی عالم نے جو مدینہ منورہ میں مقیم ہیں گویا مہاجر ہیں، ترکی میں ترجمہ کر کے ترکوں کو سمجھایا، ان ترکوں سے مل کر جی بہت خوش ہوا اگر چہ ان کو دین سے خوب ہی ہٹایا گیا مگر دین کی آگ ابھی دبی ہے، یہ حضرات موجودہ ترکی کی لادینی فضا سے بیزار معلوم ہوتے ہیں اور موجودہ لادینی فضا سے بڑے بے چین اور مضطرب معلوم ہوتے ہیں۔

۲۲ رشوال ۱۳۶۶ھ بروز اتوار

تبلیغی سفر

صبح نماز پڑھتے ہی مبلغین اپنے تبلیغی سفر کی تیاری میں لگ گئے، پانچ چھ روز کے لئے یہاں سے دس میل کے فاصلہ پر ایک قصبہ زہرا میں جانا طے ہوا، دن چڑھے مولانا ابوالحسن علی ندوی (رحمۃ اللہ علیہ) کی قیادت میں یہ مختصر سی جماعت اپنے مبارک سفر پر روانہ ہوگئی، جمعہ کے دن واپسی ہوگی، میرا بھی جانے کو جی چاہا مگر خانگی ضرورتوں کی بنا پر نہ جا سکا۔

ایک ہندی شرطی سے جھگڑ بیٹھے

عصر کے بعد ایک پنجابی حاجی ایک شرطی سے لڑ بیٹھے اور نہ معلوم کیا کیا کہہ گئے

مارنے تک کو تیار ہو گئے اور بے باکانہ طریقے سے آداب مسجد کے خلاف زبان پر جو آیا کہہ ڈالا، مسجد میں شور وغوغا ہوا لوگ جمع ہوئے، ان کو خاموش کیا، شرطی کا قصور اتنا تھا کہ ان حاجی صاحب کی بیوی کو باب جبرئیل کی جانب جانے سے روکا، مردوں کا ہجوم تھا عورتوں کا ایسے ہجوم میں جانا ایسے بھی بے حیائی ہے، اس عورت نے کچھ کہا، وہ شرطی اردو نہ سمجھا شرطی نے جواب دیا عورت نہ سمجھی تھوڑی دیر تک یہی ہوتا رہا، آخر شرطی نے زبردستی پکڑ کر جانے سے روک دیا، جس پر حاجی صاحب ایسے بگڑے کہ قتل کرنے پر تیار ہو گئے۔

شاہ کرار حسین صاحب

آج ہمارے جہاز کے بزرگ ساتھی شاہ کرار حسین صاحب وحکیم مقصود صاحب مکہ مکرمہ روانہ ہو رہے ہیں ان حضرات کو مدینہ منورہ سے جانے کا بہت رنج ہے، شاہ صاحب تقریباً ایک ماہ سے زائد مدینہ منورہ میں مقیم رہے۔

۲۲ رشوال ۱۳۶۶ھ دوشنبہ

بہت سے حجاج مکہ معظّمہ چلے گئے

آج کافی حجاج مکہ مکرمہ گئے ہمارے مکان کے نچلے حصہ کے حجاج بھی آج گئے نچلے حصہ میں مرادآبادی حضرات مقیم تھے جو برتنوں کے تاجر ہیں۔

مدینہ منورہ میں پندرہ روز سے زائد نہیں ٹھہر سکتے

ہر حاجی کو پندرہ روز مدینہ منورہ میں رہنے کی اجازت ہے، اگر کوئی حاجی پندرہ روز سے زائد قیام کرنا چاہے تو ایک ریال روز کے حساب سے ہوتے ہیں، بیس ریال سے کم لیتے نہیں، چاہے دس روز رہے یا پندرہ روز اس کا سبب پوچھنے پر معلوم ہوا کہ ہر شخص مدینہ منورہ میں زیادہ رہنا چاہتا ہے اور زیادہ تر حجاج کرام مدینہ منورہ حج سے پہلے آتے ہیں۔ اگر ان سے روپیہ نہ لیا جائے تو وہ آخر ذیقعدہ تک جب تک ہو سکے رہتے ہیں اخیر وقت میں حکومت کو جلدی جلدی مکہ پہچانے میں بڑی دقت اٹھانی پڑتی ہے۔ اس لئے روک کی خاطر یہ حکم لگایا گیا۔

حجاج کی تعلیم

میں آج تعلیم کے سلسلہ میں چند حجاج کے پاس گیا، ان حجاج کی حالت کو دیکھ کر تبلیغ کی اہمیت اور ضرورت کا بہت زائد احساس ہوا حقیقت میں بڑے رنج کی بات ہے کہ اتنے بڑے فریضہ کو انجام دینے آئیں، اور باوجود ساٹھ سالہ وستر سالہ سن کے کلمہ تک سے ناآشنا ہوں، اور فاتحہ تک نہ پڑھ سکیں، فوااسفاہ علی الذین یعلمون ولا یُعَلّمون'' کاش کہ تعلیم وتبلیغ کا سلسلہ برابر جارہے اور اسی طرز پر رہے جس طرز پر مولانا محمد الیاس صاحبؒ کے متعلقین کررہے ہیں کہ یہ زیادہ انفع اور فطری طریقہ ہے، خدا مولانا مرحوم کی روح کو آرام نصیب کرے، اور ہماری طرف سے بہت بڑی جزا عطا فرمائے کہ انہوں نے ہم کو بھلایا ہوا سبق اور ایک چھوٹے ہوئے فرض کو یاد دلایا، کاش کہ اس کا صحیح احساس ہر مسلمان کو پیدا ہو۔

۲۴ رشوال ۱۳۶۶ھ سہ شنبہ (منگل)

ہندوستان کی ڈاک آنے کی آج باری ہے کئی روز سے خطوں کا سخت انتظار ہے، ہندوستان کے ناگوار حوادث اور درندگی وحیوانیت کی روز افزوں خبریں دل کو ہلا دینے والے حادثات کی اطلاعات اضطراب وبے چینی میں آگ لگا رہی ہیں، ہندوستان کے تمام حجاج یا ان کے متعلقین خصوصاً اہل مشرقی پنجاب دہلی ومیوات جنھوں نے بے قراری سے دن رات کاٹے ہیں اس کو وہ جانتے ہیں یا خدا تعالیٰ۔

حرم شریف میں ان سیاسی باتوں اور جھگڑوں سے جو قتل وغارت کی خبروں سے پیدا ہوگئے ہیں جی بہت الجھتا ہے مگر یہ تذکرہ کرنے والے اپنے تعلق اور اپنی مصیبتوں کی وجہ سے تذکرہ کرنے پر یقیناً معذور ہیں آج والدہ مکرمہ (۱) کا والا نامہ صادر ہوا الحمدللہ ہمارے

---

(۱) والدہ معظمہ مکرمہ سیدہ امۃ اللہ العزیز مرحومہ (وفات ۲۳ رمضان المبارک ۱۴۱۶ھ) ہی اس مختصر خاندان کے ساتھ سفر حج پر جانے سے رہ گئیں تھیں، بڑی صاحب دل وصاحب استقامت خاتون تھیں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی بڑی ہمشیرہ تھیں (محمود حسن حسنی ندوی)

اطراف میں خدا کا فضل شامل حال ہے پورا امن ہے اللہ تعالیٰ برابر فضل فرمائے خطوط سے دل پوری طرح بھر گیا اور سکون وقرار کی سانس لی۔

مولانا مرتضیٰ صاحب کا خط آیا

میرے محترم دوست اور مخلص رفیق مولانا محمد مرتضی بستوی المظاہری کا خط آیا مولانا نے مجھے یاد کیا، ان کا شکریہ مولانا کا خط بھی مسرت وخوشی کا پیامبر بن کر آیا، مولوی صاحب نے دعا کے لئے تحریر کیا ہے، اگر مولوی صاحب تحریر نہ بھی فرماتے تو بھی ان کے لئے دعا نکلتی، کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی اس مقدس جگہ پر بھی اپنے محسن کو بھول جائے۔

حجاز میں بھی سیاسی باتیں

حجاز پہونچ کر مجھے خوشی ہوئی تھی کہ انشاء اللہ کم از کم پانچ ماہ تک ہندوستانی سیاسی پارٹی بازی اور فساد واختلاف، گالی گلوج اور تفرقہ بازی سے کان سننے سے آنکھیں دیکھنے سے محفوظ رہیں گی کان نہ محفوظ رہ سکے، اول تو طبیعت کے میلان سے دوسرے لوگوں کے ہر وقت انہی باتوں میں الجھے رہنے سے مجبوراً سننا پڑتا ہے۔

۲۵ رشوال المکرّم ۱۳۶۶ھ چہار شنبہ (بدھ)

صحن مسجد نبوی اور صبح کا سہانا وقت ہے، سورج ابھی تک اپنے چہرہ کو چھپائے ہے، تھوڑی تھوڑی خنکی ہو رہی ہے، میناروں تک ابھی تک سورج کی کرنوں کا اثر نہیں پہونچا، میں ہوں اور مسجد نبوی کا وسیع صحن ہے صحن میں رملہ پر سیکڑوں آدمی ایک ایک دو دو چار چار چند قدموں کے فاصلہ پر بیٹھے یاد خدا میں مشغول ہیں کوئی تلاوت کلام پاک میں مشغول ہے کوئی وظیفہ میں مشغول ہے اور ہمارے بعض ہندوستانی سیاسی گتھیاں سلجھانے میں مشغول ہیں، ایک دوسرے پر تبصرے تنقید اور تنقیص فرما رہے ہیں، ان کے نزدیک غالباً ان مبارک کاموں کے لئے مسجد نبوی سے بڑھ کر اور جگہ نہیں شمالی دالان عورتوں سے بھرا پڑا ہے صلوۃ وسلام کے لئے پہلے مردوں کا ہجوم پھر عورتوں کا تار لگتا ہے ایک ایک معلم کے سپرد بیس بیس

دس دس زائرین ہیں کوئی نماز پڑھ کر قیام گاہ کو جا رہا ہے، کوئی بیٹھا اشراق کا انتظار کر رہا ہے، بہر حال یہ صبح کا وقت مسجد نبوی کا عجیب پر لطف دلکش اور دلچسپ ہوتا ہے، پورا رملہ کا حصہ آدمیوں سے بھرا ہوا ہے اور آوازوں سے گونج رہا ہے۔

حرم نبوی کے کبوتر اور دلکش منظر

تمام لوگ اپنے ضروری ضروری مشاغل میں مشغول ہیں، اور میں ہوں تو ایک اور نظارہ کا لطف اٹھا رہا ہوں میرے چاروں طرف ایک ایک بالشت کے فاصلہ پر مسجد نبوی کے ہزاروں کبوتر صحن کے سرخ سرخ ذروں سے دانہ چن چن کر چگ رہے ہیں اور مست ہو ہو کر اپنی بولی میں نامعلوم کیا کہتے جا رہے ہیں کبوتروں کا ایک وسیع جال بچھا ہوا ہے کبھی سب کے سب ایک دوسرے سے جڑ جاتے ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ ایک خوشنما مخمل کا قالین بچھا ہوا ہے اور کبھی اڑ کر سروں پر منڈلانے لگتے ہیں گویا بادل سا چھا گیا، ان کے اڑنے کی آواز تمام لوگوں کو متوجہ کر لیتی ہے، اس آزادی سے اڑتے بیٹھتے اور چلتے رہتے ہیں، گویا کسی سے ڈر ہی نہیں، اس وجہ سے کوئی ان کو پکڑنے والا نہیں، کوئی ان کو مار سکتا نہیں، کسی کے اوپر اگر بیٹھ بھی جائیں تو کوئی ان کا کچھ نہیں کر سکتا بہت سے حجاج ڈلیوں اور اپنے اپنے دامنوں میں گیہوں باجرے کے سیروں دانے لا لا کر ڈالتے ہیں، تو تمام کبوتر جو منتشر اور نیچے بیٹھے یا اڑتے رہتے ہیں جمع ہو جاتے ہیں اور چگنے لگتے ہیں بعض دفعہ دانہ اتنا ڈالا جاتا ہے کہ تمام رملہ دانوں سے پر ہو جاتا ہے، دانہ پیروں تلے آ کر دب جاتا ہے، بے ادبی بھی ہوتی ہے اور دانہ کنکریوں تلے ہو جاتا ہے۔

۲۷ رشوال ۱۳۶۶ھ بروز جمعہ

تبلیغی جماعت زہرا میں

آج جمعہ کا دن ہے، اشراق کے وقت مولانا علی صاحب تبلیغی جماعت کے ساتھ زہرا سے واپس آ گئے ہیں معلوم ہوا ہے کہ وہ قصبہ کافی بڑا اور آباد ہے آبادی بھی زائد ہے، الحمد للہ کام اچھا ہوا، مولانا موصوف کے جانے سے کام کرنے والوں نیز سننے والوں کو بڑی آسانی

ہوئی، تبلیغی جماعت پانچ دن اس جگہ مقیم رہی مگر یہ پانچ دن یقیناً اس بڑی جگہ کے لئے ناکافی ہیں، تاہم آواز کانوں تک پہنچ گئی اس کی ضرورت ہے کہ بار بار جایا جائے، اور جم کر ٹھوس کام کیا جائے، اس کے لئے وقت اور آدمیوں کی شدید ضرورت ہے، اس درمیان زاد المعاد کا کام بالکل بند ہو گیا تھا، آج سے پھر شروع ہوا ہے خدا تکمیل کو پہونچائے۔

مسجد نبوی جمعہ کی وجہ سے ایسی پر تھی کہ اذان اول کے بعد آنے والوں کو آگے جگہ مل ہی نہیں سکی آج اتفاق سے میں بھی دیر سے پہونچا بہت جستجو کی مگر رملہ کے قریب جگہ ملی بعض حضرات نے تو جلتے ہوئے رملہ پر نماز ادا کی، بعض تو دروازوں کے باہر کھڑے ہو سکے، ان کو اندر جانے کی جگہ نہیں ملی، خصوصاً باب جبرئیل میں عام طور سے جمعہ کو باہر تک صفیں ہوتی ہیں۔

عربوں کا تبلیغی اجتماع

بعد نماز عصر عربوں کا ایک تبلیغی اجتماع ہوا، مبلغین نے بڑی کوششوں سے عربوں کو جمع کیا، مولانا ابوالحسن علی ندویؒ صاحب نے عربی میں تقریر کی، یہ اجتماع مغرب سے کچھ پہلے ختم ہو گیا، مختلف عہدوں اور مشاغل کے آدمی تھے، بعض بعض حضرات پر اثر ہوا اللہ تعالیٰ ان کو کام کی توفیق عطا فرمائے۔

حرم نبوی میں دو دلکش وقت

مسجد نبوی کی یوں تو ہر جگہ اور یہاں کا ہر وقت دلچسپ گذرتا ہے، مگر صحن مسجد میں دو وقت ایسے دلچسپ اور سہانے ہوتے ہیں کہ جن کے ذکر سے قلم قاصر ہے اس کا حقیقی لطف وہی شخص اٹھا سکتا ہے جس کو یہاں کا آنا نصیب ہو جائے۔

۱۔ بعد نماز فجر، ۲۔ بعد مغرب، ان دو وقتوں میں اگر کوئی اس مبارک صحن کا نظارہ کرے تو اس کے دل و دماغ کو ایسی فرحت اور ایسا انبساط ہوگا جو غالباً بڑی بڑی دلچسپ سیر گاہوں میں نہ ہوگا، یہ ضرور ہے کہ یہ انبساط اسی کے حصہ میں پوری طرح جلوہ گر ہوگا، جو خدا اور اس کے رسول کو پیارا اور دینی فضا کو محبوب جانتا ہو۔

یہ ٹھنڈی اور سہانی صبح کو ہزاروں کبوتروں کا اڑنا اور بیٹھنا ایک ساتھ دانہ چگنا، انسانوں سے مل کر چلنا پھرنا، عجب بھلا معلوم ہوتا ہے، جس وقت یہ خوشنما جانور ایک سے ایک جڑ کر بیٹھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ سیاہ رنگ کا ایک قالین جس پر ہلکے ہلکے رنگ کے بوٹے جڑے ہیں بچھا ہے مغرب کو اگرچہ کبوتروں کا پتہ نہیں ہے مگر بجلیوں کی روشنی کے نیچے انسانوں کا ایک جنگل، جو اللہ کی عبادت میں مشغول ہے، آگے صراحیاں رکھی ہیں اور لوگ کہیں جمع ہو کر اور کہیں اکیلے اکیلے عبادت وتلاوت میں محو ہیں۔

۲۸ رشوال المکرّم ۱۳۶۶ھ بروز سنیچر

آج مصری حجاج کی چار پانچ موٹریں مدینہ منورہ پہنچ گئی ہیں یہ مصر کا پہلا جہاز ہے جس میں تقریباً ڈیڑھ ہزار حجاج ہیں کچھ تو مکہ مکرمہ رہ گئے اور تھوڑے سے مدینہ منورہ آئے ہیں، ہر طبقہ کے لوگ ہیں بڑے بڑے عہدہ دار بھی ہیں اور تجار بھی، کسان بھی، ان کا لباس لمبائی میں عربوں سے ملتا جلتا ہے صرف فرق اتنا ہے کہ لوگ ٹوپیاں ایک خاص طرز کی استعمال کرتے ہیں۔

عصر کے بعد مبلغین کی قیام گاہ پر ہندوستانی حجاج کا تبلیغی اجتماع ہوا، جگہ کی قلت کی بنا پر اور ہندوستانی حجاج کے زیادہ ہو جانے پر دو کمروں میں اجتماع کو منقسم کر دیا گیا، ایک اجتماع میں بھائی محمد امین تاجر دہلوی نے تبلیغ کی اہمیت پر تقریر کی اور باہر نکلنے کی دعوت دی، جس پر چند حجاج تیار ہو گئے، اور دوسرے اجتماع میں مولانا سعید احمد خاں صاحب سہارنپوری نے اپنے خاص انداز میں بیان کیا، اس اجتماع میں بھی لوگ باہر چلنے کو تیار ہوئے، مغرب سے کچھ پہلے دعا کے بعد دونوں اجتماع ختم ہو گئے۔ آخر میں اختتامی تقریر مولانا زین العابدین صاحب امرتسری نے کی جس کا اثر سامعین پر بہت اچھا پڑا۔(۱)

حجاج کی کثرت کی وجہ سے کھانے کے ہوٹل بہت کھل گئے ہیں، دار الضیافہ کے

---

(۱) مولانا سعید احمد خاں سہارنپوری صاحب اور مولانا مفتی زین العابدین صاحب لائل پوری مرکز نظام الدین دہلی سے عربوں میں کام کرنے کے لئے بھیجے گئے تھے، جیسے مولانا عبید اللہ بلیاوی صاحب کا عربوں میں کام کے لئے انتخاب ہوا تھا، اور ان تینوں مبلغین دین نے بڑا اثر چھوڑا (محمود حسن حسنی ندوی)

میدان میں باب مجیدی کے سامنے کئی ہوٹل کھلے ہیں جس میں ہندوستانی کھانا (مرچ دار) مل جاتا ہے ان سے ہندوستانی حجاج کو بہت آرام ہے، ہندوستانی چائے بھی آسانی سے مل جاتی ہے، عرب کے لوگ سبز چائے پیتے ہیں دودھ دار چائے عرب میں کم رائج ہے، اور دار الضیافہ وہ جگہ ہے جہاں نور الدین زنگی رحمۃ اللہ علیہ نے تمام شہر کی دعوت کی تھی اور ان دو عیسائیوں کو جو سرور کائنات کے مزار میں سرنگ کر رہے تھے پکڑا تھا۔

۲۹ رشوال المکرّم ۱۳۶۶ھ بروز اتوار

رات کو سردی پڑنے لگی ہے اوڑھنے کی نوبت تک آجاتی ہے دن کو بھی گرمی میں شدت کم ہوگئی ہے ہم لوگ اوپر کی چھت پر سوتے ہیں اور رات کو رضائی اوڑھتے ہیں، آج ایک تبلیغی جماعت عوالی گئی ہے، عوالی بنی قریظہ اور قباء کے درمیان بستی ہے یہاں باغات بہت ہیں، کھجوروں کے درخت بے شمار ہیں، شادابی اور سرسبزی کا مرکز ہے، یہ تبلیغی جماعت پانچ دن کے واسطے گئی ہے، جمعہ تک واپس آجائیگی اس تبلیغی جماعت کا باہر نکلنے کا پروگرام ہفتہ وار ہے، مدینہ منورہ کے اردگرد ہفتہ میں ایک بار پانچ روز کے واسطے نکلتی ہے، اور ہر منگل کو ایک دن کے لئے سیدنا حمزہ یا جہاں مناسب ہو جانا ہوتا ہے۔

۳۰ رشوال المکرّم ۱۳۶۶ھ دوشنبہ

مصری حجاج سے تبلیغی سلسلہ میں اکثر ملاقات ہوتی رہتی ہے عوام سے بھی اور علماء سے بھی ہم اور ماموجی زاد المعاد کی تلخیص میں مشغول تھے کہ دو مصری پڑھے لکھے آکر بیٹھ گئے اور ان سے گفتگو رہی۔

یکم ذیقعدہ ۱۳۶۶ھ سہ شنبہ (منگل)

آج مولانا عبدالغفور صاحب جن کا ذکر ہو چکا ہے اور شیخ ابراہیم حمدی مدیر کتب خانہ مدینہ منورہ اور مولانا عبدالغفور صاحب کے بڑے بھائی مولانا محمد معصوم صاحب اور دیگر بزرگوں کی مولانا ابوالحسن صاحب ندوی نے دعوت کی، بعد نماز فجر سب لوگ تشریف لائے مجلس پر لطف

رہی، نماز عصر کے بعد مبلغین کی ایک جماعت مکہ مکرمہ روانہ ہوگئی، مشورہ کے بعد یہ طے ہوا کہ حجاج دونوں جگہ زیادہ ہیں، مبلغین دونوں جگہ کام کریں مولانا عبدالملک صاحب اور بھائی عبد الغفور صاحب میواتی وغیرہ مشورہ کے بعد روانہ ہوگئے، ہم لوگ دس بارہ روز کے بعد جائیں گے، جب تک اکثر حجاج بھی مکہ مکرمہ چلے جائیں گے، بعد حج انشاءاللہ پھر یہاں کام ہوگا۔

۲/ذیقعدہ ۱۳۶۶ھ بروز چہارشنبہ (بدھ)

صبح کو اشراق کے بعد حجاج کی تعلیم کے لئے جانا ہوتا ہے مختلف شہروں کے حجاج کے پاس دو دو معلم روانہ ہوجاتے ہیں اور تقریباً ایک گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کتابی یا زبانی تعلیم ہوتی ہے، حجاج کو حج کے فضائل اور اس کے مسائل سناتے ہیں، عوامی تعلیم سے فراغت کے بعد ایک خاص تعلیم ہوتی ہے، جس میں سیرت نبویہ اور مسائل حج پر مذاکرہ ہوتا ہے بعد نماز ظہر اور بعد نماز عشاء رمضان میں اور خالی دنوں مغرب سے پہلے حجاج میں گشت ہوتا ہے جس میں ان کی تعلیم کی اہمیت اور اس کا احساس دلایا جاتا ہے، نماز عصر کے بعد سورہ یسین کا ختم شروع کیا گیا ہے۔

ہندوستان کے ہولناک فسادات اور ناگوار حوادث کی متواتر خبروں سے کافی تشویش ہے، اسی بنا پر ختم شروع ہوا ہے اللہ تعالی اس سورہ کی برکت سے اور اس مقدس ذات جو سامنے ہی گنبد خضراء میں آرام فرما ہے اس کی برکت سے اسلام اور مسلمانوں کو غالب اور کفار کو مغلوب فرمائے۔

مدینہ منورہ الحمدللہ ان تمام شر و فساد سے مامون ہے، نہ یہاں کسی کافر لعین کا کھٹکا نہ لٹیروں اور فسادیوں سے کوئی خطرہ نہ آپس کی تفرقہ بازی کا ڈر، نہ کسی میں شر اور دھوکہ، نہ رات بھر گھر کھلا رہتا ہے، کمروں میں بڑے سے بڑے قیمتی قالین اور کپڑے رہتے ہیں مگر کوئی نظر اٹھا کر نہیں دیکھتا۔

۱۹۵۰-۵۱ء کے حج وزیارت کی کچھ یادیں

از (حضرت مولانا) سید محمد رابع حسنی ندوی
ناظم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

الحمد لله ، والصلاة والسلام علىٰ خاتم أنبيائه سيد الاولين والآخرين محمد وعلىٰ آله وصحبه أجمعين ، أما بعد:

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کا حجاز مقدس کا پہلا سفر ۱۹۴۷ء میں ہوا تھا، وہ رمضان المبارک شروع ہونے سے قبل یعنی اگست سے قبل بحری جہاز سے ہندوستان کی تحریکِ آزادی کے آغاز سے پہلے ہوا تھا۔ اس سفر میں تقریباً پانچ ماہ حجاز مقدس میں گذرے تھے، اس سفر میں مولانا کی والدہ، اہلیہ، ہمشیرہ جو راقم کی خالہ تھیں اور بھانجے مولانا محمد ثانی حسنی جو میرے بڑے بھائی تھے، ساتھ تھے۔ اس سفر میں وہاں کے قیام کے دوران مولانا کو وہاں کے علماء اور صلحاء سے ملاقات کا موقع ملا تھا۔

اس زمانے میں حجاز کی صورتِ حال معاشی لحاظ سے کمزور تھی، حتی کہ وہاں کے بعض کام ہندوستان کے مسلمانوں کے تعاون سے بھی چلتے تھے۔ حرم شریف میں فراہم کردہ بعض سہولتوں میں بھی ہندوستان کی مسلم ریاستوں کا تعاون تھا، ان ریاستوں نے اپنے حجاج کے قیام کے لئے رباطیں بنائی تھیں۔ ہندوستان سے حجاز کے بعض دینی اداروں کو مدد بھی بھیجی جاتی تھی۔ اس زمانے میں جو حجاز جاتا تھا تو وہاں کی اپنی ضروریات کے لئے ضروری سامان لے کر جاتا تھا کہ وہاں اقتصادی لحاظ سے مشقت کا سامنا نہ پڑے، لیکن وہاں کے مقدس کاموں کی خاطر حرمین شریفین میں رہائش اور دیگر دشواریوں کو برداشت کرنے کے ارادے سے جاتا تھا۔

مولانا اس پہلے سفر حج سے قبل دار العلوم ندوۃ العلماء میں حضرت مولانا کے مدرس ہونے کے بعد طلبہ کو تربیتی اور دعوتی کام میں لگنے کی طرف توجہ دلاتے تھے اور عملی طور پر جمعرات کو لکھنؤ کے اطراف کی مسجدوں میں طلبہ کی جماعت لے کر جاتے یا بھیجتے، جس میں طلبہ کسی بستی میں ایک دن کا وقت گذارتے اور جمعہ کو شام سے پہلے واپس آجاتے۔ اس زمانے میں طلبہ کی تعداد بہت کم تھی، اس لئے طلبہ اور اساتذہ کا تعلق قریبی طور پر قائم ہونا آسان تھا۔ جو طلبہ مولانا سے نسبۃً زیادہ مانوس تھے، ان میں مولانا معین اللہ ندوی جو اندور، اجین اور دیبال پور میں بسے ہوئے قاضی خاندان کے فرد تھے اور دوسرے مولوی عبدالرشید اعظمی صاحب اعظم گڑھ کے، مولانا سے زیادہ مانوس تھے۔ دار العلوم سے فراغت کے بعد یہ عموماً مولانا کے پاس اور مولانا کے ساتھ ان کے دعوتی سفروں میں ساتھ رہتے۔

اسی زمانے میں تبلیغی دعوتی کام کی وہاں حجاز میں بنا پڑی تھی۔ وہاں تقریباً اسی زمانے میں نظام الدین دہلی مرکز کی طرف سے مولانا سعید احمد خاں صاحب سہارنپوری اور مولانا عبید اللہ صاحب بلیاوی بھی مقیم تھے اور ابتدائی طور پر کام کا آغاز ہو گیا تھا جو بالعموم مختلف ملکوں سے آئے ہوئے حجاج میں اور مساجد میں آنے والے حضرات میں کیا جاتا تھا۔

مولانا نے وہاں حج وعمرہ کی غرض کے ساتھ تبلیغ ودعوت کے مقصد کو شامل کر لینے کی ضرورت کو محسوس کیا۔ تعلیمی لحاظ سے وہاں اس وقت کوئی خاص توجہ نہ تھی اور بدوی حضرات تو اور بھی اس مقصد سے دور ہوتے نظر آرہے تھے، لہٰذا وہاں جانا ایک اہم ضرورت تھی، اسی کے ساتھ یہ عزیمت کی بھی بات تھی۔ ہندوستان سے ان کے لئے صرفہ کی رقم بھیجی جاتی تھی۔ جو بقدر کفاف ہوتی تھی۔ اس طرح اخلاص اور عزیمت کے ساتھ وہاں کام کی ابتدا ہو گئی تھی۔ ندوی فارغین میں مولانا معین اللہ اور مولانا عبدالرشید اسی مقصد سے وہاں بھیجے گئے۔ ان دونوں کے بھیجے جانے کے بعد ایک سال گزر جانے کے قریب تھا کہ مولانا کا خیال نئے سال کے لئے مزید فارغ التحصیل ندویوں کو بھیجنے کا ہوا۔ مولانا نے مجھ سے فرمایا کہ اس

سال بھیجنے کے لئے جو افراد ذہن میں آرہے ہیں، ان میں تم کو بھی شریک کردیں۔ مجھے ندوہ سے فارغ ہوئے دو سال ہوئے تھے اور ندوے میں معاون استاد (متعلم تکمیل) کی حیثیت سے ایک سال گذرا تھا۔ مجھے مولانا معین اللہ صاحب اور مولانا عبدالرشید صاحب اعظمی کے وہاں کے قیام کی بعض دشواریوں کا علم ہوگیا تھا، میں نے مولانا سے اس کی طرف اشارہ کیا، جس کو مولانا نے ناپسند کیا۔ بہرحال میں مولانا کی سرپرستی میں ہی تھا۔ لہٰذا ان کے فیصلے پر عمل کرنا ہی تھا۔ چنانچہ انھوں نے میرا نام ان میں شامل کردیا۔ یہ مولانا کے پہلے حج کے تین سال بعد یعنی ۱۹۵۰ء کی بات تھی۔

مولانا معین اللہ صاحب دارالعلوم کی تعلیم سے فارغ ہونے میں مجھ سے کئی سال متقدم اور میرے بڑے بھائی مولانا محمد ثانی رحمہ اللہ کے بعض اسباق میں ساتھی تھے، اور مولانا عبدالرشید اعظمی ندوی مرحوم فراغت میں مجھ سے ایک سال بعد کے تھے، لیکن قریب العہد ہونے کی وجہ سے ہمارے درمیان ایک طرح کا دوستانہ اور بے تکلفی کا تعلق تھا۔ اسی طرح منصور پور کے مولانا سید محمد طاہر صاحب جن کے والد سید محمد یوسف صاحب حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری کے مرید کا اور تیسرا نام رامپور کے ڈاکٹر سید رضوان علی ندوی کا تھا جنھوں نے عصری تعلیم کے بعد ندوہ میں اپنی تعلیم پوری کی تھی اور پھلواری شریف پٹنہ کے مولانا عبداللہ عباس ندوی صاحب اور میرا نام تجویز ہوا۔ مولانا عبداللہ عباس صاحب مجھ سے تین یا چار سال متقدم اور میرے بڑے بھائی مولانا محمد ثانی حسنی صاحب کے ساتھی تھے باقی دو حضرات میرے بعد کے تھے۔ لیکن ان سب حضرات کا حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ سے قریبی ربط ہونے کی بنا پر مجھ سے بھی ربط تھا۔ افسوس کہ ان میں سے سبھی ایک ایک کرکے اپنے مالک حقیقی کے حضور حاضر ہوچکے ہیں۔ رحمہم اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ۔

یہ مولانا کے حج کے تین سال بعد کی بات ہے۔ مولانا کو اپنے پہلے سفر حج میں ادائیگی حج کے ساتھ دینی و علمی تعارف اور دعوتی ضرورت کے تحت جو تجربات حاصل ہوئے تھے، جن کی بنا پر

مولانا کو کچھ ندوی فضلاء کو وہاں کے دعوتی کام کی ادائیگی کے لئے بھیجنے کی ضرورت محسوس ہوئی تھی۔ وہ تجربات اور وہاں کے حالات کے احساسات کو ان خطوط سے سمجھا جاسکتا ہے جو مولانا نے اس زمانے میں اپنے اہل تعلق کو لکھا۔ خاص طور پر اپنے برادرِ معظم مولانا ڈاکٹر عبدالعلی حسنی رحمۃ اللہ علیہ کو جو ان کے سرپرست بھی تھے اور دعوتی کام کی اہمیت کو بہت محسوس کرنے والے بھی۔

ادھر مولانا کو اس سے تین سال قبل کے اپنے پہلے حج کے دو سال بعد فضلاء ندوہ کو بھیجنے کے سال ۱۹۴۹ء میں دوسرا حج کرنے کی ایک پیشکش ہوئی۔ حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ جوان کے اور ہم سب کے شیخ تھے، اور مولانا اپنے بڑے پروگراموں میں ان کا ایماء حاصل کر کے ہی فیصلہ لیتے تھے، چنانچہ انھوں نے یہ پیشکش ملنے پر اپنے شیخ و مرشد کی خدمت میں عرض کیا کہ مجھے دوبارہ حج کی سعادت کا موقع ملنے جارہا ہے، آپ کی اجازت چاہئے۔ حضرت نے فرمایا: اگر ہم روک دیں تو؟ تو مولانا نے عرض کیا کہ میں آپ کے حکم کی تعمیل کروں گا۔ تو حضرت نے فرمایا: اس موقع پر نہ جایئے۔ مولانا نے پوری بشاشت سے اس مشورے کو قبول کیا۔ اگرچہ پہلے حج کے بعد دوسرے حج کا تقاضا بہت ہو جایا کرتا ہے اور یہ احساس ہوتا ہے کہ پہلا حج میں نے بہت سی چیزوں سے پہلا واسطہ پڑنے کی وجہ سے پوری افادیت کے ساتھ نہیں کیا، تو دوبارہ موقع ملے تو اس کی تلافی ہو۔ اس لئے یہ موقع چھوڑنا دینی اطاعت کی ایک مثال تھی اور اپنی پسند کی قربانی تھی، جس کو حضرت رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ نے بھی بہت پسندیدگی کی نظر سے دیکھا، اور اس پر ایک سال گزرنے والا تھا کہ حضرت رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ نے خود سفرِ حج کا ارادہ کیا اور حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ سے کہا کہ میں بھی حج پر جاؤں گا، آپ بھی چلئے، اور یہ حج میں آپ ہی کی خاطر آپ کے بات ماننے کی قدردانی میں کر رہا ہوں۔

حضرت کے ساتھ رائے پور کے متعدد حضرات بھی تھے جو حضرت کے مسترشدین میں تھے۔ اس طرح متعدد آدمیوں کا یہ قافلہ بن گیا۔ ادھر ہم لوگوں کو یہ سعادت ملی کہ اس

قافلے میں جو بزرگانِ گرامی پر مشتمل تھا ، رفاقت حاصل ہوگئی۔ چنانچہ غالباً جولائی (۱۹۵۰ء) کے آخری ایام تھے کہ ہم لوگ ممبئی کے لئے روانہ ہوئے، جہاں سے حاجیوں کے قافلے پانی کے جہازوں سے جدہ جایا کرتے تھے۔اس کے لئے ممبئی میں حج کمیٹی کے ذریعے انتظامات کئے جاتے تھے، جہاں کئی روز ٹھہرنا ہوتا تھا۔ اس زمانے میں حج کے مسافروں کا یہی نظم تھا۔ مغل لائن کے جہازوں سے سفر ہوتا تھا جو کہ سال کے دوران مال برداری کا کام کرتے تھے اور حج کے زمانے میں وہ مسافر جہاز ہو جاتے تھے۔

ممبئی سے روانہ ہونے والے مغل لائن کے جہاز بڑے، متوسط اور چھوٹے تین سطح کے چلتے تھے۔ان میں چھوٹے جہازوں میں ایک ہزار سے کم اور بڑے میں ایک ہزار سے زائد مسافر سفر کرتے تھے۔ بڑے جہاز آٹھ روز میں ممبئی سے جدہ پہونچاتے تھے۔ متوسط جہاز دس روز میں اور ان سے چھوٹے بارہ روز میں پہونچاتے تھے۔

حج کے مسافروں کے سفری مسائل ممبئی میں تشکیل کردہ حج کمیٹی کرتی تھی جس کے افراد رضا کارانہ طور پر بھی کام کرتے تھے۔ حج پاسپورٹ بنتا تھا اور حجاز کے دوران قیام جو تقریباً تین مہینے کی مدت پر مشتمل ہوتا تھا، کھانے کے لئے غلہ ساتھ لے جانا ہوتا تھا۔ جہاز کا ٹکٹ اس وقت تین سو عمومی درجہ، اور آٹھ نو سو کا اوپر درجہ کا تھا۔

بہر حال ممبئی میں کئی روز رہ کر ہم لوگوں کا قافلہ ''اسلامی'' نامی جہاز سے روانہ ہوا، جس کی مدتِ سفر دس روز کی تھی۔ سمندری سفر کا معاملہ یہ ہوتا ہے کہ جب سمندر میں حرکت ہوتی تو عام طور پر لوگوں میں امتلائی کیفیت ہونے لگتی، اور جب سمندر میں سکون ہوتا تو بہت خوشگوار طبیعت رہتی۔ جب جہاز روانہ ہوا تو لوگوں نے رخصت کیا اور رخصت کرنے والوں نے اس احساس کے ساتھ رخصت کیا کہ جانے والے خوش قسمت ہیں کہ وہاں جا رہے ہیں، اور دعا کی کہ ہم لوگوں کو بھی موقع ملے، لیکن اس زمانے میں ہندوستان کے لوگوں کی مالی حالت عام طور پر بہت کمزور تھی۔ حج کے سفر کا خرچ برداشت کرنا عام طور پر قابلِ برداشت

نہیں سمجھا جاتا تھا، اسی لئے جانے والوں کو بہت رشک کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔

حج کے جہازوں کو رخصت کرتے وقت ایک طرف مسافر لوگ، اور دوسری طرف رخصت کرنے والے آبدیدہ ہوجاتے تھے اور بہت جذبات کا اظہار ہوتا تھا۔ جب لوگوں نے رخصت کیا اور جہاز پر کھانا ملا جو پہلا کھانا ہونے کی وجہ سے دعوتی کھانا تھا، لوگوں نے خوشی خوشی کھایا۔ اس کے تین گھنٹے کے بعد جہاز جب سمندر میں آگے بڑھا تو سمندر میں حرکت کا سلسلہ پیش آیا، تب تو ایسا حال ہوا کہ ہر طرف امتلائی کیفیت کے مناظر عام ہوئے، کھانا دیکھ کر طبیعت میں امتلاء پیدا ہوجاتا اور قے کا ایسا سلسلہ جاری ہوا کی ختم ہونے کو نہ آتا۔ ہر طرف اسی کا منظر تھا، اور یہ سلسلہ کئی روز جاری رہا۔ لوگوں کے پیٹ بالکل خالی ہوگئے، کھانا دیکھنا مشکل ہوگیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ دنیا سے رخصت ہونے کا وقت آگیا۔ تیسرے روز سے سمندر میں سکون محسوس ہوا اور آہستہ آہستہ طبیعت بہتر ہونے لگی۔

۵۔۶ دن کے بعد حضرموت کے شہر کی بندرگاہ مکلا میں جہاز رکا اور وہاں سے بھی حاجی چڑھے۔ اس میں وہاں کے قاضی صاحب کے صاحبزادے اور ان کے بعض رفیق بھی تھے۔ یہ جان کر کہ جہاز میں بعض بزرگ شخصیتیں بشمول مولانا علی میاں صاحب بھی ہیں، یہ سب ملنے آئے اور بڑی اچھی نشست رہی۔ حضرموت والوں میں قاف کی ادائیگی مشکل ہوتی ہے، اس کو وہ گاف میں بدل دیتے ہیں۔ وہاں اس کا مظاہرہ دیکھا۔ ان کو کھانے کی کوئی چیز پیش کی گئی جو تھوڑی تھی، پیش کرنے والے نے کہا:

هذا شيء قليل، اس پر وہ بولے:

قليل منك يكفيني ولكن
قليلك لا يقال له قليل

اس کی ادائیگی انھوں نے اس طرح کی:

گليل منك يكفيني ولكن
گليلك لا يگال له گليل

بہت اچھے لوگ تھے اور اچھی نشست رہی۔

دسویں روز جہاز جدہ پہونچا اور جدہ کا جو پورٹ تھا، وہ گہرے سمندر کا نہ تھا، لہذا جہاز وہاں تک نہیں جاتا تھا اور تقریباً ایک میل کے فاصلے پر گہرے سمندر میں ٹھہرتا تھا، اور وہاں سے کشتیوں پر پورٹ میں لوگ جاتے تھے۔

جدہ پہونچ کر دل مسرت اور خوشی سے بھر گئے۔ دس روز سمندر میں رہنے سے اُکتا گئے تھے کہ ہر طرف حدِ نظر پانی پانی ہی تھا، اور دن رات یہی ایک منظر۔ انسان خشکی کی مخلوق ہے۔ خشکی کی اصل قدر وہاں ہوتی تھی، جدہ پہونچنے پر سب کی طبیعتیں مسرور سی ہوگئیں، خاص مسرت اس بات کی تھی کہ ہم بلاد عربیہ کی سرزمین پر اتر رہے ہیں، کتنی بڑی سعادت کی بات ہے۔ کتنے مسلمان ہیں جو اس کی حسرت لے کر دنیا سے چلے گئے، اور یہ سعادت ان کو نہ حاصل ہوئی جو اللہ نے اس کم عمری میں ہم کو عطا فرمائی۔ دس روز نے اس کی قدر دانی کے احساس کو اور بڑھا دیا۔

جدہ میں خود ہندوستان کا بنایا ہوا ایک حج ہاؤس تھا، لکڑی کی بارکیں بنی ہوئی تھیں اور حاجی ان میں ٹھہرتے تھے، اس حج ہاؤس کی انتظامی ذمہ داری علامہ رحمۃ اللہ کیرانوی کے خاندان کے ہی ایک فرزند حکیم نعیم صاحب انجام دیتے تھے۔ وہ ہندوستانی اور عرب دونوں کے مزاج و مذاق کو سمجھنے والے تھے، حجاج میں جو کسی اہمیت کے حامل ہوتے، وہ ان کو سمجھتے اور اس کا لحاظ رکھتے تھے۔ معلّم اور ان کے وکلاء مکہ، مدینہ پہونچانے کی کارروائی انجام دیتے اور سواری کا انتظام کرتے۔ اس میں دو ایک روز لگ جاتے تھے۔ بالآخر وہاں کی مقررہ کارروائی انجام پانے پر وہاں سے بذریعہ بس مکہ مکرمہ روانگی ہوئی۔ اردگرد پہاڑیاں خشک زمینیں ہیں، لیکن وہ خشکی اور صحرائی انداز دل میں محبوبیت پیدا کرتا۔ اور یہ احساس کہ یہ ہماری قسمت کہ اس سرزمین پر ہمیں چلنے کی سعادت حاصل ہو رہی ہے، جہاں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم چلے اور رہے ہیں۔ جبرئیل امین علیہ السلام وحی لے کر اور اللہ رب العالمین کا پیغام لے کر اترے ہیں۔ مسلمان شاعر ماہر القادری کا شعر ہے، اس کو دیکھ کر انھوں نے کہا:

نہ یہاں پر سبزہ اگتا ہے، نہ یہاں پر پھول کھلتے ہیں

مگر اس سرزمیں سے آسماں بھی جھک کے ملتے ہیں

اور زائرِ حرم حمید صدیقی نے کہا:

اب جا رہے ہیں جانے والے
اب کوئی کیسے دل کو سنبھالے
اے یادِ ماضی ، اے عہدِ رفتہ
تو جتنا چاہے ستا لے

راستے میں دو ایک جگہ قہوہ خانے، چائے خانے ملے، بالکل سادہ طریقے کے، بدوی انداز کے، وہاں شوق سے چائے پی گئی، اور ابھی مکہ مکرمہ دور ہی تھا، چالیس پچاس کلومیٹر کا فاصلہ رہا ہوگا کہ وہاں کے اثرات محسوس ہونے لگے۔ وہاں کی نورانیت یہاں تک آ رہی ہے، اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ بیت اللہ شریف کو اللہ تعالیٰ نے ایسا ہی بنایا ہے۔ گویا وہ آسمانی ٹکڑا ہے جو زمین سے جوڑ دیا گیا ہے۔ اس کے اثرات دور تک پہونچنا کوئی تعجب کی بات نہیں۔

وہاں پہونچنے پر باب السلام سے داخلہ ہوا۔ داخل ہونے پر جب بیت اللہ پر نظر پڑی تو دل پر ایسا اثر ہوا، جس میں آدمی بے قابو ہو جاتا ہے، اور یہ صرف اپنا ہی تجربہ نہیں بلکہ وہاں کی پہلی حاضری اور بیت اللہ پر پہلی نظر پڑنے پر ہر ایک کا ایسا ہی حال ہوتا ہے۔ اس کی نورانی اور روحانی طاقت انسان کو بے قابو کر دیتی ہے۔ ہمارے ایک تعلق والے کے متعلق سنا کہ ان کی نظر پڑی تو وہ گر گئے۔

وہاں کی اس حاضری میں پوری جماعت تھی، جس کی سرپرستی اللہ کے ایک بڑے نیک بندے مرشدنا وشیخنا حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ کر رہے تھے، اور قافلہ والوں کو وہاں کی نورانیت اور روحانیت کا فیض ملنے کے ساتھ ساتھ اللہ کے نیک بندے کی سربراہی کا فائدہ بھی حاصل ہو رہا تھا۔ خالی اوقات میں حضرت کی مجلسوں میں بیٹھنا ہوتا اور حضرت کے وہاں پہونچنے کی شہرت ہونے سے حج میں آئے ہوئے مختلف علاقوں کے لوگ

حضرت سے ملنے آتے اور ان کی باتیں سنتے، اور یہ مزید مسرت بھی ان کو حاصل ہوتی۔ ہم لوگوں کا پہونچنا بالکل ایام حج کے قریب ہوا تھا۔ ہمارا قیام رباطِ بھوپال میں ہوا، اور حضرت رائے پوری، اور ان کے قافلہ رائے پور کا قیام وہاں کے مقیم ایک شخص کے یہاں تھا۔ حرم شریف میں بھی ملاقات ہوتی اور ان کے مکان پر بھی ملاقات ہوتی۔ چار پانچ روز کے بعد حج کے مناسک شروع ہو گئے اور وہ نعمت ہم لوگوں کو حاصل ہوئی۔

حج کے بعد حضرت رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ مدینہ منورہ روانہ ہو گئے۔ لیکن ہم لوگوں کا قیام سال بھر کا تھا، اس لئے ہم لوگوں کو مدینہ منورہ جانے میں جلدی کی ضرورت نہیں تھی۔ ہم لوگ رباط میں رہے۔ ادائیگی حج اور مدینہ منورہ کی زیارت کے بعد حضرت رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے رفقاء ہندوستان واپس ہو گئے، اور حضرت مولانا سید ابو الحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کا قیام رہا اور وہاں کے اہل علم حضرات سے ربط رہا۔

سعودی عرب کا یہ وہ زمانہ تھا جب کہ وہاں باقاعدہ خوش حالی کا حال نہیں بنا تھا۔ اس کا اثر حکومت پر بھی تھا۔ صرف وزارت مالیہ ایک وزارت تھی، باقی شعبوں میں ''مدیر'' کے لفظ کا استعمال ہوتا تھا۔ تعلیمی شعبے کے لئے بھی مدیر اور کام کے لحاظ سے وزیر کی حیثیت تھی، لیکن وزیر کے لفظ کا استعمال نہیں تھا۔ وزیر مالیہ عبد اللہ سلیمان تھے جو تنہا وزیر ہونے کی بنا پر بہت اثر رکھتے تھے اور وہ حکومت کے بہت معتمد علیہ تھے۔ ان کے نائب اور معاون محمد سرور الصبان تھے، ان کو بھی اچھی حیثیت حاصل تھی۔

ان میں مزید ایک بات یہ تھی کہ ان کا مزاج ادب اور ادیبوں کی سرپرستی کا مزاج تھا جس کی وجہ سے حجاز میں وطنی لحاظ سے باہر سے آئے ہوئے لوگوں میں سے افریقہ سے آئے ہوئے اور سعودی وطنیت کے حامل لوگ تھے۔ ادیبوں سے ان کی دلچسپی کی وجہ سے اور سعودی عرب میں وطنی لحاظ سے بھی، خوش اخلاقی اور علمی وادبی شغف بھی رکھتے تھے۔ چنانچہ حجاز کے ادباء کو ان کی سرپرستی ملتی رہتی تھی۔ حجاز کے معروف ادیبوں میں احمد عبد الغفور عطار، عبد القدوس انصاری، علی حسن فدعق، سعید العامودی، اور دیگر کئی اہم شخصیتیں تھیں۔

ان میں احمد عبدالغفور عطار اصلاً بنگالی تھے، لیکن عربی ادب سے اشتغال رکھنے پر حجاز کی ادبی کاوشوں میں ان کو معروف مقام حاصل تھا۔ ان کا مصر کے ادیبوں میں عباس محمود العقاد اور سید قطب سے قریبی ربط تھا۔ اور برصغیر کے ہونے کی وجہ سے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ سے زیادہ قربت محسوس کرنے لگے تھے۔ ان کے اس تعلق کی بنا پر حجاز کے دیگر ادیبوں سے مولانا کا تعارف ہونے میں بڑا حصہ رہا۔ ان کا تعلق گورنمنٹ کے سرکاری پریس کے منیجر سید محمود حافظ سے بھی تھا۔ سید محمود حافظ دیندار، وضع دار، اچھی تربیت اور خصوصیت کے تھے۔ ان کی والدہ پشاور کی تھیں۔ اس لئے ان کا ربط برصغیر سے بھی تھا۔ اس چیز نے بھی مولانا اور ان کے درمیان ربط بنایا۔ شیخ محمود حافظ اور احمد عبدالغفور عطار کے توسط سے مولانا کا حجاز کی ادبی اور ثقافتی شخصیتوں سے ربط برابر قائم ہوا، جس میں خود مولانا کی کوشش کو دخل تھا تاکہ دعوتی کام کے سلسلے میں وہاں کے ذہین طبقے کو اسلامی ذہن سے زیادہ سے زیادہ جوڑا جا سکے۔

مزید اس ربط کی ایک شکل یہ ہوئی کہ وہاں کی وہ مذکورہ بالا بااثر شخصیت جن کو گورنمنٹ کے ایک محکمہ میں ذمہ دار ہونے کا مقام حاصل تھا، جن کا نام سید محمود حافظ (شامی) تھا، وہ بڑے نیک صالح شخص تھے۔ ان کی والدہ پشاور کی ہونے کی وجہ سے وہ برصغیر ہندو پاک سے ایک رشتہ محبت رکھتے تھے مولانا سے بڑے مانوس ہوئے اور کہنے لگے کہ ہم آپ کی ملاقات یہاں کی بڑی اہم شخصیات علماء، ادباء اور دانشوروں سے کرائیں گے۔ علماء سے مولانا کا تعلق تھا لیکن ادباء سے نہ تھا۔ ان کو محمود الحافظ صاحب نے ایک دعوت پر جمع کیا اور مولانا کا تعارف کرایا۔ ان میں اکثر سیکولر ذہن کے تھے اور حجاز میں رہتے تھے۔ مولانا سے تعارف ہونے پر مولانا سے طرح طرح کے سوالات کئے جن کا تعلق ادب سے اور انگریزی لٹریچر سے تھا۔ مولانا کے جوابات سن کر وہ حیران رہ گئے، ان کو توقع نہ تھی کہ ایک عالمِ دین ادب سے اتنی اچھی واقفیت رکھتا ہوگا۔

پھر مولانا نے ان کو تبلیغ سے جوڑنے کی کوشش کی اور یہ کہا کہ ایک دن پکنک کے طور پر وہاں کے ایک دیہات میں کھلی فضا میں گزاریں، وہ لوگ تیار ہوگئے اور روانہ ہوئے۔ اور قریب کے ایک دیہات میں ایک مسجد میں تبلیغی طرز پر ٹھہرے۔ یہ دیہات مکہ شہر سے تقریباً پندرہ کلومیٹر پر وادی فاطمہ کے علاقے میں تھا۔ وادی فاطمہ مکہ مدینہ کے راستے پر ہے۔ یہ وادی ہونے کی بنا پر سرسبزی وشادابی کی صلاحیت رکھتا ہے۔ مکہ مکرمہ چونکہ پہاڑی خطے کے درمیان میں ہے، وہاں پانی اور پانی کے اثر سے ہونے والی شادابی نہیں۔ پانی کی بڑی کمی ہے، وہاں پانی اندرونِ زمین نہر زبیدہ کے ذریعے پہونچایا جاتا تھا، اب مزید ایک بڑی بستی کے اضافے سے پانی کی کمی کو دور کیا گیا ہے۔ شہر کا علاقہ خشک ہونے کی بنا پر وہاں کاشت وسبزیاں نہیں ہوتی ہیں، وہ ضرورت کے مطابق باہر سے مہیا کی جاتی ہیں زیادہ سبزیاں وادی فاطمہ سے آتی ہیں۔

ان میں سے ایک صاحب اپنے ساتھ ریڈیو بھی لے گئے۔ ریڈیو اس وقت تک عام نہیں ہوا تھا، اس کو صرف جدید ذہن کے لوگ ہی رکھنے کو پسند کرتے تھے، گانے اور خبریں سنی جاتی تھیں، اس لئے دینی ذہن کے لوگ کم پسند کرتے تھے۔ وہ صاحب صرف خبریں سننے کے عنوان سے لئے گئے تھے۔ مولانا نے دینی ودنیوی تقاضے سے ریڈیو لانے کو برداشت کیا۔ وہاں مولانا نے ان لوگوں سے ان کے ذہنوں کا لحاظ کرتے ہوئے دین کی باتیں کیں، جس سے وہ لوگ مانوس ہوئے اور دین کے تعلق کو محسوس کیا۔ پھر اس کے بعد وقتاً فوقتاً ان لوگوں سے ملاقاتیں ہوتی رہیں اور وہ لوگ مولانا سے بہت مانوس ہوتے چلے گئے۔ ریڈیو پر تقریریں بھی کرائیں اور زوردار تعارف بھی کرایا اور ان کے رسائل بھی جو وہ ساتھ لے کر گئے تھے، سنوائے۔ ان میں استاد احمد عبدالغفور عطار، استاد سعید عامودی، استاد علی فدعق، استاد عبدالقدوس انصاری، استاد محسن احمد باروم، شیخ رشید فارسی، علی المزروع وغیرہ اہم نام ہیں۔ ان میں کئی لوگ گورنمنٹ کے اہم عہدوں پر بھی تھے۔ مملکت کے اہم لوگوں میں نائب وزیر مالیات محمد سرور الصبان کی بھی بڑی اہمیت تھی، ان کے ادبی اور علمی ذوق اور اہلِ علم وادب کی

سرپرستی کی وجہ سے اہلِ ادب ان سے خاص تعلق رکھتے تھے۔

ان اہل ادب میں استاذ احمد عبد الغفور عطار جن کو حضرت مولانا سے اچھا تعلق ہوگیا تھا، سرور صبان صاحب سے مولانا کا تعارف کرانے کا ذریعہ بھی بنے اور پھر یہ تجویز پیش کی کہ مولانا طائف کا بھی سفر کریں۔ طائف اس علاقے میں نسبتاً سرد مقام ہونے کی بنا پر خوش حال لوگوں کی دلچسپی کا بھی شہر تھا، وہ عموماً مکہ کی گرمی سے بچتے اور طائف میں گرمی گذارتے تھے۔ اس وقت موسم بھی گرمی کا تھا، مولانا کے سفر کے لئے موزوں تھا۔ چنانچہ شیخ سرور صبان نے مولانا کے سفر کا انتظام کیا۔ اس سفر میں استاذ عبد الغفور عطار اور ان کے ساتھی اور ہم تین لوگ تھے، مولانا معین اللہ اور تبلیغی جماعت کے ذمہ دار مولانا سعید احمد خاں مکی اور ہم۔

طائف کا یہ سفر کئی روز کے قیام پر مشتمل تھا۔ ہلکی ٹھنڈک تھی جو خوش گوار تھی۔ وہاں کی اہم شخصیات سے مولانا کی ملاقات کا پروگرام رہا۔ طائف کمشنری کے کمشنر شاہی خاندان کے ایک فرد تھے، جو سننے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے، لکھ کر بات ہوتی تھی، بڑے ذہین تھے، ان سے مولانا کی ملاقات ہوئی۔

مولانا کے مصر و شام اور سوڈان کے سفر پر جانے کے بعد ان سے مجھ کو مولانا سے تعلق کی بنا پر ملنے کا موقع ملتا تھا، اور بعض وقت تبلیغی حضرات ان کو اپنے اجتماعات میں ہمارے ذریعے سے بلوا دیتے تھے، اور وہ ہمارے کہنے سے آجاتے تھے۔ یہ سلسلہ ۸۔۱۰ مہینے کا رہا۔ چھ مہینے کے بعد ہم لوگوں کو مدینہ منورہ حاضری کا موقع ملا اور وہاں چار مہینے کا قیام رہا، اور شوال المکرّم کا مہینہ تھا کہ مولانا کی باہری سفر سے واپسی ہوئی اور مولانا کا ساتھ رہا۔ اور دوسرے حج کی ادائیگی کے بعد ہندوستان واپسی ہوئی۔ ہندوستان واپسی جس جہاز سے ہوئی ، وہ محمدی تھا، وہ بڑا جہاز تھا۔ آٹھ دن میں لایا۔ میرے بعض رفقاء نے مزید قیام کیا۔

علمی اور ادبی میدان میں حجاز اور وہاں کے بقیہ علاقوں میں ابھی تعلیمی ترقی کا دور نہیں آیا تھا، زیادہ تر وہاں کے لوگ علمی و ادبی و ثقافتی میدان میں مصر سے متاثر تھے اور مصری ثقافت میں مصر کے مروجہ رجحانات کا ان پر اثر تھا۔ اور مصر میں دو یونیورسٹیاں تھیں۔

اس پورے علاقے سعودی عرب اور اس کے قرب وجوار کے علاقوں کے لوگ اعلیٰ تعلیم کے لئے مصر کا رخ کرتے تھے، اور اس وقت مصر میں مغربی فکر کے رجحانات اثر انداز ہو چکے تھے، اور وہاں کے بڑے ادباء جو ادبی لحاظ سے فرانس اور برطانیہ کے دانشور طبقے سے متاثر تھے، ان کا مسکن سعودی عرب کے علاقے حجاز ونجد تھے۔ اسی لئے مولانا کو اس کا بہت احساس تھا کہ حجاز جو مرکز اسلام ہے، وہ مغرب کی مرعوبیت میں مبتلا نہ ہو، جس کو انھوں نے وہاں کے سفر میں محسوس کیا تھا۔ مولانا کے بڑے بھائی ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی رحمۃ اللہ علیہ جو مشرقی ومغربی دونوں رجحانات سے واقف تھے، خاص طور پر یہ فکر رکھتے تھے، اور وہ مولانا کو جو تعلیمی زمانے میں ان کی سرپرستی کرتے رہے تھے، اس پر توجہ دلاتے تھے۔

مولانا کا تعلق تبلیغی جماعت سے بھی تھا، لہٰذا دعوتی فکر مولانا کی خاص فکر تھی، عربی زبان پر مولانا کو بڑا اچھا عبور حاصل ہو چکا تھا، لہٰذا وہ حجاز ونجد کے ادباء سے برابر کی سطح پر بلکہ بلند سطح پر بات کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ احمد عبدالغفور عطار اور شیخ سید محمود الحافظ نے مولانا کی وہاں کے ادباء سے ملاقات کے لئے انتظام کیا۔ دعوت میں ان کو کھانے پر جمع کیا، اور ادب کے نام پر وہاں کے ادباء شریک ہوئے۔ ان کے ذہن میں علماء کے سلسلے میں وقعت والا تصور نہ تھا، ان کے سامنے مصر کے علماء تھے، جو جدید ذہن سے الگ ذہن کے حامل تھے، اور ہندوستان کے علماء میں مزید یہ بات تھی کہ عربی میں بڑھے ہوئے نہیں تھے، چنانچہ ان ادباء نے علماء کو عالم دین سمجھتے ہوئے اس ملاقات کو محض اخلاقی ملاقات قرار دیا، کھانے کے بعد بطور دلچسپی ان ادباء نے مولانا سے ایسے سوالات کئے جو ادب کے ادبی رجحانات سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ یورپ کو کیا جانتے ہوں گے اور کوئی وقیع جواب نہ دے سکیں گے۔ لیکن ان کے سوالات پر مولانا کے جوابات ادباء کی معلومات سے کچھ آگے ہی تھے۔ اس لئے کہ مولانا کی ثقافت اور واقفیت کے اسباب میں علامہ شبلی نعمانی، علامہ اقبال اور پھر سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالماجد دریا آبادی جیسے منجھے ہوئے لوگوں سے استفادہ کے بعد اسلامی فکر کی بلندی اور گہرائی اور مغربی فکر کی پستی اور کمزوری پہلے سے حاصل ہو چکی تھی، جہاں تک وہاں

کے علماء کا مطالعہ نہیں پہونچا تھا، چنانچہ اس مجلس نے سب کو متاثر کیا اور ان سب نے محسوس کیا کہ مولانا کی فکر ان کی حاصل کردہ فکر سے بلند ہے۔ اس وقت سے ان سب کا ربط احترام وتعلق ومحبت کا ہوگیا جو آخر تک قائم رہا۔ انھوں نے علمی سطح پر مولانا سے تبادلۂ خیال کا بھی سلسلہ جاری رکھا اور اپنے اداروں میں بھی مولانا کو بلایا۔ چانچہ جدہ ریڈیو پر مولانا کی تقریریں رکھیں اور ان کا تعارف احمد عبدالغفور عطار نے کرایا جو مجلۃ'' الحج '' نے شائع بھی کیا۔

مولانا کی کتاب'' ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین '' ٹھیک اسی زمانے میں چھپ کر آئی تھی، اور چونکہ مصر میں چھپی تھی، اس لئے بھی لوگوں نے اس کو اہمیت کے ساتھ لیا، اور مولانا کی فکر بلند سے متاثر ہوئے۔ مولانا نے اپنی اس کتاب میں اسلامی دور کی جو برتری وکمال ہے، اسے مغرب کے مذہب مخالف رخ کی بے بضاعتی ظاہر کی ہے۔ اس سے اس پورے علاقے کا دانشور طبقہ متاثر ہوا۔ مولانا چونکہ بے تکلف عربی بولتے تھے اور فصیح عربی میں بات کرتے اور خطاب کرتے تھے، اس لئے مولانا کی ملاقات کا اثر محسوس کیا جاتا تھا۔

مولانا''ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین '' سے پہلے کئی رسالے تحریر کر چکے تھے، جن میں عربوں کا جو قائدانہ مقام رہا ہے، اس کی طرف لوٹنے کی طرف توجہ دلائی ہے۔ مولانا کا اسلوب عربوں کے مقام کی بلندی اور اسلامی لحاظ سے ان کی برتری کے تذکرے اور احترام کے ساتھ ان کی موجودہ احساس کمتری اور فطری لحاظ سے کم بضاعتی پر تعجب کا اظہار ہوتا تھا اور اپنا بلند مقام واپس لینے کی تلقین ہوتی تھی۔

مولانا نے اس خصوصیت کے ساتھ مزید یہ خصوصیت بھی اختیار کر رکھی تھی کہ دیگر مختلف اصحاب علم وادب کو دنیاوی فائدے کے حصول میں حرج نہیں سمجھتے تھے، مولانا نے پوری طرح اس سے گریز کیا۔ وہاں کے حکومتی افراد سے ہدیہ تک لینا گوارہ نہ کیا اور اپنا ہمدردانہ رویہ برابر ظاہر کیا۔ وہاں کی خوشحال شخصیتوں نے اس کو بہت اہمیت کی نظر سے دیکھا۔

حجاز کے ادیبوں سے مولانا کی ملاقات کا سلسلہ برابر قائم ہوگیا۔ وہ سب محبت اور قدردانی سے مولانا سے ملتے۔ ان میں سید علی حسن فدعق، دیگر ادیبوں کے مقابلے میں زیادہ آزاد ذہن رکھتے تھے۔ وہ مولانا سے ایسے متاثر ہوئے کہ بڑے بھائی اور مخلص وسینیر دوست کی حیثیت سے مولانا سے ملتے اور مولانا سے تعلق رکھتے۔ اور ان کے ذہن کی وہ آزاد خیالی جو پہلے تھی، اس کی خاصی اصلاح ہوئی۔ علی حسن فدعق جدہ کی میونسپلٹی کے چیرمین بھی منتخب ہوئے جس سے وہاں ان کی وقعت میں اضافہ ہوا۔ وہ آخر عمر تک مولانا سے محبت وقدردانی کا تعلق رکھتے رہے۔ دیگر ادباء میں عبد القدوس انصاری وہاں کے بڑے ادیب مانے جاتے تھے، اور وہ عربی میں ایک مجلّہ ''المنهل'' بھی نکالتے تھے، جو وقیع رسالہ سمجھا جاتا تھا اور اس سے ان کو اچھی شہرت حاصل تھی، وہ بھی مولانا کے گرویدہ ہوگئے اور مولانا کے تعلق سے جو بھی ان سے ملتا، وہ اس سے محبت سے ملتے۔ ان کی تعلیم ہندوستانی علماء کے قائم کردہ مدرسہ ''مدرسہ علوم شرعیہ مدینہ منورہ'' میں ہوئی تھی، اس طرح ان کی ذہنی بنیاد اچھی بنیاد تھی۔

دوسرے ادیب سعید العامودی وہاں کے ادباء کے طبقے میں احترام والا مقام رکھتے تھے۔ وہ بھی مولانا سے ایک طرح کی شفقت ومحبت کا تعلق رکھنے لگے۔ اور شیخ محسن الباروم جو وہاں کی نئی نسل کے مشہور ومعروف اہل علم وادب میں تھے، وہ بھی محبت کا تعلق رکھنے لگے۔ وزارت حج کے آرگن'' مجلۃ الحج '' کے ایڈیٹر بھی ہوگئے تھے اور اس میں بھی مولانا کے مضامین انھوں نے شائع کرائے۔

اس سفر میں جو مولانا کا دوسرا سفر حج تھا، اسی میں ان کو عظیم شیخ طریقت حضرت مولانا شاہ عبد القادر رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ کی رفاقت کا شرف حاصل تھا، اس خصوصیت سے حج میں آنے والی عالم اسلام کی دینی شخصیتوں کی حضرت رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات کا ذریعہ بھی بنے۔ اور حضرت رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ کی جو دینی خصوصیات تھیں، ان سے حج میں آنے والے علماء ومشائخ کو تعارف حاصل ہوا اور ربط قائم ہوا۔

مولانا نے حجاز کے مقام اور وہاں کے رہنے والوں کی خصوصیت کی طرف توجہ دلانے کے لئے ایک مؤثر مضمون لکھا جو وزارت حج کے آرگن ''مجلۃ الحج'' میں شائع ہوا اور پسند کیا گیا۔ مولانا نے اس میں مخلصانہ اور محبت آمیز انداز سے اسلامی خصوصیت کو اہمیت دینے اور قائدانہ مقام بتانے کی توجہ دلائی۔

اس وقت مسجد حرام کے سب سے بڑے امام شیخ ابوالسمح مصری تھے، اور ان کے نائب شیخ عبدالرزاق حمزہ اور ائمہ تھے۔ شیخ عبدالرزاق حمزہ عالمِ دین ہونے کے ساتھ ساتھ دیگر مختلف موضوعات کا اچھا مطالعہ رکھتے تھے۔ ان سے مولانا کی ملاقات پہلے حج میں ہوئی تھی، اس وقت مولانا کی کتاب ''ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین'' چھپی نہیں تھی، لہٰذا مولانا نے اس کا مسودہ ان کو دکھایا تھا اور اس پر انھوں نے بڑی قدردانی کا اظہار فرمایا تھا اور دیگر علماء میں اس کا تعارف کرایا تھا۔

دیگر علماء میں کئی ممتاز حضرات تھے۔ ان میں شیخ سید علوی مالکی خاص تعلق کا اظہار کرتے تھے اور انھوں نے اپنے صاحبزادے کو ندوۃ العلماء میں تعلیم دلانے کے لئے بھیجنے کا ارادہ بھی کیا، اور وہ ندوہ ایک جائزے کے لئے بھی آئے اور دارالعلوم دیوبند کو بھی جا کر دیکھا، پھر ان کی رائے حجاز سے باہر رہنے کی نہیں بنی، اور انھوں نے اپنی تعلیم وہیں مکمل کی، اور بعد میں ان کے والد کی شہرت ان کو بھی حاصل ہوئی۔ وہ تصوف کے بھی قائل تھے بلکہ اس کی سرپرستی کرتے تھے، اس کی وجہ سے حکومت کی نظر میں حکومت کی طرف سے ان کو زیادہ اہمیت نہیں دی گئی۔

مولانا کی حجاز میں جو ملاقاتیں ہوئیں، ان میں ہم لوگ بحیثیت مولانا کے تلامذہ کے شریک ہوتے تھے، مولانا معین اللہ ندوی، مولانا عبدالرشید اعظمی ندوی، مولانا سید محمد طاہر منصور پوری، مولانا سید رضوان علی ندوی، ہم ساتھیوں میں مولانا معین اللہ ندوی، اور مولانا عبداللہ صاحب پھلواروی ہم لوگوں سے سینئر تھے۔ ہم لوگ بھی بحیثیت طالب علم کے نہیں بلکہ ندوہ میں تعلیمی سلسلے سے تعلق ہو جانے سے ہم کو وہاں کی علمی مجالس میں فارغ

التحصیل یا شعبۂ تدریس کے دائرۂ کار کا سمجھ کر معاملہ کیا جاتا تھا، اور مولانا کے بھانجے ہونے کا جو تعلق تھا، اس کی بنا پر یہ ادباء اور اہل علم مولانا کے اس تعلق سے محبت اور شفقت سے پیش آتے تھے۔ اس طرح مجھ کو کئی مرتبہ ان ادباء کو تبلیغ ودعوت کے اجتماع میں بلانے کا ذریعہ بننے میں آسانی ہوئی، اور ان لوگوں نے ہم کو عزیز کی طرح رکھا۔

کئی مہینے مولانا نے حجاز میں گزار کر مصر کے لئے روانہ ہوئے، اس زمانے میں کچھ ترقیات نہیں ہوئی تھیں اور وہاں وہی لوگ گئے تھے جو عبادت اور حرمین شریفین سے استفادہ کی نیت رکھتے تھے۔ معاشی اور تمدنی لحاظ سے ترقی نہیں ہوئی تھی۔ تمدنی ہماہمی کم تھی۔ بہرحال ان کو ماموں اور سرپرست ہونے کی بنا پر مجھ کو ان کے جانے سے تنہائی کا احساس ہونے کی بنا پر بڑا تاسف ہوا۔ مولانا نے اپنے تاثر وتاسف کا اظہار اپنے سفرنامۂ مشرق وسطیٰ میں کیا ہے، جو شرق اوسط کی ڈائری میں لکھا۔

ہمارے رفقاء میں مولانا معین اللہ صاحب اور مولانا عبدالرشید صاحب آگے کے سفر میں ساتھ رہے، اور مولانا عبیداللہ صاحب بلیاوی بھی مولانا کے ساتھ گئے۔ ہم چار آدمی مولانا عبداللہ عباس صاحب، مولانا سید محمد طاہر صاحب، مولانا سید رضوان علی صاحب اور ہم حجاز ہی میں رہے، حجاز کا ہمارا قیام بہت ہی نفع بخش رہا اور مقصد دعوتی رہا۔ لہٰذا تبلیغ ودعوت کے کام میں اس کے ذمہ داروں سے ربط واتصال رہا اور وہاں کی اہم شخصیتوں کو بعض وقت بلانے کا ذریعہ بننے کی سعادت بھی حاصل ہوئی۔ ذاتی طور پر شیخ عبدالمیمن مصری امام حرم سے بھی استفادہ کا موقع ملا، تبلیغی جماعت کے کاموں کی سربراہی مولانا سعید احمد خاں صاحب سہارنپوری اور مولانا عبیداللہ صاحب بلیاوی کی تھی اور الحمدللہ وہاں کے نظام میں یہ امت کے تعلق والے افراد بھی آتے تھے اور وہاں کام پھیلنے کا ایک نمایاں آغاز تھا جس کے بعد کام میں اضافہ ہوا۔

مولانا مصر وسوڈان وشام کے سفر میں سات آٹھ ماہ رہ کر پھر حجاز واپس ہوئے اور ہم سب کو بڑی تقویت حاصل ہوئی۔ مولانا کے مصر وشام کے سفر کے دوران ہم نے اس سفر

کو عملی لحاظ سے بھی مفید بنانے کی کوشش کی۔ وہاں کے کتب خانوں میں جاتے اور معروف شخصیتوں سے ملاقات کرتے رہے۔ وہاں جو یکسوئی اور مقصدیت حاصل تھی، اس سے فکری اور مفید علمی کتابوں کے مطالعے کا اچھا موقع ملا، اور مدینہ منورہ میں مکتبہ شیخ الاسلام جا کر دیکھا اور وہاں کے ذمہ دار سے ملنے کا موقع ملتا رہا۔ اور مکہ مکرمہ میں دہلی کے مشہور تاجر جو سعودی عرب میں بھی تجارت کی شہرت رکھتے تھے، وہ علمی آدمی تھے، ان کا اچھا کتب خانہ تھا، انھوں نے مجھ کو اجازت دے دی تھی کہ میں وہاں بے تکلف جاؤں اور مطالعہ کروں، بلکہ وہاں سے کتاب عاریۃ لے کر مطالعہ کروں، اس سے مجھے علمی لحاظ سے بہت فائدہ پہونچا۔

حرم شریف کے ائمہ میں شیخ ابو السمح کے چھوٹے بھائی شیخ عبد المہیمن مصری بھی بعض اوقات امامت کرتے تھے۔ وہ تجوید و قرأت کے اچھے فاضل تھے۔ ہم لوگوں نے چاہا کہ ان سے شرف تلمذ حاصل کریں۔ مولانا محمد طاہر صاحب اور میں نے ان سے وقت لیا، وہ تیار ہو گئے کہ روزآنہ ہم کو صحت قرأت کی تعلیم دیں۔ چنانچہ کچھ مدت تک حرم شریف میں ان کو قرآن مجید سنا کر فائدہ اٹھاتے رہے۔ وہ امامت کے علاوہ وہاں مدرسہ سلفیہ کے ذمہ دار بھی تھے۔ یہ مدرسہ مختصر سا تھا جو وہاں کے سلفی حضرات کی طرف سے قائم کیا گیا تھا، اور اس سے طلبہ فائدہ اٹھاتے تھے۔ ان کی سلفیت صرف علمی اور رواداری کی تھی شدت کی نہیں تھی۔ اس وقت تک سعودی عرب میں دینی مدرسے حکومت کے نہیں تھے، بلکہ ہندوستانی بزرگوں کے قائم کئے ہوئے تھے۔

ان میں مکہ مکرمہ کا مدرسہ صولتیہ جو مولانا رحمت اللہ کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ کا قائم کیا ہوا تھا، ان کے خاندان کے لوگ ہی اس کے ذمہ دار تھے، اس وقت مولانا رحمت اللہ صاحب کے بھائی کے پوتے مولانا محمد سلیم صاحب کیرانوی مکی اس کے مہتمم و ناظم تھے اور اس کی مالی اعانت ہندوستان کے اہل خیر بھی کرتے تھے۔

دوسرا مدرسہ مدینہ منورہ میں مدرسہ علوم شرعیہ تھا جو حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے بھائی مولانا سید احمد فیض آبادی رحمۃ اللہ علیہ کا قائم کیا ہوا تھا جو اپنے

علمی و دینی فائدے کے لحاظ سے وہیں منتقل ہو گئے تھے اور بعد میں ان کے بیٹے مولانا محمود فیض آبادی اس کے ذمہ دار ہوئے۔ ان دونوں مدرسوں میں حجاز اور ملکی اور غیر ملکی طلبہ نے تعلیم حاصل کی اور ان کا فائدہ دنیا بھر میں عام ہوا۔ ان کا خاندان مدینہ منورہ میں استفادہ اور افادہ کے طور پر رہا۔ خود حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے وہاں عرصہ تک درس دیا اور بعد میں ہندوستان آنے پر دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث ہوئے۔ مولانا سید محمود کے بعد ان کے بیٹے مولانا سید حبیب احمد صاحب مرحوم اس کے ذمہ دار ہو گئے اور بعد میں حکومت کے قوانین کی وجہ سے وہ خالص دینی مدرسہ نہ رہا بلکہ حکومت کے مروجہ مدارس کی طرح ایک مدرسہ ہو گیا۔

سفر حجاز کی خاص بات ایک عظیم شرف کے طور پر پیش آئی کہ اس موقع پر نہ صرف حضرت مولانا اور ان کے قافلے کے ہمراہیوں نے یہ سعادت حاصل کی بلکہ بہت سے دوسرے احباب اور دوسرے ساتھیوں نے بھی داخلہ کا شرف حاصل کیا اور اطمینان سے جوف کعبہ میں نوافل پڑھیں، بعض شناساؤں نے جن کو اس کی اطلاع ہوئی شکایت کی کہ ہم رہ گئے، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی ''کاروانِ زندگی'' جلد اول میں تحریر فرماتے ہیں کہ ''میں محترم شیبی صاحب سے عرض کیا، انہوں نے دوبارہ حرم کی پولیس کے ذریعہ اس کا انتظام کیا اور خود بھی تشریف لائے، اس طرح پھر حضرت (رائے پوریؒ) کی معیت میں دوبارہ داخلی ہوئی، میری زندگی میں یہ عزوشرف کا سب سے مبارک دن تھا، جو نہ اس سے پہلے پیش آیا نہ اس کے بعد۔

اس واقعہ کی اہمیت وندرت یہ معلوم کر کے اور بڑھ جاتی ہے کہ اس کے بعد دو مرتبہ سرکاری طور پر اس کا انتظام کیا گیا کہ رابطہ کے ارکان (جن میں یہ ناچیز بھی تھا) بیت اللہ شریف کے اندر جائیں، لیکن حکومت کے پورے انتظام کے باوجود یہ شرف حاصل نہ ہو سکا، ایک مرتبہ ۱۹۶۴ء میں باقاعدہ رابطہ کے ارکان کو دعوت دی گئی اور ان کو بیت اللہ کے دروازے کے سامنے بٹھایا گیا اور زینہ لگایا گیا، اور پولیس حفاظت وانتظام کے لئے متعین

کئی گئی، لیکن زینہ لگاتے ہی ان لوگوں کا جو اس وقت مطاف یا حرم میں موجود تھے (یاد رہے کہ حج کا زمانہ قریب تھا) ایسا ہجوم ہوا کہ ایک یا دو کے علاوہ جو زینہ کے قریب تھے اور بہت چست اور مستعد ہم میں سے کوئی زینہ کے قریب بھی نہ پہنچ سکا اور یہ خیال ترک کرنا پڑا، دوسری مرتبہ خانہ کعبہ کے غسل کے موقع پر (جن کو شاہ فیصل مرحوم کو ارکان حکومت اور معززین کے ساتھ انجام دینا تھا) ہم لوگوں کو جو قریب ہی کے ہوٹل فندق شبرا میں مقیم تھے، دعوت نامہ پہنچا کہ آپ غسل کعبہ میں شریک ہو سکتے ہیں دور دور فوج اور پولیس کا پہرا تھا (اور ان کو معلوم تھا کہ ارکان رابطہ مدعو ہیں) میں اور رفیق محترم مولانا منظور نعمانی صاحبؒ چند رفقاء کے ساتھ بڑی خوشی اور فخر محسوس کرتے ہوئے حرم شریف میں داخل ہوئے معلوم ہوا کہ بیت اللہ شریف کا دروازہ بند ہو گیا ہے، اب جانے کا موقعہ نہیں۔

ان دونوں واقعات کو سامنے رکھتے ہوئے اگر یہ نتیجہ نکالا جائے کہ ہم لوگوں کو حضرت کے طفیل ہی میں یہ شرف حاصل ہوا تو بیجا نہ ہوگا۔ شاعر نے صحیح کہا ہے ؎

مور مسکین ہوسے داشت کہ در کعبہ رسید

دست بر پائے کبوتر زد و ناگاہ رسید(۱)

خالِ معظم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کو کلید بردارِ کعبۂ معظمہ جناب شیبی صاحب نے جنھیں مولانا سے بڑا تعلق خاطر ہو گیا تھا، کعبہ مقدسہ میں داخلے کا موقع عطا کیا اور پھر دوبارہ بھی یہ موقع ان کے ان احباب کی رعایت میں دیا جو پہلے دن اس شرف سے محروم رہے تھے۔ ہم لوگوں کو بھی یہ شرف حاصل ہوا، لیکن خالِ معظم اس کو اپنے شیخ حضرت مولانا عبد القادر صاحب رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ کی برکت قرار دیتے تھے جن کے ساتھ ہم سب نے یہ سعادت حاصل کی تھی۔

خال مخدوم و معظم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے سفر حجاز مقدس کی روداد دوسرے مقامات مقدسہ کی روداد کے ساتھ پیش کرنے میں احتیاط کی

(۱) ملاحظہ ہو ''کاروان زندگی جلد اول، مطبوعہ مکتبۂ اسلام لکھنؤ

البتہ سوانح حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ میں اس کو جگہ دی کہ ان کی سرپرستی میں یہ سفر ہوا تھا، چونکہ راقم الحروف کو اس مقدس سفر میں حجاز میں ساتھ رہنے کی سعادت حاصل ہوئی تھی اس لئے کتاب کے نئے ایڈیشن کے لئے ناشر کے تقاضہ پر کچھ مشاہدات وتاثرات پیش کرنے کا شرف حاصل کیا جو حرمین شریفین کے قیام میں محسوس کئے تھے، اللہ تعالی قبول فرمائے اور نافع بنائے۔ آمین

۲۱/۷/۱۴۱۵ھ (محمد رابع حسنی ندوی)

۲۱/۵/۲۰۱۴ء ناظمِ ندوۃ العلماء، لکھنؤ

حجاز مقدس سے مصر

حجاز سے روانگی:

شنبہ ۱۲ ربیع الاول ۱۳۵۰ھ مطابق ۲۰ جنوری ۱۹۵۱ء شنبہ کی شام کو غروب آفتاب کے بعد اطالوی جہاز (اونڈا) ہمیں لے کر جدّہ سے السویس (۱) روانہ ہوا۔ جدہ کی بندرگاہ پر الوداعی نظر ڈالتے ہوئے میں نے سرزمین مقدس سے بزبان حال عرض کیا: جزیرۃ العرب ہم تم سے جدا ہو رہے ہیں مگر اکتا کر نہیں اور نہ ہمیشہ کے لئے، میرا یہ سفر بھی دراصل تیرے ہی رشتہ سے، اور تیرے اس عزیز خاندان کے افراد سے ملاقات کی غرض سے ہے جو بحر احمر اور بحر روم کے ساحل پر پھیلا ہوا ہے، میں ان کو تیرا اسلام پہنچاؤں گا۔ اور اس بات کا جائزہ لوں گا کہ تجھ سے جدا ہونے کے بعد زمانہ کی دست برد نے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا اور دعوت و پیغام کی مقدس امانت کے ساتھ انھوں نے کیا برتاؤ کیا جسے یہ عزیز خاندان سارے عالم کے لئے لے کر نکلا تھا، انشاء اللہ میں پھر تیرے پاس آؤں گا اور تجھ سے ان عرب اسلامی ملکوں کی داستان بیان کروں گا اور اس دیار میں تیرے فرزندوں کی وفاشعاری، یا تیرے پیغام کی ناقدری و ناشناسی کی جو بھی تصویر دیکھوں گا بے کم و کاست تیرے سامنے پیش کروں گا۔ عربی مثل ہے کہ کارواں کا رہبر کبھی کارواں سے جھوٹ نہیں بولتا، اس لئے کہ ایسے موقع پر حقائق چھپانا، مبالغہ آمیزی یا ضرورت سے زائد خوش گمانی خود اسی کے بھائیوں اور دوستوں کے لئے باعث ہلاکت ہو سکتی ہے۔

---

(۱) مصر کی ایک بندرگاہ

سفر کے ساتھی

اس سفر میں میرے رفیق مولوی معین اللہ ندویؒ اور مولوی عبدالرشید اعظمی ندوی تھے، جو گذشتہ سال سے حجاز میں دعوت وتبلیغ کا کام کررہے تھے اور عربوں کو ان کا وہ پیغام یاد دلا رہے تھے جس کے لئے خدا نے ان کو منتخب کیا ہے، یہ عزیز حج کے زمانہ میں عالم اسلام اور عالم عربی سے آنے والے وفود سے انفرادی ملاقاتیں کرتے اور اس موضوع پر ان سے تبادلۂ خیال کرتے، پڑھے لکھے لوگوں کو ایسے عربی رسالے اور محاضرات پیش کرتے جو ان کے ذہن کو اصل مسئلہ کی طرف موڑ سکیں اور ان میں دینی شعور بیدار کرنے، اور موجودہ صورتِ حال کے نقص کو واضح کرنے میں مفید ومعاون ثابت ہوں۔

یہ دونوں عزیز ہندوستانی و پاکستانی احباب کے تبلیغی پروگراموں میں بھی شریک ہوتے، ان کے ساتھ دیہاتوں اور عرب قبائل کی آبادیوں میں گشت کرتے، جہاں تقریر اور نجی ملاقاتوں کے ذریعہ دینی جذبات پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی اور دینی جدّ وجہد کے لئے ہمت بلند کرنے اور ایثار وقربانی سے کام لینے کی دعوت دی جاتی۔ یہ دونوں اس سفر میں میرے ساتھ رہیں گے۔ اور میرے ہی ساتھ ہندوستان واپس آئیں گے۔(۱)

ہم نے شنبہ کی صبح کو محترم جلال حسین صاحب رکن (مجلس الشیوخ المصری)(۲) کو بذریعہ تار اپنے مصر روانہ ہونے کی اطلاع کردی تھی۔

چند دنوں پہلے مجھے ان کا عنایت نامہ ملا تھا جس میں انھوں نے میرے مصر کے عزم سفر پر اظہار مسرت کیا تھا اور خوش آمدید کہا تھا، اور اطلاع دی تھی کہ وہ لندن کے سفر پر روانہ ہورہے ہیں لیکن جلد واپس آجائیں گے، انھوں نے اپنے سکریٹری استاد حُسنی صقر کو

---

(۱) افسوس کے یہ دونوں دنیا میں نہیں رہے اول الذکر نے حضرت مولانا کے کاموں میں معاون بن کر ان کی حیات میں ہی اگست ۱۹۹۹ء میں وفات پائی اور ثانی الذکر نے ان کی وفات کے کچھ عرصہ بعد لکھنو میں مختصر علالت کے بعد وفات پائی (مترجم)

(۲) مصر میں دو ایوان قانون ساز ہیں۔ ایک مجلس عوام جیسے ہمارے یہاں لوک سبھا اور برطانیہ میں پارلیمنٹ دوسرے ایوان بالا جیسے ہندوستان میں راجیہ سبھا اور برطانیہ میں ہاؤس ہاف لارڈس اس دوسری مجلس کو مجلس الشیوخ کہتے ہیں۔

ہدایت کردی تھی کہ وہ میرے قیام کا نظم کریں۔

ہمیں رخصت کرنے کے لئے بندرگاہ تک عزیزان مولوی عبداللہ عباس ندوی (۱) مولوی سید رضوان علی (۲) مولوی سید محمد طاہر منصور پوری (۳) اور خواہر زادہ عزیز محمد رابع ندوی (۴) آئے تھے۔ جو ابھی حجاز میں دو سال قیام کریں گے۔ عربی زبان وادب میں دست گاہ حاصل کریں گے اور مدرسوں اور کالجوں کے طلباء میں کام کریں گے۔

عزیزی محمد رابع اس سفر میں برابر یادرہیں گے کہ وہ سفر وحضر کے ساتھی اور علمی کاموں میں میرے معاون تھے، خدا کرے ان تمام عزیزوں سے اس سرزمین پاک میں پھر بخیر وعافیت ملاقات ہو۔

یکشنبہ ۱۳/۳/۱۳۷۰ھ مطابق ۲۱/۱/۱۹۵۱ء

سنی نہ مصر وفلسطین میں وہ اذاں میں نے

رات اطمینان وسکون سے گذری رات بھر ہوا کے تیز جھونکوں کے باوجود میٹھی نیند آئی ،صبح کو بیدار ہوئے تو طبیعت ہلکی اور چست تھی ،ایک مصری دوست نے فجر کی اذان دی، صبح کے تڑکے میں یہ پہلی حق کی آواز تھی، جو جہاز وسمندر کی پرسکون وخاموش فضا میں گونجی، یہ وہی آواز تھی جس نے کبھی سارے عالم کو بیدار کردیا تھا بحر وبر میں زندگی کی روح پھونک دی تھی، لیکن اس وقت یہ آواز جہاز کے سب مسافروں کو بھی نہ جگا سکی جو بہت تھوڑے تھے، کتنی

---

(۱) مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندویؒ جو رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ میں ایک عہدہ پر فائز تھے، اور جامعہ (ام القری) مکہ مکرمہ میں استاذ کے فرائض انجام دیئے، ندوۃ العلماء کے معتمد تعلیم بھی رہے اور جدہ میں وفات پاکر مکہ معظمہ میں جنت المعلیٰ میں مدفون ہوئے۔ (مترجم)

(۲) ڈاکٹر سید رضوان علی ندوی جامعہ الامام محمد بن سعود، ریاض اور لیبیا میں عرصہ تک استاد رہے اب کراچی میں وفات پائی۔ (مترجم)

(۳) مولانا سید محمد طاہر منصور پوری مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی کے داماد ہوئے اور ندوۃ العلماء کے مددگار ناظم عرصہ تک رہے لکھنو میں وفات پائی اور تکیہ رائے بریلی میں مدفون ہوئے۔ (مترجم)

(۴) مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دارالعلوم ندوۃ العلما کے استاد ہوئے اور پھر ناظم ندوۃ العلماء، وصدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ، اطال اللہ بقاءہ (مترجم)

دلخراش حقیقت ہے کہ اذان آج اپنی قوت وطاقت اور دلوں پر اثر انداز ہونے کی صلاحیت اس حد تک کھو چکی ہے، اس کی روحانی قوت وتاثیر کو سب سے زیادہ جس چیز نے کمزور و بے اثر کر دیا ہے، وہ مغرب کی مادیت ہے، جس کو دین وعقیدہ اور عبادت ونماز کے سوا تمام چیزوں میں کامیابی کی منزلیں نظر آتی ہیں، یہ مادیت اس کی قائل نہیں کہ نماز سونے سے بہتر ہے، بہر کیف کچھ لوگ جنھیں اللہ نے توفیق دی بیدار ہوئے اور ہم نے جماعت کے ساتھ نماز پڑھی، نماز سے فارغ ہونے کے بعد میں جہاز میں ایسی جگہ بیٹھ گیا، جہاں سے سمندر کا نظارہ ہو سکے سمندر پر سکون تھا، ہوا تیز نہ تھی اور جہاز میں کوئی ایسی حرکت نہ تھی جو مسافروں کے لئے پریشانی کا سبب بنتی، میں استاذ احمد عبدالغفور عطار اور استاذ عبدالقدوس الانصاری ایڈیٹر المنہل کی باتوں سے بہت خائف تھا اس لئے کہ یہ دونوں حضرات اپنے مصر کے سفر میں بہت پریشانیوں سے دوچار ہوئے تھے، چکر کی وجہ سے کھانا پینا تو درکنار اپنی جگہ سے حرکت تک کرنا آسان نہ تھا، خود میں بھی حج کے دونوں سفروں میں ایسے ہی بلکہ اس سے زیادہ پریشانیوں سے دوچار ہوا تھا، تقریباً ہفتہ بھر کھانے پینے کی طرف طبیعت مائل نہ ہوئی، بس کچھ پھلوں اور چٹنی اچار وغیرہ ہی پر اکتفا کرنی پڑی۔ لیکن خدا کا شکر ہے اس سفر میں اللہ تعالیٰ نے بڑا فضل فرمایا۔ اس وقت تک کوئی بات نہیں پیش آئی اور اللہ کی ذات سے بہتری اور خیر وعافیت ہی کی امید ہے۔

ہمارا جہاز دراصل بار بردار جہاز ہے، جیسا کہ جدہ اور سوئیس کے درمیان عام طور پر ہوتا ہے یہ جہاز عموماً عمارتی لکڑیاں اور ناریل کولمبو اور بحر ہند کے جزیروں سے لاد کر لاتے ہیں جہاز نے جدہ سے تقریباً پچاس مسافر لئے جن میں اکثر مصری اور حجازی تھے، چھ ہندوستانی و پاکستانی وغیر ہندوستانی تھے اور تھوڑے سے سوڈانی اور تکرونی تھے۔

جہاز کے مسافر

جہاز میں شام کے ایک نوجوان سے تعارف ہوا، ان کے والد جدہ میں تجارت کرتے ہیں، یہ صاحب ہندوستان و پاکستان کا بھی سفر کر چکے ہیں، یہ پڑھے لکھے، سنجیدہ وشائستہ نوجوان تھے میں نے ان کو اپنے دو رسالے (بین الصورۃ والحقیقۃ) اور (بین الہدایۃ والجبایۃ) دیئے،

انھوں نے دونوں رسالوں کو پڑھا اور پسندیدگی کا اظہار کیا، یہ عرب ملکوں میں مادیت کے غلبہ اور عام اخلاقی انحطاط سے (جس سے یہ ممالک دوچار ہیں) بہت نالاں و بیزار تھے۔

جہاز میں ہم نے تمام نمازیں جماعت سے پڑھیں، جماعت میں شریک ہونے والے سب سے زیادہ مصری ہوتے تھے، جہاز کے اور مسافروں کی بہ نسبت یہ لوگ نماز کی پابندی کا زیادہ اہتمام کرتے تھے، ان میں اکثر ملازمت پیشہ، اور کاریگر تھے، جو حجاز میں کام کرتے تھے اور اپنے وطن جارہے ہیں۔ ہم کو دوسروں کے مقابلہ میں ان کے اندر نشاط، خوش اخلاقی اور دین وعلم کا احترام اور اس سے خاص تعلق نظر آیا، عصر کے وقت ہمیں موسم میں کچھ تبدیلی محسوس ہوئی، اور اندازہ ہوا کہ اب ہم نسبتاً سرد علاقہ سے قریب ہورہے ہیں اور کل شاید سردی سے ہمارا سابقہ پڑے گا۔

دوشنبہ ۱۴/۳/۱۳۷۰ھ مطابق ۲۲/۱/۱۹۵۱ء

الحمدللہ صبح کو صحت ونشاط کے ساتھ بیدار ہوئے اور جماعت کے ساتھ نماز فجر ادا کی، پھر جہاز کے بالائی حصّہ پر اس اطمینان کے ساتھ چہل قدمی کرتے، جیسے آدمی زمین پر چلتا ہے۔ جہاز پرسکون تھا، نہ کوئی حرکت تھی اور نہ کوئی پریشان کن ڈگمگاہٹ، تھوڑی دیر بعد ناشتہ اور چائے نوشی ہوئی۔

جہاز کا ماحول:

جہاز کی یہ چھوٹی سی آبادی جو مختلف ملکوں کے باشندوں پر مشتمل تھی، اس نے میری آنکھوں سے بہت سے پردے اٹھادیئے، عورتوں میں حد سے بڑھی ہوئی آزادی، ستر پوشی کا بہت کم خیال، شرعی پردہ یکسر نایاب، میں ان عورتوں کو ہر طرح اور ہر موضوع پر اس طرح بے تکلف باتیں کرتے دیکھ اور سن رہا تھا، جیسے وہ سفر میں نہیں درون خانہ ہیں۔ اکثر اوقات وہ مجھے بے پردہ نظر آئیں۔ مردوں کا حال یہ ہے کہ ہم نے ان کے اندر اسلامی تعارف وملاقات کا کوئی شوق اور احساس نہیں پایا، پڑوس کا خیال یا اجتماعی زندگی کا کوئی اثر ان میں محسوس نہیں ہوا۔ یہ

چیزیں اس بات کی غمازی کرتی ہیں کہ ہمارے اسلامی ملکوں میں اسلامی طرز زندگی بہت کمزور اور افسوس ناک حد تک زوال پذیر ہو چکا ہے اور اس کی جگہ ایسی طرز زندگی نے لے لی ہے، جس میں آدمی صرف اپنی ذات، اپنے پیٹ، اپنے آرام وراحت اور اپنے متعلقین ہی کی فکر کرتا ہے، کسی اور سے کوئی سروکار نہیں رکھتا، ہم اپنے ملک میں جب انتہائی قرب یا اشتراک باہمی اور رفاقت کی تعبیر کرنا چاہتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ''ہم لوگ ایک ہی کشتی کے سوار ہیں'' لیکن اس وقت جب کہ ہم حقیقتاً ایک ہی کشتی میں ہیں ایک دوسرے کے بہت قریب ہونے کے باوجود بہت دور اور بیگانہ ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم میں سے ہر شخص الگ الگ کشتی میں سوار ہے۔

ہمارے ایک رفیق سفر نے قریب میں بیٹھے ہوئے ایک صاحب کو میرے بعض رسالے پیش کئے انھوں نے رسالے پر نظر ڈالتے ہی صاحب رسالہ کو پہچان لیا اور بتایا کہ میں مکہ مکرمہ میں آپ سے واقف ہو چکا ہوں آپ کی بعض مجلسوں میں حاضری کا شرف حاصل ہے۔ اب وہ ہم سے مانوس ہو گئے اور اجنبیت کا حجاب جاتا رہا۔

دن بھر ہم براعظم افریقہ کے پہاڑوں کا نظارہ کرتے رہے۔ جب ہمارا جہاز سوئیس کی طرف ہوتا ہے تو ادھر بھی پہاڑوں کا لامتناہی سلسلہ نظر آتا ہے، شاید اسی جگہ کہیں کوہ طور بھی ہو۔ لیکن کوئی ایسا واقف اور باخبر نہ ملا جو متعین طور پر بتا سکتا کہ طور کس جگہ ہے، خشکی کے دونوں کناروں کا باہمی فاصلہ برابر کم ہوتا رہا، یہاں تک کہ دائیں بائیں دونوں سمت کے ساحل نظر آنے لگے۔ ہمارے پاس سے بہت سی چھوٹی چھوٹی کشتیاں اس طرح گزرنے لگیں جیسے ہم خشکی کے راستہ میں ہوں اور سواریاں اور موٹریں دائیں بائیں سے گزر رہی ہوں۔

مصر کا اشتیاق:

ہمیں اس کا اندازہ تھا کہ صبح کو سوئیس پہنچ جائیں گے، لیکن اس کے اظہار میں کوئی تکلف نہیں کہ بکثرت سفر کرنے کے باوجود اس سفر میں ناقابل بیان مسرت میرے دل میں ایسا کیف پیدا کر رہی تھی جس سے بچپن کی خوشی اور سب سے پہلے سفر کی یاد تازہ ہو گئی، مصر

میرے دل و دماغ پر اس عزیز وطن کی طرح چھا گیا تھا، جس سے انسان بچپن سے مانوس ہوتا ہے اس کا سبب یہ تھا کہ مصر کے بارے میں مَیں نے بچپن سے بہت کچھ سنا اور پڑھا تھا، اس کے حالات اور شخصیتوں سے واقف تھا، وہاں کی کتابیں، رسالے اور اخبارات پڑھتا تھا، اور اگر میں یہ کہوں تو شاید غلط نہ ہو کہ میں اپنی عربی تعلیم میں مصر کا مرہون منّت ہوں، اس میں ایسے صحافی اور ادیب ہیں جنھوں نے میرے ادب اور اسلوب پر اثر ڈالا ہے، اور ادب و انشاء میں میں نے عرصہ تک ان کی تقلید کی ہے۔ مصری پریس سے شائع ہونے والی کتابوں سے میرا ربط اسی طرح قائم ہے جیسے مصر سے باہر رہنے والے کسی عرب کا ہوسکتا ہے، میں اس کے ماہانہ رسالوں اور مشہور اخبارات کو فکر و رجحان کے اختلاف کے باوجود پڑھتا ہوں، مصری پریس سے دین و ادب، تاریخ و سیاست سے متعلق جو کچھ بھی شائع ہوتا ہے وہ میری نظر سے گزرتا ہے، میں اس کے ادیبوں، اہل قلم اور صحافیوں سے اور ان کے مقام و مرتبہ سے اتنا ہی واقف تھا جتنا اپنے ملک کے ادیبوں اور صحافیوں سے، اس کے بعد اگر مجھے مصر کا اشتیاق ہو اور اس کے قرب سے اس درجہ مسرت ہو تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔

۱۵/۴/۱۳۷۰ھ مطابق ۲۳/۱/۱۹۵۱ء

ساحل مصر پر

صبح کی روشنی کے ساتھ ہی سوئیس کا شہر آیا۔ ہم دونوں ہی کے منتظر و مشتاق تھے، جہاز لنگر انداز ہوا، اور ساحل سے بہت سے موٹر لانچ آ گئے، ان پر مصر کے سرکاری لباس میں کچھ لوگ سوار تھے، ان کے سروں پر سُرخ خوبصورت ترکی ٹوپیاں تھیں، جن سے ہم اپنے وطن ہی سے مانوس تھے، ترکی ٹوپی ہمارے ملک کے پڑھے لکھے شریف لوگوں کا خاص شعار اور ترکوں سے محبت کی علامت سمجھی جاتی رہی ہے، اُن سواروں میں سے کچھ لوگوں نے ہمیں سلام کیا اور خوش آمدید کہا۔ اس وقت ہم کو اسلامی و غیر اسلامی ملک کا کھلا ہوا فرق محسوس ہوا۔ جس کو وہ مسلمان محسوس نہیں کرتا، جس نے کسی اسلامی ملک میں آنکھ کھولی ہو،

اور جس کا نشو ونما وہیں ہوا ہو، جہاز کے قانونی مراحل طے ہو چکے تو ہم اپنا سامان لئے ہوئے خشکی پر اُتر آئے، ہمیں یہ بالکل اندازہ نہیں تھا کہ تحقیق و تفتیش اور اندراجات کے کن پریشان کُن مرحلوں سے گزرنا ہوگا جو عموماً باہر سے آنے والوں کے لئے ضروری ہوتے ہیں۔

لیکن اچانک ایک معقول آدمی از راہِ نوازش ہماری طرف بڑھا اور ایک رہبر کی حیثیت سے اپنی خدمات پیش کیں، ہم نے اس کی رضا کارانہ خدمت کو قبول کرلیا، وہ ہمیں پولیس آفس لے گیا، وہاں ہماری ملاقات ایک ایسے شخص سے ہوئی جن کی ظاہری شکل و صورت بتارہی تھی کہ وہ کوئی بڑے افسر ہیں، وہ میری طرف متوجہ ہوئے، میرے متعلق دریافت کیا، جب میں نے ان کو اپنا نام بتایا تو وہ بولے کہ جلال صاحب نے قاہرہ سے تار کیا ہے کہ میں سوئیس میں آپ کا استقبال کروں اور ضروری سہولت پہنچاؤں، چنانچہ انھوں نے درمیان میں پڑ کر، جلد اور آسانی کے ساتھ سارے مراحل طے کرادیئے، اس رہبر نے سامان اٹھانے اور قاہرہ میں شارع معروف پر واقع جلال صاحب کے دفتر پہونچنے کے لئے موٹر طے کرنے میں ہماری مدد کی، رخصت ہوتے وقت اس خدمت کے صلے میں میں نے ایک مناسب رقم ان کو پیش کی اور موٹر پر سوار ہوئے۔

سوئیس سے قاہرہ کو روانگی:

ہمارا راستہ خشک چٹیل، بے آب و گیاہ اور غیر آباد و صحرائی علاقہ سے ہو کر گذرتا تھا، کچھ مسافت طے کرنے کے بعد ڈرائیور نے موٹر روکتے ہوئے کہا، یہاں ہم ظہر کی نماز پڑھیں گے، یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس مصری ڈرائیور کو میں نے حسن اخلاق، شیریں زبانی اور دینداری میں ہندوستان کے ڈرائیوروں سے بہت مختلف پایا جو بدکلامی اور بدمعاملگی میں ضرب المثل ہیں اور ان میں دینی فرائض اور نماز کا اہتمام بہت کم بلکہ تقریباً نایاب ہے، اس مصری ڈرائیور میں جو خصوصیات مجھے نظر آئیں وہ مصر کے سبھی ڈرائیوروں میں پائی جاتی ہیں۔ یا یہ اسی کی خصوصیت ہے صحیح اندازہ تو مزید تجربوں سے ہوگا، نماز سے فارغ ہو کر موٹر پر سوار ہوگئے۔

تھوڑی دیر بعد ہماری موٹر مصر کی فوجی چھاؤنی کے پاس سے گزر رہی تھی، یہ پہلی

چھاؤنی تھی جسے ایک اسلامی ملک میں دیکھنے کا اتفاق ہوا، چھاؤنی دیکھ کر بڑی خوشی ومسرّت ہوئی، اور زبان پر بیساختہ دعا کے الفاظ جاری ہوگئے، جب ہم مصر الجدیدہ (۱) میں داخل ہوئے تو ایسا محسوس ہوا کہ ہم یورپ کے کسی بڑے شہر میں ہیں، کہیں کہیں مشرقی تہذیب نظر آتی ہے۔ لیکن مغربیت کی آمیزش کے ساتھ، ہم قاہرہ کے اندرونی حصّہ کی طرف بڑھتے رہے جو دور تک پھیلا ہوا ہے اور بیس لاکھ سے زائد آبادی پر مشتمل ہے۔ ہم جلال صاحب کے دفتر ''شارع معروف'' پہنچے اور دفتر میں داخل ہوئے تو ان کے سکریٹری استاذ حسنی صقر نے ہمارا استقبال کیا اور بتایا کہ استاد جلال حسین نے سوئیس کے حاکم ضلع اور مدرسۃ السویس کے پرنسپل کو ہمارے استقبال کرنے اور مدد پہونچانے کے لئے تار کردیا تھا، لیکن استاد عبدہ کے علاوہ ہمیں کوئی اور نہ ملا، استاد حسنی صقر نے جلال بے صاحب کو فون کیا اور ہمارے پہونچنے کی اطلاع کی۔ انھوں نے فون پر مجھ سے بات کی اور خوش آمدید کہا اور اچانک اپنے کسی عزیز کے حادثہ انتقال کے سبب سویس نہ پہونچنے کی معذرت کی، میں نے ان کے منصب ومرتبہ اور سن وسال کے مناسب جواب اور ان کے اس اہتمام وگرمجوشی اور خوش اخلاقی کا شکریہ ادا کیا، انھوں نے فرمایا ہم ابھی تھوڑی دیر بعد آرہے ہیں، استاد حسنی صقر نے بتایا کہ انھوں نے جمعیۃ مکارم اخلاق کی عمارت میں ہمارے لئے دو کمرے لے رکھے ہیں اور یہ بتایا کہ جمعیۃ کے سکریٹری شیخ احمد عثمان ابھی آتے ہیں اور آپ سے ملاقات کرتے ہیں۔

تھوڑی دیر بعد شیخ احمد عثمان (۲) تشریف لائے، بڑی گرمجوشی سے سلام کیا اور ہم بیٹھ کر باتیں کرنے لگے، ایک دوسرے سے تعارف شروع ہوا، اتنے میں جلال بک صاحب نے اپنے سکریٹری کو فون کیا اور کسی وقتی مشغولیت کے سبب حاضر نہ ہوسکنے پر معذرت کی اور ان کو ہدایت کی کہ آج رات محلّہ سیدنا الحسین (۳) کے کسی ہوٹل میں ہمارے قیام کا انتظام کردیں،

---

(۱) یہ قاہرہ کا ایک ایسا ہی نیا اور فیشن ایبل حصہ ہے جیسے ''نئی دہلی'' دہلی کا۔

(۲) مصریوں میں بہت سے لوگوں کے نام عثمان ہوتے ہیں۔ اس کی حقیقت کا علم نہیں

(۳) وہ جگہ جہاں کی ایک مسجد کے گوشہ میں کہا جاتا ہے کہ حضرت امام حسین کا سر دفن ہے، تاریخی اعتبار سے اس کی کوئی اصل نہیں۔

لیکن ہوٹل کے منیجر نے پردیسیوں کو اس وجہ سے ٹھہرانے سے انکار کردیا کہ پاسپورٹ اور ویزا کے مسائل پیدا ہوتے ہیں اور زحمتیں پیش آتی ہیں۔ یہاں سے ہم (العتبة الخضراء) کے فندق مصر میں گئے یہاں بھی وہی بات پیش آئی جو اس سے پہلے پیش آچکی تھی، اس وقت مجھے پردیسی ہونے کا احساس ہوا، اس نے میرے اس خیال کو اور بھی پختہ کردیا کہ آمد ورفت کے ذرائع نے رکاوٹوں میں دشواریوں کو دور نہیں کیا بلکہ ان کو اور بڑھا دیا اور سفر کو پہلے سے زیادہ مشکل کردیا ہے اس کا اظہار کرنے میں کوئی حرج نہیں کہ مجھے ہوٹل والوں کی کج خلقی اور ضرورت سے زیادہ قانونی گفتگو سے بڑا تکدر ہوا اور ایک قسم کی ذلت واہانت محسوس ہوئی، میں نے شیخ عثمان صاحب سے کہا کہ اب ہوٹل میں ہم کسی قیمت پر نہ ٹھہریں گے کہیں بھی قیام کرلیں گے۔

لیکن شیخ اس پر تیار نہ ہوئے اور ہمیں عتبہ ہی کے ایک ہوٹل ''فندق البرلمان'' لے گئے یہاں معمولی گفتگو اور اطمینان حاصل کرلینے کے بعد منیجر نے ہم کو ہوٹل میں ٹھہرنے کی اجازت دے دی، چنانچہ ہم پہلی منزل کے ایک کمرے میں ٹھہرے اور تاخیر سے مغرب کی نماز ادا کی، پھر بیٹھ کر باتیں کرنے لگے، انھوں نے اختصار کے ساتھ '' الجماعة الشرعية '' کا تعارف کرایا میں نے ان سے کہا کہ میں '' الجماعة الشرعية '' کے بعض ان حضرات کو جانتا ہوں جن سے میری پہلے اور آخری حج میں ملاقات ہوئی تھی، جب میں نے ان سے اپنے دوست الحاج علی الشریف کا ذکر کیا تو شیخ احمد عثمان نے فرمایا کہ میں ابھی ان کو آپ کی آمد کی اطلاع کرتا ہوں، وہ فوراً آئیں گے چنانچہ ایسا ہی ہوا، ہم بیٹھے باتیں کررہے تھے کہ تھوڑی دیر میں علی شریف صاحب آگئے تین سال کی طویل جدائی کے بعد اس ملاقات سے بہت خوشی ہوئی۔ مدینہ منوّرہ میں کس طرح ہم لوگوں کا اوّل اوّل تعارف ہوا تھا، نیز وہاں کی ملاقاتوں اور جلسوں کا ذکر چھڑ گیا جن میں ہم شریک ہوتے اور تقریریں کرتے تھے، پھر وہ یہ کہہ کر تشریف لے گئے کہ ظہر بعد ملاقات ہوگی۔

چہارشنبہ ۱۶/۴/۱۳۷۰ھ مطابق ۲۴/۱/۱۹۵۱ء

چند اہم ملاقاتیں اور مولانا عبداللہ بلیاوی صاحب کی آمد

ناشتہ سے فارغ ہوکر ہم جلال صاحب کے دفتر گئے ان کے سکریٹری نے بتایا کہ جلال بک صاحب ابھی آئیں گے اور تھوڑی دیر بعد جلال صاحب تشریف لائے اور بڑی گرمجوشی اور تپاک سے ملے، وہ شام کو دفتر آئے تو انھیں ہمارا خط ملا جو تاخیر سے پہونچا تھا، شیخ عبداللطیف سرحان ازہری کا بھی خط ملا جو مکہ مکرّمہ میں حکومت کی دعوت پر گئے ہوئے ہیں۔ اسی طرح ہم نے ان کے سکریٹری کو جو تقریریں ان کو پہنچانے کے لئے دی تھیں وہ بھی انھیں ملیں، جلال صاحب نے فرمایا کہ ہم آپ کے بارے میں برابر معلوم کرتے رہے، ہوٹل والوں نے آپ کے ساتھ جو سلوک کیا اس سے مجھے بڑی تکلیف ہوئی ان لوگوں کا یہ رویہ مجھے بہت ناگوار گزرا، مجھے بتایا گیا کہ آج دوپہر کا کھانا الحاج علی الشریف کے یہاں کھائیں گے۔ کل انشاء اللہ آپ وہ جگہ ملاحظہ فرمائیں گے جو ہم نے آپ کے لئے منتخب کی ہے اگر وہ آپ کو پسند ہے اور وہاں ٹھہرنا مناسب سمجھتے ہیں تو بہت اچھا ورنہ دوسری جگہ تلاش کریں گے ہم نے کہا یہی ٹھیک ہے اور ان سے اجازت چاہی، ہم نے ان کو ہندوستانی نوٹ دیئے کہ وہ ان کو مصری سکّے میں تبدیل کرادیں، اس کے بعد ہم لوگ الحاج علی شریف کے یہاں ''شُبرا'' گئے وہاں ظہر کی نماز پڑھی اور اس جگہ گئے جہاں وہ نئے مکان کی تعمیر کی نگرانی میں مشغول تھے ان کے ساتھ دوپہر کا کھانا کھایا اور عصر کی نماز پڑھی اور واپس آگئے قیام گاہ پر چند ملاقاتی کارڈ ملے اور معلوم ہوا کہ مولانا عبید اللہ بلیاوی جو حجاز میں دعوت وتبلیغ کے نگراں ہیں اور دو ہفتہ قبل اپنے ساتھیوں کے ہمراہ سوڈان کے سفر سے واپس آئے ہیں وہ تین مرتبہ آئے اور ہم سے ملاقات نہ ہوئی ان کے ساتھ سندھ کے ڈائرکٹر آف ایجوکیشن (ناظم تعلیمات) ہمارے دوست سید علی اکبر بھی تھے، وہ ایک پرچہ چھوڑ گئے کہ آج وہ ازہر کے ہندوستانیوں کے ہاسٹل ''رواق الھنود'' میں دوستوں کو مجھ سے ملاقات وتعارف کے لئے جمع کریں گے ہمارا وہاں پہونچنا ضروری ہے

وہ ہمارے پاس عشاء کے وقت پھر آئیں گے ہم نے ان کا انتظار کیا مولانا عبید اللہ صاحب اور سید علی اکبر صاحب آئے۔

ہندوستانی دارالاقامہ میں ایک جلسہ اور تقریر

یہاں سے ہم ازہر گئے جہاں طلباء میں ہمیں تقریر کرنی تھی، ہم تو یہ سمجھ رہے تھے کہ ہندو پاک کے تھوڑے سے طلباء ہوں گے، لیکن وہاں پہونچے تو ہال سرخ ترکی ٹوپیوں، اور سفید عماموں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا، میں ایسے سنجیدہ، وجیہ، پروقار نوجوانوں کے سامنے تھا، جنھیں دیکھ کر مقرّر کی طبیعت میں جولانی، نشاط اور تقریر کا داعیہ خود بخود پیدا ہونے لگتا ہے، جب یہ معلوم ہوا کہ حاضرین کی ایک بڑی تعداد ترک نوجوانوں کی ہے تو میری خوشی و مسرّت میں مزید اضافہ ہوگیا، اتنی ہی تعداد فلسطین وشام کے طلباء کی تھی۔

شام کے ایک نوجوان محمد توفیق کنجی جو سکریٹری تھے، اسٹیج پر آئے اور جلسوں کی رسم کے مطابق میرے لئے استقبالیہ کلمات کہے۔ پھر شیخ لقمان ندوی ازہری جو ہندوستانی دارالاقامہ کے نگراں ہیں اٹھے اور مجھ سے تقریر کی فرمائش کی۔ میں نے برجستہ و بے تکلف جو اس وقت ذہن میں آیا وہاں عرض کیا مجھے یہ اندازہ نہ تھا کہ ایک ایسی مجلس میں تقریر کرنی ہوگی جس میں ترکی، شامی، مصری، فلسطینی اور دیگر ملکوں کے طلبہ ہوں گے۔

میری تقریر کا خلاصہ ولبّ لباب

''اسلام ایک ابدی پیغام حیات ہے جو قدیم وجدید کی بحث سے ماوراء ہے، قدیم وجدید کا فرق تو انسان کے خودساختہ نظاموں، تہذیبوں اور ادب وزبان میں ہوتا ہے جو قوم وجماعت بھی اپنے کو اس پیغام سے منسلک کردے گی اور اپنا رشتۂ حیات اس سے جوڑ دے گی، اس کو بقاء ودوام حاصل ہوگا، وہ زمان ومکان کی قید وبند سے آزاد ہوگی جو انقلاب وتبدیلی کا تابع ہے اور مادّی قوتوں وطاقتوں، رکاوٹوں اور رقابتوں پر غالب ہوجائے گی یہی صحابہ کرامؓ کی

کامیابی و بڑائی کا راز تھا، انھوں نے اپنی قوت اور خداداد صلاحیت کا اندازہ لگالیا اور اس کا جائزہ لینے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ وہ روم و فارس جیسی ترقی یافتہ مادّی وفوجی طاقت رکھنے والی حکومتوں کے ہم پلّہ نہیں ہوسکتے، انھوں نے اس ابدی پیغام سے اپنے کو منسلک کردیا جس کو نبی ﷺ لے کر آئے تھے، جس کے ظہور وغلبہ اور سارے عالم میں پھیلنے کا خدائی فیصلہ ہو چکا تھا، صحابہ کرامؓ نے اپنی شخصیت، اپنے وجود اور اپنے جان و مال کو ہر طرح سے اس کے لئے وقف کردیا، اپنے مستقبل اور رشتۂ حیات کو اس میں اس طرح فنا کردیا کہ وہ اسلام کا جزلاینفک بن گئے کہ نہ ان کے بغیر اسلام پھل پھول سکتا تھا، نہ وہ اسلام سے الگ و بے نیاز ہوکر زندہ رہ سکتے تھے، جب صحابہ کرامؓ نے اس ہمت وعزیمت کا مظاہرہ کیا اور اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو صلاح وتقویٰ کی میزان میں تول لیا تب وہ نصرت وتائید خداوندی کے مستحق ہوئے۔ اور اللہ تعالیٰ نے ان کے ظہور وغلبہ اور روئے زمین پر قدم جمانے کا فیصلہ فرمایا۔

عزیز طلبائے ازہر! تم بھی، جب اپنے کو پیغام اسلام کے لئے خالص کرلوگے، اپنی زندگی اور اپنے مستقبل کو اسلام پر ثابت قدمی اور اس کی دعوت وتبلیغ کے ساتھ جوڑ دوگے اپنے وجود کو اسلام کی شخصیت میں ضم اور تحلیل کردوگے، اسلام تم سے چلے گا، اور تم اسلام کو لے کر چلوگے، تو یقیناً تم کامیاب رہوگے، حاوی وغالب ہوگے، زمانہ تمہارے سامنے جھکے گا اور گھٹنے ٹیکے گا اور تمہارا تابع ہوجائے گا۔"

جب میں اپنی تقریر ختم کرچکا تو استاذ محمد توفیق کنجی دمشقی نے جو ازہر شریف میں اسلامک اسٹڈیز کے سکریٹری ہیں اور " کلیة الشریعة " میں پڑھتے ہیں، شکریہ ادا کیا اور (جمعیة الشبان المسلمین) کے ہال میں تقریر کرنے کی درخواست کی جہاں میرے مخاطب جامع ازہر کے وہ طلباء ہوں گے جو مختلف اسلامی ملکوں سے تعلق رکھتے تھے، میں نے ان کی پیشکش منظور کرلی اور ان سے کہا کہ میں اس کے لئے تیار ہوں اس جیسی مجلس میں بات کرنے سے مجھے خوشی ہوگی اور ان سے خواہش ظاہر کی کہ وہ طلباء سے تعارف کرائیں، کچھ طلباء سے پہلے انھوں نے پوچھا پھر کہا کہ طلباء خود تعارف کرائیں، ترکی، مصری، فلسطینی اور شامی طلباء سے

تعارف ہوگیا تو میں نے ترکی طلباء سے خصوصی ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ میں نے کہا، اپنی قیام گاہ پر بھی ان سے ملنے میں مجھے خوشی ہوگی اور اگر وہ ہم کو اپنی قیام گاہوں پر بلائیں تب بھی بھی مجھے کوئی عذر نہیں، اس کے بعد جلسہ ختم ہوگیا، اور ہم برلمان ہوٹل واپس آگئے۔

جمعرات ۱۷/۴/۱۳۷۰ھ مطابق ۲۵/۱/۱۹۵۱ء

مولانا عبیداللہ بلیاوی (۱)، سید علی اکبر (۲) اور شیخ میری قیام گاہ پر آئے، کچھ ہی دیر بعد استاذ حُسنی صقر ہم کو اس جگہ لے جانے کے لئے آگئے، جس کو جلال صاحب نے ہمارے قیام کے لئے منتخب کیا تھا، میں ان حضرات کے ساتھ گیا، جگہ پسند آئی اور یہ طے ہوگیا کہ آج یا کل صبح وہاں منتقل ہوجائیں۔

ڈاکٹر احمد امین سے ملاقات:

راستہ میں ہم نے احمد امین صاحب (۳) کو فون کیا، مکّہ مکرّمہ سے ان کو اپنے مصر کے ارادہ سفر کی اطلاع کرچکا تھا۔ ہم نے ٹیلیفون پر پوچھا کہ آپ سے کب اور کہاں ملاقات ہوسکتی ہے، انھوں نے بتایا کہ بارہ بجے تک جیزۃ (الادارۃ الثقافیۃ) کے دفتر میں ملوں گا، میں نے انھیں اب تک نہیں دیکھا تھا لیکن ان کی کتابوں کا مطالعہ خوب کیا تھا اور ان کے علمی طرز تحریر، واقعات کی تحلیل و تجزیہ، تاریخ پر اچھی نظر اور متوازن فکر سے متاثر تھا، اسی وجہ سے میں

---

(۱) تبلیغی جماعت کی مشہور شخصیت رکن ورہنما مقیم مرکز نظام الدین، جو ہمارے مصر میں پہونچنے سے چند ہی دن پہلے سوڈان میں تبلیغی کام کرتے ہوئے قاہرہ پہونچے تھے اور ہمارے منتظر تھے۔

(۲) سید علی اکبر صاحب سندھ پاکستان کی وزارت تعلیمات کے اہم عہدہ پر تھے اور اس زمانہ میں مشرق وسطی کی سیاحت پر نکلے ہوئے تھے۔

(۳) مصر کے مشہور ادیب ومورخ اور صاحب طرز انشاء پرداز اور مقبول مصنف جن کا سلسلہ فجر الاسلام اور ضحیٰ الاسلام علمی وادبی حلقوں میں بڑی مقبولیت حاصل کرچکا تھا، وہ اس وقت کلیۃ الآداب (جامعہ مصریہ) پرنسپل شپ (عمادہ سے) ریٹائر ہوکر عرب لیگ کے الادارہ الثقافیہ کے انچارج اور لجنۃ التالیف والترجمہ والنشر قاہرہ کے صدر تھے، اسی ادارہ نے "ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین" پہلی مرتبہ شائع کی تھی۔

نے ان سے اپنی کتاب (ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین) پر مقدمہ لکھنے کی فرمائش کی تھی، مجھے یہ خیال تھا کہ مصر کے صاحب قلم مصنفین اور ادیبوں میں وہ اس کتاب کا مقدمہ لکھنے کے لئے زیادہ موزوں ہیں۔ کتاب کے موضوع، اور ان کے فکر وذوق اور نظریہ میں بھی ہم آہنگی ہے۔ میرا خیال تھا کہ وہ مقدمہ شوق ورغبت اور طبیعت کے تقاضہ کے ساتھ لکھیں گے، لیکن شاید ایسا نہیں ہوسکا میرے اکثر دوستوں نے اس مقدمہ کو پسند نہیں کیا، ان کا خیال ہے کہ مقدمہ کتاب کی صحیح تصویر کشی اور حقیقت نمائی سے خالی ہے بلکہ اس مقدمہ نے کتاب کی بڑی حق تلفی کی ہے اور اس کے مقام کو بہت گھٹا دیا ہے، مگر اس میں احمد امین صاحب کی کوئی خطا نہیں، خطا اس کی ہے جو بڑی امیدیں قائم کرلیتا ہے، ادیب وصحافی کی طبیعت ہمہ وقت یکساں نہیں ہوتی اور نہ ہر موضوع پر چلتی ہے، پھر شکایت ہی کیا؟

کتاب کے ساتھ مقدمہ کے اس ''حسن سلوک'' کے بعد بھی، احمد امین کے بارے میں میرے جو خیالات تھے وہی رہے اور میں اپنی اس رائے پر قائم رہا کہ وہ اپنے وسیع مطالعہ، علمی اسلوب، کثرت مواد میں اپنے طبقہ میں ممتاز ہیں۔

ہمارے قدم ان کے دفتر کے طرف بڑھ رہے تھے اور دل میں یہ خیالات گردش کررہے تھے کہ ابھی تھوڑی دیر میں اس شخص سے ملاقات اور گفتگو ہوگی، جس کی تصنیفات، مضامین اور علمی مضامین کے ذریعہ میں اس سے اچھی طرح واقف ہوں، اس کے فکر وادب اور علمی شخصیت کو دیکھ چکا ہوں، آیا وہ جسمانی طور پر بھی بھاری بھرکم ہوں گے۔ اس کے برعکس ایسا اکثر ہوتا ہے کہ تخیل حقیقت سے زیادہ حسین ہوتا ہے، ایسا بھی ہوتا ہے کہ مصنف و ادیب اپنے مضامین وتحریروں میں اپنی مجلسی گفتگو سے کہیں زیادہ پرکشش وجاذب نظر آتا ہے، ان دونوں میں جو بھی صورت پیش آئے گی اس سے مجھے حیرت نہ ہوگی اس لئے کہ دونوں طرح کے تجربوں سے میرا سابقہ پڑ چکا ہے۔

اپنے انھیں خیالات وتصورات کے ساتھ میں (الادارة الثقافية) کے دفتر میں داخل ہوا اور ڈاکٹر احمد امین صاحب کو پوچھا۔ دفتر والوں نے باغ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے

بتایا کہ وہ ہیں۔ نظر پھیری تو دیکھتے ہیں کہ ایک معمر، دراز قامت اور دُبلا پتلا شخص ہماری طرف بڑھ رہا ہے اور ہمیں خوش آمدید کہہ رہا ہے، جسم بیماری سے متاثر، کثرت تالیف ومطالعہ کی محنت سے نڈھال اور قوت بینائی کمزور ہو چکی ہے، ڈاکٹر کے مشورہ سے دانت بھی نکلوا چکے ہیں، جس سے بات کرنے میں تکلف ہوتا ہے، چہرہ مہرہ اور ظاہری شکل وصورت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دُبلا پن بیماری وپیرانہ سالی کے سبب ہے، جوانی میں تنومند بھاری بھرکم حسین وخوبرو تھے، ڈاکٹر احمد امین صاحب مجھ سے ملے، خوش آمدید کہا اور ایک دوسرے کا تعارف ہوا، ہر ایک نے ایک دوسرے سے خیر وعافیت معلوم کی، باتوں باتوں میں میری کتاب (ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین) کا ذکر چھڑ گیا، میں نے کہا بعض لوگوں کا خیال ہے کہ میں نے آپ کو مقدمہ لکھنے کی زحمت بیجا دی، کہنے لگے نہیں نہیں، میں نے تو کتاب سے بڑا فائدہ اٹھایا، بہت سے مراجع کا علم ہوا، میں نے بغور اس کو پڑھا۔

ڈاکٹر احمد امین کے بعض منفرد خیالات

پھر وہ اپنی نئی تصنیف ''اسلام کا ماضی وحال'' ''الاسلام ماضیه وحاضره'' کا ذکر کرنے لگے جو ابھی شائع نہیں ہوئی، کہنے لگے اس کتاب میں میں نے بعض ایسے خیالات اور نظریات پیش کئے ہیں جو بہت سے لوگوں کو گراں گزریں گے، مثلاً یہ کہ اسلام عہد رسالت کے علاوہ کبھی اور پورے طور پر نہیں نافذ ہوا، حضرت عمر کا طرز حکومت عربی تھا نہ کہ اسلامی، پھر مثالیں ودلائل ذکر کرنے لگے۔

ایک بات یہ بھی لکھی ہے کہ بہت سے دینی مسائل اور مشکلات پیش آتے رہتے ہیں جو اجتہاد اور اظہار رائے کے متقاضی ہوتے ہیں، لہٰذا اجتہاد کا دروازہ کھلا رہنا چاہئے، مثلاً موجودہ دور میں زندگی بہت مشغول ہے، لہٰذا سخت مشغولیت والے مقیم کو حالت قیام میں بھی جمع بین الصلاتین کی اجازت ہونی چاہئے، اسی طرح کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کو موسم گرما میں فدیہ دے کر روزہ چھوڑنے کی اجازت ہونی چاہئے، اسی طرح فقہ کے بعض ایسے اصول ہیں جن میں کبھی غریب پر زکوٰۃ فرض ہو جاتی ہے اور امیر سے ساقط ہو جاتی ہے، لہٰذا اس

پر نظر ثانی ہونی چاہئے۔ اسی طرح حج میں کچھ لوگوں کو قربانی کے بجائے کھجور صدقہ کرنے کا مشورہ دینا چاہئے اس لئے کہ قربانی کا گوشت ضائع ہوجاتا ہے، سڑ کر فضا کو متعفن کرتا ہے جس سے بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔ اصول دین کے خلاف ان خیالات پر میں نے اپنے اختلاف و ناگواری کا اظہار کیا مگر چونکہ یہ پہلی ملاقات تھی، اس لئے بحث کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

ڈاکٹر احمد امین کی نظر میں عربی طرز فکر اور مغربی طرز فکر کا فرق

پھر وہ عربی طرز فکر اور مغربی طرز فکر پر گفتگو کرنے لگے، کہنے لگے عربی طرز فکر اپنی تحلیل و تجزیہ میں ممتاز ہے اسی لئے اس میں احکام و مثالیں نمایاں ہیں، اس نے اختصار سے کام لیا ہے، اس کا اہتمام کیا ہے، اسی لئے قصّوں میں اس کی طبیعت خوب چلتی ہے، پھر مغربی طرز فکر پر گفتگو کی اور اس کی گہرائی کی تعریف کی، انھوں نے کہا کہ وہ تصوف سے زیادہ قریب ہے، محمد اسد صاحب کی کتاب (الاسلام علی مفترق الطرق) پر پسندیدگی کا اظہار کیا، یہ ایک علمی مجلس تھی جس میں علم و دین دونوں موضوع رہے۔ دوسرے دن دوپہر کے کھانے کی دعوت دی، میں نے کہا کسی اور دن کے لئے متعین کریں گے۔(۱)

ماذا خسر العالم کے پانچ نسخے مجھے ہدیہ کئے۔ میں نے کہا کہ آپ کی کتاب "حیاتی" کے مطالعہ کا اشتیاق تھا، وہ مجھے نہ ہندوستان میں ملی نہ حجاز میں۔ چنانچہ اس کتاب کا ایک نسخہ منگا کر مجھے ہدیہ کیا اور اس پر لکھا (هدية إلى الأخ الاستاذ أبي الحسن تحية معرفة) احمد امین

استاذ ابوالحسن کو ہدیہ سلام و تعارف کے طور پر۔ احمد امین ۲۵/۱/۱۹۵۱ء

پھر میں نے ان سے اجازت چاہی، اس ملاقات میں میرے ساتھ شیخ احمد عثمان اور مولوی عبدالرشید ندوی تھے، ہاں اور احمد امین صاحب نے ہندوستان و پاکستان سے آئے ہوئے

---

(۱) محمد اسد صاحب سابق لیو پولڈ ویس یہودی مفکر تھے اسلام لائے اور اسلام کی خوب خدمت کی آخر میں اسپین میں مقیم ہوئے تھے ۱۹۹۲ء میں وفات پائی (مترجم)

میرے وہ خطوط دیئے جوان کے پتہ پر آئے تھے، ان خطوط میں ایک پُر محبت وادیبانہ خط مولانا مسعود عالم ندوی کا تھا جو انھوں نے اپنے ادبی انداز اور برادرانہ اخلاص کے ساتھ لکھا تھا، ان کا یہ معمول ہے کہ جب مجھ کو خط لکھتے ہیں تو تکلف وتصنع سے کام نہیں لیتے، آمد ہی آمد ہوتی، لہٰذا ان کا خط ادبیت، گہری مخلصانہ محبت کا ایک دل آویز مرقع ہوتا ہے، اگر ہم دونوں کی باہمی مراسلت کا مجموعہ کوئی تیار کردے تو اخوان الصفا کا ایک نیا ایڈیشن تیار ہوجائے، جو فلسفیانہ مباحث اور حقائق اشیاء کے بیان کرنے کے الجھاؤ سے پاک ہوگا، رات میں ہمارے ایک مخلص دوست محمود قندیل آگئے جن کا الجمعیۃ الشرعیۃ سے تعلق ہے۔ عباسیہ میں ان کا ورک شاپ ہے، مکہ مکرمہ میں ہماری ان کی ملاقات ہوچکی تھی، دونوں ایک دوسرے سے مانوس ومتعارف تھے۔ انھوں نے ہمارے ہوٹل میں ٹھہرنے کا شکوہ کیا کہ ہمارے قاہرہ میں ہوتے ہوئے آپ نے ایسا کیوں کیا؟ ہم نے اس بات پر ان سے معذرت کی، وہ دیر تک بیٹھے، یہ طے ہوا کہ ہم لوگ ''الجمعیۃ الشرعیہ''(۱) جمعیۃ کی مرکزی مسجد میں جمعہ پڑھیں وہاں ملاقات ہوگی۔

۱۸/۴/۱۳۷۰ھ، ۲۶/۱/۱۹۵۱ء

الجمعیۃ الشرعیۃ کی مسجد میں میری تقریر

گذشتہ رات الحاج علی الشریف نے ٹیلیفون پر بتایا تھا کہ وہ ساڑھے دس بجے آئیں گے اور جمعیۃ کی مسجد لے جائیں گے، ہم نے ان کا اور شیخ احمد عثمان صاحب کا انتظار کیا اور ان دونوں کی آمد کے بعد مسجد گئے۔ شیخ احمد عثمان نے خطبہ دیا اور نماز پڑھائی، خطبہ موقع ومحل کے لحاظ سے بہت مناسب تھا، نماز کے بعد حاجی علی شریف صاحب نے اعلان کیا کہ ہندوستان کے ایک معزز مہمان عالم تقریر کریں گے۔ میں منبر پر چڑھا اور جو کچھ اللہ نے کہلوایا کہا، میں نے اپنی تقریر میں اسلام اور مسلمانوں کی اس کسمپرسی کا ذکر کیا جو اس وقت ہر ملک میں پائی جاتی ہے اور اس جماعت کو استقامت اور وقت کے دھارے کے ساتھ نہ بہنے پر مبارک باد

(۱) اس نام کی ایک انجمن تھی جس کے بانی بڑے عالم حقانی بزرگ شیخ محمود خطاب سبکی تھے۔

دی۔ میں نے ہندوستان ومصر کی ان شخصیتوں کا بھی ذکر کیا جو سنت پر عامل اور اس کی نگہبان ومحافظ تھیں۔ میں نے کہا کہ اس صورت حال کو بدلئے۔ دھارے کا رخ فساد سے اصلاح کی طرف پھیرنے اور خود اپنے ملک اور اپنے لوگوں میں اسلام کی مسافرت اور کسمپرسی کو دور کرنے کے لئے بڑی جدوجہد، محنت وجانفشانی اور ایثار وقربانی کی ضرورت ہے اور یہ کام نقل وحرکت، اسلامی دعوت کی نشر واشاعت اور اس کے لئے محنت ومشقت اٹھائے بغیر نہیں ہوسکتا۔

میں نے یہ بھی کہا کہ اسلام کوئی میراث نہیں ہے، جو بیٹے کو باپ سے یا ایک نسل کو دوسری نسل سے ملتی رہے جیسا کہ بہت سے لوگ سمجھتے ہیں، جو لوگ اس غلط فہمی کا شکار ہیں ان لوگوں نے دین کی قدر وقیمت نہیں سمجھی، اس لئے کہ اسلام ان کو کسی مشقت کے بغیر مفت اور بلا قیمت مل گیا، یہی وجہ ہے کہ جب اسلام کو کوئی افتاد پہونچتی ہے تو ایسے لوگوں کے کان میں جوں تک نہیں رینگتی، ان میں کوئی حرکت اور جذبۂ مقاومت نہیں پیدا ہوتا، اس کے برعکس صحابہ کرامؓ کی جماعت ہے جنھوں نے اسلام کے لئے خون کا دریا پار کیا، مصائب وآلام کے پل سے گزرے اور یہی وجہ ہے کہ اسلام ان کو جان ومال سے زیادہ محبوب ومرغوب ترین چیزوں حتیٰ کہ آل واولاد سے بھی زیادہ عزیز تھا۔ ہمیں چاہئے کہ ہم تاریخ کا جائزہ لیں، اپنی گذشتہ زندگی پر نظر ڈالیں تو ہمیں عمل پیہم اللہ کے دین کے لئے جدوجہد، ابتلاء وآزمائش، مصائب ومشکلات میں صبر وثبات، حدود اسلامی کی حفاظت اور راہ خدا میں قربانی وعزیمت کا ایک سنہرا وتابناک باب نظر آئے گا۔ ہمیں چاہئے کہ ہم اس پر خدا کا شکر ادا کریں اور موجودہ صورت حال کا مجرم اولین خود کو گردانیں اور پھر اپنے اعمال وکردار کو درست کرنے اور مستحکم کرنے کا فیصلہ کریں۔

أَحَسِبَ النَّاسُ أَنْ يُتْرَكُوا أَنْ يَقُولُوا آمَنَّا وَهُمْ لا يُفْتَنُونَ ' لَقَدْ فَتَنَّا الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللَّهُ الَّذِينَ صَدَقُوا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكَاذِبِينَ ' (العنکبوت۔۲،۳)

(کیا لوگوں نے سمجھا کہ ہم ایمان لائے یہ کہہ کر چھوڑ دیئے جائیں گے اور وہ آزمائے نہیں جائیں گے۔ ہم نے ان سے پہلے لوگوں کو بھی آزمایا، پس

ضرور جان لے گا، اللہ ان کو ان لوگوں کو جو سچے ہیں اور ان لوگوں کو بھی جان لے گا جو جھوٹے ہیں)۔

جب میں نے تقریر ختم کی تو جماعت کے بانی شیخ محمود خطاب کے صاحبزادہ اور خلیفہ اور جماعت کے موجودہ صدر شیخ امین خطاب منبر پر تشریف لائے، مقرر کا شکریہ ادا کیا اور پھر ایک گھنٹہ تک مفصل تقریر کی جس میں دعوت وتبلیغ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی فضیلت بیان کی، بہت سے فقہی مسائل کی تشریح کی، اسماء وصفات اور متشابہات کے مسئلہ پر روشنی ڈالی، تقریر ان کے وسعت مطالعہ متون حدیث کے استحضار، جماعت میں ان کی مقبولیت وبااثر ہونے کی آئینہ دار تھی۔

تقریر طویل تھی تاہم اکثر لوگ جم کر بیٹھے رہے، اگر کوئی اٹھا بھی تو کسی ضرورت ومجبوری کی بنا پر۔

جمعیۃ کی مسجد

مسجد نہایت سادہ، ظاہری آرائش اور جدت طرازی سے خالی تھی، اسی طرح نماز اور خطبہ میں بھی کوئی قابل اعتراض اور خلاف سنت بات نہ تھی، خطیب نے خلفائے راشدین کے لئے دعا نہیں کی اور ان کا ذکر ہم نے خطبہ میں نہیں سنا۔ یہ ایک نئی بات تھی۔ پہلی اذان بھی ہم نے نہیں سنی، نماز تعدیل ارکان، رکوع وسجود، سکون واطمینان میں ممتاز تھی، مسجد کے نظام اور نمازیوں کے سکون کا سماں دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی، جب شیخ منبر سے اتر آئے تو نمازی ہم لوگوں سے مصافحہ کے لئے ٹوٹ پڑے، اپنے ملک ہندوستان کے خطۂ میوات کے علاوہ کہیں، اور لوگوں کو اس اخلاص ومحبت کے ساتھ مصافحہ کرتے اور دعا کی درخواست کرتے نہیں دیکھا۔

جمعیۃ اور اس کے بانی

یہاں اس جمعیۃ اور اس کے بانی کے متعلق کچھ عرض کروں گا، اس جمعیۃ کی بنیاد شیخ محمود خطاب سبکی نے ڈالی۔ یہ بزرگ ہستی اور قدآور شخصیت ۱۲۷۴ھ ضلع منوفیہ کے ایک

مقام سبک میں پیدا ہوئی۔ عام کسان بچوں کی طرح پرورش پائی۔ اپنے والد کی بکریاں چراتے اور باغ کی رکھوالی کرتے۔ کچھ پڑھا لکھا نہیں۔ جب جوان ہوئے تو شیخ احمد بن محمد جبل السبکی حلوائی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اذکار و وظائف میں مشغول ہوگئے۔ بالآخر اپنے کو عبادت و ریاضت کے اس مقام پر پہنچا کہ شیخ نے ان کو مریدین کی اصلاح اور طالبین سلوک کی دیکھ بھال کرنے کی اجازت دے دی، اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں علم کی محبت بھی ڈال دی۔

اس وقت ان کی عمر ۲۰ برس سے زائد ہو چکی تھی۔ مگر ہنوز زیور علم سے عاری تھے۔ اوّلاً انھوں نے خط لکھنا سیکھا۔ پھر ازہر گئے اور وہ مرتبۂ علم حاصل کیا کہ ازہر کے طالب علموں کو درس دینے لگے۔ یہ سب کچھ تقریباً ایک سال کی مدّت میں ہوا جیسا کہ انھوں نے اپنی کتاب (فتاوی ائمۃ المسلمین) میں خود بیان کیا ہے۔ دورانِ تعلیم میں ان کا یہ معمول تھا کہ ازہر میں پڑھتے اور دیہاتی بچوں کی تربیت کرتے، ازہریوں میں وہ ازہری ہوتے اور دیہاتیوں میں واعظ و مرشد ہوتے، شادیوں میں کھیل، تماشوں، ناچ گانوں اور خوشی و غمی کے موقعوں پر جو ناروا باتیں ہوتی تھیں ان کے انسداد کی کوشش شروع کی، ازہر اور دوسری مسجدوں میں پھیلی ہوئی بدعات کے خلاف جدوجہد کی اور غلط سلسلوں کے مشائخ کے ساتھ مناسب اسلوب اصلاح اپنایا، ازہر سے امتیازی نمبروں سے عالمیت کی سند حاصل کی اور درس دینے میں مشغول ہوگئے، دوران درس زبان و قلم دونوں سے جہاد کرتے رہے۔ ۱۳۳۵ھ میں انھوں نے ایک جمعیت (انجمن) قائم کی جس کا نام (الجمعية الشرعية لتعاون العاملين بالكتاب و السنّة المحمدية) رکھا۔ اس انجمن کا کام واعظین و مبلغین کو مختلف علاقوں میں بھیجنا، سنّت کے مطابق مسجدوں کی تعمیر اور قومی صنعتوں کا قیام تھا ان کے اس اخلاص، کدوکاوش اور اس جدوجہد کا مصری اضلاع پر نمایاں اثر پڑا جو آج صحت عقائد، توحید میں پختگی، شرک و بدعت سے نفرت اور اسلامی معاشرت کی پابندی میں صاف نظر آتا ہے۔ یہ جماعت اور اس کے کارکن عماموں اور شرعی داڑھیوں سے پہچانے جاتے ہیں

جو مصر میں نایاب و نامانوس تھیں۔ علماء اور دیندار طبقہ میں بھی داڑھیوں کا رواج اٹھ چکا تھا۔

۱۳۵۴ھ میں شیخ کا انتقال ہوا۔ اور شیخ کے بعد ان کے صاحبزادے شیخ امین محمود خطاب جن کا ذکر گذر چکا، شیخ کے قائم مقام ہوئے، میں جب بھی اس جماعت کے لوگوں سے ملا علماء دیوبند اور اس کے متبعین کی یاد تازہ ہوگئی۔ وہی عقائد کی درستی، اتباع سنّت کا شوق، دینی شعائر و آداب کی پابندی، توحید وصفات باری کے نظریہ میں ان دونوں جماعتوں میں بڑی یگانگت و یکسانیت پائی جاتی ہے۔ اگر مسئلہ صفات و متشابہات کے مفہوم کا اختلاف نہ ہوتا تو الجمعیۃ الشرعیۃ اور اہل نجد متحد الخیال ہوتے۔

تحریکوں کی زندگی کا انحصار زمانہ کی نبض شناسی پر ہے

ہم نے محسوس کیا کہ ان ممالک میں جو مغربی تہذیب کے سامنے سپر ڈال چکے ہیں اور مادیت کا شکار ہیں، وہاں یہ جماعت زیادہ بہتر اور امید افزا حالت میں ہے، یہ جمعیۃ اس سرمایہ کو سینے سے لگائے ہوئے ہے جو اس کو اپنے بانی سے ورثہ میں ملا ہے، لیکن کیا مستقبل میں بھی یہ جمعیۃ اپنے نشاط و سرگرمی کو باقی رکھ سکے گی اور اپنے کارکنوں کے روحانی اثرات سے فائدہ اٹھائے گی؟ یا رفتار زمانہ کا ساتھ دے گی؟ اس کا انحصار، جدوجہد، غور وفکر، دعوت، پیغام، زمانہ اور نئی نسل کے لئے نئے اسلوب اور طرز کلام کے اختیار کرنے پر ہے، تجربہ بتاتا ہے کہ بہت سی انجمنیں اور جماعتیں ایسی ہیں جن کی داغ بیل ایک مخلص، صاحب فکر اور بااثر شخصیت ڈالتی ہے لیکن جب اس کی جگہ ایسے لوگ آتے ہیں جو اس کے سرمایہ میں کوئی اضافہ نہیں کرتے، زمانہ کے تقاضوں اور اپنے دعوت و پیغام کے طریقہ و اسلوب میں مناسبت نہیں قائم کرتے اور زیادہ مؤثر، و نفع بخش طرز اسلوب نہیں اپناتے تو یہ جماعت آہستہ آہستہ اپنا اثر کھو دیتی ہے یا لاشئے بے جان ہو کر رہ جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس جمعیۃ کو ایسے بُرے انجام سے محفوظ رکھے۔

جمعہ کی نماز کے بعد ہم تھوڑی دیر صدر جمعیۃ کے پاس بیٹھے، بال کھچڑی (کچھ کالے کچھ سفید) چہرہ پر زہد و قناعت کا نور عیاں، وقار و سنجیدگی کے ساتھ ساتھ ان کی ظرافت

وزندہ دلی مجھے بہت پسند آئی، جب ہم شیخ کی مجلس سے نکلے تو ہم کو محمد احمد عثمان اور الحاج علی شریف نے رخصت کیا۔ ہم بھائی محمود قندیل کے ساتھ گئے، اور ان کے یہاں دوپہر کا کھانا کھایا ان کے یہاں سے عشاء کے وقت واپسی ہوئی۔

عالم عربی کا زوال

دوستوں نے مجھے بتایا تھا کہ استاذ سعید رمضان (۱) قاہرہ میں ہیں، انھوں نے شہری اور دیہی علاقوں میں ان کی آمد ورفت اپنے دوستوں اور اخوان المسلمین کے اراکین سے ملنے اور سرگرم عمل رہنے کا حال بھی سنایا تھا۔ میں ان سے ملنے کا بڑا مشتاق تھا۔ اسلامی تحریکوں اور شخصیات سے ملاقات کو میں اس سفر کا سب سے بڑا فائدہ اور اس کا حاصل سمجھتا ہوں۔

حجاز کے دوران قیام میں نے عرب ممالک کا زیادہ قریب سے مطالعہ کیا، میں وہاں کے اخلاقی انحطاط، حکومتوں کے ظلم وجور، سیاسی انارکی، دین سے بیزاری وانحراف اور مادّہ پرستانہ ذہنیت سے اچھی طرح واقف تھا، میں نے ایسے قائدین کو دیکھا جو قوم وحکومت کے مال سے اس طرح کھیل رہے تھے۔ جیسے بچے کنکریوں اور ٹھیکریوں سے کھیلتے ہیں، سیاسی پارٹیاں معاشرہ سے آنکھ مچولی کھیل رہی تھیں، مقاصد کے خاطر لوگوں کو ایک دوسرے سے لڑا رہی تھیں اور ایسے لوگوں کو جن کے دل اسلام سے منشرح نہیں ہیں، اپنا آلۂ کار بنا کر اس بات پر آمادہ کر رہی تھیں کہ وہ اسلام پسندوں پر اقتدار حاصل کرلیں۔

اپنے مطالعہ سے میں اس نتیجہ پر پہونچا کہ اس نازک صورت حال سے عالم اسلام کو زوال پذیر ہونے سے ایک ایسی طاقتور عوامی تحریک ہی بچا سکتی ہے جس کی بنیاد ایمان وتقویٰ اور خالص اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے جد وجہد پر ہو، اس فاسد معاشرہ کو اجتماعی امراض سے پاک کرنا اور اسلامی نظام حیات کو اسلامی ملکوں میں جاری کرنا اس کا مقصد

---

(۱) ڈاکٹر سعید رمضان اخوان المسلمین کے سرگرم کارکن بانی جماعت شیخ حسن البناء کے داماد عرصہ تک المسلمون نکالا، جنیوا میں مرکز اسلامی (اسلامک سینٹر) کے نگراں اور انچارج ہیں وہ رابطہ عالم اسلامی مکہ معظمہ کے بنیادی وبانی ممبروں میں ہیں، عربی کے شعلہ بیان خطیب اور موثر شخصیت کے مالک تھے۔

اوّلین ہو۔ میں نے محسوس کیا کہ پانی سر سے اونچا ہو چکا ہے اور معاملہ اس سے بہت آگے بڑھ چکا ہے کہ انفرادی کوشش، دینی وعظوں اور تقریروں، تصنیفات، کتابوں یا ایسی دینی انجمنوں سے اس کا تدارک کیا جائے جو بہت سُست رفتاری سے کام کر رہی ہیں۔

عشق خود ایک سیل ہے سیل کو لیتا ہے تھام

سیلاب کو روکنے کے لئے اس سے زیادہ طاقتور سیلاب کی ضرورت ہوتی ہے، دھارے کا رُخ اس سے قوی تر دھارا ہی پھیر سکتا ہے، میں حجاز کے جن ادیبوں سے ملا، اور اخوان کے جن حضرات سے میری ملاقات ہوئی ان سے معلوم ہوا کہ تحریک اخوان المسلمین اس خواب کو شرمندۂ تعبیر کر سکتی ہے، ملکی زندگی پر اس نے بڑا اثر ڈالا ہے، اس جماعت کے اندر قوت ایمان وعمل کا دو آتشہ کارفرما ہے، اس کے افراد علم، حوصلہ مندی، ڈسپلن اور دعوت وجذبۂ ایمانی کے اسلحہ سے لیس ہیں (اگر اللہ کو منظور ہوا) تو ملک کا رُخ لادینیت سے دین کی طرف پھیر سکتے ہیں اور دین کے ساتھ استہزاء اور استخفاف کے مزاج کو دینی ذوق، اور دین پر فخر واعتماد کے مزاج سے بدل سکتے ہیں۔

لیکن نقراشی پاشا کے اختلاف اور مرشد عام کے اچانک قتل، جماعت کے توڑ دینے اخوان کو جلاوطن کرنے اور طرح طرح کی اذیتیں پہنچانے کا وہ حادثۂ جانکاہ پیش آ گیا، جس نے بالآخر تمام امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ یہ عرب ممالک اور عالم اسلام کا المیہ ہے۔ لیکن اب پھر سے اخوان میں نئی زندگی پیدا ہو رہی ہے، وہ اپنا رسالہ نکال رہے ہیں، میں نے حجاز سے استاذ صالح کو لکھا تھا۔ جس میں مصر کے ارادۂ سفر کی اطلاع اور ان سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تھی، مصر پہونچ کر کئی دن تک اخوان المسلمین کے کسی اہم رکن سے ملاقات نہ ہوئی نہ کوئی ایسا آدمی ملا، جو استاذ عشماوی تک رہنمائی کرتا۔

جب مجھے سعید رمضان کے وہاں موجود ہونے کی خبر ملی تو میں نے ان سے ملنے کی خواہش ظاہر کی مجھے ان کا سلام اور مجھ سے ملنے آنے کی خواہش کی اطلاع ملی چنانچہ شنبہ کی

رات وہ اخوان کے کچھ نوجوانوں اور کالج کے طلباء کے ساتھ ملاقات کے لئے آئے۔ ہماری ملاقات اس طرح ہوئی جیسے بچھڑے ہوئے دو دوستوں سے ہوتی ہے، استاذ سعید رمضان سے معلوم ہوا کہ ہمارے رفیق وصدیق مولانا محمد ناظم صاحب ندوی (۱) نے ان سے میرا ذکر کیا تھا اور ان کو میرے بعض رسالے بھی دیئے تھے، استاذ سعید رمضان میرے پہلو میں بیٹھے اور مخلص دوست اور ہمدرد بھائی کی طرح باتیں کرتے رہے، انھوں نے اس کی ذرا کوشش نہ کی کہ پہلی ملاقات میں اپنی شخصیت وغیر معمولی صلاحیت کا مجھ سے مظاہرہ کریں نہ اس کی فکر کی کہ تھوڑی مدّت میں اپنی کاوشوں اور کامیابیوں کا ذکر کریں جیسا کہ بہت سے قائد یا اس سے زیادہ صحیح الفاظ میں لیڈری جھاڑنے والے لوگ کرتے ہیں، ان کے ہاتھوں کی حرکت اور چہرہ پر دبتی اور ابھرتی ہوئی لکیروں اور اہل مجلس کی طرف مُنہ پھیر پھیر کر پُر لطف باتوں سے نشاط وزندگی کا جو مظاہرہ ہو رہا تھا، اس سے مجھے خوشی ہوئی، ان کی بلا کی ذہانت اور زندہ دلی سے بھی میں بہت متاثر ہوا۔ تھوڑی دیر گفتگو کے بعد بعض اسلامی شخصیات اور ملکوں کا ذکر چھڑ گیا، عقل وروح کی کشمکش، روح پر عقل کے غلبہ کی بات چل پڑی، اس کے علاوہ عالم اسلام اور مسلمانوں کے متعلق باتیں ہوتی رہیں، وہ اس وعدے کے ساتھ رخصت ہوئے کہ کل استاذ عشماوی سے میری ملاقات کرائیں اور وہ مجھے اس کی اطلاع ظہر بعد دیں گے۔ تھوڑی دیر بعد مولوی سید علی اکبر آ گئے۔ آج رات برلمان ہوٹل میں ہمارے ہی کمرے میں گزاریں گے اور صبح تڑکے پلین کے ذریعہ دمشق کا سفر کریں گے۔

شیخ حامد الفقی سے ملاقات

استاد حسنی صقر آئے اور سامان لے کر انھیں کی گاڑی پر ہم اپنی نئی جگہ، شارع موسکی صرافوں کے بازار میں منتقل ہو گئے۔ ظہر بعد ہم لوگ شیخ محمد حامد الفقی سے ملنے کے لئے ''جمعیۃ انصار السنۃ المحمدیۃ'' کے دفتر گئے دفتر شارع العابدین پر واقع ہے ہم جمعیۃ کی عمارت

(۱) مولانا محمد ناظم ندوی سابق استاد دار العلوم ندوۃ العلماء وجامعۃ الملک سعود ریاض وشیخ الجامعۃ اسلامیہ بھاولپور متوفی ۱۴۲۱ھ ۲۰۰۰ء پاکستان (مترجم)

میں داخل ہوئے تو ایک صاف ستھرے شائستہ و مستعد نوجوان سوٹ بوٹ میں ہم سے ملے اور بتایا کہ وہ جمعیۃ کے نگراں ہیں، ان کا نام محمد عبدالوہاب البنّا ہے، ان صاحب نے ہم کو بتایا کہ شیخ عصر بعد آئیں گے۔ ہم بیٹھ کر انتظار کرنے لگے اور ان کو تعارفی کارڈ بھیج دیا، عصر بعد شیخ آگئے، وہ ہم لوگوں سے بڑی خوش دلی اور حُسن اخلاق سے ملے، تاخیر سے ملنے کا شکوہ کیا، میں نے اس کا مناسب اندازہ میں جواب دیا، کہنے لگے، میں نے آپ کی کتاب کا ایک نسخہ حاصل کرلیا تھا۔ اس کو پڑھ بھی لیا۔ میرا جی چاہا کہ اس کتاب پر تبصرہ لکھوں، پھر اس خیال سے نہ لکھا کہ اس پر تبصرہ کے لئے بہت زیادہ رواں اور پختہ قلم کی ضرورت ہے، میں لکھنے سے زیادہ بولنے پر قادر ہوں، میں نے عرض کیا معاف فرمائیں، آپ تبصرہ لکھتے تو مجھے بڑی مسرّت ہوتی، پھر میں نے ان سے شیخ الازہر شیخ عبدالمجید سلیم، کثیر التصانیف عالم شیخ احمد محمد شاکر، محمد بن ابراہیم آل الشیخ (حال مقیم مصر)(۱) سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی، فرمایا میں تیار ہوں، ملاقات کرادوں گا۔ تھوڑی دیر بعد وہ ہم لوگوں کو انصار السنّۃ کے پریس لے گئے۔

شیخ الازہر سے ملاقات

مغرب بعد ہم لوگ شیخ الازہر علامہ عبدالمجید سلیم کے گھر گئے، کوٹھی میں داخل ہوتے ہی ہم نے ایسا محسوس کیا کہ جیسے ہم کسی بڑی حکومت کے وزیر کی رہائش گاہ میں ہیں، استاذ محمد حامد فقی بے تکلف شیخ کے گھر میں داخل ہوگئے۔ اس سے اندازہ ہوا کہ ان کی شیخ سے پرانی شناسائی اور دوستی ہے، لہٰذا ان کو ملاقات کے لئے معین وقت اور اجازت لینے کی ضرورت پیش نہیں آئی، شیخ کی مجلس میں ازہر کے بڑے بڑے اساتذہ اور حکومت کے عہدیداران موجود تھے، ازہر کے رجسٹرار شیخ عبداللطیف دراز بھی شریک محفل تھے۔

شیخ نے اٹھ کر ہم لوگوں کو خوش آمدید کہا شیخ محمد حامد فقی نے مجھے شیخ کے سامنے

---

(۱) علامہ محمد ابراہیم آل شیخ شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب نجدی سے خاندانی نسبت رکھنے والے سعودی عرب کے ممتاز عالم اور دینی رہنما تھے، جن کی بات کا اثر حکمراں طبقہ سے لے کر سبھی خاص و عام طبقہ پر تھا (مترجم)

کر دیا، ندوۃ العلماء اور دار العلوم سے میرے تعلق کا اظہار کیا، میں نے شیخ الازہر سے کہا میں آپ کو علماء ہند کا سلام پہونچاتا ہوں، وہ ازہر کو بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں شیخ نے اس کا اچھے انداز میں جواب دیا، میں نے اپنی کتاب (ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین) کا ایک نسخہ پیش کیا اور بیٹھ کر باتیں کرنے لگا۔

ہندوستان کا دینی طرز تعلیم اور علماء کی تربیت میں اس کا نمایاں حصّہ

میں نے ان سے کہا کہ ہندوستان کی دینی تعلیم کا طرز ان ممالک کے دینی طرز تعلیم سے مختلف ہے، جن میں دینی و تعلیمی ادارے حکومت کی امداد اور توجہ سے چلتے ہیں، ہمارے یہاں کے دینی اداروں کے خرچ کا بار وہاں کے مسلم عوام سنبھالتے ہیں اور ان میں وہ علماء تعلیم دیتے ہیں جن کے سامنے تنخواہ سے زیادہ اخروی اجر و ثواب ہوتا ہے، ان مدرسوں میں وہی لوگ داخلہ لیتے ہیں جو طے کر لیتے ہیں کہ حکومت کے عہدوں اور نوکریوں کی طرف ان کو نہیں دیکھنا ہے، اس لئے وہی لوگ اس کی طرف آتے ہیں جو اپنے اقتصادی مستقبل کو قربان کر چکے ہوتے ہیں، یہی چیز ہندوستان کے علماء میں، ہمت جہاد و مقابلہ کی روح اور خدا واسطے کام کرنے کا جذبہ پیدا کرتی ہے۔

شیخ الازہر نے فرمایا، زمانہ سابق میں ازہر بھی ایسا ہی تھا، میں نے کہا وہ عہد ازہر کے لئے عہد زریں تھا، اس کے بعد میں نے ان سے کہا کہ ہمارا دار العلوم جو ندوۃ العلماء کے ماتحت چلتا ہے، ہندوستان کے بڑے دینی مدرسوں میں ہے، یہ مسلمانوں کا بڑا مرکزی اور ثقافتی ادارہ ہے، اتنے میں استاد محمد حامد بول اٹھے اور دار العلوم کی دینی و علمی خدمات کی تعریف کرنے لگے اور فرمایا اس کے صدر پھر کچھ سوچنے لگے، جیسے نام بھول گئے ہوں میں نے کہا مولانا سیّد سلیمان ندوی؟ فرمایا ہاں۔ سید سلیمان ندوی شاید سید صاحب سے ان کی ملاقات حجاز میں ہوئی تھی، میں نے کہا اس کے موجودہ مہتمم جو ازہر کے فارغ ہیں مولانا عمران خاں ندوی ازہری ہیں۔(۱)

---

(۱) ۱۹۵۶ء سے اہتمام سے الگ ہو گئے اور تاج المساجد بھوپال کو مرکز توجہ بنایا جو انہیں کے کرنے کا کام تھا۔

حاضرین نے ہندوستانی مسلمانوں کے دینی حالات اوران کی سیاسی حیثیت اور کردار کے بارے میں سوال کیا، میں نے کہا وہ دین پر پوری طرح قائم اور ہندوستان میں رہنے کا پختہ ارادہ رکھتے ہیں، میں نے ان کو بتایا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے بڑے بڑے دینی، ثقافتی مرکز ہیں، میں نے ان مرکزوں کوذکر کیا، بات ختم ہوئی تو شیخ محمد حامد چلنے کے لئے اٹھے، شیخ سے اجازت لی، شیخ ازہر دروازہ تک ہمارے ساتھ آئے اور مہمانوں کو بڑی تواضع واکرام کے ساتھ رخصت کیا۔

شیخ الازہر

میں نے ان کی ملاقات سے محسوس کیا کہ شیخ الازہر حسن کردار اور تواضع وخاکساری کے بلند مقام پر ہیں، بڑے باوقار سن رسیدہ اور علمی تفوق اس پر مستزاد، خود ان کی شخصیت ازہر کے منصب مشیخت کے لئے باعث افتخار ہے، واپسی میں میں نے شیخ محمد حامد فقی سے پوچھا شیخ کا علمی مقام کیا ہے، وہ بولے اس وقت مصری علماء میں کوئی ان کا ثانی نہیں، میں ان سے اس وقت سے واقف ہوں جب وہ ملک فواد کے امام تھے، پھر شرعی عدالت کے نائب جج ہوئے، اس کے بعد دیار مصر کے مفتی ہوئے، پھر وہ پنشن لے کر رخصت ہوئے اور آخر میں شیخ الازہر منتخب کر لئے گئے جو انھیں کے شایان شان تھا۔

میں نے ان سے پوچھا، ازہر کے اساتذہ کی اسٹرائک (۱) کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ انھوں نے فرمایا کہ اس کا محرک تنخواہ میں زیادتی اور مال کی ہوس ہے، انھوں نے مجھ سے فرمائش کی کہ شیخ کی مجلس میں علماء ہند کے اخلاقی اور دینی طرز تعلیم سے متعلق میں نے جو گفتگو کی تھی۔ رسالہ (الہدی النبوی) کے لئے اس پر ایک مختصر مضمون لکھوں۔

شیخ حامد فقی کے درس میں شرکت

راستہ میں معلوم ہوا کہ رات کو عشاء کے بعد ان کا درس ہوتا ہے، میں نے حاضری کی اجازت چاہی اوران کے ساتھ ساتھ جماعت کے مرکز گئے، ہم نے وہیں عشاء کی نماز

(۱) چند ہی دن پہلے ازہر کے اساتذہ نے تنخواہ میں اضافہ کے لئے اسٹرائک کی تھی۔

پڑھی، ہم کو نوجوانوں اور جدید تعلیم یافتہ لوگوں کی ایک بڑی تعداد نظر آئی، ان کو دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ جمعیۃ کی کاوشیں بارآور ہوئیں اور اس کا دائرہ اثر ونفوذ وسیع ہوا ہے، اوپر کی منزل میں لوگ جمع ہوئے وہ تقریباً تین سو یا اس سے زائد تھے، آج رات کا درس قرآن مجید کی آیت یَا یَحْیٰ خُذِ الْکِتَابَ بِقُوَّۃٍ..... سے متعلق تھا، اچھا درس تھا، طرز بیان دلکش، مثالیں مؤثر، مسلمانوں کی موجودہ دینی حالت پر تنقید پُر مغز اور حقیقت سے لبریز، حقیقت یہ ہے کہ میں شیخ حامد کے جوہر خطابت، قادر الکلامی اور حاضرین پر چھا جانے کی اس صلاحیت سے واقف نہ تھا، ہاں مگر مقلدین اور مذاہب اربعہ کے پیروؤں کے بارے میں ان کا طرز گفتگو مجھے پسند نہیں آیا، ان کے بارے میں ان کا انداز گفتگو ان کے مقام سے فروتر اور تمسخر آمیز تھا، انھوں نے کہا کہ یہ لوگ دینا وآخرت دونوں سے اندھے، بہرے گونگے ہیں، یہ زبان اور اندازِ بیان کسی مخلص، مصلح اور داعی کے لئے زیبا نہیں، یہ تو نفرت پیدا کرنے والا انداز بیان ہے۔ اس سے دین کی کسی درجہ میں بھی خدمت نہیں ہوتی، مجھے خیال ہوا کہ کاش ان کے درس میں عقل کی طرح دل کا بھی حصہ ہوتا کہ زیادہ تر یہی چیز تزکیۂ نفس، خشوع اور انابت الی اللہ کی دولت سے آشنا کراتی ہے، یہ چیز ایسی جماعت کے لئے بہت ضروری ہے، جو مسلمانوں کی اصلاح اور دین کی خدمت کا دم بھرتی ہو، بہرحال حق بات کا اعتراف کرنا چاہئے، یہ درس صاحب درس کو عزت بخشنے والا اور سامعین کے لئے مفید تھا، درس کے بعد مجھے اطلاع کئے بغیر انھوں نے منگل کے دن میرے محاضرہ کا اعلان کردیا، میں نے اس کو منظور کرلیا میں خود موقع کی تلاش میں تھا کہ اس جمعیۃ کے اراکین اور اس کے بہی خواہوں سے بات کرنے کا موقع ملے۔

درس کے بعد جمعیۃ کے شاخ کی سکریٹری استاذ علی عدلی المرشدی مجھ سے بڑی محبت اور تپاک سے ملے، انھوں نے گذشتہ دنوں میرا رسالہ ''من الجاہلیۃ الی الاسلام''(۱) شائع کیا تھا، مجھ کو بتایا کہ اس رسالہ کو مصر وسوڈان میں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی اس کی

(۱) یہ رسالہ ''ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین کا ایک باب ہے

خوب اشاعت ہوئی۔ سوڈان سے بار بار آرڈر آئے اور میں نے اس کے نسخوں کو تلاش کر کے تعمیل کی، مجھ سے وعدہ کیا کہ بدھ کو اس کا ایک نسخہ لے کر آؤں گا، اس کے بعد ہم اپنی قیام گاہ واپس آئے تو معلوم ہوا کہ سعید رمضان کا قاصد آیا تھا، اور یہ اطلاع دی کہ کل ظہر بعد استاذ عشماوی صاحب اپنے دفتر میں ہمارا انتظار کریں گے اور ہمیں سعید رمضان کے گھر لے جائیں گے، جہاں ہم دوپہر کا کھانا کھائیں گے اور باتیں کریں گے۔

۲۰ ربیع الثانی ۱۳۷۰ھ مطابق ۲۸/۱/۱۹۵۱ء

اخوانی نوجوانوں کے ساتھ

صبح کو ازہر کے دو اخوانی طالب علم یوسف قرضاوی (۱) اور محمد الدمرداشی ہمارے پاس آئے، ان کے چہروں سے دینی غیرت وحمیت، ذہانت وعالی ہمتی ہویدا تھی، دونوں ایسے ہونہار نوجوان تھے جن سے آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور اس ملک میں اسلام کا مستقبل روشن ومضبوط نظر آئے، اخوانیوں میں کتنے ہی ایسے نوجوان ہیں، اگر اخوانیوں میں دینی جذبات کو اجاگر کرنے اور مسلم نوجوانوں میں اسلامی روح پیدا کرنے والے اور ان کو دین کی طرف موڑنے کے علاوہ کوئی اور خوبی نہ ہوتی تو اتنا ہی ان کے فخر ومباہات کے لئے کافی تھا، اخوانی نوجوانوں نے ''ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین'' کا مطالعہ کیا تھا، یہ کتاب اخوانیوں میں خوب پڑھی جاتی تھی، یہ اس کو پڑھنے اور پاس رکھنے کے شوقین تھے، جس کی وجہ یہ تھی اخوان کے ثقافتی نگراں استاذ عبدالعزیز کامل اس کے پڑھنے کا مشورہ دیتے تھے، اور اس کی طرف توجہ دلایا کرتے تھے، ان دونوں نوجوانوں نے مجھ سے کلیۃ اصول الدین کے طلباء میں خصوصی خطاب کا مطالبہ کیا، میں نے بخوشی ان کی خواہش کو منظور کر لیا کہ یہی اس سفر کا مقصد ہے، میں نے ان دونوں نوجوانوں سے اپنے دور سالوں

(۱) ڈاکٹر یوسف القرضاوی جو اس وقت قطر کے کلیۃ التربیۃ کے مدیر اور سحر بیان خطیب ہیں جشن ندوۃ العلماء ۱۹۷۵ء میں شریک تھے، ان کی کتاب فقہ الزکوۃ اس موضوع پر مرجع سمجھی جاتی ہے (مصنف)

"من العالم إلى جزيرة العرب "اور"من الجزيرة العربية إلى العالم "کا تذکرہ کیا.....وہ دونوں مضمون جس مطبع سے ان کا ربط تھا اس سے اشاعت کی خاطر لے لئے ،ان دونوں کے بعد عبداللہ العقیل (۱) آئے ، یہ ایک عراقی مسلم نوجوان ہیں، اخوان کے نقطۂ نظر کے جان ودل سے داعی اوراس کے لئے ہرطرح تیار، یہ کلیة الشریعة میں پڑھتے ہیں ، میں نے ان سے ذکر کیا کہ مولانا مسعود عالم ندوی نے اپنے سفرنامہ (دیار عرب) میں ان کا اوران کے گھر کا تذکرہ کیا ہے، یہ مجھے استاد عشماوی کے دفتر لے جانے کے لئے آئے تھے،ہم دونوں نکلے،راستہ بھر تحریک اخوان المسلمین اوراس کے نمایاں اشخاص کا ذکر کرتے رہے۔شیخ محمد الغزالی کی بعض تصنیفات بھی میرے لئے بطور ہدیہ لائے تھے میں استاد صالح عشماوی سے ملا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے مشتاق تھے ، دونوں نے دھڑکتے ہوئے دلوں کے ساتھ معانقہ کیا، جیسے ہم دونوں عرصہ سے دوست رہے ہوں۔

استاد سعید رمضان کے ساتھ

ظہر بعد ہم لوگ استاد سعید رمضان کے یہاں گئے ،تھوڑی دیر بیٹھے، ہندوستانی مسلمانوں کے حالات ، اس ملک میں ان کی پوزیشن ، دینی ودعوتی تحریکات ، اوراسلامی جماعتوں کے بارے میں گفتگو ہوتی رہی ، پھر کھانا کھایا اورعصر کی نماز پڑھی ،مغرب بعد انصار السنۃ کے دفتر گئے ۔ یہاں سے عشاء بعد ہم لوگ شیخ محمد حامد فقی کے ساتھ جمعیۃ کی ایک شاخ کے افتتاحی جلسہ میں محلّہ بولاق گئے ، بڑا پرزور جلسہ تھا،بجلی کے قمقموں سے ایسا جگمگا رہا تھا، جیسے ہمارے ملک میں عید میلاد النبیؐ وغیرہ کے موقع پر ہوتا ہے۔ بڑا بارونق منظر تھا۔ حاضرین کی اونچی اونچی سرخ ٹوپیوں سے اس کا حسن دوبالا ہورہا تھا۔ استاد محمد حامد فقی نے ایک طویل تقریر کی جس سے لوگ متأثر ہوئے ۔ یہاں سے ہم لوگ پھر اپنی قیام گاہ آگئے۔

---

(۱) اس وقت کویت میں وزارت اوقاف میں امور دینیہ کے ڈائرکٹر تھے

۲۱/۴/۱۳۷۰ھ مطابق ۲۹/۱/۱۹۵۱ء

آج ہم نے ڈاکٹر احمد امین سے ملنے کا نظام بنایا تھا تا کہ ان کو وہ ہدایا پہنچا دیں جو ہم ان کے لئے حجاز سے لائے تھے یہ ایک عجمی مصلی اور برقی تسبیح تھی، ان کے دفتر پہنچے تو معلوم ہوا کہ آج خلاف معمول قبل از وقت دفتر سے چلے گئے، افسوس ہوا۔ ہم لوگ استاد رشاد عبدالمطلب سے ملے جو دفتر میں مخطوطات کے شعبہ میں کام کرتے ہیں، وہ بڑے باخبر اور پڑھے لکھے شخص ہیں۔ ہم لوگوں سے جلد مانوس ہو گئے اور ہمارے پاس بیٹھے، مخطوطات اور علمی آثار کے موضوع پر گفتگو رہی۔ ہم نے ڈاکٹر احمد امین کے گھر فون کیا تو جواب ملا کہ وہ مجمع فؤاد الاوّل میں ہیں، بڑے انتظار کے بعد ہم ان کے گھر گئے وہ ابھی تک گھر نہیں آئے تھے، ہدایا ان کے صاحبزادہ کے حوالہ کئے اور ملاقاتی کارڈ دے کر تھکے ہارے واپس آ گئے، شام کو استاذ احمد محمد شاکر سے ملنے کا ارادہ کیا، جماعۃ انصار السنۃ کی عمارت میں فون سے بات کی تو انھوں نے محمد حامد فقی کی موٹر منگائی تا کہ وہ جماعت انصار السنۃ کی عمارت میں آ جائیں، شیخ محمد حامد فقی بڑی تاخیر سے آئے۔

محمد بن ابراہیم آل شیخ (۱) سے ملاقات

استاد احمد محمد شاکر نے خیال ظاہر کیا کہ آج شیخ محمد بن ابراہیم عبداللطیف آل شیخ سے جیزہ میں ان کے مکان پر ملاقات کی جائے، وہ بغرض علاج مصر آئے ہوئے تھے، جیزہ میں کرایہ کا ایک مکان لے لیا ہے۔ ہم لوگ ان کے پاس گئے۔ گھر میں داخل ہوئے تو اس کو بڑے مالدار اور عہدیدار کے شایان شان پایا۔ کمرہ جدید طرز پر سجا ہوا تھا۔ ہم نے شیخ کو سلام کیا اور اپنے دینی بھائی اور ان کے عزیز شیخ عمر بن الحسن آل شیخ کا خط پیش کیا، شیخ محمد

(۱) شیخ محمد بن ابراہیم مملکت عربیہ سعودیہ کی سب سے بڑی دینی علمی شخصیت، رابطہ عالم اسلامی کے مستقل صدر اور جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے پہلے دن سے اپنی وفات تک چانسلر رہے، مملکت کے مفتی اکبر اور امور دینیہ کے نگراں اور مدار المھام تھے، وہ شیخ محمد بن عبدالوہاب کے اولاد میں تھے، علمی حیثیت سے بھی انکا پایہ بلند تھا شیخ عبد العزیز بن باز حال وزیر الافتاء والدعوۃ وغیرہ ان کے شاگرد رشید ہیں۔

بن ابراہیم نابینا ہیں، اپنے قریب رہنے والوں میں ایک صاحب کو دیا کہ وہ ان کو پڑھ کر سنائیں اس کے بعد گفتگو شروع ہوئی۔ میں نے عبیداللہ زاہد درویش کے بارے میں پوچھا جو ہندوستان سے ہجرت کر کے آئے تھے، نجد کے لوگ ان کی بڑی تعریف کرتے ہیں اور بہت اچھے انداز میں ان کا ذکر کرتے ہیں، شیخ نے عبدالکریم درویش اور عبداللہ درویش کا تذکرہ بھی کیا ان دونوں بزرگوں کے تذکرے کی مناسبت سے حضرت شاہ اسماعیل شہید دہلویؒ اور حضرت سید احمد شہیدؒ کا ذکر بھی آ گیا، اس وقت ہمیں معلوم ہوا کہ شیخ محمد بن ابراہیم اور شیخ حامد دونوں حضرات ان کے جہاد و تحریک سے قطعاً ناواقف ہیں۔ حسن اتفاق کہ میں اپنے ساتھ ''الاعلام بمن فی تاریخ الهند من الاعلام'' لئے ہوئے تھا جو نزہۃ الخواطر کا خلاصہ ہے(۱)، میں نے حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ کا تذکرہ پڑھ کر سنایا، شیخ نے اس کتاب کے پڑھنے کی خواہش ظاہر کی، لہٰذا میں نے کتاب ان کے پاس چھوڑ دی۔ شیخ کو اپنے جد امجد کے بارے میں بڑی معلومات ہیں کہ کس نے ان پر تنقید کی ہے، کس نے دفاع کیا ہے، وہ اپنے آباء و اجداد کی کتابوں اور علماء نجد کے بارے میں اچھی واقفیت رکھتے ہیں۔ شیخ نے ہمارے دوست مولانا مسعود عالم ندوی کا ذکر کیا جن سے ان کی ملاقات ریاض میں ہوئی تھی، شیخ الاسلام سے متعلق بعض چیزوں کے بارے میں ان سے تذکرہ رہا، یہاں سے ہم اپنی قیام گاہ واپس آ گئے۔

بدھ ۲۲/۴/۱۳۷۰ھ مطابق ۳۰/۱/۱۹۵۱ء

آج کچھ سستی اور ٹھنڈک کا اثر رہا، لہٰذا اپنے کمرہ ہی میں رہے، اور اپنے رسالہ (المد و الجزر فی تاریخ الاسلام) کی تصحیح و اضافہ اور قابل طباعت بنانے کی تیاری میں لگے رہے جس کو مصر میں شائع کرانے کا ارادہ تھا۔ شیخ احمد محمد عثمان نے فون پر مجھے بتایا

---

(۱) یہ خلاصہ مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی کا ہے جو مصنف کے بڑے صاحبزادے اور ندوۃ العلماء کے ناظم تھے، اب یہ کتاب سید احمد شہید اکیڈمی دار عرفات رائے بریلی سے ''نزہۃ الاعلام'' کے نام سے مولوی خلیل احمد حسنی ندوی کی تحقیق سے طبع ہوئی ہے (مترجم)

کہ وہ چار بجے عصر کے وقت آئیں گے اور مجھے شیخ امین خطاب کے یہاں لے جائیں گے، وہ وقت پر آگئے اور ہم ان کے ساتھ الجمعیۃ الشرعیۃ کے مرکز گئے جہاں ہم نے مغرب کی نماز پڑھی اور شیخ سے ملاقات کی، انھوں نے سنیچر کے دن دوپہر کے کھانے پر بلایا، میں چاہتا تھا کہ شیخ کے ساتھ کچھ دیر بیٹھوں، اور ہمارے ملک میں دعوت کا جو کام ہو رہا ہے اس کے طریقۂ کار کے بارے میں گفتگو کروں، ہوسکتا ہے ان کو اس کے بعض اصولوں سے اتفاق ہو اور اس کو وہ مفید سمجھیں کہ حکمت مومن کی متاعِ گم شدہ ہوتی ہے، اس کو جہاں پاتا ہے لے لیتا ہے، لہٰذا میں نے موقع غنیمت جان کر ان کی دعوت قبول کر لی۔

جمعیۃ الشبان المسلمین کے مرکز عام میں

آج ہم لوگ جمعیۃ الشبان المسلمین کے مرکز گئے۔ ہم لوگ ڈاکٹر عبدالحمید سعید ہال میں داخل ہوئے تو اس مرد مومن کی یاد تازہ ہوگئی، جو مصری نوجوانوں کا مرجع اور مسلمان نوجوانوں کی تحریک کا روح رواں تھا، میں نے ان کے لئے دعائے خیر کی، جمعیۃ کی عمارت اپنے مختلف شعبوں اور شاخوں پر مشتمل ان کی اچھی اور پائیدار یادگار ہے، آج رات ازہری عالم اور رائد الشبان المسلمین (۱) استاذ احمد الشرباصی کی تقریر تھی، وہ ابھی تک نہیں آئے تھے۔

جنرل محمد صالح حرب سے ملاقات

ہم لوگ جمعیات الشبان المسلمین کے صدر جناب جنرل محمد صالح حرب باشا کے کمرے میں گئے، جو بیماری کے سبب دار الجمعیۃ کے ایک کمرہ میں تنہا رہتے تھے، ہم نے ان کی عیادت کی، سلام کیا اور ان کو شیخ محمود شویل کا تعارفی خط پیش کیا، انھوں نے میرے مصر آنے کی خبر سنی تھی، آدمی پڑھے لکھے، خوش خلق و خوش گفتار ہیں۔

دار الجمعیۃ کی زیارت

محترم باشا صاحب کی خواہش تھی کہ ہم جمعیۃ کے شعبوں کو دیکھیں اور اس کی

---

(۲) شبان المسلمین کے حلقہ میں ان کو اسی نام سے یاد کیا جاتا تھا، ہر ہفتہ اسی عمومی مرکز میں انکی تقریر ہوتی تھی

سرگرمیوں کا جائزہ لیں۔ چنانچہ ہم لوگ جمعیۃ کے ایک رکن کے ساتھ جمعیۃ کی عمارت میں داخل ہوئے، اوراس کے کمروں اور مختلف شعبوں کو دیکھا، کلب کے ممبروں کو ورزشی کھیلوں، باکسنگ اور کشتی میں مشغول پایا، ان کے جوش عمل، ورزش کا شوق اور جسمانی تربیت کا اہتمام مجھے بہت پسند آیا، ان کی صحت اور قوت کو دیکھ کر ہمیں پنجاب کے تندرست اور چست نوجوان یاد آگئے۔

ہم لوگ جمعیۃ کے مختلف گروپوں کی تصویروں کے پاس سے گزرے جن کو مختلف حالتوں میں دکھایا گیا تھا، ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ہم مغربی طرز کی ایک ملکی انجمن اور ورزش و اسکاؤٹنگ کی ایک ترقی یافتہ مجلس میں ہیں۔ ہم لوگ جمعیۃ کے کتب خانہ بھی گئے، یہاں ہمیں رسائل اور افسانوں کے اچھے و بُرے دونوں ہی نمونے نظر آئے، یہ ایک ایسا روگ ہے جو تمام ملکوں میں جڑ پکڑ چکا ہے، اور شہر و دیہات کوئی جگہ اس سے باقی نہیں بچی ہے۔

انصار السنۃ میں میری تقریر

آج رات جماعت انصار السنۃ میں میری تقریر تھی، جلدی جلدی ہم لوگ وہاں گئے، پہنچے تو لوگوں کو منتظر پایا، عشاء کی نماز پڑھی گئی اور میں تقریر کے ہال میں داخل ہوا، وہاں مجھے جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں اور جماعت کے اراکین و معاونین کی بڑی تعداد نظر آئی، صدر جمعیۃ شیخ محمد حامد فقی آگے بڑھے، چند منٹ تمہیدی تقریر کی، پھر مجھے تقریر کرنے کو کہا اس کے بعد میں نے دعوت الی اللہ کی اہمیت اس کی عظمت و نزاکت، اس کے مطالبات کی باریکیوں نیز اس کے شرائط و آداب پر روشنی ڈالی، میں نے کہا بہت سے لوگ جو کوئی کام یا پیشہ اچھی طرح نہیں کر سکتے وہ دعوت الی اللہ کا کام اپنا لیتے ہیں، شاید وہ سمجھتے ہیں کہ زندگی میں سب سے آسان کام یہی ہے۔ حالانکہ وہ بہت وسیع، نازک اور مہتم بالشان کام ہے، یہ کام سیاسی، اقتصادی، علمی اور فکری دعوتوں سے کہیں زیادہ اہم اور ذمہ دارانہ کام ہے، کوئی انقلاب اور کسی

---

(۱) شبان المسلمین کے حلقہ میں ان کو اسی نام سے یاد کیا جاتا تھا، ہر ہفتہ اسی عمومی مرکز میں انکی تقریر ہوتی تھی

ڈھانچہ کی تبدیلی یا کسی پرانے نظام کی جگہ نئے نظام کا قیام، اخلاق اور روح، اور تقاضہ انسانیت کے بغیر بھی ہو جاتا ہے، ان دعوتوں کے کارکن اپنی دعوت اور جدّ وجہد میں مخلِص ہونے کے باوجود بعض اوقات اخلاقی اور کردار کے لحاظ سے بہت گھٹیا اور گرے ہوئے ہوتے ہیں۔ لیکن اس کو دعوت کے منافی ومخالف نہیں سمجھا جاتا، مگر دعوت الی اللہ، حُسن اخلاق اور تمام دینی اور انسانی تقاضوں کی طالب ہوتی ہے، وہ طاقتور ایمان، سچّے یقین، نمایاں قربانی، کھلی ہوئی بہادری، صحیح عقل وشعور اور صحیح علم، ذاکر زبان، خدا کی طرف رجوع ہونے والے دل کی متقاضی ہوتی ہے، وہ عبادت میں خشوع، دعا میں ابتہال وتضرع اور خدائی چوکھٹ پر پڑ جانے کی متقاضی ہوتی ہے، یہ صرف تبلیغ وتعلیم ہی نہیں ہے بلکہ تبلیغ وتعلیم، تربیت وتزکیہ سب کا نچوڑ اور خلاصہ ہے، یہ اس نبی کی خلافت وجانشینی ہے جس کے اوصاف اور فرائض چہارگانہ، تلاوت کتاب، تعلیم کتاب، تعلیم حکمت اور تزکیہ بیان کئے گئے (لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْ عَلَيْهِمْ آيَاتِهٖ وَ يُزَكِّيْهِمْ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَ الْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلَالٍ مُبِيْنٍ (سورہ آل عمران آیت ۱۶۴)

ہندوستان میں دینی داعیوں اور مجاہدین کی چند مثالیں

پھر میں نے عہد اسلامی کے دور اوّل کے داعیوں کی جاندار مثالیں پیش کیں اور ہندوستان کے بعض داعیوں اور مجاہدین فی سبیل اللہ کے واقعات بیان کئے جیسے مولانا یحییٰ علی عظیم آبادی مولوی محمد جعفر تھانیسری، ان کے علاوہ ان لوگوں کے قصّے جو اللہ تعالیٰ کے اس قول کے مصداق تھے، مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ مَنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَنْ يَنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا (مومنوں میں کتنے ہی ایسے شخص ہیں کہ جو اقرار انھوں نے خدا سے کیا تھا اس کو سچ کر دکھایا، تو ان میں بعض ایسے ہیں جو اپنی نذر سے فارغ ہو گئے اور بعض ایسے ہیں جو انتظار کر رہے ہیں اور انھوں نے اپنے قول کو ذرا بھی نہیں بدلا)۔

میں نے وہ منظر پیش کیا کہ ان حضرات نے پھانسی کا حکم کس خوشی ومسرت کے ساتھ سنا، ان میں سے بعض حضرات کس طرح جیل میں یہ شعر پڑھتے تھے۔

فلست أبالی حین اقتل مسلمًا
علیٰ أی شق کان للّٰہ مصرعی
و ذلك فی ذات الالٰہ وإن یشأ
یبارك علیٰ اوصَال شلو ممزع

" میں مسلمان ہونے کی حالت میں قتل کیا جاؤں، تو مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں کہ میں کس پہلو گروں گا، یہ تو اللہ تعالیٰ ہی کی خاطر ہے وہ چاہے تو اعضاء کے ہر ٹکڑے میں برکت دے۔

مولانا یحییٰ علی کس طرح جیل کے ان جلاّدوں کو مخاطب کرتے تھے جو ان کے سر کے پاس ہتھیار اور بندوق لئے کھڑے رہتے تھے۔

" یا صاحبی السجن أ أرباب متفرقون خیرٌ أم اللّٰہ الواحد القھار ما تعبدون من دونہ إلا أسماءً سمیتوھا انتم وآباء کم ما أنزل اللّٰہ بھا من سلطان إن الحکم إلا لِلّٰہ، أمر أن لا تعبدوا إلا إیاہ ذلك الدین القیم ولکن اکثر الناس لا یعلمون۔ (سورہ یوسف)

" اے میرے جیل کے ساتھیو! کیا مختلف خدا اچھے ہیں؟ یا ایک زبردست اللہ اس کے سوا تم جس کی عبادت کرتے ہو وہ چند نام ہیں جن کو تم نے اور تمہارے باپ داداؤں نے گڑھ لیا ہے خدا نے اس کے لئے کوئی دلیل وثبوت نہیں اتارا ہے، حکومت اللہ ہی کے لئے ہے۔ اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا تم کسی اور کی عبادت نہ کرو، یہی سیدھا اور درست دین ہے، لیکن بہت سے لوگ نہیں سمجھتے"۔

آپ کے وعظ سے غیر مسلموں پر کس طرح گریہ طاری ہو جاتا تھا، وہ روتے تھے

اور اپنی جگہ سے ہٹنا پسند نہیں کرتے تھے، پھر میں نے بتایا کہ کس طرح یہ پھانسی کا حکم عمر قید میں تبدیل ہوگیا، پھانسی کے حکم سے ان کا شوق شہادت اور دو چند ہوگیا، ملک کے حاکم انگریزوں نے ان کی اس خوشی کو پسند نہ کیا، انھوں نے یہ نہ چاہا کہ ان کی مُنہ مانگی مراد (شہادت) پوری ہو۔

مادی دعوت اسلامی دعوت کی حریف

اس کے بعد ہم نے اپنے ملک میں دعوت کے طریقۂ کار کی تفصیل بیان کی، دارالعلوم ندوۃ العلماء کی مسجد میں ہفتہ وار اجتماع (۱) اور ہر طبقہ کے لوگوں کا اپنے خرچ پر شہروں، گاؤں اور قصبوں کی طرف نکلنے اور اس رضا کارانہ عمومی دعوت کے فوائد اور اچھے نتائج کا نقشہ کھینچا، پھر میں نے کہا آج تمام دعوتیں سرد پڑ چکی ہیں، کمزور و بے روح ہوگئی ہیں، بس ایک دعوت مادیت کا دَور دورہ ہے، یہی دین واسلام کے لئے جدوجہد کرنے والے لشکر کا سب سے بڑا حریف ہے، اب ہمارے لئے ضروری ہے کہ اپنی طاقت کو مضبوط بنائیں اور اس سے برسر پیکار ہونے کی تیاریاں کریں، اس کے بغیر ہمارے لئے ممکن نہیں کہ کما حقہ ہم اپنے زمانہ پر اثر انداز ہوں اور مادیت کے ان دبیز پردوں کو چاک کردیں جو دل ونگاہ پر چھا چکے ہیں، ہم مؤثر دینی شخصیت اور مسحور و مسخر کرنے والی روحانی قوت ہی سے اس پر غالب آسکتے ہیں۔

سامعین کے چہروں سے معلوم ہورہا تھا کہ تقریر کا ان پر اثر ہوا، داد و تحسین کی آوازیں بلند ہوئیں، یہ اثر شاید مخلص داعیوں اور مجاہدین کے ان اثر انگیز واقعات کی وجہ سے تھا جو میں نے بیان کئے۔ ان واقعات سے ایسا اثر ہوتا ہے جو کسی اور چیز سے نہیں ہوتا۔

تقریر کے بعد شیخ محمد حامد فقی نے مقرر کا شکریہ ادا کیا اور از راہ تواضع فرمایا کہ مجھے اس تقریر سے بڑا فائدہ ہوا۔

---

(۱) اس زمانہ میں لکھنؤ کا ہفتہ وار تبلیغی اجتماع ہر شب جمعہ کو دارالعلوم ندوۃ العلماء کی وسیع مسجد میں ہوتا تھا، جس میں شہر اور دیہاتوں سے لوگ اپنا اپنا بستر اور کھانا لیکر آتے تھے اور رات گذارتے تھے، شہر میں تبلیغی مرکز واقع کچہری روڈ بن جانے کے بعد یہ اجتماع وہاں منتقل ہوگیا۔

۲۳/۴/۱۳۷۰ھ مطابق ۳۱/۱/۱۹۵۱ء

ڈاکٹر احمد امین سے ایک ملاقات

گزشتہ رات استاد محمد رشاد عبدالمطلب ہم سے ملے اور ہم کو بتایا کہ ڈاکٹر احمد امین بک ہم سے ملنا چاہتے ہیں، چنانچہ صبح کو ہم لوگ الادارة الثقافية گئے، ڈاکٹر احمد امین صاحب ہم لوگوں سے بڑی گرمجوشی سے ملے، انھوں نے ہمیں کچھ کتابیں ہدیہ کیں جس میں چھ جلدوں پر مشتمل (العقد الفريد) بھی تھی جس کی تصحیح اور شرح وتہذیب میں احمد امین صاحب نے بھی کام کیا تھا، اسے لجنۃ التالیف نے شائع کیا ہے، ایک نسخہ اپنی کتاب ''حیاتی'' کا بھی دیا، بطور یادگار ایک فاؤنٹن پن بھی عنایت کیا اس عنایت پر میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور اسے قبول کرلیا پھر ہم لوگ بیٹھ کر باتیں کرنے لگے، میں نے ان سے عرض کیا کہ میری تمنا ہے کہ آپ قرآن کریم کے درس ومطالعہ میں زیادہ وقت صرف کریں، انھوں نے جواب دیا (الاسلام ماضيه و حاضره) کی تیاری میں مشغول ہوں، عنقریب اس کو ختم کرلوں گا، میں نے کہا مجھے توقع ہے کہ آپ کے قلم سے کوئی ایسی چیز نہ نکلے گی جس سے اس وقت کے آزاد خیال نوجوانوں کے ذہن میں کوئی شک وشبہ یا خلش پیدا ہو، انھوں نے کہا کہ یہ آپ واقعہ بیان کررہے ہیں یا محض تنبیہ مقصود ہے، میں نے کہا میری آرزو اور خواہش ہے، انھوں نے کہا تنقید وصراحت ضروری ہے، میں نے کہا یہ بات صحیح ہے، لیکن اس زمانہ کے لوگ برائیوں کو تو قبول کرلیتے ہیں اور خوبیوں کو چھوڑ دیتے ہیں، انھوں نے اس بات کی تائید کی۔

''زعماء الاصلاح فی العصر الحدیث'' پر میری رائے

میں نے ان سے کہا کہ آپ کی کتاب زعماء الاصلاح کا میں نے حجاز مقدس میں مطالعہ کیا۔ کتاب مجھے بہت پسند آئی اور میں نے اس سے استفادہ کیا، خصوصاً عبدالرحمٰن

کواکبی اور خیر الدین باشا تونسی اور مدحت باشا کے بارے میں جو کچھ آپ نے لکھا ہے اور جلیل القدر عالم شیخ محمد بن عبدالوھابؒ کے بارے میں معلومات حاصل ہوئیں، میں نے شیخ کے خاندان کے بعض علماء کو وہ حصہ پڑھ کر سنایا تو انھوں نے اس کی تصدیق کی اور پسند کیا، انھوں نے کہا الحمدللہ لیکن بعض اہلِ علم نے شیخ کے سفر بغداد کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس کی نفی کی ہے، میں نے کہا کہ شیخ عمر (۱) کا بھی یہی خیال ہے، احمد امین صاحب نے کہا کہ میں نے یورپین مصنفین کی کتابوں سے رجوع کیا ان سے میری تحریر کی تائید ہوتی ہے، میں نے کہا کہ سیّد امیر علی کو جو مقام آپ نے دیا ہے وہ اصلاح و نمائندگی کے اس مقام پر نہیں ہیں، وہ ان بڑے مصنفین میں ہیں جنھوں نے اسلام کی خوبیوں پر انگریزی میں روشنی ڈالی ہے اور اس زبان میں وقیع کتابیں لکھی ہیں، اسی طرح سر سید احمد خاں بھی اسلامی فکر و قیادت کے اس بلند مقام پر نہیں ہیں جو آپ نے ان کو دیا ہے، ان کی ذہانت ان کے علم سے بڑھی ہوئی تھی، ان سے بہت سی لغزشیں ہوئیں جن سے مسلمانوں کو نقصان پہنچا، ہندوستان میں اور لوگ بھی تھے جو ان سے زیادہ اس کتاب میں ذکر کے مستحق تھے۔ انھوں نے کہا وہ کون لوگ ہیں؟ میں نے کہا کہ حضرت سیّد احمد شہیدؒ، مولانا اسمٰعیل شہیدؒ، انھوں نے کہا کہ افسوس ہے کہ ہمیں ان حضرات کے بارے میں معلومات نہ حاصل ہوسکیں، میں نے کہا کہ آپ نے سیّد احمد شہیدؒ کا تو اپنی کتاب ''المھدویۃ والمھدیوین'' میں تذکرہ کیا ہے لیکن آپ نے مغربی مصنفین کی کتابوں سے معلومات اخذ کئے ہیں جن میں غلط بیانی اور رنگ آمیزی سے کام لیا گیا ہے اور جن کی معلومات نہایت ناقص ہیں، میں نے کہا اسی طرح علاّمہ اقبال اس قابل تھے کہ آپ کی کتاب میں ان کو نمایاں مقام حاصل ہوتا، انھوں نے کہا کہ میں ان کے بارے میں اتنی معلومات نہ حاصل کرسکا کہ ان کا تذکرہ کروں۔ ہمارے دوست عبدالوہاب عزام نے ایک مختصر کتابچہ ان پر شائع کیا ہے، میں قاہرہ میں ان سے ملا ہوں، وہ بڑے صاحب دل تھے،

---

(۱) اس سے مراد شیخ عمر ابن الحسن ہیں جو شیخ محمد ابن عبدالوہاب کے خاندان کے ذی علم فرد تھے عرصہ تک ریاض کے ہیئۃ امر بالمعروف نہی عن المنکر کے افسر رہے، حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے بڑے ہی قدرداں اور معترف تھے اور مملکت میں ان کا اثر و رسوخ رکھتے تھے۔ (مترجم)

میں نے ان سے کہا کہ ان کے فکر وشعر کا منبع ان کا دل ہی تھا میں نے ان کے مختصر حالات لکھے ہیں جو سعودی ریڈیو سے نشر ہو چکے ہیں۔

ازہر و جامعہ فواد کے بارے میں احمد امین کی رائے

اس کے بعد دوسرے موضوعات پر گفتگو ہونے لگی ڈاکٹر احمد امین نے کہا کہ حال میں ہالینڈ کے ایک طالب علم مجھ سے ملے، پوچھا کہ ازہر سے آپ کو کچھ توقع ہے؟ میں نے کہا ''نہیں'' اس لئے کہ ازہر قدامت پسندی کی تحریک کی قیادت کرتا ہے، درآنحالیکہ نوجوانوں میں اس وقت ایک بے چینی اور ترقی پسندی کی ایک تیز رو چل رہی ہے، دوسری بات یہ ہے کہ قصر شاہی ازہر کی سرپرستی کرتا ہے نہ وہ کچھ کرنا چاہتا ہے نہ کرنے دیتا ہے، پھر انھوں نے کہا کہ فؤاد یونیورسٹی (۱) سے آپ کو کوئی توقع ہے؟ میں نے اس کے بارے میں بھی کہا کہ نہیں، انھوں نے پوچھا کہ کیوں؟ میں نے کہا کہ وہ ایک خالص مغربی طرز کی دانش گاہ ہے۔

دین اور سیاست کی تفریق کے بارے میں احمد امین کی رائے

میں نے پوچھا کہ آپ کو شیخ علی عبدالرازق کی کتاب ''الاسلام واصول الحکم'' سے اتفاق ہے، انھوں نے نفی میں جواب دیا اور بتایا کہ استاذ علی عبدالرازق یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام صرف ایک روحانی پیغام ہے، اس کو حکومت وسیاست سے کوئی تعلق نہیں، اس کے برعکس میرا عقیدہ ہے کہ اسلام اجتماعی زندگی سے گہرا ربط رکھتا ہے، بیع وشراء اجارہ کے مسائل کے اصول رکھتا ہے، استاذ علی عبدالرازق کا مقصد یہ تھا کہ اسلامی فکر کو سیاست اور اجتماعی مسائل سے آزاد رکھیں، یہ بات اجتہاد کا دروازہ کھلا رکھنے سے حاصل ہو سکتی ہے، دین کو سیاست سے الگ رکھنے کی ضرورت نہیں۔

کیا مسلمان موجودہ تمدن اور دینی روح کے جمع کرنے میں ناکام رہے

میں نے کہا کہ حجاز میں میں نے بعض موقعوں پر کہا کہ مسلمان جدید تمدن اور دینی

---

(۱) جو بعد میں جامعۃ القاہرہ کے نام سے موسوم ہوئی جو مصر کی سب سے بڑی یونیورسٹی ہے۔

روح کو جمع کرنے میں ناکام رہے، تمدنی پہلو عموماً دینی پہلو کی حق تلفی کرتا ہے، یہ بات ان لوگوں کی کمزوری کے سبب سے ہوئی جو دینی پہلو کی نمائندگی کرتے تھے۔

ناکامی کے اسباب اور علاج ڈاکٹر احمد امین کی نظر میں

ڈاکٹر احمد امین نے کہا کہ اس ناکامی کے دو سبب ہیں، پہلا تو یہ کہ عالم اسلام میں ایسے علماء کی بہت کمی ہے جو شریعت کے کل مقاصد سے بخوبی واقف ہوں، اور مغربی تہذیب کی چھان پھٹک کر کے نفع ونقصان کا موازنہ کریں، دوسرا سبب جس کو آپ نے اپنی کتاب ''ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین'' میں بیان کیا ہے۔ نئے تمدن کے بارے میں مسلمانوں کا احساس کمتری ہے، اس کا علاج ایسے علماء کی دریافت ہے جو دینی اور دنیاوی دونوں علوم کے جامع ہوں، پھر مسلمانوں کے اندر یہ خیال پیدا کرنا کہ مغربی تہذیب نہ تو کُل کی کُل خیر ہے اور نہ سب کی سب شر ہے، بلکہ اس میں دونوں چیزیں ہیں، خیر بھی اور شر بھی۔ یہاں سے ہمارا موضوع بدل گیا۔ اس دوران ڈاکٹر احمد امین نے کہا کہ مغربی تہذیب کی بنیاد، ثقافت وادب سے زیادہ علوم پر ہے، اس کے برعکس مشرق نے ثقافت وادب میں زیادہ ترقی کی ہے، علوم میں نہیں۔

''ضحیٰ الاسلام'' پر میرا تبصرہ اور معتزلہ کے بارے میں میری رائے

میں نے کہا کہ آپ کی کتاب ''ضحیٰ الاسلام'' پر بعض اشکالات ہیں، ایک بات تو یہ کہ آپ نے معتزلہ کو ان کے مقام سے زیادہ اونچا درجہ دیا ہے، میرا خیال ہے کہ معتزلہ عقل کے دورِ طفولیت میں تھے، ان کی رائے ابھی پختہ نہیں ہوئی تھی، انھوں نے کہا ہاں لیکن وہ محدثین سے زیادہ وسیع فکر رکھتے تھے، ان کی بقاء اسلام کے لئے بہتر تھی، لیکن میں سیاست میں ان کے دخل دینے کو غلط سمجھتا ہوں، میں نے کہا یہ کر کے انھوں نے اپنے ہی اوپر زیادتی کی جیسا کہ آپ نے اپنی کتاب میں لکھا ہے، انھوں نے کہا کہ ان کی کتابیں ضائع ہوگئیں، مجھے

قاضی عبدالجبار معتزلی کی کتاب اتفاقاً مل گئی، عنقریب میں اسے شائع کروں گا، اس کے ذریعہ ہم معتزلہ کے بہت سے دینی خیالات سے واقف ہوجائیں گے، پھر ہم لوگ اٹھے اوران سے اجازت چاہی انھوں نے ہمیں اگلے دن دوپہر کو نیل ہوٹل میں کھانے کی دعوت دی ہم نے شکریہ کے ساتھ دعوت قبول کرلی اور الادارۃ الثقافیۃ میں ملنے کا وعدہ کیا۔

شیخ احمد محمد شاکر سے ملاقات

عصر کے وقت ہم لوگ مشہور مصنف اور سابق جسٹس (شرعی) احمد محمد شاکر سے ملنے کے لئے نکلے اور شیخ محمد عثمان اوران کے دوست عبدالرحمٰن آفندی جانو کی معیت میں ''مصر جدیدہ'' کا رخ کیا اور وہاں پہنچے، یہ نئے طرز کا ایک مستقل شہر ہے، معلوم ہوا کہ یہ چند سال پہلے آباد ہوا ہے، ہم نے الجمعیۃ الشرعیۃ کی مسجد میں نماز پڑھی پھر شیخ احمد شاکر کے گھر کا رخ کیا، ہمیں ان کا مکان علماء کے مقابلہ میں وزراء کے مکانوں سے زیادہ ملتا جلتا نظر آیا، استغفر اللہ ابھی تک میں ہندوستان ہی میں ہوں، اس سے کب نکلوں گا۔ مصری علماء کی حالت اور حیثیت، ہندوستانی علماء سے بہت مختلف ہے، اللہ تعالیٰ نے ان کو مال سے نوازا ہے، خوشحال زندگی عطا کی ہے، جس کے نتیجہ میں انھوں نے عہد عباسی کے قاضیوں کی یاد تازہ کردی ہے، جدید طرز پر سجے ہوئے ایک کمرہ میں ہم لوگ ان سے ملے، مختلف موضوعات پر گفتگو رہی، کچھ ازہر سے متعلق، کچھ مصر کی دینی انجمنوں سے متعلق، گفتگو سے معلوم ہوتا تھا کہ شیخ کی معلومات بہت وسیع ہیں، کثرت مطالعہ اور زندگی کے تجربات نے ان کے اندر کلامی اور فقہی اختلافات میں توسع اور لوچ پیدا کردیا ہے۔ میں نے ان کو کچھ پمفلٹ اور رسالے دیئے، اپنی کتاب'' ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین ''کا ان سے تذکرہ کیا تو فرمایا کہ آپ کی کتاب جیسے ہی بازار میں آئی میں نے اس کو حاصل کرلیا، دفتر میں برابر سامنے رہتی ہے، لیکن میں اس کو ابھی تک ختم نہ کرسکا، میں نے اپنے والد مرحوم کی کتاب ''الثقافۃ الاسلامیۃ فی الھند'' کی اشاعت کے بارے میں گفتگو کی، میں نے ان

سے اپنا یہ منشا ظاہر کیا کہ اس کی اشاعت کے سلسلہ میں بعض کتب خانوں اور مکتبوں سے گفتگو کریں، انھوں نے اس سے معذرت کی اور فرمایا ناشرین پر تجارتی مفاد زیادہ غالب رہتا ہے، مجھے یہ توقع نہیں کہ وہ علمی خدمت کی غرض سے کوئی چیز شائع کریں گے، ہمیں ان میں سے کسی سے امید نہیں تاہم میں کتاب ذرا دیکھوں گا، پھر آپ سے گفتگو کروں گا، ہم لوگوں نے واپسی کی اجازت چاہی، اس لئے کہ بعد مغرب کلیۃ الشریعہ کے طلباء میں میری تقریر کا وقت مقرر ہو چکا تھا۔

ازہر اور کالج کے نوجوانوں کے ساتھ

مغرب بعد ہم لوگ ''شبرا'' آ گئے، یہاں نوجوانوں کا بڑا منتخب مجمع نظر آیا جو کلیۃ الشریعہ اور ازہر کے کلیۃ اصول الدین اور کلیۃ الہندسۃ (انجینیر نگ کالج) جامعہ فؤاد اوّل کے کلیۃ التجارۃ (کامرس) کالج کے طلباء پر مشتمل تھا، ان نوجوانوں نے فرط اشتیاق میں کہا کہ آپ رات بھر تقریر کریں تو ہم لوگ نہ اکتائیں گے۔

میں نے ان کو دین اور دینی تحریکات سے متعلق باتوں کے سننے کا مشتاق و پیاسا پایا، کلیۃ اصول الدین کے طلباء میں سے ایک ذہین طالب علم یوسف قرضاوی (۱) اسٹیج پر آئے۔ اخلاص وحرارت ایمانی سے بھرپور سلجھی ہوئی مختصر تقریر کی، پھر اس رات کے مقرر کو خوش آمدید کہا اور اس کو دوستوں اور ساتھیوں کے سامنے پیش کیا۔

دنیا کے دو روپ ہیں، نوجوانوں میں میری تقریر

میں نے تقریر شروع کی اور کہا کہ اس عالم کی دو شکلیں ہیں ایک شکل تو خالق کائنات اللہ کی ذات سے تعلق رکھتی ہے، ہمارا اس میں کوئی دخل نہیں اور نہ اس کے بارے میں ہم سے کچھ پوچھا جائے گا، وہ ہے خلق وتکوین کی شکل، اللہ تعالیٰ نے جیسا چاہا اس عالم کو بنایا، وہ خوب جاننے

(۱) اس وقت کے طالب علم اور آج کی عالم اسلام کی طاقتور رہنما شخصیت علامہ یوسف القرضاوی مصری مقیم دوحہ قطر (مترجم)

والا اور باخبر ہے، اللہ ہی کی کاریگری ہے جس نے ہر چیز کو مستحکم کیا۔ ہم صرف اس کے مکلّف ہیں کہ اس میں غور وفکر کریں اور مخلوق کے ذریعہ سے خالق کو پہچانیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے،

" اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیَامًا وَّ قُعُوْدًا وَ عَلٰی جُنُوْبِھِمْ وَ یَتَفَکَّرُوْنَ فِی خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ ھٰذَا بَاطِلًا " (سورہ آل عمران ۱۹۱) وہ لوگ جو اللہ کو یاد کرتے ہیں کھڑے ہونے کی حالت میں اور بیٹھے ہونے کی حالت میں اور اپنے پہلوؤں پر لیٹے ہوئے اور غور کرتے ہیں آسمان اور زمین کی پیدائش کے بارے میں۔ اے ہمارے رب تو نے اس کو بے مطلب نہیں پیدا کیا'' لیکن ہم اس عالم کی خلق وتکوین کے مکلّف نہیں ہیں اور ہم سے یہ نہ پوچھا جائے گا کہ ستاروں کو اس طرح پھیلایا اور بکھیرا کیوں گیا ہے؟ سورج مشرق سے کیوں طلوع ہوتا ہے؟ مغرب میں کیوں غروب ہوتا ہے؟ پہاڑ یہاں کیوں نہیں ہیں، وہاں کیوں ہیں؟ کائنات کی تخلیق کے بارے میں اسی طرح کے اور سوالات، ہم دوسری شکل کے مکلّف ہیں، اس کے متعلق ہم سے سوال ہوگا، وہ کائنات کے اس وسیع نظام کی تشکیل وتنظیم جس کو خدا نے بنایا ہے، اور اس کو ہمارے ہی لئے مستقل ومحکم اور اچھی طرح منظّم ومرتب کیا، وہ بنیادی اصول جن کو قانون الٰہی کہا جاتا ہے، وہ ہم کو اس تنظیم کی بقاء اور عالم کی ذمہ داری سنبھالنے کا مکلّف بناتے ہیں، خدا نے اس زمین پر اپنا خلیفہ بنا کر ہم پر یہ ذمہ داری ڈالی ہے، فرمایا 'اِنِّی جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً " (البقرۃ ۳۰) (میں زمین پر اپنا خلیفہ بنانے والا ہوں) یکے بعد دیگرے انبیاء کرام اسی لئے تشریف لائے کہ اس عالم کو منظّم کریں، یہاں کی زندگی کو اللہ تعالیٰ کی پسند ومرضی کے مطابق ڈھالیں، اور سنواریں، اس میں سے ہر ایک اس عالم کی اصلاح اور اس کے نظم ونسق کی حفاظت کا حریص و خواہاں تھا یہاں تک کہ جب بعض بدطینت لوگوں نے زمین کے اس نظم کو بگاڑنا چاہا تو اس نے کہا (تم لوگ زمین میں بگاڑ نہ پیدا کرو اس کی درستگی کے بعد)'' وَلَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِھَا '' (الاعراب ۵۶) اور جب کسی قوم یا خاندان یا کسی جماعت نے اس بگاڑ اور عالم کے نظام کو نقصان پہنچانے پر کمر باندھ لی تو اللہ تعالیٰ نے اس کو جڑ سے نیست

ونابودفرمادیا۔

اس نظام کی بقاء جس کو وہ اس عالم کے لئے پسند کرتا ہے، اس کو بہت زیادہ عزیز اور اس کے نزدیک ضروری ہے، وہ نظام قوموں، جماعتوں اور بادشاہوں سے بھی زیادہ اہم و ضروری ہے، فرمایا" فَقُطِعَ دَابِرُ القوم الذين ظلموا والحمد لله رب العالمين " (الأنعام آیت ۴۵) (پس ان لوگوں کی جڑ کاٹ دی گئی جنھوں نے حَد سے تجاوز کیا اور ساری تعریفیں اللہ ہی کے لئے ہیں، جو سارے عالم کو پالنے والا ہے) کچھ قومیں اور تہذیبیں سامنے آئیں اور اس عالم کو اپنے فکر وعقیدہ، تربیت وعلم اور مقاصد کے مطابق نظم کیا، اللہ تعالیٰ ان کو یہ موقع اور آزادی اس لئے دیتا ہے، تاکہ ان کو پرکھے، کہ کون ان میں عمل کے اعتبار سے اچھا ہے فرمایا" و هو الذى جعلكم خلٰئف فى الارض و رفع بعضكم فوق بعض درجات ليبلوكم فيما اٰتاكم ان ربك سريع العقاب وانه لغفور رحيم " (سورۃ الانعام آیت ۱۶۵) (وہی ہے جس نے تم کو زمین پر خلیفہ بنایا اور تم میں سے بعض کو بعض پر بڑھایا رتبہ کے اعتبار سے تاکہ تم کو آزمائے اس چیز میں جو تم کو دیا ہے، بیشک تمہارا رب جلد باز پرس کرنے والا ہے اور بہت ہی معاف کرنے اور رحم کرنے والا ہے)۔

ان خودساختہ منتظمین کا دور ختم ہوا

یہاں سے روم اور یونان کا دور چلا پھر مسلمانوں اور اس کے بعد اہل یورپ کا، ہر ایک نے اپنی بہترین صلاحتیں اس دنیا پر ختم کردیں اور اس میں کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا، یہ مغربی تہذیب اور فلسفۂ مغرب کا دور ہے، اس نے اپنے ترکش کے سارے تیر ایک ایک کرکے آزمائے اور اپنی جھولی خالی کردی، اہل مغرب کے پاس جو بہتر سے بہتر صلاحیت تھی وہ اس کو میدانِ عمل میں لے آئے، انھوں نے جو کچھ کیا اس سے زیادہ وہ کر بھی نہیں سکتے تھے، ان کو فکر وعمل کی پوری آزادی اور وسائل کی ساری طاقت حاصل تھی، انھوں نے نظام عالم کو بگاڑ کر رکھ دیا۔

اس عالم کی از سر نو تعمیر وہی ہاتھ کر سکتے ہیں جنھوں نے حرم تعمیر کیا

یہ بات اچھی طرح ثابت ہو چکی ہے کہ اس عالم کی از سر نو اصلاح و تعمیر وہی ہاتھ کر سکتے ہیں جنھوں نے کبھی حرم کی تعمیر کی تھی، وہی قوم اس کو سنوار سکتی ہے جو حرم کی نگراں و محافظ، اور اس کو اپنا قبلہ سمجھتی رہی ہے، اس وقت جنگ دراصل مغربی تہذیب، اس کے فلسفۂ حیات، جمہوری و اشتراکی نظام اور اسلام و مسلمانوں کے مابین ہے، اب نوجوانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس جنگ میں قوت آزمائی کریں، حقیقت یہ ہے کہ یہ تحریک و دعوت انھیں کے توانا بازوؤں پر قائم ہوئی، بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ صحابۂ کرامؓ جن کے بل بوتے پر دعوت اسلام کا نشو و نما ہوا، اور اسلام پروان چڑھا، وہ کمزور اور زندگی سے الگ تھلگ تھے، ایسا نہیں ہے کہ زندگی نے انھیں ٹھکرا دیا تو وہ اسلام کی طرف متوجہ ہوئے بلکہ وہ زندگی کے مرد میداں اور معاشرے کے ستون تھے یہی وجہ تھی کہ جب قریش نے ہوشیار دانا اور اچھے نوجوانوں کو اسلام کی طرف آتے دیکھا تو کہہ اٹھے "ان هذا لشیء یُراد" (سورۂ ص آیت ۶) کہ یہ کوئی سوچی سمجھی بات معلوم ہوتی ہے۔

مجاہد نوجوانوں کی چند مثالیں

پھر میں نے ان لوگوں کے سامنے کچھ ایسے نوجوانوں کا ذکر کیا جنھوں نے اپنی ساری زندگی اور صلاحیت اور اپنے معاشی مستقبل اور عیش و عشرت کو کمیونزم کی دعوت اور اس کے اصول کی نشر و اشاعت کے پیچھے قربان کر دیا، میں نے بتایا کہ ان میں کا ایک شخص جو ناز و نعم کا پروردہ اور اور باعزّت ہوتا تھا، کس طرح یونیورسٹی اور ملازمت کو تج دیتا تھا، اور راستے پر کھڑے ہو کر کمیونزم کی تبلیغ کرنے والے اخبارات بیچتا، اور آوازیں لگاتا رہتا، اس کے دوست احباب اور خاندان کے لوگ اس کے پاس سے گذرتے وہ ذرا بھی جھینپتا نہ شرماتا، میں نے ان سے بیان کیا کہ جاپانی نوجوانوں نے اپنے وطن و عقیدے کی خاطر کیا کچھ نہ کیا۔

پھر میں نے ان کے سامنے ان نوجوانوں کی قربانی اور بہادری کی بہترین مثالیں

بیان کیں جو حضرت سیّد احمد شہیدؒ رائے بریلوی کی تحریک میں شریک ہوئے اور ہندوستان کی شمالی سرحد افغانستان تک ساتھ دیا اور آخر وقت تک ان کے دامن سے وابستہ رہے، میں نے ان سے سیّد موسیٰ (۱) کا قصہ بیان کیا جو اٹھارہ برس کی عمر میں جنگ مہیار میں زخمی ہوئے ،ان کے سر کا خون آنکھوں اور چہرہ پر چھا گیا تھا، اس حال میں بھی ان کے ہونٹ حرکت کر رہے تھے، اور وہ خدا کے ذکر میں رطب اللسان تھے، سیّد ابو محمد کا واقعہ بھی سنایا۔

ڈاکٹر یوسف القرضاوی اور بعض دوسرے ساتھیوں نے خواہش ظاہر کی کہ میں مولانا یحییٰ علی عظیم آبادی اور مولانا محمد جعفر تھانیسری کا واقعہ بیان کروں، میں نے دونوں بزرگوں کی سرگزشت بیان کی، میں نے کہا کہ دینی اخلاق روحانی اور علمی تربیت اور اس کی مکمل تیاری بہت ضروری ہے، کوئی اسلامی حکومت، قوی روحانیت اور صحیح علم کے بغیر نہیں قائم رہ سکتی، اس تیاری اور تربیت کا اثر مستقبل میں زیادہ بڑے دائرہ میں ظاہر ہوتا ہے، تقریباً ایک گھنٹہ تک میری تقریر جاری رہی، حاضرین کے مزید اصرار پر میں نے تقریر جاری رکھی، انھوں نے ہندوستان کی دعوت وتحریک کا طریقۂ کار تفصیل سے معلوم کرنے کا مطالبہ کیا، میں نے تفصیل سے ان کو بتایا، اور یہاں کے دعوتی طرز کی تشریح کی، یہ نوجوان اس تقریر سے بہت خوش اور محظوظ ہوئے اور بڑی پسندیدگی اور اخلاص کا اظہار کیا، ان میں سے اکثر نے میری کتاب ''ماذا خسر العالم'' پڑھی تھی، اُن لوگوں نے اصرار کیا کہ ہم رات وہیں گزاریں لیکن ہم نے معذرت کی اور ان سے کہا کہ کسی اور دن آپ لوگوں کے ساتھ رات گزاریں گے۔ ہم لوگ بہت تھکے ہوئے تھے، اور بڑی تاخیر سے اپنی قیام گاہ واپس ہوئے۔

۲۴/۴/۱۳۷۰ھ مطابق ۱/۲/۱۹۵۱ء

ڈاکٹر احمد امین سے مسئلہ یوگا اور تصوف پر گفتگو

آج سویرے میں نے اپنے رسالہ ''بین العالم وجزیرۃ العرب'' کا مقدمہ لکھا

---

(۱) حضرت سید احمد شہید کے بھانجہ ان کی تحریک کے جانباز کمانڈر سید احمد علی شہید کے فرزند عالی قدر (مترجم)

پھر ڈاکٹر احمد امین سے ملنے ''جیزہ'' گیا، ڈاکٹر صاحب ہمارے منتظر تھے، دوران گفتگو انھوں نے مجھ سے یوگا کے بارے میں دریافت کیا، میں نے کہا یہ ایک علم ہے، جو ہندوستان میں عام ہے، ان لوگوں کے پاس جسمانی ورزش، حفظان صحت اور جسم کو قوی بنانے کے اچھے تجربات ہیں، رہا روحانیت کا معاملہ تو اس میں یہ لوگ جسم کو تکلیف کا عادی بنا کر اور خواہشات نفسانی پر قابو حاصل کر کے خلاف فطرت چیزوں کا مظاہرہ کرتے ہیں، وہ نفس کو عرصۂ دراز تک لذائذ و خواہشات سے محروم رکھتے ہیں اور اسی طرح کی خلاف فطرت حرکتیں کرتے ہیں، اس میں شبہ نہیں کہ جب نفس کو سدھار لیا جائے تو آدمی میں حیرت انگیز باتوں کے مظاہرہ کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے، لیکن ان جوگیوں کے یہ کمالات اہل اللہ کے کمالات کے مقابلہ میں شعبدہ بازی اور کرتب سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے، یہی وجہ ہے کہ صوفیاء کرام جو سنت کے پیرو ہوتے ہیں اپنی اصل توجہ دل کی اصلاح و صفائی پر مرکوز رکھتے ہیں، بات تصوف اور صوفیاء کرام پر چل نکلی، اندازہ ہوا کہ ڈاکٹر احمد امین اس کا بھی کچھ ذوق رکھتے ہیں، ایک نقشبندی شیخ سے جو دوا فروش تھے، کچھ علم تصوف حاصل کیا تھا، میں نے کہا یہ حقیقت ہے کہ ان حضرات کے علم و تجربہ میں کچھ اذکار و اشغال اور معمولات و وظائف ہیں جن سے دل کو سکون اور قوت حاصل ہوتی ہے۔

حکیم اور عارف کا فرق

ڈاکٹر احمد امین نے کہا کہ میں نے کسی کتاب میں یہ پڑھا ہے کہ ایک مرتبہ ابن سینا کی مشہور بزرگ سلطان ابوسعید ابوالخیر سے ملاقات ہوگئی، دونوں حضرات تین دن تک ساتھ رہے، جدا ہونے کے بعد ایک شخص نے ابن سینا سے شیخ ابوسعید ابوالخیر کے مرتبہ کے متعلق پوچھا، ابن سینا نے جواب دیا کہ ان کی بلند مقامی کا حال یہ ہے کہ جو میں جانتا ہوں اسے وہ دیکھتے ہیں شیخ ابوالخیر سے ابن سینا کے بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے کہا کہ جو ابن سینا جانتے ہیں میں اس کو دیکھتا ہوں، میں نے عرض کیا کہ علامہ اقبالؒ نے اپنے شعر

میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

سَر دیں مارا خبر اورا نظر

او درونِ خانہ ما بیرون در

کثرت سے وحدت کی طرف

میں نے کہا کہ غور وفکر اور علم کا منشاء ومقصود کثرت سے وحدت کی طرف پہنچنا ہے یہ انسان کی سب سے بڑی طاقت اور سب سے بڑا عِلم ہے، اگر کسی شخص کو یہ بات حاصِل ہوجائے تو وہ اسباب ومادیت کی دہلیز پر جبہ رسائی اور پریشان نظری سے نجات پاجائے اور یہ علم حقیقی اس کو اسباب کے ذریعہ خالق اسباب تک پہونچادے، انھوں نے کہا ایک دن میں اپنے دوستوں کی ایک بے تکلف مجلس میں کہہ رہا تھا کہ صرف عقل علم کا سرچشمہ نہیں ہے بلکہ دل بھی انسان کے عِلم کا سرچشمہ ہے بعض احباب اپنے اس خیال پر مصر تھے کہ صرف عقل علم کا سرچشمہ ہے، میں نے ان سے کہا کہ مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی نے عقل پر تنقید کرتے ہوئے بڑے پتے کی بات کہی ہے، ان کا نظریہ یہ ہے کہ عقل بالکل بے خطا، اور انسان کی وجدانی صلاحیت اور کشف وادراک یکسر معصوم نہیں، بلکہ عقل ووجدان بھی ظاہری اور بدیہی چیزوں، نیز عادات و خواہشات سے متاثر ہوتے ہیں، حق وناحق صحیح وغلط اس طرح باہم مل جاتا ہے کہ انسان اس کو محسوس نہیں کرسکتا، ٹھیک اسی طرح جیسے آئینہ میں بہت سی چیزوں کا عکس نظر آتا ہے۔

علم کا صحیح سرچشمہ وحی الٰہی اور علم نبوّت ہے

میں نے کہا علم کا اصل سَرچشمہ جس پر اعتماد کیا جائے، وہ وحی الٰہی اور انبیاء کرام کا لایا ہوا عِلم ہے، تعجب کی بات ہے کہ مشہور جرمن فلسفی اس نتیجہ تک پہونچا اور اپنی معرکۃ الآرا کتاب (تنقید عقل خالص) میں عقل مجرد کے وجود کا انکار کیا ہے، ہم لوگ قاہرہ کے حدیقۃ الحیوانات

(زو) میں ٹہل رہے تھے، تبادلۂ خیال اور گفتگو کا سلسلہ برابر جاری تھا، چلتے چلتے ہم لوگ ''جزیرۃ الشائے'' پہونچے اور تالاب کے کنارے ایک چھتری کے نیچے بیٹھ گئے، ڈاکٹر احمد امین نے کھانا منگوایا تالاب کے صاف شفاف پانی اور اس میں تیرنے والی بطخوں کے دلفریب منظر کا بھی ہم لطف اٹھا رہے تھے اور ڈاکٹر صاحب کی پُر از معلومات باتوں سے بھی مستفید ہو رہے تھے، سلسلۂ کلام میں ڈاکٹر صاحب نے اس بات کو تسلیم کیا اور کہا، اس میں شک نہیں کہ تصوف کے ذریعہ آدمی تہذیب جدید کی ترغیبات کا مقابلہ کر سکتا ہے۔

شیخ جمال الدین اور محمد عبدہٗ کے بارے میں کچھ معلومات

میں نے کہا کہ شاید سید جمال الدین افغانی کو تصوف سے کچھ لگاؤ تھا وہ ذکر قلبی کیا کرتے تھے، ڈاکٹر احمد امین نے کہا، میں تو سمجھتا ہوں کہ شیخ محمد عبدہٗ پر بھی تصوف کا اثر تھا۔ یہ دونوں زاہدانہ زندگی گزارتے تھے، جب ان کا انتقال ہوا تو وراثت میں کچھ نہیں چھوڑا، میں نے پوچھا کہ آپ نے شیخ محمد عبدہٗ سے پڑھا ہے؟ فرمایا میں ان کے دو درسوں میں حاضر ہوا ہوں، وہ بڑے سخی اور ایثار پسند تھے، جو کچھ ملتا، اپنے ساتھیوں اور غرباء میں تقسیم کر دیتے، کچّی اینٹ کے گھر میں رہتے تھے، پھر وہ کہنے لگے وحدۃ الوجود کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ میں نے کہا یہ مسئلہ فکر و نظر سے زیادہ عمل سے تعلق رکھتا ہے، انھوں نے بھی یہی خیال ظاہر کیا اور فرمایا کبھی کبھی انسان کو بڑی قیمتی گھڑیاں اور کیفیات نصیب ہوتی ہیں لیکن اس کیفیت روحانی کو بقاء و دوام حاصل نہیں ہوتا، میں نے عرض کیا کہ اگر ہمیشہ یہ کیفیت رہے تو انسان زندگی سے کٹ کر گوشہ نشین ہو جائے اور یہ رزم گاہ حیات اور زندگی کا نظم و ضبط برقرار نہ رہ سکے، زندگی مفلوج ہو کر رہ جائے، انھوں نے کہا میں نے کچھ لوگوں کے بارے میں سنا ہے کہ ان کو ہمہ وقت یہ کیفیت حاصل رہتی تھی، میں نے کہا ایسا بھی ہوتا ہے اور یہ اس وقت ہوتا ہے جب انسان کو پورا ملکہ حاصل ہو جاتا ہے

تعلیم اور عہدۂ قضا کا فرق

طرح طرح کی باتیں ہوتی رہیں، میں نے کہا کیا آپ کو جج بننے کا شوق تھا؟ بولے نہیں، اسی لئے تو میں نے آخر میں عہدۂ قضا سے الگ ہوکر، درس وتدریس کا مشغلہ اپنایا، عہدۂ قضاء میں اکثر ایسے اجڑے ہوئے خاندان سامنے آتے ہیں جن سے طبیعت متأثر ہوتی ہے اس کے برخلاف درس وتدریس میں ایسی کلیاں سامنے آتی ہیں جو کھلنا چاہتی ہیں، ڈاکٹر احمد امین نے کہا میرے ایک استاد کہا کرتے تھے کہ تمہارا ذہن ریاضی پسند ہے، تم ادب کیوں پڑھ رہے ہو، میں نے کہا جی ہاں! اسی لئے آپ کا ادب حشو وزوائد سے پاک ہے، انھوں نے کہا میں ادب میں عقلی ترتیب پسند کرتا ہوں، میں شعر وشاعری کا ذوق اسی لئے نہیں رکھتا کہ اس میں عقلی ترتیب نہیں ہوتی، اس کے بعد دوپہر کا کھانا آگیا، کھانا کھا کر ظہر کی نماز پڑھی، پھر اجازت چاہی (ڈاکٹر صاحب چھٹیاں گزارنے کے لئے اسکندریہ جانے والے تھے)۔

جمعیۃ الشبان المسلمین کے ڈاکٹر عبدالحمید ہال میں

رات کو ہم لوگ جمعیۃ الشبان المسلمین کے عبدالحمید ہال میں ڈاکٹر سعید رمضان صاحب کی تقریر سننے کے لئے جمع ہوئے، تقریر طویل اور پرجوش تھی، تقریر دو گھنٹے تک جاری رہی، تقریر کا موضوع ''اسلامی اتحاد'' تھا، اس تقریر میں علمی رنگ سے بڑھ کر دینی رنگ غالب نظر آیا۔ اس سے ہمیں معلوم ہوا کہ مصری زندگی میں بڑا انقلاب پیدا ہوگیا تھا، مذہبی بات جو کبھی نامانوس اور طبیعتوں پر گراں تھی، اب مقبول وپسندیدہ ہوچکی ہے، اسی طرح سے نوجوان طلباء بھی دین کی طرف مائل ہیں، حاضرین جلسہ نے پوری تقریر ہمہ تن گوش ہوکر سنی، بہت سے جوانوں نے کھڑے کھڑے تقریر سنی، تقریر کے دوران ''اللّٰہ اکبر'' ''وللّٰہ الحمد'' کے نعرے گونجتے اور زوردار تالیاں بجتیں۔

۲۵/۴/۱۳۷۰ھ مطابق ۲/۲/۱۹۵۱ء جمعہ

صبح کو ناشتہ کے بعد ہم لوگ الحاج علی شریف کی دوکان شبرا گئے تا کہ یہاں سے ''اوسیم'' جہاں جمعہ کی نماز پڑھیں گے اور الحاج عطیہ البھو اشی کے یہاں دوپہر کا کھانا ہوگا، وہاں اچانک ہمارے دوست شیخ احمد عثمان ہم لوگوں سے ملنے آگئے فرمایا: ''مصر پر تو بجلی گر گئی''، میں نے کہا کیا بات پیش آئی، انھوں نے بتایا کہ یونیورسٹی کے طلباء نے مطالبہ کیا ہے کہ پیشہ ور عورتوں کو حسب سابق اجازت دی جائے، ان پر جو پابندی لگائی گئی ہے اس کو ختم کیا جائے، اس لئے کہ نوجوان لڑکے راہ چلتی لڑکیوں سے بہت چھیڑ چھاڑ کرنے لگے ہیں، اس کے بغیر اب اس پر قابو نہیں پایا جا سکتا کہ پیشہ ور عورتوں کو اجازت دی جائے، اس واقعہ سے وہ بہت متاثر تھے دوسرے وقت پھر میرے پاس آئے، دینی حمیت اور جوش اسلامی سے مغلوب الحال تھے، ازہر کے علماء کو سخت سُست کہنے لگے، فرمایا جس طرح انھوں نے گریڈ اور یکسانیت کے لئے اسٹرائک کی ہے۔ دینی اخلاقی قدروں کے لئے کیوں نہیں کرتے؟ جس طرح اپنی ذاتی غرض کے لئے انھوں نے اسٹرائک کی خدا اور رسولؐ کے لئے کیوں نہیں کرتے؟ میں نے کہا آپ کا یہ احساس بالکل صحیح ہے، لیکن اسلام سے کشمکش، اخلاق سے مذاق، بے حیائی اور فطری حدوں سے تجاوز میں ترقی ہوتی ہی رہے گی، جب تک کہ سوسائٹی میں طاقت ور دینی روح اور ان مضحکہ خیز اور رُلانے والے واقعات کے مقابلہ میں صحیح حمیت دینی اور خودداری نہ پیدا ہو جائے۔

معاشرہ میں دینی شعور و روحانی بیداری

جب تک سوسائٹی کے افراد میں دینی شعور نہ پیدا ہوگا اور قوم حکومت کے اخلاقی میلان اور اس کے اختیارات کی رقیب و محاسب نہ ہو یہ روگ دور نہ ہوگا اس کے بغیر ہر تدبیر وقتی اور ناقص ہوگی ہم الحاج عطیہ کی موٹر پر سوار ہوئے، ہمارے ساتھ استاد محمد غنائم تھے، جو اخبار ''صوت الامۃ'' کے محرر اوّل اول اور وزیر صحت کے پریس سکریٹری تھے، ہم

لوگ موٹر ہی میں بیٹھے ہوئے مصری ریڈیو اسٹیشن سے قرآن کی تلاوت سنتے رہے، میں نے کہا اس وقت قرآن کا سننا کتنا عام ہو گیا لیکن اس کے بقدر فائدہ اٹھانا اور اس سے متاثر ہونا کتنا کم ہو گیا ہے، ہم لوگ ایک دیہی مقام ''اوسیم'' گئے۔

مصری دیہات کی سیر

پہلی بار میں نے مصری دیہات دیکھا، یہاں اور ہندوستان کے دیہات میں اتنی یگانگت تھی کہ ایسا محسوس ہوا جیسے ہم ہندوستان میں ہیں، دیہات کی جس زندگی کو ہم لوگ دیکھ رہے تھے اور زمین کے جن حصوں کو ہم طے کر رہے تھے یہ اتنے پسماندہ تھے، جیسے ان کا قاہرہ سے کوئی تعلق نہیں، قاہرہ تہذیب وتمدن کے بام عروج پر ہے اور یہ دیہات انتہائی پسماندہ غریب مفلوک الحال اور حکومت کی بے توجّہی کے شکار ہیں۔

معیار زندگی میں بہت زیادہ فرق ایک بڑا خطرہ ہے

زندگی کے رہن سہن تہذیب وثقافت میں ایک ہی سوسائٹی، ایک ہی شہر، بلکہ شہر کے ایک ہی محلّہ میں یہ نمایاں فرق ملک وقوم کے لئے بڑا خطرہ ہے، یہی چیز معاشی بغاوت اور کمیونزم کے لئے راہ ہموار کرتی ہے۔

ہم لوگ الحاج ''عطیہ الہواشی'' کے گھر پہونچے، ان کا مکان ایک شاندار محل تھا، میں نے قاہرہ میں سنا تھا کہ انھوں نے اس کی تعمیر میں ۲۵ ہزار پونڈ صرف کئے، پھر ہم مسجد گئے اور جمعہ کی نماز پڑھی، ہمارے دوست سیّد علی محمود الشریف نے خطبہ دیا اور نماز پڑھائی، نماز کے بعد میری تقریر کا اعلان کیا، میں کھڑا ہوا اور سورہ عصر کی تفسیر بیان کی، جیسے ہی میں نے تقریر ختم کی لوگ مجھ پر ٹوٹ پڑے، ہر ایک مصافحہ کرنا چاہتا تھا، اتنا ہجوم تھا کہ میں نے خطرہ محسوس کیا کہ کہیں گر نہ جاؤں اور لوگ مجھے روند ڈالیں، احباب لوگوں کو مجھ سے مصافحہ کرنے سے روک رہے تھے، مگر کامیاب نہ ہوتے تھے، میں نے ایسی گرمجوشی محبت اور اخلاص کا مشاہدہ کیا جس سے مجھے سابقہ نہ پڑا تھا، مجھے لوگوں کے اس طرح پروانہ وار ٹوٹنے سے شرم آرہی تھی۔

دیہات میں مسلم مہمان کے سَاتھ اچھا برتاؤ

میں اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ ان لوگوں کے حسن ظن کو صحیح ثابت کرے اور ہمیں آخرت میں رسوا نہ کرے، ان کا برتاؤ دیکھ کر دل پر دین کے غلبہ اور اثر ونفوذ کا مجھے اور یقین آ گیا کہ میں ہندوستان کا رہنے والا اور یہ مصر کے، دینی تعلق کے سوا ہمارا ان کا کوئی رشتہ نہ تھا، لیکن وہ اس اخلاص اور دلی کیفیت سے مل رہے تھے کہ روئے زمین کے کسی خطّہ میں کسی پردیسی سے اس طرح نہیں ملا جاتا، یہ دینی جذبہ تھا جس کی وجہ سے یہ سب کچھ ہو رہا تھا، ہم لوگ مسجد سے نکلے تو جلال بے صاحب اور دوسرے احباب کو اپنا منتظر پایا، ان حضرات کو الحاج عطیہ نے ہمارے ساتھ کھانے پر بلایا تھا۔

کچّا مال جو ضائع ہو رہا ہے

میں مسلمان بھائی کے ساتھ ان کے اس اچھے برتاؤ، سلامت طبع اور جذبۂ محبت سے متاثر تھا، میں نے اس احساس کا اظہار بھی اپنے دوستوں سے کیا اور کہا دنیا میں خام مال جتنا بہتر سے بہتر پایا جا سکتا ہے وہ آپ کے پاس موجود ہے لیکن وہ بے فائدہ ہے، اس کو کوئی ایسا شخص میسر نہیں، جو اسے صحیح رخ پر ڈالے اور اس سے فائدہ اٹھائے، استاد جلال حسین نے میری تائید کی اور فرمایا میں مشرق ومغرب کے ملکوں میں پھرا ہوں، یورپ کی کئی بار سیر کی ہے لیکن اس کو ان دیہاتی مصریوں کے مقابلہ میں ایمانی اور روحانی طور سے زیادہ صاف ستھرا، زیادہ اچھا اور طاقتور نہیں پایا مگر ہم احساس کمتری کے شکار ہیں، ہم اپنا اور اپنی قوم کا اعتماد کھو چکے ہیں، ہم اس کو حقیر اور کمتر اور یورپ کے معاشرہ کو بلند و برتر سمجھتے ہیں، خدا شاہد ہے کہ ہم نے صفائی اور سلامت طبع، ایمانی قوت اور فطری صلاحیت، اس درجہ کی کہیں نہیں دیکھی، جتنی عرب مسلمان اور دیہات کے عام باشندوں میں دیکھی، استاذ عبدالوہاب نے اس کی تائید کی پھر ہم نے ان کے سامنے ہندوستان کے طریقۂ اصلاح ودعوت کی تشریح کی، عوام سے ملنے، پڑھے لکھے خوشحال لوگوں کے اس راہ میں تعاون کرنے گاؤں اور شہروں میں نکلنے کا

حال بیان کیا، ہم نے بتایا کہ وہ لوگ مہینہ یا ہفتہ میں کچھ دن متعین کر لیتے ہیں جس میں وہ دینی تبلیغی سفر کرتے ہیں، استاذ جلال حسین نے میری تائید کی اور ہندو پاک میں انھوں نے جو کچھ دیکھا تھا اور اس دعوت و تبلیغ سے ان دونوں ملکوں میں جو نفع ہوا ہے اس کو بیان کیا، میں نے حاضرین میں اس خاکہ کو اپنے شہر میں چلانے کا شوق محسوس کیا شاید اللہ تعالیٰ اس کے بعد کوئی صورت پیدا فرمائے، اس کے بعد ہم لوگ کھانے کے لئے گئے، کھانے سے فارغ ہو کر عصر کی نماز پڑھی، پھر الحاج عطیہ اور دوست علی محمود کے ساتھ قاہرہ واپس ہو گئے۔

۲۶/۴/۱۳۷۰ھ - ۳/۲/۱۹۵۱ء بروز سنیچر

جامع ازہر کی زیارت

ازہر کے قریب رہتے ہوئے اس کو نہ دیکھنا بڑی زیادتی کی بات معلوم ہوئی، اگرچہ اس وقت ازہر میں اسٹرائک چل رہی تھی، تاہم خیال ہوا کہ ازہر دیکھنے کا شرف حاصل کریں اس کے دارالاقامہ، کالج، دفاتر، جو کچھ بھی دیکھ سکیں دیکھ لیں، غرض کہ پہلے ہم جامع ازہر گئے اور اس تاریخی مسجد اور عظیم گہوارۂ علم میں داخل ہوئے جس نے اتنے ائمہ، محدثین، فقہاء، مصنفین، صلحاء اور داعی پیدا کئے کہ عالم اسلام کے کسی دوسرے تعلیمی ادارے اور یونیورسٹی نے پیدا نہ کئے ہوں گے، اس مبارک مسجد اور اس عظیم درسگاہ کا اجتماع کیا خوب ہے، ہم مسجد میں داخل ہوئے تو ان علماء دین و سلف اور دین کے سچے خادموں کی یاد تازہ ہوگئی جو چٹائی اور معمولی فرش پر بیٹھتے تھے اور بادشاہوں پر حکومت کرتے تھے، وہ اپنی قوم، دین اور علم کے بے لوث خادم، اور صحیح معنوں میں راہ حق کے مجاہد تھے، مسجد میں داخل ہوتے ہی ہمیں علم کی بو محسوس ہوئی، علم و اخلاص، خوفِ خدا اور دنیا سے بے تعلقی کی تیز مہک لئے ہوئے، شاندار ماضی کا ایک لطیف جھونکا مشام جاں کو معطر کر گیا، اسٹرائک کے بعد جب تعلیم شروع ہوگی تو پھر انشاء اللہ ازہر آئیں گے۔

ازہر کے دفتر میں

مسجد سے نکل کر ہم ازہر کے دفتر کی طرف چلے، دفتر اتنا وسیع و شاندار تھا کہ جیسے

کسی حکومت کا سکریٹریٹ ہو، ہم ایک کمرے سے دوسرے کمرے کی طرف بڑھتے گئے اور ان پر لگی ہوئی تختیوں کو پڑھتے گئے، چلتے چلتے ہم ایک ایسی تختی کے پاس سے گزرے جس پر (ادارہ مجلۃ الازہر) لکھا ہوا تھا۔

استاذ محمد فرید وجدی سے باتیں

یہاں میں رک گیا، مجھے استاذ فرید وجدی یاد آ گئے، جن سے میں طالب علمی کے زمانہ سے واقف تھا، میں نے ان کا دائرۃ معارف القرن العشرین (بیسویں صدی کا انسائیکلو پیڈیا آف اسلام) اور بہت سے مقالے پڑھے تھے، ہم نے ان کو ملاقاتی کارڈ بھیجا، اسی وقت ہم لوگ بلا لئے گئے، استاذ فرید وجدی ہم سے ملے اور خوش آمدید کہا، جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ ہم لوگ ہندوستان کے رہنے والے ہیں اور ان کی تصنیفات اور مضامین سے واقف ہیں تو وہ ہماری ملاقات سے بہت خوش ہوئے، میں نے ان کو بتایا کہ ان کی پرانی کتاب (المرأۃ المسلمۃ) کا جس کو انھوں نے قاسم امین کی کتاب (المرأۃ المصریۃ) کی تردید میں لکھا تھا، ہندوستان میں بہت عرصہ پہلے اردو میں ترجمہ ہو چکا ہے، ترجمہ ہندوستان کے وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی نوجوانی کے زمانہ میں کیا تھا، ترجمہ بہت اچھا اور ادبی شاہکار سمجھا جاتا ہے، میں نے عرض کیا کہ آپ تو مصر کے پرانے لکھنے والوں میں سے ہیں۔ خدا آپ کی عمر میں برکت دے، آپ کی عمر کیا ہوگی؟ فرمایا بہتر سال، میں نے ان سے کہا کہ ہم آپ کی دینی اور جدید علوم کی جامع شخصیت سے واقف ہیں فلسفۂ یورپ اور علوم جدیدہ کے ہتھیاروں سے اسلام کے دفاع کی خدمات سے باخبر ہیں، انھوں نے کہا کہ موجودہ زمانہ میں اسلام کی خدمت کا یہی بہتر طریقہ ہے۔

انگریزی اور فرانسیسی تعلیم کا فرق

میں نے استاذ فرید وجدی سے پوچھا آپ کی تعلیم انگریزی ہے یا فرانسیسی؟ انھوں نے کہا تعلیم تو فرانسیسی ہے لیکن میں انگریزی زبان کو فرانسیسی زبان پر ترجیح دیتا ہوں

میں نے کہا شاید انگریزی زبان میں علمی گہرائی زیادہ ہے اور فرانسیسی میں ادب وشعر وشاعری کا پہلو غالب ہے انھوں نے کہا ہاں ایسا ہی ہے، میں نے کہا انگریز قوم حقیقت پسند ،سنجیدہ اور دھن کی پکّی ہے انھوں نے کہا انگریز روحانیت کی طرف متوجہ ہیں اور اس کو پڑھ رہے ہیں آئندہ ان سے روشنی چمکے گی میں نے کہا معاف فرمایئے گا، انگریز روحانیت کی طرف ایک صنعت اور فن کی حیثیت سے توجہ کرتے ہیں وہ اپنی تحقیق اور مطالعہ میں حق کی سچّی طلب نہیں رکھتے ،اس بات پر استاذ فرید وجدی خاموش رہے گویا انھوں نے میرے اس خیال سے اتفاق ظاہر کیا۔

پھر ہم لوگوں نے ہندوستانی مسلمانوں اور ان کے مستقبل کے متعلق باتیں کیں انھوں نے کہا کہ مجھے توقع ہے کہ ہندو مستقبل میں اسلام کی طرف متوجہ ہوں گے میں نے کہا مجھے بھی یہی امید ہے۔

استاذ محمد فؤاد عبدالباقی سے ملاقات

''مفتاح کنوز السنۃ'' کے مترجم جنھوں نے اس کو ہالینڈ کی زبان سے عربی میں منتقل کیا) استاذ محمد فؤاد عبدالباقی سے شیخ کے یہاں اتفاقاً ہم لوگوں سے ملاقات ہوگئی ،انھوں نے مولانا سیّد سلیمان ندوی کے بارے میں پوچھا اور ان کی تعریف کی انھوں نے بیان کیا کہ سیّد صاحب نے میرے خط اور ہدیہ کا بہت اچھا جواب دیا۔ اظہار تشکر فرمایا اور میری محنت کو سراہا، میں نے استاذ محمد فؤاد عبدالباقی کو اپنی کتاب ہدیہ کی انھوں نے خوشی سے قبول فرمایا اور ہم سے دفتر ہی میں ملنے اور اپنی بعض تصنیفات کے ہدیہ کرنے کا وعدہ کیا۔

جامع ازہر کے دارالاقامہ کے بارے میں میرا تأثر

مصری کتب خانوں کے سابق ناظر اور ''السمیر المہذب'' کے مصنف استاذ علی فکری سے اسی طرح اتفاق سے ملاقات ہوگئی ،ہم نے ان سے تعارف حاصل کرلیا دفتر سے نکلنے کے بعد ''کلیۃ الشریعہ'' کے طالب علم محمد الدمرداشی کی معیت میں ہم نے ''کلیۃ

الشریعہ'' اور اس کا کتب خانہ دیکھا اور ازہر کے دارالاقاموں میں گئے، دارالاقامہ کی بدنظمی اور گندگی دیکھ کر ہمیں تکلیف ہوئی، میرا خیال ہے کہ یہ دارالاقامہ اپنے مکینوں کے اندر کمزوری و بے مائیگی کا احساس پیدا کرتے ہیں، یونیورسٹیوں اور کالجوں کی زندگی وہاں کے نظام، طلبہ کے اندر زیادہ عزت پیدا کرتے ہیں، اسی ذہنیت کو احساس کمتری کہتے ہیں وہاں دین اور علم پر فخر کرنے کا کوئی جذبہ نہیں جو اس احساس کا مقابلہ کرے، زیادہ بہتر یہ ہوگا کہ جامع ازہر ایسے دارالاقامے بنائے جو نظم اور صفائی میں علوم جدیدہ کے کالجوں اور یونیورسٹیوں اور ہاسٹلوں سے کم نہ ہوں، ہم نے شیخ امین خطاب اور دیگر مہمانوں کے ساتھ دوپہر کا کھانا کھایا، عصر کے وقت ہم لوگ استاذ رشاد عبدالمطلب کے ساتھ حکومت عثمانیہ کے سابق شیخ الاسلام شیخ مصطفیٰ صبری آفندی سے ملنے گئے، لیکن وہ بیمار تھے ہم ان سے ملاقات نہ کر سکے ہم نے اپنی کتاب ''ماذا خسر العالم'' اور کچھ رسالے ہدیۃً ان کو بھیج دیئے۔

علاّمہ محمد زاہد کوثری سے ملاقات

یہاں سے ہم لوگ شیخ صبری کے دوست اور ساتھی اور مشہور مصنف علامہ محمد زاہد کوثری سے ملنے گئے، وہ بڑی تواضع اور خوش خلقی کے ساتھ ملے انھوں نے اپنی خاکساری اور بشاشت سے ہمیں علماء ہند کی یاد دلادی ہم لوگ بیٹھ کر باتیں کرنے لگے گفتگو کا اکثر حصہ مولانا شبلی نعمانیؒ اور مولانا سید سلیمان ندویؒ کی کتاب سیرۃ النبی کے ترکی ترجمہ، مولانا یوسف بنوری اور ہندوستان کے مخطوطات سے متعلق رہا۔ انھوں نے اپنی تصنیفات اور پمفلٹوں کا ایک اچھا مجموعہ ہم کو ہدیہ کیا۔ افسوس کہ مجھے دینی بحث ومباحثہ اور مناظرہ کا ذوق نہیں رہا ہے، ائمہ کے متعلق ان کی شان کو گھٹانے اور ان کے دفاع میں جو کچھ لکھا اور کہا گیا ہے مجھے اس سے زیادہ واقفیت نہیں، ورنہ بڑی اچھی اور دلچسپ نشست رہتی پھر ہم نے ان سے اجازت چاہی، ان کی خاکساری، سادگی، وسعت معلومات، نشاط اور اس کبرسنی میں مطالعہ اور تصنیف میں ان کی مشغولیت بڑی بھلی معلوم ہوئی جب کہ یہ بڑھاپے کا زمانہ علمی مشقتوں کے برداشت کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔

۲۷/۴/۱۳۷۰ھ مطابق ۴/۲/۱۹۵۱ء بروز اتوار

فوجداری عدالت کی سیر اور اخوان کے مقدمے میں حاضری

عبداللہ عقیل عراقی آئے، ان کے ساتھ ہم پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق عدالت فوجداری گئے، آج اخوان المسلمین کے مقدمہ میں ماخوذ اشخاص کی صفائی میں ڈاکٹر سعید رمضان کی بحث تھی میں نے سوچا مصری عدالت کا منظر دیکھوں، کہ وہ بھی زندگی اور ملکوں کے انتظامی امور کا ایک شعبہ ہے، ہم لوگ عدالت پہنچے، خدام نے ہماری تلاشی لے کر داخلہ کی اجازت دے دی، عدالت کے کمرہ میں طلبہ، نوجوان، عورتوں اور وکیلوں کی ایک بڑی تعداد نظر آئی، عدالت کے منتظمین اور خدام کی زبان سے خیر مقدم کے ایسے الفاظ سنائی دیئے جن کا ہمیں اپنے ملک کی عدالتوں میں سننا ناممکن ہے، جہاں بے رخی کا ماحول ہوتا ہے۔ جہاں کی فضا کا خوفناک اور ڈراونا ہونا ضروری ہے، اس کے برعکس یہاں مصری عدالت میں ہم نے بعض چپراسیوں کو کہتے سنا (برکت آئی) یہ لوگ ہمارے مہمان ہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ عربوں کی فطرت و مزاج میں ایسی بشاشت و خوشدلی ہے جو ان کے ضمیر سے کسی آن جدا نہیں ہوتی، ہم نے نگاہ اٹھائی تو ججوں اور ان کے ایڈوائزر حضرات کی نشست گاہ میں ان کے سر کے اوپر دیوار میں ایک تختی لگی ہوئی نظر آئی جس میں قرآن کریم کی یہ آیت لکھی ہوئی تھی " إِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ " (النساء آیت ۵۸) (اور جب تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو) دل ہی دل میں میں نے کہا کاش کہ اسلامی ملکوں میں فیصلوں کی بنیاد اسی پر ہوتی، وہاں کی عدالتوں کا یہی شعار اور دستور العمل ہوتا اور کاش کہ کتبہ حکام اور ججوں کی نگاہوں کے سامنے ہوتا، نہ کہ ان کے سر کے پیچھے، جیسا کہ اس وقت ہے، عدالت کا لباس پہنے ہوئے جیوری کے لوگ آئے اور کرسی عدالت پر بیٹھ گئے، پھر قیدی آئے اور مجرموں کے کٹہرے میں داخل ہو گئے۔

استاذ سعید رمضان کی صفائی اور اس کا تأثر

سرکاری وکیل ایک طرف بیٹھا اور استاذ سعید رمضان وکیل صفائی کی حیثیت سے بحث کے لئے کھڑے ہوئے مقدمے کو بڑی موثر تقریر اور بے مثال جراءت کے ساتھ پیش کیا، حضرت آدمؑ کے خلیفہ بننے اور پھر ان کے جنت سے نکلنے، حق و باطل کی قدیم جنگ آزمائی، نبوی تعلیمات سے شیاطین کی ازلی کشاکش پر روشنی ڈالی، پھر خلافت اسلامیہ کے شباب، بعد ازاں اس کے ضعف واضمحلال کا نقشہ کھینچا، تاتاریوں کے حملے، صلیبیوں کی غارت گری کا قصہ دل سوز سنایا، پھر انیسویں صدی میں یورپین صلیبیوں کا ذکر کیا اور انگریزی غلبہ کے اسباب بتائے اور آخر میں یہودی اسلام دشمنی، ان کے منصوبوں اور عالم اسلام کے لئے اس سے پیدا ہونے والے خطرات پر سیر حاصل بحث کرتے ہوئے بتایا کہ ان خطرناک حالات میں تحریک اخوان المسلمین وجود میں آئی اور ان حالات سے نبرد آزما ہوئی ، اخوان کی پوزیشن مجاہدین فی سبیل اللہ کی ہے، باغیوں اور مجرموں کی نہیں، استاذ سعید رمضان اپنی ان تمام باتوں کو قرآنی آیات اور احادیث نبوی کی روشنی میں مضبوط و مدلل کرتے جارہے تھے، جس وقت وہ آیات واحادیث سے استشہاد پیش کرتے عدالت کا ماحول دینی فضا سے بدل جاتا، حاضرین کے دلوں پر رقت وخشیت طاری ہوجاتی، مقرر اور لوگ بھول جاتے کہ وہ عدالت میں ہیں، انہیں تصور ہونے لگتا کہ وہ کسی دینی وعظ یا سیاسی جلسہ میں ہیں، یہ بات وکیل کی قوت گویائی، اس کے ایمان ویقین، فضا کے بدلنے اور تحریک اخوان المسلمین سے اس کے متاثر ہونے پر دلالت کرتی ہے پھر جب وکیل نے جج صاحبان کے ایڈوائزروں کے جذبۂ انصاف ورحمت کو اپیل کیا اور چاہا کہ ان کے جذبۂ ایمان اور دینی شعور کو بیدار کرے کہ وہ فطرتاً مسلمان تھے تو لوگ بہت متاثر ہوئے، آخر میں جب انھوں نے اپنی تقریر کا رخ قیدیوں کی طرف موڑا اور انھیں صبر واستقامت کی تلقین کی اور اس مضمون کی احادیث اور آیات پڑھ کر ان کو سنائیں تو آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے

اور عدالت کے گوشوں سے آہ و بکا کی آوازیں بلند ہوئیں، خصوصاً جدھر عورتیں تھیں، ہم لوگوں نے عدالت میں جو کچھ دیکھا اور سنا اس سے بہت متأثر اور حیرت زدہ ہو کر نکلے۔

اخوان المسلمین کے بانی امام حسن البنا کے والد شیخ احمد بن عبدالرحمٰن کے ساتھ

ہم لوگ عدالت دیکھنے کے بعد امام حسن البنا کے والد شیخ احمد بن عبدالرحمٰن البنا ساعاتی کے پاس گئے، ہندوستان میں ہم ان کو ''الفتح الربانی'' کے مصنف اور حدیث شریف کے ایک خادم کی حیثیت سے جانتے تھے، یہاں ہمیں معلوم ہوا کہ وہ شیخ حسن البنا کے والد ہیں، اگر بہت سے لوگ اپنے باپ کے نام سے مشہور ہوئے تو کچھ ایسے بھی ہیں جن کو اپنے ہونہار بیٹوں کے نام سے شہرت حاصل ہوئی، ان کے گھر پہنچے دروازہ کھٹکھٹایا تو وہ باہر تشریف لائے، درازیٔ عمر اور حوادث روزگار نے انھیں بوڑھا اور کثرت مطالعہ وتصنیف وتالیف نے بہت کمزور کر دیا تھا، وہ ہمیں ایک ایسے کمرے میں لے گئے جو ہر طرف کتابوں سے بھرا ہوا تھا، انھوں نے ہمیں بتایا کہ مسند امام احمد بن حنبل کی طرح مسند امام شافعیؒ کی تہذیب بھی انھوں نے کی ہے اور مسند ابی داؤد الطیالسی پر بھی کام کیا ہے، انھوں نے بتایا کہ ان کو ہندوستان کا چھپا ہوا ایک نسخہ مل گیا، ہندوستان کے علماء کے بارے میں جو لکھا ہے اس سے ہمیں آگاہ کیا اور ان کی علمی خدمات اور اخلاص عمل کو بہت سراہا، پھر از راہ نوازش عربی قہوہ لائے۔

شیخ حسن البنا کے والد اپنے قابل فخر فرزند کا قصّہ سُناتے ہیں

میں نے ان سے عرض کیا کہ اسلام کے مرحوم سپوت آپ کے صاحبزادہ عالی قدر شیخ حسن البنا کے بارے میں ہم آپ سے کچھ سننا چاہتے ہیں ان کے بچپن اور جوانی کے حالات کیسے تھے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ولا ینبئك مثل خبیر (سورۂ فاطر آیت ۱۴) (حقیقت حال تمہیں کوئی باخبر ہی بتا سکتا ہے) فرمایا بہت اچھا، اور پھر بڑی تفصیل کے ساتھ ان کے حالات زندگی بیان کئے، بتایا کہ بہت عرصہ تک میرے کوئی بچہ نہیں پیدا ہوا، یہاں تک کہ مجھے اولاد کا

شوق ہوا اور میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ مجھے ایک نیک لڑکا عنایت فرمائے، میں نے ایک چھوٹے سے بچے کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا تو مجھے بہت بھلا معلوم ہوا، میں نے کہا میرا بچہ اس بچہ کی طرح نماز پڑھے اور اللہ اس کو ہونہار بنائے اس کے بعد میرے ایک لڑکا پیدا ہوا میں نے اس کا نام حسن رکھا اس لئے کہ جب میری شادی ہوئی تو والدہ نے میری بیوی کو ''ام الحسن'' کہہ کر مخاطب کیا، جب یہ بچہ عمر کے چوتھے سال میں داخل ہوا تو میں نے اس کو ایک مکتب میں داخل کر دیا وہ برابر ایک مکتب سے دوسرے مکتب منتقل ہوتا رہا یہاں تک کہ قرآن پاک کے ۲۷ پارے حفظ کر لئے، میں نے ارادہ کیا کہ اس کو ''دمنہور'' کے مدرسۃ المعلمین الاولیۃ میں داخل کر دوں، مگر پیچیدگی یہ تھی کہ مدرسہ اپنے یہاں ایسے لڑکوں کو داخل کرتا تھا جن کا حفظ مکمل ہو چکا ہو، میں نے ایک دن اس کو بلایا وہ بڑا فرمانبردار اور طبعاً نیک تھا میں نے اس سے کہا کہ بیٹے ہم تم کو مدرسۃ المعلمین میں داخل کرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں لیکن تم ابھی تک حفظ نہیں مکمل کر سکے، بتاؤ تمہاری کیا رائے ہے؟ اس نے کہا ابا جان آپ جو مناسب سمجھیں وہ کریں میں آپ کے حکم کا تابع ہوں، میں نے کہا تختی لاؤ وہ تختی لے کر آیا میں اس پر قرآن لکھ دیا کرتا تھا وہ اس کو یاد کرتا بس تھوڑے دنوں میں اس نے قرآن پاک حفظ کر لیا اور مدرسہ میں داخل ہو گیا۔

۵

سن بلوغ کو پہنچنے سے پہلے ہی سے عبادت کا اسے بڑا شوق تھا، رجب، شعبان، رمضان، تین مہینے روزہ رکھتا تھا، میں نے اس سے کہا کہ بیٹے ابھی تم بالغ نہیں ہو روزہ تم پر فرض نہیں پھر تم کیوں پریشان ہوتے ہو؟ اس نے کہا والد صاحب مجھے روزہ کا شوق ہے اس سے مجھے تکلیف نہیں ہوتی، میں نے اس کو اس کے حال پر چھوڑ دیا وہ میرے مسجد کے درس میں حاضر ہوتا تھا، عبادت میں نہایت مستعد تھا اور بہت سے بوڑھوں اور بزرگوں سے بھی آگے، اس کو دعوت واصلاح کا بڑا شوق تھا اس کا ایک عجیب واقعہ ہے ایک دن وہ ''دمنہور'' کے دریا کے کنارے تفریح کر رہا تھا ایک کشتی پر اس کی نظر پڑی جس میں ایک برہنہ عورت کا مجسّمہ تھا اسی وقت وہ پولیس انسپکٹر کے پاس گیا اور کہا اس مجسمہ کا لگانا مناسب

نہیں جبکہ دریا پر نوجوان لڑکے اور لڑکیاں تفریح کرنے آتے ہیں اور اس پر ان کی نظر پڑتی ہے اس کا توڑنا اور کشتی سے نکالنا ضروری ہے، انسپکٹر ہنسا اور جان چھڑانے کے لئے اس کے ساتھ ایک پولیس والے کو بھیج دیا اور یہ جانتے ہوئے کہ کشتی کا مالک مجسمہ کو توڑنے پر تیار نہ ہوگا پولیس والے کو ہدایت کردی اگر کشتی والا اس کے توڑنے پر راضی ہو جائے تو تم اس کو توڑ دو وہ گیا اور مجسمہ والے کو سمجھا کر یہ باور کرادیا کہ یہ حرام ہے، اس کا لگانا مناسب نہیں اس نے مجسمہ کو توڑ دیا۔

یہاں ایک بزرگ عالم باعمل تھے میں نے اس کو ہدایت کی کہ وہ ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرے وہ ان کے پاس بیٹھتا تھا پھر ان سے اس کو بڑا تعلق ہو گیا اور فائدہ اٹھایا، اس کا مدرسہ کا آخری سال تھا اور اسی سال دارالعلوم قاہرہ نے عربی علوم کے ساتھ ساتھ جس میں وہ ممتاز و نمایاں تھا جدید مضامین بھی اپنے نصاب میں داخل کر لئے تو میں نے دارالعلوم کے اچھے معیار تعلیم اور اس کی شہرت کی وجہ سے اس کو وہاں داخل کرنے کا ارادہ کر لیا، اس سلسلہ میں میں نے اس سے بات کی، یہ طے پایا کہ یہ سال تو مدرسہ دمنہور میں گزارے اور دارالعلوم میں داخلے کی تیاری کرے اس نے کہا والد صاحب آپ تو مجھے علوم نقلیہ، حدیث، فقہ وغیرہ میں تیار کریں یہ میری ذمہ داری ہے کہ علوم ریاضی میں میں خود سے تیاری کروں، چنانچہ یہی ہوا وہ قاہرہ گیا، امتحان کی شب، الجبرا سے وہ بہت ڈرا ہوا تھا کہ امتحان میں فیل ہو جائے گا، اس کو نیند آ گئی اس نے خواب میں ایک بزرگ کو دیکھا جو اس سے کہہ رہے ہیں کہ حسن گھبراؤ نہیں جو باتیں تم سے پوچھی جائیں گی میں تم کو بتا دوں گا، اس کو پکڑا اور ایک دریا کی طرف لے گئے اور اسے لے کر دریا کے پار اتر گئے، کتاب کا ایک صفحہ متعین کر دیا اور فرمایا کہ تم اس کو خوب سمجھ لو اور اچھی طرح یاد کر لو۔

شیخ احمد عبدالرحمٰن نے فرمایا حسن قسم کھا کر کہتا تھا کہ جب وہ سو کر اٹھا تو اس کو یہ سبق یاد ہو چکا تھا اور جب امتحان دینے گیا تو اسی سبق کا سوال آیا اور آسانی سے پاس ہو گیا(۱)

---

(۱) امام حسن البنا نے اپنی مذکرات (مذکرات الدعوۃ والداعیۃ) میں علم نحو وصرف کے تعلق سے یہ بات لکھی ہے (مترجم)

اور برابر امتحان میں فرسٹ آتا رہا اور ہمیشہ نمایاں طور پر کامیاب ہوتا رہا یہاں تک کہ اس کا ایک ساتھی جو اسی شہر کا رہنے والا تھا، عمر میں اس سے دس سال بڑا تھا اس سے حسد کرنے لگا اور اس سے اس کو کد ہوگئی ایک دن وہ تیزاب اور زہر لے کر آیا تیزاب اس کی آنکھ میں ڈال کر اندھا بنا دینے اور زہر منہ میں ڈالنے کا ارادہ کیا، لیکن اس کا ہاتھ اچٹ گیا تیزاب اس کے منہ پر پڑا اور زہر منہ میں داخل نہ ہوسکا، حسن گھبرایا ہوا زخم و تکلیف کی حالت میں بیدار ہوگیا، بعد میں تحقیق سے پتہ چلا کہ یہ اس کے فلاں ساتھی کی حرکت تھی معاملہ پولیس تک پہنچا لیکن بعض لوگوں نے مجرم کی سفارش کی تو حسن نے اس کو معاف کر دیا اور کہا اللہ تعالیٰ نے مجھے اس کے مکر سے بچالیا اس لئے شکرانہ کے طور پر اس کو معاف کرتا ہوں اور اس کے اجر و ثواب کو آخرت پر چھوڑتا ہوں۔

حسن آخری امتحان میں بڑے امتیازی نمبروں سے پاس ہوا اور اسماعیلیہ میں بحیثیت مدرس اس کا تقرر ہوگیا وہاں اس نے دعوتی کام شروع کیا اور ''جمعیۃ الاخوان المسلمین'' قائم کی، وہ مسجدوں اور ہوٹلوں میں جاتا وہاں دینی مقالے پڑھتا اور تقریریں کرتا، دینی باتیں بتاتا اور غلط باتوں پر ناپسندیدگی کا اظہار کرتا، تحریک نے زور پکڑا اور اس کا حلقہ وسیع ہوگیا، اب ایک بہت وسیع مکان میں اس کا مرکز قائم کر دیا گیا اس کا اثر اسماعیلیہ سے دوسرے ضلعوں تک ہوگیا، اسکندریہ، سوئز، بلکہ وہ ہر جگہ کا ایک بہت سرگرم داعی ہوگیا، ہر جگہ اخوان کی انجمنیں قائم کرتا، دعوت کو منظم کرتا اور تقریر کرتا یہاں تک کہ انجمن کی شاخیں پورے مصر میں پھیل گئیں، اس کا اخلاق اور زندگی پر بڑا اثر پڑا اس کی مقبولیت عام ہوگئی، جیسا کہ آپ کو معلوم ہے۔

پھر میرے لڑکے نے صنعت و تنظیم کی طرف توجہ کی، اس نے دیکھا کہ اس ملک کی اقتصادیات پر غیر ملکیوں کا قبضہ ہے وہ قوم کا خون چوس رہے ہیں، صنعت و تجارت اور کانوں میں انھیں کی اجارہ داری ہے اس صورت حال نے اس کو کارخانے اور کمپنیاں قائم کرنے پر آمادہ کیا اور ایسے انجینیروں کو تربیت دینے کا داعیہ پیدا کیا کہ جوان کارخانوں میں کام کریں اور قوم کو غیر ملکیوں سے بے نیاز کریں اس چیز نے غیر ملکی آبادی اور یورپ کی

کمپنیوں کو گھبراہٹ میں ڈال دیا اور وہ تحریک اخوان المسلمین کو ناکام بنانے اور غیر قانونی قرار دینے کی تدبیریں اور سازشیں کرنے لگے اور اس وقت کے وزیر اعظم نقراشی باشا اور انجمن اخوان میں اختلاف ہوگیا، اخوان نے اس کی مخالفت کی آخر کار بادشاہ نے نقراشی سے استعفا طلب کیا اور اس نے استعفا دے دیا، حسن اور اس کی انجمن سے نقراشی باشا کے کینہ کا یہی سب سے بڑا سبب تھا اس کے بعد دوبارہ پھر یہ وزارت قائم ہوئی اور جنگ فلسطین شروع ہوگئی اور انجمن غیر قانونی قرار دے دی گئی اور پھر نقراشی کے قتل اور حسن کی شہادت کا قصہ پیش آیا جس کو سبھی لوگ جانتے ہیں اور آپ کو بھی معلوم ہے۔

شیخ احمد عبدالرحمٰن نے اپنے عزیز بیٹے اور گوشۂ جگر کا قصہ بڑی سنجیدگی اور سکون کے ساتھ سنایا، جیسے وہ اپنے بیٹے کا نہیں بلکہ تاریخ کا کوئی قصّہ سنا رہے ہوں، اس جوانمردی اور قوت ایمانی سے ہم لوگ متحیر رہے دعوت و جہاد کی راہ میں اپنے بیٹے کی شہادت پر ثواب کی توقع رکھی اور اس دردناک حادثے کو جھیلنے میں مومن اور جانباز مجاہد کی بہادری کا ثبوت دیا، اس مناسبت سے مجھے دو شعر یاد آگئے جس کو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اسی مناسبت سے پڑھا تھا اس کا ترجمہ ہے۔

فإن تسألينى كيف أنت فإننى
صبور على ريب الزمان صليب
يعز عَلىَّ ان ترى لى كآبة
فيشمت عاد أو يساء حبيب

(اگر تم پوچھتی ہو کہ تم کیسے ہو تو میں حوادثِ روزگار پہ پختہ اور ثابت قدم ہوں میرے لئے بڑی دشوار بات ہے کہ تم میرے اوپر کوئی رنج کی بات دیکھو اور میں کمزوری کا مظاہرہ کروں پھر دشمن ہنسے یا دوست غمگین ہو)۔

پھر ہم نے اجازت لی اور اپنی قیام گاہ پر آگئے۔

علوبہ باشا سے گفتگو

۴ر بجے ہم لوگ اپنے دوست استاذ احمد عثمان کے ساتھ محمد علی علوبہ باشا کی خدمت میں حاضر ہوئے، ۱۹۳۳ء میں جب وہ مفتی امین الحسینی کے ساتھ ہندوستان آئے تھے، تو لکھنؤ ہی میں ان سے ملاقات ہوئی تھی، دار العلوم ندوۃ العلماء بھی آئے تھے، لکھنؤ کے زمانہ قیام میں ان سے ملنے کے لئے برلنگٹن ہوٹل جانا ہوا تھا اس وقت میری عمر بیس سال تھی ''مصر الجدیدۃ'' میں ہم ان سے ملے تو ان کو اٹھارہ سال پیشتر جس حال میں دیکھا تھا اس سے زیادہ تندرست اور صحتمند پایا، میں جلدی فیصلہ نہ کرسکا کہ وہی ہیں یا مجھے دھوکہ ہو رہا ہے، بعد میں معلوم ہوا کہ وہ امریکہ گئے وہاں علاج کرایا جس کے بعد ان کی صحت پہلے سے بہت اچھی ہوگئی، وہ مجھے اس طرح غور سے دیکھتے ہوئے باہر نکلے جیسے کسی ایسے شخص کو پہچاننے کی کوشش کررہے ہوں جس کو کبھی دیکھا ہو، باتوں کا سلسلہ شروع ہوا دار العلوم میں حاضری کا تذکرہ کیا، دار العلوم اور مسلمانوں کے حالات پوچھے پھر پاکستان کے سلسلہ میں اپنی کدوکاوش منصوبوں اور اپنی حکومت کو اس سے دینی ثقافتی تعلق پیدا کرنے کی طرف توجہ دلانے کا تذکرہ کرنے لگے، ہندوپاک میں حکومت مصر کو اپنے خرچ پر عربی مدارس قائم کرنے پر آمادہ کرنے کے منصوبوں کو بیان کیا۔

ہندوپاک اور انڈونیشیا کے مسلمانوں کے بارے میں علوبہ باشا کی رائے

علوبہ باشا نے فرمایا کہ اگر اس وقت کچھ امید کی جاسکتی ہے تو ہندوپاک اور انڈونیشیا کے مسلمانوں ہی سے کی جاسکتی ہے، یہی وہ ممالک ہیں جن میں قومی جذبہ دینی شعور اور حوصلہ مند قوم پائی جاتی ہے، عرب ممالک کے سربراہ اتفاق واتحاد کی فضا قائم کرنے میں کچھ زیادہ مخلص وسنجیدہ نہیں ہیں، پھر فرمایا کہ یہ مشرقی ممالک جن کا میں نے ذکر کیا اپنی قوت واہمیت اور کثرت آبادی کے باوجود مصر کو عالم اسلام کے قائد کی حیثیت سے دیکھتے ہیں، پاکستان کے وزیر تعلیم جو ایسے ملک کے وزیر تعلیم ہیں جس میں مصر سے چار گنا

زائد مسلمان رہتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ مصر دین وعلم میں ہمارا امام ہے، میرے خیال میں مصری حکومت کا بہترین سیاسی مفاد اس میں تھا کہ وہ ان نئے اسلامی ملکوں سے دینی اور ثقافتی رابطہ قائم کرتی اور ان کے حلقے میں مناسب پوزیشن بناتی ہم ان کے پاس سے نکلے، اور استاذ اسماعیل کے یہاں نماز پڑھی اور ان ہی کی موٹر میں عتبة الخضراء آ گئے۔

۲۸/۴/۱۳۷۰ھ مطابق ۵/۲/۱۹۵۱ء بروز دوشنبہ

وقت مقرّرہ پر ہم لوگ ازہر کے دفتر گئے، فرید وجدی صاحب کو "ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین" کا ایک نسخہ دیا اور ان سے کہا کہ مجلۃ الازہر میں اس کتاب پر تبصرہ بھی کریں انھوں نے وعدہ بھی کرلیا، کتاب کے صفحات پلٹے اس کی فہرست پڑھی اور پسندیدگی کا اظہار کیا، تھوڑی دیر بعد استاذ محمد فؤاد عبدالباقی آئے اور اپنی کتاب "تیسیر المنفعة بکتابی مفتاحِ کنوزِ السنة والمعجم المفهرس لالفاظ الحدیث النبوی" کا ایک نسخہ راقم سطور کو دیا اور ایک علامہ سید سلیمان ندویؒ کے لئے دیا۔

شیخ محمد الغزالی سے ملاقات

میں شیخ محمد الغزالی سے ملنے کا خواہش مند تھا وہ اخوان المسلمین کے نمایاں رکن اور مصر کی موجودہ ذہنی بیداری کی جدوجہد کے رہنماؤں میں ہیں، یہ آرزو پوری ہوئی میں "الاسلام والاوضاع الاقتصادیة" "الاسلام والمناهج الاشتراکیة"، "الاسلام المفتری علیه" اور "من هنا نعلم" کے مصنّف سے ملا، میں اس صاحب قلم سے ملا جس سے اخوان کو صحیح فکر وروحانی غذا اور صالح اسلامی لٹریچر ملتا ہے، ان سے مل کر بڑی خوشی ہوئی، ان میں میں نے ایک صالح تعلیم یافتہ، سرگرم، زندہ دل، روشن دماغ شخص کو دیکھا جس کے چہرے سے بشاشت ٹپکتی ہے، ان سے مل کر معلوم ہوا کہ ہم میں سے ہر ایک رسالوں اور کتابوں کے ذریعہ دوسرے سے واقف ہے اور ان کتابوں میں اس کے فکر واصول

کی تصویر دیکھ چکا ہے، آج ریڈیو پر ان کی تقریر تھی، ازہر کے شیوخ اور واعظین حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے یوم ولادت کے موقع پر دینی تقریریں نشر کرنے کا انتظام کرتے ہیں، ہم لوگ بھی ان کے ساتھ گئے۔

جشن میلاد سیدنا حسین رضی اللہ عنہ

ان دنوں مصر میں حضرت حسینؓ کے یوم پیدائش کے جلسے ہوتے ہیں، اس زمانہ میں آپ کو قاہرہ کے گلی کوچوں میں بجلی کے قمقموں، رنگا رنگ پھولوں، مٹھائیوں اور جلسوں کے سوا کچھ نظر نہ آئے گا ادھر ایک شخص غرباء ومساکین کو روٹیاں تقسیم کر رہا ہے اس روٹی کو لینے کے لئے امیر غریب سب ٹوٹے پڑ رہے ہیں ادھر جلسہ سجا ہے دکانیں آراستہ سڑکیں روشنی سے بقعۂ نور بنی ہوئی ہیں قاہرہ کے ہر حصہ میں آپ کو دیہاتیوں کے جتھے اور ٹولیاں دکھائی دیں گی، یہ سب سیدنا حسینؓ کے مہمان ہیں، اس مظلوم شہید کے جشن میلاد کے موقع پر تفریح وتماشہ کے لئے آئے ہوئے ہیں ان میں کچھ ایسے بھی ہیں جو اس مقام کی زیارت کے لئے آئے ہیں جہاں آپ کا سر دفن ہے اس سے ان کو کوئی سروکار نہیں بلکہ اس شہر کے بہت سے اہل علم کو بھی اس کی فکر نہیں کہ حضرت حسینؓ کا سر قاہرہ کیسے پہونچا، کب آیا، کون لایا اس رسم کی کوئی تاریخی حقیقت بھی ہے یا نہیں؟ عوام میں اس کی شہرت ہی حجت اور قابل عمل ہے، اسی پر اپنے دین کی بنیاد رکھتے ہیں بلکہ اس سلسلہ میں لوگ عجیب قصہ بیان کرتے ہیں کہ ایک عورت نے اپنے بچہ کو مار ڈالا پھر اس کا سر کاٹ کر حضرت حسینؓ کے سر کی جگہ رکھ دیا اور ان کا سر نکال کر مصر لائی تاکہ مصر کو اس کے مدفن ہونے کو شرف حاصل ہو، مصری اس عورت کی بھی بڑی قدر کرتے ہیں، اور اسی طرح اس کی قبر کی بھی زیارت کرتے ہیں، حضرت حسینؓ کے سر کے پاس وہ بھی مدفون ہے۔ عصر بعد ہم لوگ شیخ محمد حامد فقی کے یہاں گئے مغرب تک انتظار کرتے رہے ان سے ملے اور عشاء کے بعد واپسی ہوئی۔

۲۹/۴/۱۳۷۰ھ مطابق ۶/۲/۱۹۵۱ء بروز منگل

آج صبح کو طبیعت مضمحل تھی رات میں اپنا مضمون (اسمعی یا مصر) لکھنے میں مشغول تھا

وہی میرے فکر پر چھایا رہا جس کے سبب نیند نہیں آئی یہ آج ہی کی بات نہیں جب بھی میرا ذہن کسی فکر میں لگ جاتا ہے تو ایسی صورت پیش آتی ہے، دیر سے سویا تھا، نیند پوری نہ ہونے پائی کہ جگ گیا اس لئے آج طبیعت میں اضمحلال تھا۔

شیخ صالح عشماوی سے ملاقات

ظہر سے پہلے ہم لوگ شیخ صالح سے ملنے گئے ان سے ملے ہوئے ایک عرصہ گذر گیا تھا کئی دن ہو گئے تھے اور ملاقات نہ ہو سکی تھی۔ جبکہ ہمیں مصر میں گنے چنے دن ہی رہنا تھا اور وہاں قیام کی مدت محدود تھی تو ان سے کئی دن نہ ملنا واقعی طویل مدّت معلوم ہوتی تھی اگر ہم اسلامی جذبہ اور فکر رکھنے والے لوگوں سے نہ ملیں تو ہمارے مصر میں ٹھہرنے کا فائدہ ہی کیا؟

بہر کیف ہم لوگ الدعوۃ کے دفتر گئے اور ان سے ملاقات کی، ہم تھوڑی دیر بیٹھے پھر ان سے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ یہاں کی اہم شخصیتوں سے آپ ہماری ملاقات کرادیں انھوں نے ملاقات کرانے کا وعدہ کیا مگر رسالہ کی تیاری کے سلسلہ میں مشغولیت کے سبب ساتھ چلنے سے معذرت کردی، رسالہ نکالنے کا کام تو واقعی بڑی مشغولیت کا کام ہوتا ہے۔

ہم نے شیخ احمد محمد عثمان کو فون کیا اور ان سے تشریف لانے کی گذارش کی، تاکہ وہ ہم جن لوگوں سے ملنا چاہتے ہیں ان سے ہماری ملاقات کرادیں اس لئے کہ ہمیں ان کی جائے قیام معلوم نہیں۔

رسالہ الفتح اور اس کے ایڈیٹر سے غائبانہ تعلق وتعارف

عصر کے وقت ہم لوگ ''الفتح'' کے ایڈیٹر استاد محبّ الدین الخطیب کے پاس جزیرۂ روضہ گئے، الفتح اور اس کے ایڈیٹر سے میرا تعارف پرانا ہے، اس تعارف پہ تقریباً بیس سال گزر چکے ہیں اس وقت جب ہم شیخ تقی الدین ہلالی مراکشی (جو کہ اب ڈاکٹر ہلالی ہیں) کے شاگرد تھے، رسالہ الفتح طلبہ کی انجمن اور ہمارے گھر دونوں جگہ آتا تھا، یہ ہمارا بہت محبوب رسالہ تھا ان دونوں میں امیر شکیب ارسلان اور ہمارے استاذ علامہ تقی الدین ہلالی لکھا کرتے تھے، مجھے اور

میرے دوست مولانا مسعود عالم ندوی کو بھی اس میں لکھنے کا شرف حاصل ہو چکا تھا، اس زمانہ میں اس میں میرے کئی مضمون شائع ہوئے تھے جن میں سے ایک مضمون ''لسان العصر'' تھا اس میں میں نے مغربی تہذیب پر ظریفانہ اور ادبی انداز میں تنقید کرنے والے اردو کے مشہور ہندوستانی شاعر اکبر الہ آبادی کے اشعار کا ترجمہ کیا تھا، الفتح نے میرے اس مضمون کو مسلسل کئی شماروں میں شائع کیا تھا، محبّ الدین صاحب کی چیزیں میں نے بہت پڑھی تھیں، الحدیقہ کے حصے پڑھ چکا تھا جس نے صالح اور جدید اسلامی عربی ادب سے واقف کرایا اور اس کے ذریعہ سے بہت سے نئے ادیبوں سے میں واقف ہوا، اسی طرح الزہراء کی جلدوں سے بھی مستفید ہو چکا تھا۔

استاذ محبّ الدین خطیب سے ملاقات

ہم لوگ جزیرۂ روضہ پہونچے وہ شہر کے آخری حصے میں واقع ہے ہمارے ساتھی شیخ احمد عثمان نے کہا کہ شیخ دنیا کے آخری سرے پر رہتے ہیں ان سے کون ملے گا، میں نے عرض کیا ان سے محبّ ہی مل سکتا ہے، جب ہم استاذ محبّ الدین خطیب سے ملے تو انہیں دیکھ کر مجھے وہ زمانہ یاد آ گیا، جب میرا عنفوان شباب تھا اور صفحۂ زندگی صاف اور سادہ تھا میں نے پوچھا الفتح کا کیا حال ہے انھوں نے جواب دیا کہ جب سے ملک میں الفتح کا پڑھنے والا مجرم گردانا جانے لگا اس کے یہاں تلاشی ہونے لگی، الفتح رکھنے والا موجب سزا ٹھہرا دیا گیا اس وقت سے میں نے اس کو بند کر دیا ان کا اشارہ اخوان کو شہر بدر کرنے اور ان کی خانہ تلاشی کی طرف تھا یہاں کے ماحول میں اپنی نامانوسی اور اس ملک میں اپنی اجنبیت وافسردہ دلی کا تذکرہ کرنے لگے، احمد عثمان صاحب نے یہاں کے بعض ادباء اور مشہور صحافیوں سے میرے شوقِ ملاقات کا ذکر چھیڑ دیا تو انھوں نے ان کے کیرکٹر اور ابن الوقتی پر تنقید کی اور فرمایا ان لوگوں کی صحیح تعبیر یہ ہے کہ وہ بہروپیہ کا پارٹ ادا کرتے ہیں اور جو ذمہ داری اس کو دی گئی ہے اس کو ہو بہو پوری ہوشیاری، کمال اور مہارت کے ساتھ ادا کرتے ہیں، مثلاً اس سے بادشاہ کی نقل اتارنے کو کہا

جائے یا وہ خود باشاہ کی نقل اتارے تو اس کا کمال یہ ہے کہ وہ اس پارٹ کو اتنی بے تکلفی و مہارت اور شاہانہ طور وطریق کے ساتھ ادا کریں کہ دیکھنے والے کو سو فیصدی یقین ہو جائے کہ وہ بادشاہ ہی ہے، ان ادباء کا یہی حال ہے ان میں سے کسی سے کہا جائے کہ فلسفہ قرآن پر کتاب لکھو تو وہ بحسن وکمال لکھ دے گا، اسی طرح سیرت نبوی پر کتاب لکھ دے گا اور اسی مہارت ونکتہ آفرینی کے ساتھ کسی بادشاہ کو خوش کرنے اور اس سے فائدہ اٹھانے کی غرض سے اس کی سیرت بھی لکھ دے گا، اسی طرح وہ ایسے مضامین اور کتابیں بھی لکھ دے گا جو اسلامی اصول اور دینی روح کے خلاف ہوں، انھوں نے کہا کہ ایک قابل اعتماد شخص نے مجھ سے واقعہ بیان کیا کہ ایک دن اس سے ایک بڑے ادیب سے اسلامی موضوع پر گفتگو ہو رہی تھی اس دوران گفتگو میں اس ادیب نے کہا (نعوذ باللہ) اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم مصر آجائیں اور اس میں پورے طور پر اسلامی نظام چلانا چاہیں تو ان سے جنگ کرنے کے لئے میں سب سے پہلے نکلوں گا۔

صورت حال کچھ ایسی ہی ہے، استاذ محبّ الدین نے جو بات کہی وہ ایک حقیقت ہے اور اس وقت کے بہت سے ادباء پر صادق آتی ہے جنھوں نے اسلامی موضوع پر لکھنا اپنا پیشہ اور ذریعۂ معاش بنالیا ہے، مصری ہی میں نہیں بلکہ بہت سے اسلامی ملکوں میں یہی صورتحال ہے، استاذ محبّ الدین خطیب نے میرے مضمون ''لسان العصر'' کے چھپے ہوئے فارم دکھلائے، اس پرانے مضمون کو دیکھ کر جسے میں تقریباً بھول چکا تھا ایسی خوشی ہوئی جیسے آدمی کو کسی دیرینہ دوست سے جس سے ملاقات کی توقع نہ رہی ہو مل کر خوشی ہوتی ہے، انھوں نے مجھے بتایا کہ وہ اسے شائع کر رہے ہیں بہت تھوڑے سے حصّہ کی طباعت اور باقی ہے، شیخ احمد محمد عثمان نے کہا کہ آپ کو میلاد حسینؓ کی تفریح کا شوق ہے؟ میں نے ظرافت کے انداز میں کہا جی ہاں، اگر آپ جیسا متبع سنّت اور بدعت کو ناپسند کرنے والا کوئی بزرگ ہمارے ساتھ ہو تو کوئی حرج نہیں، میرا مطلب تھا، اس جشن میلاد کا مقصد معلوم کروں جس کا مصر میں بہت زیادہ اہتمام ہوتا ہے، اسی بہانہ اس ملک کی دینی حالت کا بھی جائزہ لوں۔

جشن میلاد حسینؓ کی تفریح

احمد عثمان کے ساتھ پہلے ہم لوگ ایک جلسہ میں گئے جس کو ''شرقی بس کمپنی'' اور ''صعید بس کمپنی'' نے ''قبۃ الغوری'' میں حضرت حسینؓ کی یاد میں منعقد کیا تھا، ہم نے سنا تھا کہ شیخ صاوی شعلان (۱) اس جلسہ میں قصیدہ پڑھیں گے ہم جلسہ گاہ پہونچے تو وہاں حاضرین کی تعداد تو بہت کم، ٹیپ ٹاپ اور سجاوٹ ایسی نظر آئی کی آنکھیں خیرہ ہوں، پہلے عبد الصمد خلیل وراق آگے بڑھے اور قرآن کریم کی کچھ آیتیں پڑھیں آوازیں ٹکرا رہی تھیں، لاؤڈ اسپیکر بہت سے تھے، ایک قاری جلسہ میں پڑھ رہا ہے ایک جلسہ سے باہر پڑھ رہا ہے اور لاؤڈ اسپیکر سے اس کی آواز بلند کی جارہی ہے، آیتیں صاف سنائی نہیں دیتیں تو خشوع وخضوع کا کیا ذکر، اس کے بعد ازہری واعظوں کے ناظر استاذ حسن صقر اسٹیج پر آئے اور میلاد کے فوائد پر تقریر کی، آوازوں کے شور وہنگامہ اور اس غیر اسلامی رسم ورواج اور صورتحال سے کبیدہ خاطر ہوکر ہم لوگ یہاں سے نکلے اور شیخ صاوی شعلان سے ملنے کے لئے مسجد سیدنا حسینؓ کی طرف روانہ ہوئے، مسجد کے زائرین، راہ گیروں اور تفریح کرنے والوں کی راستوں پر شدید بھیڑ تھی، اس بھیڑ بھاڑ میں بھٹک جانے کا خطرہ ہوا چنانچہ اس مشکل سے بچنے کے لئے ہم لوگوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑا اور بڑی مشکلوں سے مسجد کے قریب پہنچے، یہاں ذکر کا ایک حلقہ قائم تھا جو اہل ذکر کی محفل سے کہیں زیادہ ورزش کی ٹیم سے مشابہ تھا، ہمیں معلوم ہوا کہ یہ لوگ اہل تصوف کے بعض سلسلوں سے تعلق رکھتے ہیں، احمد عثمان صاحب نے کہا چلئے ابھی تھوڑی دیر میں پھر ادھر آئیں گے۔

ہم لوگ اس ''محسن عورت (۱)'' (بچہ کی ماں) کی طرف بڑھے جو حضرت حسینؓ کا

---

(۱) شیخ صاوی شعلان مشہور مصری مصنف استاذ وادیب تھے ''فلسفہ اقبال والثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند'' ان کی اہم کتاب ہے ۱۹۸۲ء میں وفات پائی (مترجم)

(۱) مصر میں روایت مشہور ہے کہ ایک عورت نے حضرت حسین شہید کا سر مبارک دمشق میں رکھا ہوا دیکھا تو اس کو شوق ہوا کہ اس کا مدفن بننے کی سعادت مصر کو حاصل ہو، اس نے اپنے بیٹے کا سر کاٹ کر کے وہاں رکھ دیا اور حضرت حسین کا سر لے کر مصر کی طرف بھاگی اور قاہرہ آکر دم لیا، یہ سب خلاف عقل اور بے اصل روایتیں ہیں، حافظ ابن تیمیہ کا مستقل رسالہ اس موضوع پر ''راس الحسین'' کے نام سے ہے اس میں اس قسم کی واہی تباہی باتوں کی تردید ہے

سرلائی تھی، جیسا کہ بہت سے مصریوں کا اعتقاد ہے، اس کے مزار کی طرف جاتے ہوئے، راستہ میں ہر قسم کے کھیل تماشوں، قسم قسم کی دوکانوں اور پھیری والوں کے پاس سے گزرے، بھیڑ ایسی کہ خدا کی پناہ، شور و ہنگامہ ایسا کہ الحفیظ والامان، غضب یہ کہ اسی بھیڑ کے اندر سے کوئی بھڑکتی ہوئی آگ لے کر دوڑ رہا ہے، آگ لگنے کی بھی پرواہ نہیں اسی بے ہنگام ہجوم میں جہاں تل رکھنے کی بھی جگہ نہیں جوانوں کا ایک ریلہ چلتا ہے، اور ایک دوسرے کو دھکا دیتا ہوا ٹرین کی طرح راستہ بناتا ہوا چلا جاتا ہے، یہاں ہمیں شراب کی بو آئی اور ہم لوگ پیچھے کی طرف لوٹے، مسجد کے دروازہ پر پہونچے تو ذکر کا حلقہ قائم تھا، اہل حلقہ ورزش کی بڑی پرمشقت حرکتیں کرتے ہوئے نظر آئے، اس میں وہ اللہ کا ذکر کر رہے تھے، اپنی ناکوں سے اس زور کی سانس نکالتے کہ ہماشما کے بس کی بات نہیں، نصف جسم تک جھکتے پھر کھڑے ہو جاتے جیسے نٹوں کے بعض کھیل ہوتے ہیں۔

شیخ حلقہ ایک ایسا نوجوان تھا جس کی داڑھی مونڈی ہوئی سر پر ترکی ٹوپی لگائے ہوئے، کسی بزرگ کا قصیدہ پڑھ رہا تھا، قصیدہ کے بعض اشعار کا مطلب یہ تھا کہ اگر میرے رازہائے دروں پہاڑ پر رکھ دیئے جائیں تو وہ ریزہ ریزہ ہو جائیں، سمندر پر رکھ دیئے جائیں تو وہ خشک ہو کر چٹیل میدان ہو جائے اور اگر اس کو کسی مردے پر رکھ دوں تو وہ ہمارے آقا کے حکم سے زندہ ہو جائے، اور اسی کے ہم معنی اشعار، ہم یہ سب دیکھ ہی رہے تھے اور حلقہ ذکر زوروں پر گرم تھا کہ اچانک ایک بوڑھی عورت پر وجد طاری ہوا اس نے مردوں سے معانقہ کیا پھر وہ اپنے حال میں نہیں رہی، ایک شخص کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ وہ "وہ نبیؐ سے محبت کرتی ہے" ہمیں معلوم ہوا کہ یہ لوگ طریقہ شنادیہ احمدیہ سے تعلق رکھتے ہیں، مسجد کے ایک گوشہ میں میں نے دوسرا حلقہ دیکھا لوگوں نے بتایا کہ یہ طریقہ بیومیہ ہے۔

تکلیف دہ صورت حال

اس بھیڑ بھاڑ میں بڑمشکلوں سے راستہ طے کرتے ہوئے یہاں سے ہم لوگ نکلے، ایسی دوکانوں پر سے گزرے جن کے مالکوں نے اپنی دوکانوں پر چھوٹے چھوٹے جلسے قائم

کرر کھے تھے، کچھ قاریوں، گویوں اور واعظین کو بلا رکھا تھا جو اپنے فن ومہارت کا مظاہرہ کرر ہے تھے اور آواز کے زیر وبم اور لے کے ساتھ آیتیں پڑھنے اور اشعار سناتے یا قصہ بیان کرتے، لوگ جھومتے اور مزید پڑھنے کا مطالبہ کرتے، مکرر مکرر کی آوازیں بلند کرتے، دین وعقل، تہذیب وشائستگی سے گری ہوئی باتوں کو دیکھ کر جسے ذوق سلیم قبول نہیں کرتا تھک کے چور اور غمزدہ ورنجور ہو کر واپس ہوئے، یہ منظر دیکھ کر قرآن کریم کی یہ آیت یاد آئی وذرالذین اتخذ واد ینھم لھوًا ولعبًا '' ان لوگوں کو چھوڑو جنھوں نے دین کو کھیل تماشہ بنالیا ''۔اس بات سے ہمیں اور رنج وقلق اور تعجب ہوا کہ یہ سب کچھ ازہر سے چند قدم کے فاصلے پر ہو رہا تھا۔

یکم جمادی الاول ۱۳۷۰ھ ۳/۲/۱۹۵۱ء بروز بدھ

شیخ محمد الغزالی کے ساتھ

ہم لوگ شیخ محمد الغزالی کے یہاں گئے، وہ ہم لوگوں سے بڑی محبت وگرمجوشی سے ملے، ہم لوگ بیٹھ کر باتیں کرنے لگے، طرح طرح کی باتیں ہوئیں جو دینی اور علمی موضوعات سے متعلق تھیں، انھوں نے بعض ان مصنفین کا ذکر کیا جنھوں نے اسلامی قانون پر نکتہ چینی کی ہے اور دینی کتابوں میں اسلامی حقائق اور اس کے اصولوں اور بنیادوں کی بڑی دیدہ دلیری سے مخالفت کی ہے حالانکہ ان کا نشو ونما دینی ماحول ہی میں ہوا اور انھوں نے دینی تعلیم بھی حاصل کی، میں نے ان سے پوچھا اس ردعمل کا محرک اور سبب کیا ہے؟ کیا اس کا تعلق ذاتی حالات اور ان واقعات سے ہے جو ان مصنفوں کے تجربوں اور احساسات سے تعلق رکھتے ہیں جیسا کہ ایسے حالات میں بہت سے ملکوں میں ہو رہا ہے۔

عام طور پر دین کے خلاف ردّعمل اور بغاوت کا سبب دیندار لوگوں کی بدمعاملگی ان کی اخلاقی کمزوری اور معاشرہ کا بگاڑ ہوا کرتا ہے۔

شیخ محمد الغزالی نے میرے اس خیال کی تائید کی اور بتایا کہ ان مصنفین میں سے ایک شخص کو میں جانتا ہوں جو میرا جامع ازہر کا دوست اور ساتھی رہ چکا ہے وہ ایک دینی انجمن

کارکن اور اپنے خاندان میں یکتا تھا، میرا یہ دوست بڑی تنگدستی کی زندگی گزار رہا تھا اور اس کے دینی احباب بڑی خوشحالی وفارغ البالی کی زندگی گزار رہے تھے لیکن ان میں سے کسی نے بھی اس کا مالی تعاون نہ کیا، چھوٹے بڑے کسی نے عام انسانی حسن سلوک محبت وغمخواری کا بھی ثبوت نہ دیا، دوستی ورفاقت کا برتاؤ تو دور کی بات تھی اس صورت حال نے اس کو دینی حلقہ اور دیندار لوگوں سے بدگمان کر دیا، میں سمجھتا ہوں کہ اگر یہ شخص کسی کلیدی عہدہ پر ہو مثلاً وزیر خارجہ یا مالیات کا وزیر ہو تو اس دیندار شخص کے مقابلہ میں جس میں اس کو اخلاقی بلندی اور اونچا انسانی کیرکٹر نہیں نظر آیا، ایک بے دین شخص کو وزیر مملکت بنانا پسند کرے گا۔

شیخ محمد الغزالی نے جو فرمایا وہ بہت سے ان آدمیوں اور باصلاحیت لوگوں پر صادق آتا ہے جو دینی ماحول میں پلے بڑھے پھر دین کے باغی ہو گئے، آدمی اگر ذکی الحس اور زیادہ باشعور ہو اور پھر اس طرح کے تکلیف دہ تجربات سے اس کا واسطہ پڑے تو اس کے اندر شدید ردعمل اور خطرناک فکری بغاوت پیدا ہو جاتی ہے، فلسفۂ کمیونزم کے بانی مارکس کے ساتھ یہی قصہ پیش آیا، اور دین کے بہت سے باغیوں کے ساتھ یہی سانحہ پیش آیا، بات یونیورسٹی کی تعلیم وہاں کے پروفیسروں اور بعض مصنفین اور بڑے صحافیوں کے متعلق ہونے لگی، شیخ محمد الغزالی نے فرمایا افسوس کہ ان میں بہت سے لوگ بڑے پڑھے لکھے اور صاحب علم ہیں، معلومات اتنی وسیع مطالعہ اتنا گہرا کہ بعض کو انسائیکلوپیڈیا اور دائرۃ المعارف کہا جا سکتا ہے، انھوں نے تاریخ اسلام، اسلامی تہذیب وثقافت اور اس کے دور عروج پر ایسی کتابیں لکھی ہیں جن کو بڑی علمی حیثیت حاصل ہے، لیکن ان مصنفین میں سے اکثر ایسے ہیں جو اسلام کے عملی پہلو کی طرف توجہ نہیں کرتے، ان کے اندر دینی اعمال وارکان یا نماز کا زیادہ اہتمام نظر نہیں آتا، مجھے ڈر ہے کہ ان میں سے بعض لوگ مرجیہ(۱) کا مسلک نہ اختیار کر لیں اور اعمال کو زیادہ اہمیت نہ دیں اس قسم کے لوگوں سے میں تعلیمی معاملہ میں مطمئن نہیں، اسی طرح ان اداروں کے نظم پر بھی مطمئن نہیں، جن میں دینی اور دنیاوی دونوں تعلیم شامل ہیں اور جن کا منصوبہ ایسے افراد کا پیدا

---

(۱) مسلمانوں کا ایک قدیم فرقہ جس کا عقیدہ تھا کہ ایمان ونجات کے لئے عقیدہ کافی ہے عمل شرط نہیں۔

کرنا ہے جو دینی اور دنیاوی تعلیم کی کھوئی ہوئی کڑی ہوں ان اداروں پر اکثر دنیاوی رنگ غالب آجاتا ہے اور وہ صحیح جامعیت اور امتزاج نظر نہیں آتا جو مطلوب ہے۔

ازہر کا طرز تعلیم

محمد الغزالی صاحب نے ازہر کے طرز تعلیم پر تنقید کرتے ہوئے فرمایا کہ ازہر میں اسلامی اصول ومقاصد اس کے مبادیات وکلیات سے کہیں زیادہ بے فائدہ تفصیل اور بال کی کھال نکالنے پر وقت صرف کیا جاتا ہے وہاں کا دینی ذوق ورجحان پست وکمزور ہے، میں نے کہا تو پھر ازہر کس چیز میں ممتاز ہے انھوں نے کہا کہ عہد عباسی کے مدون شدہ فلسفہ وعلم اور لغت میں ممتاز ہے۔

خالص دینی دعوت کو مذہبی اختلافات سے آزاد رہنا چاہئے

اس نظریہ پر ہم دونوں متفق تھے کہ ایسی دینی دعوت جس کا مطمح نظر دینی اصلاح ہو، اس کو مذہبی اختلافات سے الگ رہنا چاہئے، ان فقہی مباحث کو بھی زیادہ چھیڑنا نہ چاہئے جو مختلف فیہ ہوں، شیخ الغزالی نے اپنے اس نظریہ کو بیان کرتے ہوئے کہا کہ شاید آپ نے یہ محسوس کیا ہو کہ میں جب اپنی کتاب میں کسی ایسے مسئلہ کا ذکر کرتا ہوں، جس میں توسع کی گنجائش ہو تو بہت محتاط انداز میں کرتا ہوں اس لئے کہ قوم کی ترقی اختلافی مباحث میں پڑنے سے نہیں ہوسکتی، ہم دونوں کا نظریہ ایک ہے پھر انھوں نے کہا کہ اس شخص کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے جو ایک کتاب لکھے اور اس کا نام رکھے (قوم کی ترقی قراءت خلف الامام میں ہے) اس نام سے ہم لوگوں نے لطف لیا۔

پردے کے بارے میں شیخ محمد الغزالی کی معتدل رائے

شیخ محمد الغزالی پردے کے بارے میں اعتدال پسند ہیں، ان کا نظریہ یہ ہے کہ پردہ شرعی ہو، تاکہ عورتیں دینی خدمات وترقی میں حصہ لے سکیں انھوں نے بتایا کہ اخوانی احباب کے قید وبند کے زمانے میں عورتوں نے کس طرح خدمت کی، گرفتار شدگان کے خاندانوں کو

کس طرح سہارا دیا، انھوں نے بتایا کہ صرف عورتیں ہی قیدیوں اور ان کے خاندان کے درمیان واسطہ اور رابطہ تھیں، اگر یہ عورتیں نہ ہوتیں تو ان کے خاندان بڑی پریشانی میں مبتلا ہوجاتے انھوں نے بتایا کہ ہم نے ان کے لئے پردہ اس حد تک ضروری قرار دیا جو ساتر ہو یعنی کہ ایسا لباس جو ڈھیلا ڈھالا ہو، راہب عورتوں کے لباس سے ملتا جلتا ہو۔

دینی جوش اور قربانی کے جذبہ کو کس طرح باقی رکھا جاسکتا ہے

شیخ محمد الغزالی کو ہمارے اس خیال سے اتفاق ہے کہ مصری قوم اور خصوصاً وہ لوگ جو دیہاتوں میں رہتے ہیں خام مال ہیں۔ اگر ان کی صحیح تربیت کی جائے تو یہ بڑے کام کے آدمی ثابت ہوں گے۔ ہم لوگوں نے ایک اہم مسئلہ پر گفتگو کی جو تمام اسلامی جماعتوں اور دینی ترقی کے لئے جدوجہد کرنے والوں سے تعلق رکھتا ہے، وہ مسئلہ یہ تھا کہ دینی جوش وجذبہ جدوجہد اور قربانی کی روح ہمہ وقت یکساں نہیں رہتی، اس میں اتار چڑھاؤ اور سرد مہری سے واسطہ پڑتا رہتا ہے جو جماعت کے انجام، اس کے بقاء اور وجود پر اثر انداز ہوتی ہے، کیا وسائل اختیار کئے جائیں کہ اس جوش وولولہ اور نشاط وعمل میں اتار چڑھاؤ اور کمی زیادتی نہ واقع ہو؟ بعض تجربہ کار لوگ اس کا یہ حل بتاتے ہیں کہ جماعت کو ذکر خداوندی کی روحانی غذا ملتی رہنی چاہئے اور ایسے معمولات اختیار کرنا چاہئے جو جماعت کے اندر دینی جذبات بیدار کرتے رہیں، ان کو اس طرح جلاتے وبھڑکاتے رہیں کہ بجھنے نہ پائیں، بہرکیف جماعت کو اس پہلو پر نظر رکھنی چاہے کہ یہی اس کی زندگی کا سرچشمہ اور اس کی قوت کا منبع ہے، اس گفتگو کے بعد ہم نے ان سے اجازت چاہی اور انھوں نے ہمیں اس امید پر رخصت کیا کہ جلد ہی ہم لوگ پھر ملیں گے۔

ایک سن رسیدہ فلسطینی بزرگ سے ملاقات

عصر بعد ہم لوگ اپنے دوست سید یاسین الشریف فلسطینی کے دادا شیخ عارف بن عبدالرحمٰن الشریف سے ملنے گئے جو مغرب اقصیٰ کے مدرس اور نگران اعلیٰ تھے وہ بہت بوڑھے تھے عمر ۹۵ سال کی تھی، ایک پناہ گزین کی طرح اپنے متعلقین واعزہ کے ساتھ ''مصر الجدیدہ'' میں رہتے

تھے، ہم لوگوں سے بڑی محبت واکرام سے ملے برابر مسرت کا اظہار فرماتے، خوش آمدید کہتے، اور بار بار فرماتے (مجھے اسلام کی خوشبو ملی) ان کے اس جملہ سے کہ ''مسجد اقصیٰ غمگین ہے اُس پر حسرت برس رہی ہے'' اس کو وہ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد دہراتے رہتے تھے، ہم لوگوں کے دل پر بڑا اثر پڑا، آنکھیں اشکبار تھیں، وہ یہ جملے کہتے جاتے اور آنسو پونچھتے جاتے تھے، درحقیقت فلسطین کا زخم ابھی مندمل نہیں ہوا تھا، مسجد اقصیٰ، حرم ابراہیم ان دونوں کے انوار وبرکات اور سکینت کا برابر ذکر کرتے رہے یہاں تک کہ ہمارے اندر دونوں کو دیکھنے اور ان میں نماز پڑھنے کا بہت اشتیاق پیدا ہوگیا، ہم نے ان سے درخواست دعا کی، جب لوٹنے لگے تو ضعف پیری کے باوجود ہم کو رخصت کرنے آئے اپنی قیام گاہ شارع عمادالدین آتے ہوئے ہم لوگ شارع عمادالدین اور شارع فؤاد سے ہوکر گزرے، ان کی چمک دمک، روشنی اور سجاوٹ کا کیا کہنا، سنیما ہاؤس پر بھیڑ لگی ہوئی تھی، اندرونی حصہ تماشائیوں سے پُر اور باہر لائنوں پر لائنیں کھڑی اپنی باری کا انتظار کررہی تھیں، آنے جانے والی موٹروں کا سیلاب امنڈ رہا تھا جو راستہ کے ہجوم کو چیرتا ہوا گزر جاتا، دوکانوں پر خوبصورت عربی رسم الخط میں بورڈ نہ لگے ہوتے اور عربی نام نہ ہوتے تو ہم یہی گمان کرتے کہ ہم یورپ کے کسی بڑے شہر میں ہیں۔

۲/۵/۱۳۷۰ھ مطابق ۸/۲/۱۹۵۱ء

ڈاکٹر محمد غمراوی سے باتیں

دس بجے دن کو ہم لوگ ڈاکٹر محمد احمد بک الغمراوی کے پاس عباسیہ گئے، اپنے زمانہ طالب علمی میں اولاً ان کی کتاب '' النقد التحليلي للأدب الجاهلي (۱) ''

(۱) مصر کے نامور ادیب واہل قلم طہٰ حسین نے الادب الجاہلی کے نام سے ایک تشکیکی کتاب لکھی تھی جس نے مصر کے نوجوانوں میں بڑا ذہنی انتشار، اور دینی حلقوں میں ناراضگی کی لہر پیدا کردی تھی، مصنف نے عربی کے قدیم مآخذ اور شعروادب کی صحت کے بارے میں شک وشبہ پیدا کرنے کی کوشش کی تھی، یہ یورپ کے بعض دشمن اسلام مستشرقین کی تحریروں اور ان خیالات کا چربہ تھا، ڈاکٹر محمد الغمراوی نے جو جدید علوم کے فاضل اور غیور مسلمان تھے، کتاب کا علمی اور تاریخی جائزہ لیا، امیر البیان امیر شکیب ارسلان نے اس کتاب پر مقدمہ لکھا اور اس کو بہت سراہا۔

کے ذریعہ ان کی شخصیت سے متعارف ہوا پھر ان کے بہت سے مضامین ومقدمات پڑھے جوان کی دینی غیرت اور اسلامی فکر کا پتہ دیتے ہیں۔ مجھے ان سے ملنے اور ملاقات کرنے کا شوق ہوا، شیخ احمد عثمان نے ہم کو فون کیا، انھوں نے ان سے ملنے کا وقت لے لیا۔

بعض ادیبوں کے دین سے منحرف ہونے کا سبب

اپنی توقع کے مطابق میں نے ان کو پڑھا لکھا صاحب ایمان پایا، میں نے ان سے بعض ان ادباء اور صحافیوں کے بارے میں پوچھا جو دین سے منحرف ہو گئے ہیں اور ان کی بہت سی ایسی کتابیں اور مقالے شائع ہوئے ہیں جن میں اسلام اور اسلامی عقیدہ کو مطعون کرنے کی کوشش کی گئی ہے، انھوں نے بتایا کہ یہ ان کی سابقہ تربیت کی بناء پر ہوا، میں نے کہا کہ ان میں بعض ایسے بھی ہیں جنھوں نے ازہر میں پڑھا ہے، انھوں نے کہا ٹھیک ہے کہ ان میں سے بعض لوگوں نے ازہر میں پڑھا مگر میرا خیال ہے کہ وہ زمانہ تعلیم ہی میں ازہر میں ناپسندیدہ سمجھے جاتے تھے، قرآن وحدیث سے ان کو کوئی دلچسپی نہیں تھی، صرف ادب اور عربی شاعری پر ان کی توجہ مرکوز رہی۔

اس ملک کا ادبی رجحان غیر دینی ہے

انھوں نے فرمایا ہمارا ادب ایک عرصہ سے بے دینی کا شکار ہے، ابونواس جیسے شعراء کا کلام زیادہ پڑھا جاتا ہے، اور ظاہر ہے ایسے لوگوں کا ادب پڑھنے والوں سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ دیندار اور اسلام پسند ہوں گے، مزید برآں یہ کہ وہ یونیورسٹی کے ماحول میں زندگی گزارتے ہیں، یورپ کے اکثر سفر کرتے رہتے ہیں؟۔ میں نے کہا آپ سخت ماحول سے کیسے بچ نکلے کہ دامن تر نہ ہوا جب کی آپ اسی زمانہ کی پیداوار ہیں اور اسی طرز تربیت میں پلے بڑھے ہیں، جس کے متعلق ہم گفتگو کر رہے ہیں، انھوں نے کہا کہ میرا قیاس ان لوگوں پر نہیں کیا جاسکتا، میرے گھر کا ماحول دینی اور علمی ماحول تھا، میرے بھائی ازہر میں پڑھتے تھے میں بھی ان کے ساتھ ازہر جایا کرتا تھا، میں نے ازہر اور اس کے اسٹاف کا وہ

زمانہ دیکھا جو اس زمانہ سے کہیں بہتر تھا، اس زمانہ کا اور میرے گھر کے اچھے ماحول کا مجھ پر اثر پڑا میں نے کہا کہ دینداروں اور دین سے اس کی بغاوت کا اصل سبب شاید مسلمانوں کا زوال، ان کی زبوں حالی اور حالت کی خرابی ہے جو شخص ذکی الحس اور کمزور اعصاب کا ہو وہ اس صورت حال کو سہار نہیں سکتا وہ بے سوچے سمجھے دین کا باغی ہو جائے گا، انھوں نے ذرا تیور بدل کر کہا اس کے اندر اندھی تقلید اور منفی پہلو سے بغاوت کا جذبہ کیوں نہیں پیدا ہوتا؟ ان کا مطلب تھا دین کی صحیح دعوت اس بگاڑ کی اصلاح کا جذبہ اور بے دینی سے بغاوت؟ میں نے کہا کہ یہ بات تو توفیق خداوندی سے حاصل ہوتی ہے۔

ادب کو دینی فکر کی طرف کیسے موڑا جا سکتا ہے

میں نے کہا کہ ادب کو دین کی طرف کیسے موڑا جا سکتا ہے؟ انھوں نے فرمایا کہ دینی تحریک اور اسلامی طرز زندگی سے ادب میں دینی رجحان پیدا کیا جا سکتا ہے، ادباء اور مصنفین کا معاملہ یہ ہے کہ وہ وہی چیز پیش کرتے ہیں جس کی لوگوں میں طلب اور بازار میں مانگ ہوتی ہے، جب لوگ دین کی طرف متوجہ ہوں گے ان میں دینی طلب ہوگی، تو لامحالہ یہ ادباء و مصنفین وہی چیز پیش کریں گے جو ان کے لئے پسندیدہ اور قابل قدر ہوگی، میں نے کہا کہ آپ ازہر کے لئے کیا چیز مفید سمجھتے ہیں۔

ازہر کے لئے تجویز

انھوں نے کہا کہ میں نے شیخ ظواہری(۱) کے زمانہ میں تجویز رکھی تھی کہ ازہر کے اساتذہ کے لئے ایک ٹریننگ کالج کھولا جائے جو ان تمام فنون کے اساتذہ تیار کرے، جو ازہر میں پڑھائے جاتے ہیں، اس طرح ازہر اس قسم کے اساتذہ کی خدمت سے بے نیاز ہو جائے گا جنھوں نے ایسی تعلیم و تربیت پائی ہے جو نہ ازہر سے میل کھاتی ہے نہ اس کی شان کے مطابق ہے ایسے اساتذہ جو خود دین اور دینی حقائق سے پوری طرح مطمئن نہ ہوں،

(۱) شیخ محمد ازہر حمدی بن ابراہیم ظواہری شیخ محمد عبدہ کے ممتاز شاگرد تھے، شیخ الازہر کے منصب پر ۱۹۲۹ء سے ۱۹۳۵ء تک رہے اور ۱۳۶۳ھ میں قاہرہ میں وفات پائی (مترجم)

شک اور تذبذب کی فضاء پیدا کرتے ہیں، دینی حقائق، اسلامی عقائد اور علوم جدیدہ میں کشمکش کا ذہن بناتے ہیں، یہ صورت حال طلبہ میں بے اطمینانی اور دین سے بدگمانی پیدا کرتی ہے لیکن جب اساتذہ اس ازہری مدرسہ سے فارغ ہوں گے تو وہ طبعی علوم کو آیات قرآنی کی تفسیر کی طرح پڑھائیں گے اور ان علوم کی دین کے ساتھ مطابقت کر سکیں گے۔

مشرقی اسلامی ممالک میں سائنسی علوم کی کمی

لیکن مجھے معلوم ہوتا ہے کہ میری تجویز ''سرخ فیتہ'' کی نذر ہوگئی اور اس کا نفاذ نہ ہوسکا، میری اب بھی یہی رائے ہے، انھوں نے کہا کہ مشرق اسلامی میں صرف طبعی علوم کی کمی ہے، ہم کو اس بات کی ضرورت ہے کہ ان کو محض طبعی علوم کی حیثیت سے حاصل کریں مغربی علوم کی حیثیت سے نہیں ہم مغرب کے عمرانی و اجتماعی علوم و آداب کے محتاج نہیں، سائنسی علوم پر مغرب کی مہر نہیں لگی ہے کہ کوئی دوسرا اسے نہ حاصل کر سکے۔

طبعی علوم حاصل کرنے کا طریقہ

ان علوم کے پڑھنے کا طریقہ یہ ہونا چاہئے کہ ہم ان علوم و نظریات اور ان سے جو کچھ ثابت ہے اس میں اور جو ابھی تجربہ و تحقیق کی منزل میں ہے اس میں فرق کریں اور دونوں کو ان کا الگ الگ مقام دیں۔

مصر کی تقلید سے انتباہ

ڈاکٹر عمر اوی نے جو کچھ کہا اس میں سے ایک بات یہ بھی ہے کہ وہ ہندو پاک اور انڈونیشیا سے زیادہ پر امید ہیں میں نے ان سے کہا اس وقت ہندو پاک میں ایسی دینی سرگرمی ہے جو عرب ممالک میں بھی نہیں پائی جاتی، انھوں نے میری یہ بات سن کر فرمایا کہ لیکن ان ملکوں کو مصر کی تقلید کرنے میں احتیاط سے کام لینا چاہئے کہ مبادا وہ مصر کو ثبوت میں پیش کریں کہ اس میں جامع ازہر جیسا ادارہ ہے، اس کے باوجود مصر نے یہ رخ اختیار کیا تو

ہمیں اس کو اپنانے میں کیا حرج ہے۔

ازہر کے مستقبل کے بارے میں گفتگو

ازہر اور اس کے مستقبل کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے فرمایا کہ اس وقت ازہر کی بڑی مخالفت اور اس کے خلاف سازش پائی جاتی ہے، انگریزوں کے اشارہ پر ازہر مختلف کالجوں میں تقسیم ہوگیا اور مختلف مدرسوں اور دینی اداروں کی شکل میں اس کو بانٹ دیا گیا، س کا محرک یہ تھا کہ جب انگریزوں نے دیکھا کہ اتنا بڑا جم غفیر ایک ہی جگہ تعلیم حاصل کرتا ہے، ایک ہی شہر میں رہتا ہے تو انہیں خطرہ محسوس ہوا اور ان سے خوف زدہ ہوکر انھوں نے شہروں اور ضلعوں میں ازہر کی شاخیں قائم کرنے کا منصوبہ پیش کیا، جن میں ان اطراف کے طلبہ علم حاصل کریں اور قاہرہ آکر تعلیم حاصل کرنے کی زحمت وگرانباری سے بچ جائیں، اس تجویز میں طلبہ اور ان کے سرپرستوں کے لئے سہولت تو ہوئی، لیکن ازہر کی طاقت اس سے کمزور ہوگئی، میں نے عمراوی صاحب کو اپنی کتاب ماذا خسر العالم کا ایک نسخہ ہدیہ کیا اور ان سے اجازت چاہی۔

قلعہ اور اس کی مسجد کی سیر

ڈاکٹر عمراوی کے گھر سے نکل کر ہم نے قلعہ کا رخ کیا جو محمد علی باشا کبیر کے عہد میں مرکز حکومت تھا اور وہاں کی عظیم الشان مسجد کو دیکھا، مسجد کے طرز تعمیر، زیب وزینت اور اس کی پختگی ومضبوطی ہمیں پسند آئی، اس میں شبہ نہیں کہ مسجد فن تعمیر کی ایک زندہ وجاوید مثال ہے، اس کے بعد ہم لوگ اس عمارت کی طرف گئے جو خدیو حکومت کا سکریٹریٹ اور سرکاری دفاتر کا مرکز تھا، یہاں باہر کھڑے ہوکر ہم لوگ قاہرہ اور اس کی عظیم الشان مسجدوں اور ان کے اونچے اونچے میناروں اور اھرام جیزہ کے دلکش مناظر سے لطف اندوز ہورہے تھے جو دور سے دکھائی دیتے تھے، بڑا دلفریب وانوکھا منظر دیکھا، موسم سرما کا زمانہ اور چاشت کا وقت تھا ہلکی ہلکی خوشگوار دھوپ شہر کے در وبام کو سنہری کرنوں کا لباس پہنا رہی تھی۔

قلعہ کا کتب خانہ

ہم لوگ قلعہ کے کتب خانہ میں داخل ہوئے وہاں "الوقائع المصرية" (۱) کی جلدیں دیکھیں، جس کا نام تاریخ ادب، عربی اور مصر کی سیاست وادبی تاریخ میں پڑھا کرتا تھا، اور رسالہ" اللواء" کی جلدیں دیکھیں اس کی نگرانی اور اس میں مضمون نگاری مصطفے کامل مرحوم کیا کرتے تھے، " المؤيد " کا فائل بھی دیکھا، احمد زکی باشا کے کتب خانہ میں داخل ہوئے جو قلعہ کے کتب خانہ میں بطور امانت رکھا ہوا ہے، اس محقق کی بعض یادگاریں دیکھیں، ہم نے وہ کتب خانہ دیکھا جو کبھی احمد زکی باشا کے آباد گھر " دار العروبة " کی زینت تھا۔

فوجی میوزیم

پھر ہم لوگوں نے فوجی میوزیم دیکھا جو فرعونی، عربی عہد ممالیک سے متعلق تھا ہم نے اس کے ہر حصہ کو دیکھا، متعدد نقشوں اور قیمتی معلومات کا مشاہدہ کیا، شیخ احمد عثمان کے بیٹے زکریا کمال ہمارے ساتھ تھے، چونکہ وہ ثانویہ کے طلباء اور اساتذہ کے ساتھ بارہا اس میوزیم کو دیکھ چکے تھے اس لئے ہم سب سے زیادہ واقف تھے، بہت سی چیزوں کی وضاحت کرتے اور بتاتے، بڑی مفید دلچسپ تفریح رہی۔

مسجدوں اور مقبروں کی سیر

مسجد سلطان حسن میں ہم لوگوں نے عصر کی نماز پڑھی پھر مسجد رفاعی کو دیکھا یہ ملک فواد اور ان کے والد خدیو اسماعیل اور ان کے علاوہ دیگر لوگوں کا مقبرہ ہے، بہت سی قبروں کے پاس سے ہمارا گذر ہوا۔ میں نے کہا اگر تمام لیڈروں، علماء اور صالحین کے مقبرے بنتے تو مُردوں کا شہر زندوں کے شہر سے بہت بڑا ہو جاتا اور زندوں کو گھر بنانے کے لئے بالشت بھر زمین ملنی مشکل ہوتی۔

---

(۱) معروف وقیع مصری جریدہ جسے محمد علی نے قاہرہ سے ۱۸۲۸ء میں نکالا تھا (مترجم)

مقبروں کے متعلق صحیح اسلامی موقف اور اس کی حکمت

اسلام نے مقبرہ سازی کی ہمّت افزائی نہ کر کے بڑا اچھا کیا، اللہ تعالیٰ اپنے رسول کی قبر کو نور سے بھر دے، انھوں نے اس سے ڈرایا اور بڑی ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا اور یہود و نصاریٰ کے طرز عمل سے احتراز کیا، ان میں جب کوئی شخص مرتا تو اس کی قبر پر ایک مسجد تعمیر کر دیتے۔

عصر بعد شارع التوفیقیہ میں واقع الحاج احمد عطیہ رضوان کے ہوٹل میں دوپہر کا کھانا کھایا جو ایک نیک شخص کا صاف ستھرا ہوٹل ہے، مغرب بعد تھکے ہارے اپنی قیام گاہ واپس آئے، دن کا بڑا حصہ سیر و تفریح میں گذرا، یہ دن تاریخی آثار کی سیر کا دن تھا۔

۳/۵/۱۳۷۰ھ مطابق ۹/۲/۱۹۵۱ء بروز جمعہ

شہر فسطاط اور مسجد عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی سیر

آج سویرے ہم لوگ شیخ احمد عثمان کے ساتھ شہر فسطاط دیکھنے گئے، پہلے ہم لوگ سیدنا عمرو بن العاص کی مسجد میں داخل ہوئے، سلاطین نے اس میں توسیع کی ہے، اور مختلف زمانوں میں اس میں اضافہ ہوتا رہا، اس وقت وہ اصل مسجد سے بہت زیادہ وسیع ہے، یہ بات ضرور ہے کہ اس کا حجازی طرز باقی ہے جو منیٰ کی مسجد خیف اور حرمین شریفین کی یاد تازہ کرتا ہے، سرزمین مصر کی اس اوّلین مسجد میں داخل ہو کر جس کی بنیاد توحید اور تقویٰ اور خدائے واحد کی عبادت پر رکھی گئی ہے، ہم نے ایک روحانی لذت محسوس کی، کیوں نہ ہو کہ اس کی بنیاد ان مبارک ہاتھوں نے رکھی ہے جنھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر بیعت کی اور بے شمار مرتبہ آپ سے مصافحہ کا شرف حاصل کیا۔

مسجد سیدنا عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ میں ہمارا احساس

اس مسجد میں ہم نے ایسی قلبی کشش اور انس محسوس کیا جو مصر کی وسیع سرزمین میں

کسی مسجد کے اندر نہ محسوس ہوا، یہ آرائش وزیبائش سے (جس کو اس زمانہ میں آرٹ کہا جاتا ہے) یکسر خالی اور سادی مسجد ہے، لیکن افسوسناک حد تک لاپرواہی کا شکار ہے، اس کے چاروں طرف گندگی، کوڑے اور ملبہ کا ڈھیر لگا ہوا ہے۔

لغویات

میں نے سنا کہ شاہ فاروق (شاہ مصر) ہر سال اس میں جمعۃ الوداع ادا کرتے ہیں، اس وقت شاید منتظمین مسجد میں ایسا فرش لگا دیتے ہیں جو اس کی خستہ حالی اور ذمہ داروں کی لاپرواہی پر پردہ ڈال دیتا ہے اور بادشاہ کو اس کی خبر نہیں ہوتی، مسجد کے ستونوں میں ہم نے ایک ایسا ستون دیکھا جس کے چاروں طرف لوہے کی جالی لگی ہوئی تھی، ہمیں بتایا گیا کہ مزدور زیادہ وزنی ہونے کے سبب سے اس ستون کو اٹھانے میں بہت پریشان ہوئے اس سے انھوں نے یہ قیاس کیا کہ یہ اپنی اندرونی خباثت کی وجہ سے مسجد جانے سے انکار کرتا ہے، اس وقت سے مسلمان اس کو جوتے سے مار کے سزا دیتے ہیں، ذلیل اور رسوا کرتے ہیں، حکومت نے اس کو محفوظ رکھنے کے لئے لوہے کی جالی سے گھیر دیا ہے، جو غصہ میں بھرے ہوئے مجاہدین کے جوتوں سے اس کی حفاظت کرتی ہے، یہ کر کے حکومت نے اچھا رول ادا کیا۔

اس کے برعکس مسجد کے ایک دوسرے گوشہ میں ایک ایسی جگہ بھی ہے جہاں سیدہ نفیسہ (۱) کے بیٹھنے اور لوگوں کو اپنے علم سے فائدہ پہنچانے کا معمول تھا، ہم نے ایک ایسا ستون بھی دیکھا جس کو لوگ اپنی زبان سے چاٹتے ہیں، چاٹتے چاٹتے اس میں گڑھا سا ہو گیا ہے، حکومت نے لوہے کی جالی لگا کر اس لغویت کو بھی بند کر دیا۔

مصر قدیم میں

مسجد سے نکل کر ہم نے پرانے شہر فسطاط کا قصد کیا جو مصر کا پہلا اسلامی دارالسلطنت تھا، راستہ میں یکا یک ہم نصرانیوں کے مقبروں ان کی صلیبوں اور گرجا گھروں کے پاس سے

(۱) خانوادہ نبوت سے انتساب رکھنے والی یہ وہ مبارک خاتون تھیں جن سے سیدنا امام شافعیؒ نے بھی استفادہ کیا (مترجم)

گزرے، کاش کہ اسلامی شہر کا گردوپیش بھی اسلامی ہی ہوتا، جو دلوں میں عظمت وشوکت اور سکینت وطمانیت پیدا کرتا، ہم لوگ شہر فسطاط کے حدود میں داخل ہوئے اور دیر تک اس کے کھنڈرات اور ویرانوں میں چلتے رہے لیکن میرے ذہن میں صحابۂ کرامؓ کے شہران کی فوجی چھاونی اور مجاہدین کے خیموں کی تصویر گردش کرتی رہی اور دل ہی دل میں کہتا رہا کہ شاید یہاں حضرت زبیر بن العوامؓ کا خیمہ تھا، یہاں حضرت عبادہ ابن صامتؓ کا خیمہ تھا، حضرت محمد بن مسلمہؓ شاید وہاں ٹھہرے ہوئے تھے یہ شاید حضرت عمرو بن العاص کا مکان ہے کہ جس میں آج قاہرہ کا مزدور اور فقیر بھی رہنا پسند نہ کرے گا لیکن اس معمولی مکان کے مکین نے حکومت روم کو شکست دی، وہی اس ملک کا بھی فاتح اور شاید ان کے مشہور عالم بیٹے حضرت عبداللہ بن عمروؓ اسی جگہ خدا کی عبادت کرتے تھے اور درس حدیث دیتے تھے۔

حقائق تصورات سے مغلوب نہیں ہوتے

صورت حال یہ تھی مگر میں کوشش کر رہا تھا کہ اپنے فکر کو اس مبارک عہد پر مرکوز کردوں، اور اسی وقت اس فضا سے اس مبارک فضا میں منتقل ہو جاؤں اور یہ بھول جاؤں کہ مصر جدید اور چودہویں صدی میں ہوں۔

لیکن حقیقت تصور وخیال سے مغلوب نہیں ہوتی، میں اپنی کوشش میں کامیاب نہ ہوا، حقائق وواقعات کی موجودہ دنیا ہی میں رہا، اسی کی آوازیں سنائی دیتی رہیں، اسی کے مناظر کا مشاہدہ کرتا رہا، ہم لوگ ان آثار قدیمہ کے پاس پہنچے جو اس اجڑے ہوئے شہر سے نکالے گئے تھے ہم یہاں تھوڑی دیر رک کر اس کے کارکنوں سے باتیں کرتے اور ان سے اس شہر کے متعلق معلومات حاصل کرتے رہے، اور اس سے قبل عہد عباسی اور عہد اموی کے شہروں سے متعلق بھی معلومات حاصل کرتے رہے، ہم اسی حال میں تھے کہ ایک موٹر آئی، اس میں سے بعض ترک اساتذہ اور آثار قدیمہ کے استاذ حسن عبدالوہاب بک بھی اترے احمد عثمان صاحب نے ہم سے ان کا تعارف کرایا انھوں نے خیر مقدم کیا اور خوش آمدید کہا اور

عربی آثار کے دیکھنے کے سلسلہ میں اپنی خدمات پیش کیں۔ ہم نے اس عنایت پر ان کا شکریہ ادا کیا اور ان سے دوشنبہ کے دن دوبارہ ملنے اور ملاقات کرنے کا وعدہ کیا۔

مصر قدیم سے ہم لوگ (شرکس) کو چلے جہاں شیخ سلمان کی مسجد میں جمعہ پڑھا نماز بعد میں نے کچھ دینی باتیں کیں اس میں ہندوستان میں دینی دعوت کے طریقہ کار کی تشریح کی اور اس کے بعض تجربے اور فوائد بیان کئے۔ ہم نے شیخ احمد عثمان کے گھر دوپہر کا کھانا کھایا اس کے بعد شباب سیدنا محمد کے دفتر گئے مگر وہاں کوئی نہ ملا، وہاں ملاقاتی کارڈ دے کر علامہ سید خضر حسین سے ملنے کے لئے دار الهداية الاسلامية گئے لیکن ان سے بھی ملاقات نہ ہوئی، مسجد سیدہ زینب میں مغرب کی نماز پڑھی، یہ بہت بڑی اور خوبصورت مسجد ہے بلکہ قلعہ کی مسجد کے بعد قاہرہ کی خوبصورت ترین مسجدوں میں سے ہے۔

۴/۵/۱۳۷۰ھ مطابق ۱۰/۲/۱۹۵۱ء بروز سنیچر

آج دن کا اکثر حصہ (دار الکتاب العربی) میں اپنا رسالہ "بين العالم وجزيرة العرب" اور "المدوالجزر فی تاریخ الاسلام" کے پروف کی تصحیح میں گزرا۔ یہ کام "انصار السنة" کے پریس میں انجام پایا۔

استاذ محمد علی طاہر سے گفتگو

مغرب بعد ہم لوگ یاسین الشریف کے ساتھ پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق "الشوریٰ" کے اڈیٹر محمد علی طاہر سے ملنے گئے، امیر شکیب ارسلان سے ان کے تعلق اور ان کی کتاب کے اشاعت کے سبب ہم لوگ ان سے ہندوستان ہی سے واقف تھے، ان کی نئی کتاب "معتقل هاكستب" کا کچھ حصہ میں نے حجاز میں پڑھا تھا، ان کے پاس پہنچے تو وہاں فلسطینی جنرل عبداللہ التل بھی موجود تھے، ہم لوگ بیٹھ کر فلسطین اور مسلمانوں کے قبضہ سے اس کے نکل جانے کے اسباب پر گفتگو کرنے لگے، استاذ محمد علی طاہر خصوصیت کے ساتھ مسئلہ فلسطین کے بارے میں بڑی واقفیت رکھتے ہیں، انھوں نے کہا میں خاص فلسطین سے

متعلق ایک کتاب لکھنا چاہتا ہوں جس میں اس کی پوری خصوصیات تاریخ اور تمام مسائل کا مکمل جائزہ لیا جائے گا، ورنہ مجھے خطرہ ہے کہ فلسطین کہیں تاریخ کے دائرے سے بھی اس طرح نکل جائے جس طرح مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گیا کتاب نہ لکھی گئی تو اس کے بعد مؤرخین و مصنفین جب فلسطین کے بارے میں بحث کریں گے تو ان کو پوری معلومات حاصل نہ ہوسکیں گی، میں چاہتا ہوں کہ یہ کتاب ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھے جس میں مستند معلومات ہوں، فلسطین کا معاملہ بالکل اندلس جیسا ہے، اگر المقری نے اپنی عظیم الشان کتاب (نفح الطیب) نہ لکھی ہوتی تو اندلس بھی تاریخ سے غائب ہو جاتا۔

فلسطین کا المیہ اور اس میں عرب ملکوں کی کوتاہی

پھر وہ فلسطین کے المیہ اور اس کے بارے میں عرب حکومتوں کی کوتاہی بلکہ زیادتی کا ذکر کرنے لگے، انھوں نے بتایا کہ کس طرح فلسطینیوں سے ہتھیار چھین کر ان کو نہتا کر دیا گیا تھا کہ وہ اپنی جان و آبرو تک کی حفاظت نہ کر سکتے تھے، یہود آتے اور اہل شہر ان کا لقمۂ تر بن جاتے، اگر یہ حکومتیں اور یہ سیاسی جماعتیں اور ادارے فلسطینیوں کو انھیں کے حال پر چھوڑ دیتے تو بھی غنیمت تھا، وہ آج بھی بہادروں کی طرح اپنے ملک کا دفاع کرتے جیسا کہ اس سے قبل عرصے سے کرتے رہے تھے، پھر ہماری گفتگو علماء اور قائدین کے اخلاقی انحطاط سے متعلق ہونے لگی، میں نے کہا کہ پہلے علماء، رجال کی جرح و تعدیل پر کتابیں لکھا کرتے تھے لیکن جب سے سیاست اور قیادت کا یہ نیا دور شروع ہوا ہر شے پر سیاست ہی چھا گئی اور علم کی جگہ اس نے لے لی اور لوگوں نے اپنے رہنماؤں اور اسلامی قیادت پر تنقید کرنا شروع کر دی۔

میں نے انھیں "ماذا خسر العالم" کا ایک نسخہ پیش کیا اور انھوں نے مجھے اپنی کتاب "ذکری الامیر شکیب ارسلان" دی جو ان مقالات کا مجموعہ ہے جو تعزیتی جلسوں میں پیش کئے گئے تھے یا مرحوم کے دوستوں، قدردانوں اور رسائل و اخبارات کے ایڈیٹروں نے لکھے تھے، انھوں نے ایک کتاب "اوراق مجموعة عن فظائع

الانجلیز فی فلسطین وغدر الیھود وصبر العرب " اور "کتاب معتقل ھا کستب" بھی دی، اتنے میں ان کے کچھ ملنے والے آگئے انھوں نے ہم سے ان کا اور ان سے ہمارا تعارف کرایا، انھیں لوگوں میں عرب لیگ کے معاون سکریٹری جنرل استاذ احمد الشقیری اور یمنی حکومت کے وزارت خارجہ کے سکریٹری قاضی محمد عبداللہ العمری بھی تھے، سکریٹری صاحب سے منگل کے دن قصر الجزیرہ کے ہوٹل میں ملنا طے ہوا اور اسی روز یا بدھ کو احمد الشقیری صاحب سے ملنا طے ہوا۔

۵/۵/۱۳۷۰ھ مطابق ۱۱/۲/۱۹۵۱ء بروز اتوار

حمام میں افسوسناک منظر

آج شاہ فاروق کے یوم پیدائش منانے کا دن تھا، پورا شہر سجایا گیا تھا، مصری قوم بادشاہوں سے تعلق اور ان کی محبت میں فنائیت کے اندر پرانے زمانے سے مشہور ہے، شیخ احمد عثمان نے شوق دلایا کہ میں ان کے ہمراہ شاہی محل عابدین دیکھوں، انھوں نے وہاں کے رجسٹر میں ہم لوگوں کا نام درج کیا، ملک کے رسم ورواج اور وہاں کے حالات جشن و خوشی کے مناظر سے واقفیت حاصل کرنے کی غرض سے ہم نے ان کی تجویز قبول کرلی، آج میں حمام بھی گیا جو ترکی حمام خانوں کے طرز پر بنا تھا، غسل کرنے کے لئے اندر داخل ہوا تو نوجوان لڑکوں، بوڑھوں کا برہنہ ہجوم نظر آیا ان میں اور جانوروں میں کچھ فرق نہ تھا، اس خلاف شرع اور فطرت انسانی سے گرے ہوئے بے تکے منظر کو دیکھ کر میں حیران رہ گیا اور نہائے بغیر نہایت تکدر کی حالت میں واپس ہوگیا۔

اخبارات کی بے حیائی

ملک فاروق کی سالگرہ کی مناسبت سے آج کے اخبارات شاہ اور شاہ کی منگیتر کی تصویروں کے ساتھ شائع ہوئے جن سے آج ہی منگنی طے ہوئی تھی، یہ ایسی تصویریں تھیں جو

کسی مسلمان عورت کے لئے زیبا نہیں، وہ عورت جو چند ہی دنوں میں مصر کی ملکہ بننے والی ہے، اس کے لئے کسی طرح یہ روا نہ تھا کہ اخبار میں اس کی تصویریں آئیں، جس پر ہر کس و ناکس کی نظر پڑتی ہے لیکن ذوق و نگاہ بدل چکے ہیں، اخبارات آزاد ہیں، ان پر کوئی پابندی نہیں، جو چاہتے ہیں شائع کرتے ہیں، اس کو نہ پسند کرنے والے لوگ بھی بہت تھوڑے ہیں جن کا کوئی اثر نہیں، شیخ احمد عثمان آئے اور ہم لوگ قصر عابدین کے ارادہ سے نکلے، وہاں زرق و برق لباس میں ملاقاتیوں کا ایک جم غفیر نظر آیا، ہم لوگوں نے حاضری کے رجسٹر میں اپنے دستخط کر دیئے۔

اہرام کی سیر

ہم لوگ اہرام کی ان عظیم الشان عمارتوں کو دیکھنے گئے جن کا شمار عجائبات عالم اور تاریخ کے دیرپا آثار میں ہے جن کے بارے میں ہم نے بہت کچھ پڑھا اور سنا تھا، ہم لوگ وہاں اس طرح پہونچے کہ نگاہیں اس کی طرف لگی ہوئی تھیں اور دل اس کے مشتاق تھے، ہمیں بے جان پتھروں کی ایک مخروطی اور بہت بلند عمارت نظر آئی اور سخت حیرت ہوئی کہ جبل مقطم سے یہاں تک یہ پتھر کیسے پہونچائے گئے ہوں گے۔

ظالمانہ بیگار کی یادگار

ہم لوگوں نے بڑے مقبروں کا چکر لگایا جو ملک خوفو کے مقبرے کے نام سے موسوم ہے، عمارت کی عظمت و شوکت اور اس کی تاریخی اہمیت و ندرت کے باوجود مجھے اس ہوس اور جنون سے سخت نفرت پیدا ہوئی جس نے ان مضبوط تاریخی یادگاروں کو وجود بخشا، اس کی حقیقت ایک بادشاہ کے مقبرہ کے سوا کچھ نہیں کہ جس کے لئے دو گز زمین کافی تھی لیکن اس نے فخر و غرور کی ہوس اور یادگار چھوڑنے کے جنون میں اس لغو کام کے لئے عرصہ دراز تک ہزاروں لوگوں سے بیگار لیا، انھیں دیکھ کر قرآن کریم کی یہ آیت یاد آتی ہے اور اس کی صداقت و عظمت کی تصویر سامنے آجاتی ہے۔

"أَتَبْنُونَ بِكُلِّ رِيعٍ آيَةً تَعْبَثُونَ، وَتَتَّخِذُونَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُونَ" (الشعراء آیت ۱۲۸۔۱۲۹)

(کیا تم ہر اونچے مقام پر یادگار بناتے ہو، جس کو محض فضول بناتے ہو) اس لغو کام میں انسانی قوت وصلاحیت اور اس کے قیمتی وقت کے ضائع کرنے پر افسوس ہوا جس کا کوئی بدل نہیں۔

یہاں سے ہم لوگ بعض معابد میں بھی گئے، جہاں ہر وقت تصویریں، مورتیاں، نقش ونگار اور کتبے لگے رہتے ہیں۔ رہبر نے آثار قدیمہ کے ماہرین سے جو کچھ سنا تھا اور عبادت گاہوں اور پروہتوں کے متعلق اس کو جو معلومات تھیں ان کے مطابق وہ تشریح کرتا جاتا تھا، ہم لوگوں نے (سب سے بڑے بت ابوالہول) کو دیکھا، اس تاریخی سیر میں چند گھنٹے گزار کر ہم لوگ اپنی قیام گاہ پر واپس آ گئے۔

۶/۵/۱۳۷۰ھ مطابق ۱۲/۲/۱۹۵۱ء دوشنبہ

ازہر اور اس کے قرب وجوار کی سیر

آج بارش ہو رہی تھی لیکن تیز نہیں تھی، ہلکی ہلکی پھوار اور ترشح تھا جس سے نکلنے اور آنے جانے میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی، دس بجے سے پہلے ہم لوگ نکلے آثار قدیمہ کے چیف نگراں استاذ حسن عبدالوہاب بک سے ملنے ازہر نیز قرب وجوار کے آثار قدیمہ کی سیر کا یہی وقت مقرر تھا۔

ازہر کے کتب خانہ میں

ازہر کے گیٹ پر ہم لوگ اکٹھا ہوئے، شیخ احمد عثمان ہمارے ساتھ تھے، اس کتب خانہ کی سیر کی جو خدیو عباس حلمی ثانی کے زمانہ میں المدرسۃ الانبغاویۃ اور کچھ باقی حصہ اسی سے ملے ہوئے دوسرے مدرسے طبرسیہ میں قائم کیا گیا تھا، اس کتب خانہ میں متفرق کتب اکٹھا کی گئی تھیں، کچھ مکتبے بھی اس کو ہدیہ کئے گئے جن میں سب سے اہم مکتبہ سلیمان باشا اباظہ مرحوم کا تھا۔

استاذ حسن عبدالوہاب ہم کو ان قدیم کتابوں کی طرف متوجہ کرتے جاتے تھے جو چوتھی پانچویں صدی کی مخطوطات تھیں، ہم بہت سی پرانی کتابوں اور نادر مخطوطات، قدیم طرز پر

لکھے ہوئے قرآن کریم، پنج سوروں اور شاہی فرامین سے واقف ہوئے، جو دنیا کے ہر کتب خانہ کے لئے باعث زینت بن سکتے ہیں، سب سے اہم چیز جس کا ہمیں علم ہوا، وہ ابواسحٰق کی کتاب رسوم دَارالخلافۃ تھی جو انہیں کے نسخہ سے نقل کی گئی تھی، شاید ازہر کا کتب خانہ ایسا ہے جس میں یہ کتاب موجود ہے، اس کتاب میں حکومت عباسیہ کے اجتماعی اور اقتصادی حالات پر روشنی ڈالی گئی ہے، اور آمد وخرچ کا حساب لکھا گیا ہے، استاذ حسن عبدالوہاب مکتبہ کی سیر کے دوران ہم کو اس کی عمارتوں، محرابوں گیلریوں کے طرز تعمیر کی طرف متوجہ کرتے رہتے تھے، اس کی تعمیر کی تاریخ پر بھی روشنی ڈالتے جاتے تھے، پھر ہم لوگ ازہر گئے، اس کے بعد ازہر قدیم دیکھا، جو فاطمی خلیفہ معزلدین اللہ کی تعمیر کردہ ہے اور اس میں امیر عبدالرحمٰن کتخدا اور دوسرے لوگوں نے اضافہ کیا ہے۔

استاذ حسن عبدالوہاب اس عظیم الشان ادارے کی تاریخ اور جو چیزیں اس کی تعمیر میں داخل کی گئیں اور مختلف عہدوں میں اضافہ ہوتا رہا ان سب کی تشریح کرتے جاتے استاذ حسن عبدالوہاب اس ملک میں آثار قدیمہ کے ممتاز عالم ہیں۔

ازہر سے ہم لوگ نکلے اور مدرسہ ''منصور قلاؤون'' جاتے ہوئے بازاروں میں داخل ہوئے اور منصورہ میں صلیبیوں پر غالب آنے والے بادشاہ صالح نجم الدین ایوبی کے قائم کردہ مدرسہ کے پاس سے گزرے جو مذاہب اربعہ کی تعلیم کے لئے قائم کیا گیا تھا، ہم نے مدرسہ کا خوبصورت منارہ دیکھا، حسن عبدالوہاب صاحب نے بتایا کہ مسجدوں میں بادشاہوں کی تدفین کا سلسلہ حکومت ایوبیہ کے دور اخیر سے شروع ہوا، فاطمیوں کے عہد میں یہ چیزیں نہیں ملتیں، حکومت ایوبیہ کے بادشاہ اسی طریقہ پر چلے اور مساجد میں تدفین ہوتی رہی۔

مدرسہ منصور قلاؤون میں

ہم لوگ خان الخلیلی کے بازار سے گزرتے ہوئے مدرسہ ''منصور قلاؤون'' میں داخل ہوئے، یہ بہت شاندار عمارت اور اچھی تاریخی یادگار ہے، لوگوں میں مشہور ہے کہ اس کی

تعمیر صرف چودہ مہینوں میں مکمل ہوگئی بلکہ صدر دروازے پر یہی عبارت کندہ ہے لیکن استاذ عبدالوہاب پورے اعتماد کے ساتھ کہتے تھے کہ یہ عمارت سات سال آٹھ مہینے میں مکمل ہوئی ان کی دلیل یہ تھی کہ اس کی تعمیر کی ابتداء بالاتفاق ربیع الآخر ۶۸۳ھ میں ہوئی اور سلطان منصور کا انتقال ۶ رذی القعدہ ۶۸۹ھ میں ہوا، ان کا تابوت پہاڑ کے قلعہ میں لے جایا گیا اور محرم کی پہلی تاریخ ۶۹۰ھ جمعرات کی شام تک وہیں رہا، ۲ رمحرم کو وہاں سے مدرسہ منصوریہ میں ان کی اصل قبر میں منتقل ہوگیا، جسے خود انہوں نے بنوایا تھا، اگر عمارت تیار ہوتی تو یہیں دفن کئے جاتے، قلعہ نہ لے جائے جاتے، یہ شاندار عمارت ایک گنبد، مدرسہ اور اسپتال پر مشتمل ہے جو فن تعمیر کے مختلف انوکھے ڈیزائنوں کا مجموعہ اور قاہرہ کی اسلامی عمارتوں میں ایک شاندار تاریخی یادگار ہے جو" المعز لدین اللہ" روڈ پر پرانے فاطمی محلوں کے درمیان واقع ہے۔

سحیمی کے مکان میں

مدرسہ منصور قلاؤون سے ہم لوگ اس تاریخی مکان کو دیکھنے گئے جو ترکی عہد کے امراء اور ان لوگوں کے مکان کے نظم ونسق کا نقشہ پیش کرتا ہے جو دیندار بھی تھے، صاحب ثروت وصاحب علم بھی تھے، یہ مکان قدیم رؤساء وامراء کے رہن سہن کی پوری تصویر پیش کرتا ہے، یہ سحیمی کے نام سے مشہور ہے، موجودہ دور کے طرز تعمیر کے مقابلے میں اس مکان کا طرز تعمیر بہت زیادہ راحت بخش اور آرام دہ ہے۔

عصر بعد میں "المدّ والجزر" کے پروف کی تصحیح میں مشغول رہا، اور مغرب بعد تک ہم لوگ" انصار السّنة" کے چھاپہ خانہ میں رہے۔

۷/۵/۱۳۷۰ھ مطابق ۱۳/۲/۱۹۵۱ء بروز منگل

یمنی حکومت کی وزارت خارجہ کے سکریٹری سے گفتگو

آج ہم لوگ یمنی وزارت خارجہ کے سکریٹری قاضی عبداللہ عمری سے ملنے کے لئے

" قصر الجزیرۃ ہوٹل گئے، ہم لوگ بالاخانہ پر ان کے کمرہ میں داخل ہوئے قیام گاہ کی شان وشوکت، ظاہری سجاوٹ وتکلفات ایسی قوم وحکومت کے نمائندے کے شایانِ شان تھے جو مالدار ہو، جو کچھ بھی کہا جائے موجودہ دور سیاست نے مشرقی حکومتوں کو اس پر مجبور کر دیا ہے کہ وہ یورپ کا طرز اختیار کریں، سکریٹری صاحب نے علماء اور دیندار حضرات کی کشادہ دلی اور حسن اخلاق کے ساتھ ہمارا استقبال کیا اور خوش آمدید کہا، ہم لوگ بیٹھ کر باتیں کرنے لگے، میں نے ان سے یمن کے ساتھ ہندوستان کے علمی وثقافتی تعلقات کا ذکر کیا" تاج العروس" کے مصنّف جلیل القدر ہندوستانی عالم علامہ سیّد مرتضیٰ زبیدی (بلگرامی) کا بھی ذکر کیا جو عرصہ تک یمن رہنے کی وجہ سے زبیدی مشہور ہو گئے تھے علامہ شیخ حسین بن محسن انصاری کا ذکر کیا، جو اس صدی کے اکثر علماء حدیث کے استاذ ہیں، میں نے ان سے کہا کہ میرے علم ومطالعہ کے سلسلے میں مجھ پر بھی یمن کا احسان ہے اس لئے کہ شیخ خلیل بن محمد بن حسین یمنی کا شاگرد ہوں۔

میں نے ان سے یمن دیکھنے کا شوق ظاہر کیا اس لئے کہ تنہا یمن ایسا عربی ملک ہے جو ابھی تک پرانی تہذیب وطرز زندگی پر قائم ہے، اس کی روش میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی، باقی دوسرے ممالک تو مغربی تہذیب کے ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں، ان کو دیکھ کر انسان کوئی نئی معلومات نہیں حاصل کر سکتا نہ کچھ فائدہ اٹھا سکتا ہے، بلکہ ان میں سے کسی ایک ملک کو دیکھ کر باقی کو اسی پر قیاس کر لینا کافی ہوگا، انھوں نے میری اس خواہش پر اظہار مسرّت فرمایا۔

یمن دوراہے پر

انہوں نے ہمیں یمن دیکھنے کی دعوت دی، میں نے ان سے کہا عَرب ممالک اپنے کسی معاملہ میں خود مختار نہیں، وہ مغربی تہذیب کے دھارے میں بہہ رہے ہیں، انہیں کچھ اختیار نہیں رہا لیکن یمن خود مختار وبا اختیار ہے، مجھے توقع ہے کہ وہ بے سوچے سمجھے، مغربی تہذیب کو نہ اپنائے گا، اور نہ عجلت سے کام لے گا، اس کے نظام تعلیم اور طریقہ حیات پر اس طرح نہ گرے گا، جس طرح پیاسے پانی پر اور پروانے شمع پر گرتے ہیں، بلکہ صرف اس کے اس

حصّہ کو اپنے ضابطۂ حیات میں شامل کرے گا، جو اس کے ممتاز طرزِ زندگی دینی واسلامی مزاج اور اس کے پیغام ودعوت سے میل کھاتا ہو، اس کے مہمل ومضر اجزاء کو چھوڑ دے گا یمن دنیا سے الگ تھلگ رہنے کی وجہ سے شاید ایسا سمجھتا ہے کہ قافلہ حیات سے پیچھے رہ گیا ہے، مجھے ڈر ہے کہ وہ کہیں قافلۂ حیات سے ملنے کے لئے تیز تیز قدم بڑھائے پھر ٹھوکر کھا جائے یا گم کردہ رَاہ ہو جائے اور وہ بات پیش آجائے جس کی تلافی ناممکن اور جس کے بعد سنبھلنا دشوار ہوتا ہے۔

اسلامی ملکوں میں زندگی کے دوستون

میں نے کہا کہ میرے نزدیک اسلامی ملکوں میں صحیح اسلامی زندگی کا انحصار قوم کے اندر مضبوط اور صحیح دینی شعور پر ہے، اور یہ بات عمومی دعوت، قوم سے رابطہ اور اس کی دینی تربیت اور ہر طبقہ میں بیداری پیدا کئے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی۔

دوسری بنیادی چیز صحیح نظام تعلیم ہے جس کو قرآن وحدیث کی روشنی میں مرتب ہونا چاہئے جس میں نہ غلطی کا امکان ہے نہ باطل کا خدشہ، یہ علم سدا بہار ہر معاشرہ وترقی یافتہ تہذیب کی بنیاد ہے، ہمیں قرآن وحدیث کے علوم اور طبیعاتی علوم نئے تجربات وایجادات (جس میں یورپ مشرق سے بہت فائق اور غالب ہے) کے درمیان توازن قائم کرنا ہے، مجھے امید ہے کہ یمن ان دونوں قوتوں کو جمع کرے گا، اور ان میں صحیح تطبیق دے گا، اگر ایسا ہوگیا تو مجھے توقع ہے کہ یمن دوسرے عرب ممالک میں بہت ممتاز ہوگا، جو نہ اب اسلامی کہے جاسکتے ہیں نہ مغربی، اس کے ہم معنی تھوڑے سے فرق کے ساتھ مختصراً میں نے اور باتیں کیں، محترم سکریٹری صاحب نے غور سے بات سنی اور میرے اس خیال سے اتفاق کیا، میں نے انہیں ذہین سریع الفہم اور باخبر پایا، انہوں نے یمن اور اس کے مناظر عمارتوں اور شاہی خاندانوں سے متعلق انگریزی میں ایک کتاب ہدیہ کی دورانِ گفتگو یمن کے نمائندہ جناب علی مؤید صاحب یمنیوں کی ایک جماعت کے ساتھ آگئے سکریٹری موصوف نے ہمارا ایک دوسرے سے تعارف کرایا، میں نے کہا ''اتاکم اهل اليمن''

سکریٹری صاحب صنعاء کے سفر پر روانہ ہونے کے لئے پابرکاب تھے، آئندہ مہینہ انشاء اللہ بخیر وعافیت واپس ہوں گے، خدا مبارک فرمائے۔

شام کے طلبہ میں تقریر

عشاء کے بعد سیّد یاسین الشریف نے شامیوں کے بورڈنگ ہاؤس کے ایک کمرہ میں فلسطین وشام کے کچھ طلبہ کو جمع کیا، ہم لوگ پہنچے تو انہیں دیکھ کر ایسا محسوس ہوا کہ ہم لوگ علوم جدیدہ کی کسی ہندوستانی یونیورسٹی یا کالج میں ہیں، ازہر میں بلاد اسلامیہ کے تعلیمی وفود کے صدر محمد کنجی نے تعارف واستقبالیہ کے کلمات کہے، پھر میں نے طالبان علوم دینیہ کے فرائض ان کی صلاحیتوں اور خصائص کے موضوع پر تقریر کی اور طلباء ازہر کو روحانی پہلوؤں کی طرف توجہ دینے اور دل کو روحانی غذا پہنچانے کی تقریر کی، عبادت میں بلند ہمتی دینی فرائض وواجبات کی پابندی کرنے پر زور دیا، میں نے ان سے کہا فرائض کی پابندی اور جماعت میں حاضری کا تو کیا ذکر آپ کو تو نوافل وتہجد کا پابند ہونا چاہئے۔

میں نے کہا اگر ہم ان شخصیات اور نمایاں حضرات کی تاریخ کا جائزہ لیں، جنھوں نے اس دین کی خدمت کی، اسلامی معاشرہ میں نئی روح پھونکی انقلاب پیدا کیا تو ہمیں نظر آئے گا کہ وہ روح کی خلش، دل کی تپش، کثرت عبادت، ہمہ وقت ذکر کی مشغولیت میں عوام سے بہت فائق اور ممتاز تھے، اگر انسان ایمان ویقین سے بھرپور دل، روحانی حرارت اور بااثر دینی شخصیت کا مالک نہ ہو تو وہ نہ دوسرے پر اثر انداز ہوسکتا ہے اور نہ معاشرہ میں دینی روح وتڑپ پیدا کرسکتا ہے، اور نہ زندگی میں حرکت ہی پیدا کرسکتا ہے، مگر افسوس ہم یہ دیکھتے ہیں کہ آج معلومات تو بہت زیادہ وسیع ہوگئیں، اتنا کہ اگر ان کو کسی ایک شہر کے باشندوں پر تقسیم کیا جائے تو اس کے ہر فرد کو عالم بنادیں، لیکن دل بہت کمزور قوت ارادی حد سے زیادہ مضمحل وافسردہ اور ایمان بے جان ہوگیا ہے، موجودہ زمانہ میں ہم نے بڑی علمی ترقی کی لیکن یہ علم ہم کو عمل پر نہیں آمادہ کرتا، ہم اپنے ایمان کو صحابۂ کرامؓ اور حضرات تابعین کے ایمان جیسا نہیں پاتے، نہ

ہماری نمازیں ان کی جیسی نمازیں ہیں، اس کا سبب یہ ہے کہ ہمارا علم ایمان وعمل سے کہیں زیادہ وسیع اور زیادہ ہوگیا، اب ہمارے لئے ضروری ہے کہ اپنا صحیح محاسبہ کریں، نفس کی تربیت اور اس کے ساتھ بہی خواہی میں اخلاص وحقیقت پسندی سے کام لیں، اسلام اور موجودہ مادّیت کے مابین خطرناک جنگ میں اترنے سے پہلے اس کو پورے طور پر تیار کرلیں، جب تک ہم اس طاقت واسپرٹ اور دینی پختگی واستقامت سے مسلح نہ ہوں اور پیمانہ دل حقیقت ایمان سے لبریز نہ ہو، اس وقت تک ہمارے لئے اس معرکہ میں ثابت قدم رہنا اور جمنا، ناممکن ومحال اور اس طاقت ور، دلفریب اور کافرادا، مادّیت کا سامنا کرنا دشوار ہے، مجھے توقع ہے کہ یہ باتیں ضائع نہ جائیں گی سامعین پر ان کا کچھ اثر ہوگا۔

۸/۵/۱۳۷۰ھ مطابق ۱۴/۳/۱۹۵۱ء بروز بدھ

''العالم العربی'' کے دفتر میں

آج صبح ہم لوگ رسالہ " العَالَمُ العَربی " کے دفتر شارع ابراہیم باشا گئے اور رسالہ کے ایڈیٹر جناب اسعد حسنی کو پوچھا، اس وقت وہ اپنے گھر پر تھے، خبر ہوئی تو آئے اور ہم لوگوں سے ملے، میں نے ان کو بتایا کہ ہم لوگ ہندوستانی ہیں، اس رسالہ سے دلچسپی رکھتے ہیں۔

مسئلہ فلسطین میں ناکامی سے متعلق گفتگو

اس کے بعد میں نے ان سے عالم عربی قضیۂ فلسطین اور اس کی ناکامی کے بارے میں اپنے بعض خیالات کا اظہار کیا، میں نے کہا کہ اس ناکامی کا سب سے بڑا سبب روحانی دیوالیہ پن، ایمان کا فقدان، اور قوموں وحکومتوں میں دینی جوش وولولہ کا سرد پڑ جانا تھا، جو فلسطین کے میدان میں جنگ آزمائی کررہی تھیں، میں نے کہا کہ مغربی تہذیب اور مادّیت ہی وہ سم قاتل ہے، جس نے ان قوموں پر ستم ڈھایا اور ان کی روحانی اور حقیقی قوت کا خاتمہ کردیا، (میری بات سن چکے) تو انھوں نے کہا کہ لیکن مجھے تو یورپین قوموں میں عربوں سے زیادہ

طاقتور روح نظر آتی ہے، اسی روح کے بل بوتے پر انہوں نے جنگیں لڑیں اور اپنا دفاع کیا، میں نے ان سے کہا کہ مغربی قومیں وطن پرستانہ جذبہ اور سیاسی شعور کی بیداری کے ذریعہ غالب آئیں، ان کے اس جذبہ نے روح کی جگہ لے لی اور ایک بڑی طاقت بن گیا، جہاں تک عرب قوموں کا تعلق ہے، انہوں نے نہ تو اپنی روح کی حفاظت کی اور نہ کوئی ایسی چیز حاصل کی جو روح کی جگہ لے سکے اور اس خلاء کو پر کر سکے، نہ ان کے پاس دینی روح ہے نہ سیاسی بیداری ہے، اسی لئے وہ ہر جنگ اور معرکہ میں تباہ کن ناکامی اور شرمناک شکست سے دوچار ہوتی ہیں، انہوں نے کہا میرا خیال تو یہ ہے کہ عرب حکومتوں کی ناکامی کا سبب قبائلی ذہنیت ہے جسے لے کر ان حکومتوں نے فلسطین کے میدان میں جنگ لڑی ہے، میں اپنی رائے کا اظہار رسالہ کے بعض شماروں میں کر بھی چکا ہوں، میں نے کہا جی ہاں میں نے اسے دیکھا ہے اور مجھے یہ تعبیر پسند آئی، اس کے بعد میں نے اپنی کتاب " ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین " کی آخری فصل " زعامة العالم العربی " ان کے سامنے بڑھائی، انھوں نے تھوڑا سا پڑھا اور اپنی پسندیدگی کا اظہار فرمایا، پھر آخری باب کی پہلی فصل کے چند عنوانات میں نے خود پڑھ کر سنائے، مثلاً " الاستعداد الروحی "، " روحانی تیاری " اور " الاستعداد الصّناعی والحربی " ، " صنعتی وجنگی تیاری " اور " التنظیم العلمی الجدید " ، " جدید علمی تنظیم "۔ میں نے ان کی فرصت وتوجہ کے اس موقع کو غنیمت جانا کیوں کہ صحافیوں کو پڑھنے اور مطالعہ کا زیادہ وقت نہیں ملتا، وہ قارئین کے سامنے اپنے خیالات کو پیش کرنے کی فکر میں دوسروں کی چیزیں پڑھنے کا وقت نہیں نکال پاتے، میں نے اس گذارش کے ساتھ کہ وہ اس کتاب کے مطالعہ کے لئے اپنے قیمتی وقت میں سے کچھ موقع نکالیں گے۔ کتاب کا ایک نسخہ ہدیہ کیا، انہوں نے مطالعہ کا وعدہ کیا اور اپنے رسالہ میں شائع کرنے کے لئے میری تصویر مانگی، میں نے تصویر دینے سے معذرت کردی، میں نے اپنی وہ تصویر دینے کا وعدہ کیا جس کو میں اپنے قلم سے کھینچتا ہوں، جو میری فکر وزندگی کی تصویر ہے۔ انہوں نے اس کو منظور کرلیا۔

پھر ہم نے ان سے اجازت چاہی اور ''الرسالۃ'' کے دفتر گئے، وہاں ہمیں استاذ احمد حسن زیّات نہ ملے، یہاں سے ہم'' شباب سیّدنا محمد'' کے مرکز دارالارقم گئے، معلوم ہوا کہ استاذ حسین یوسف سفر میں ہیں کل لوٹیں گے، اس کے بعد ہم نے دوپہر کا کھانا کھایا پھر شبرا آگئے جہاں استاذ احمد عثمان سے ملاقات ہوئی پھر اپنے دوست الحاج علی الشریف کے ساتھ استاذ حسن بے عبدالوہاب کے گھر گئے۔ ان کے پاس تھوڑی دیر بیٹھے چائے پی اور بعض تاریخی آثار و یادگار کے متعلق گفتگو رہی، ان کی تحقیقات و مطالعہ اور ان کی رائے سے ہم اس نتیجہ پر پہنچے کہ سیدہ نفیسۃ کے علاوہ قاہرہ کے اندر اہل بیت میں سے کسی اور قبر کا ہونا تاریخی طور پر ثابت نہیں۔ میں نے ان سے علاّمہ سید مرتضیٰ ''بلگرامی'' کی قبر کے متعلق پوچھا جو زبیدی کے نام سے مشہور ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ان کہ اہلیہ تو سیّدہ رقیہ کے مقبرہ میں مدفون ہیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ بھی وہیں مدفون ہوں گے پھر انہوں نے تاریخ جبرتی اٹھا کے دیکھا تو اس سے یہی ثابت ہوا انہیں کے یہاں "الادارۃ الثقافیۃ" شعبۂ مخطوطات کے ناظم محمد رشاد عبدالمطلب سے ملاقات ہوگئی ان کے اور حسن عبدالوہاب کی معیت میں دوشنبہ کے دن دو بجے '' دار الکتب المصریۃ ''اور'' دار الآثار العربیّۃ '' دیکھنا طے ہو، استاذ حسن عبدالوہاب کے گھر سے ہم لوگ شیخ احمد عثمان کے ساتھ ''العشیرۃ المحمدیۃ '' کے دفتر گئے اور انجمن کے صدر شیخ استاذ محمد زکی ابراہیم سے ملے اور العشیرہ کے کچھ رسائل دیکھے۔ میں نے عرض کیا کہ فقہی بحث و مباحثہ اور شخصیات پر جرح و قدح کرنے سے بچنا بہت ضروری ہے۔ میں نے کہا کہ اس وقت تو مادہ پرستی، اخلاقی انارکی کے مقابلہ اور دین خالص کی دعوت دینے پر ساری کوششوں کو مرکوز کر دینا چاہئے۔ ہمیں یہ نہ معلوم تھا کہ آج انجمن میں درس کا دن ہے۔ ہمیں یہ نہیں معلوم تھا کہ ہم انجمن کے درس میں شریک ہوں گے تو تقریر بھی کرنی ہوگی چنانچہ شیخ محمد زکی نے جلسہ میں شرکت اور مختصر تقریر کی دعوت دی ہم نے ان کی دعوت قبول کر لی اور جلسہ میں حاضر ہوئے پہلے تو شیخ احمد عثمان نے

ہندوستان میں ہمارے طریقۂ دعوت وتبلیغ کی تشریح میں تقریر کی انہوں نے بڑی خوبی واجمال کے ساتھ ہمارے طریقۂ دعوت کو بیان کیا پھر میں نے ان کی تقریر کی تائید اور اس کی مزید تشریح کی پھر واپس آ گئے۔

آج ہم استاذ یٰسین الشریف اور مولانا عبیداللہ بلیاوی کے ساتھ الرّسالۃ کے دفتر گئے وہاں معلوم ہوا کہ استاذ احمد حسن زیات سفر میں ہیں دوشنبہ کے دن دفتر آئیں گے۔

پنجشنبہ ۹/۵/۱۳۷۰ھ، ۱۵/۲/۱۹۵۱ء

استاذ علی الغایاتی کے ساتھ

منبر الشرق کے ایڈیٹر استاذ علی الغایاتی سے ملنے کی غرض سے ہم لوگ خدیو میدان کی طرف چلے، ہندوستان میں ہم لوگ اس پرچہ کے خریدار تھے، اس کے مضامین میں ہم ایمان کی جھلک محسوس کرتے تھے، ہمیں اس کے ایڈیٹر سے ملنے کا شوق ہوا ایسے لوگ جو دینی احساس رکھتے ہیں اور دین کے غلبہ اور کامیابی کے لئے جدّ وجہد کرتے ہیں، ہر شہر میں ان کی تعداد بہت تھوڑی ہے، لہٰذا ان چھوٹے چھوٹے دینی خاندانوں میں ایک دوسرے سے رابطہ قائم ہونا ضروری ہے۔

غایاتی صاحب اپنے گھر ہی پر ہم لوگوں سے ملے، ہمیں ان کے بالوں میں سفیدی، چہرہ پر ایمان کا نور نظر آیا، میں نے ان سے اپنا تعارف کرایا، اپنے کچھ پمفلٹ اور ماذا خسر العالم کا ایک نسخہ انہیں پیش کیا، وہ ہندوپاک ان دونوں کے مستقبل، دینی ماحول اور ان دونوں ملکوں میں حکومت کے رجحان کے متعلق سوالات کرتے رہے، میں نے اپنے علم ومشاہدہ کے مطابق ان کو جواب دیا۔

بلادِ عربیہ اور ہندوپاک کی مثال

ہندوپاک میں دینی شعور وبیداری کا ذکر چھڑ گیا، میں نے کہا ہندوپاک کے مسلمانوں میں بڑا دینی جذبہ اور عرب ممالک سے بہت زیادہ دین کی عظمت پائی جاتی ہے۔

معاف فرمائیں، بلادعربیہ میں تو دین کے ساتھ وہ معاملہ ہے جو آسودہ شخص کھانے کے ساتھ بے رغبتی و بے اعتنائی کا معاملہ کرتا ہے، عرب ممالک کا حال اس بچہ کا سا ہے جو دینی علمی گھرانے میں پلا ہو، ہمہ وقت اپنے پس وپیش، چپ وراست دینی کتابیں اور رسائل دیکھتا ہو، اس صورتحال سے دین وعلم کے ادب واحترام کا جذبہ اس کے اندر سے ختم ہوگیا ہو تو ظاہر ہے کہ وہ دین وعلم کا کما حقہٗ ادب واحترام اور اس کی قدر شناسی نہ کرے گا۔

اسی طرح یہ ممالک جو اصلاً اسلام کے داعی اور خالص عرب ہیں، دین ورسول اور قرآن کی طرف عادت ورسم کی نظر سے دیکھتے ہیں جس میں نہ کوئی کشش ہوتی ہے نہ تعظیم اس کے بمقابل ہندوستان و پاکستان کا معاملہ یہ ہے کہ وہ اسلام کو اس نومسلم کی نظر سے دیکھتے ہیں جو اپنے دین میں پشتینی مسلمانوں سے بہت زیادہ جوشیلا اور جذباتی ہوتا ہے وہ دین کا اتنا اہتمام کرتا ہے جو خود عربوں میں پایا نہیں جاتا، پھر میں نے ان سے دونوں ملکوں میں نئی دینی سرگرمی اور دعوت کے کام کا تذکرہ کیا، میں نے اپنی کتاب ''ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین'' میں سے ''محمّد رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم روح العالم العربی'' کے عنوان سے جو کچھ لکھا ہے پڑھ کر انھیں سنایا، انہوں نے بہت پسند کیا اور اس سے اتفاق ظاہر کیا۔

منبر الشّرق کے متعلق گفتگو

میں نے غایاتی صاحب سے منبر الشرق کے متعلق گفتگو کی انہوں نے بتایا کہ میں نے اسے جنیوا میں جاری کیا اور وہاں تقریباً ۲۷ سال تک رہا، لیکن خدا کا شکر ہے میں دین پر ثابت قدم رہا، وہاں کا ماحول اور مغربی تہذیب کے جراثیم مجھ پر اثر انداز نہ ہوسکے، حالانکہ جنیوا یورپ کے بہت زیادہ ترقی یافتہ شہروں میں سے ہے، پھر جب میں مصر واپس آیا تو ڈاکٹر زکی مبارک نے ''الاھرام'' میں لکھا کہ میں ایک ایسے مصری کو جانتا ہوں جو جنیوا میں ۲۷ سال رہا ہے لیکن وہاں کے تمدّن وترقی کا کوئی اثر قبول نہیں کیا اور وہ اپنے ازہری

فکر کے ساتھ مصر واپس آیا، ہمیں امید تھی کہ وہ اپنے ملک وقوم کی خدمت کرے گا اور اپنے تجربات سے اس کو فائدہ پہونچائے گا مگر ہماری ساری امیدوں پر پانی پھر گیا، اسی طرح ہمارا رسالہ ''منبر الشرق'' بھی اپنے دینی رنگ اور اصول کا پابند رہا اسی وجہ سے اس کی اشاعت ومقبولیت اتنی نہ بڑھ سکی جتنی اس کے بعد نکلنے والے پرچوں کی بڑھ گئی، ہمارے دوست امیر شکیب ارسلان ظرافت میں فرمایا کرتے تھے کہ ''منبر الشرق'' آخرت میں کامیاب ہے، فرمایا میں ان لوگوں کے زمانہ کا ہوں، جو عالم گیر اسلامی اتحاد (پان اسلامزم) کے حامی تھے، میں نے اس مسئلہ میں ایک مرتبہ ملک عبد العزیز ابن سعود سے بات کی اور ان سے اس اسلامی وحدت اور مسلمانوں میں دینی مساوات کی طاقت کا ذکر کیا، تو انہوں نے کہا، حضرت سلمان فارسی کے واقعہ سے یہی ثابت ہوتا ہے، میں نے علی الغایاتی صاحب سے عرض کیا کہ '' منبر الشرق'' جیسے رسالہ کے لئے یہ زیادہ بہتر ہے کہ وہ فقہی مباحث اور مقامی اختلافات میں پڑنے سے احتراز کرے وہ دین واخلاق کی دعوت ہی کو اپنا ہدف بنائے اور اس پر جمار ہے انہوں نے میری اس رائے سے اتفاق کیا اور اس کی تحسین کی، میں نے کہا جب تک میں مصر میں رہوں گا آپ سے رابطہ رکھوں گا انھوں نے اس پر خوشی کا اظہار فرمایا اور بڑے اخلاص ومحبت کے ساتھ ہم کو رخصت کیا۔

دار ارقم میں

منبر الشرق سے ہم لوگ شباب سیّدنا محمد(۱) کے مرکز ''دار الارقم'' گئے، جناب حسین یوسف صاحب سے ملنے میں ہم لوگ کئی بار ناکام ہو چکے تھے لیکن وہ اس مرتبہ مل گئے، ہم لوگ اس ہونہار مسلم نوجوان سے ملے جو خلوص وایمان سے بھرپور، نام نہاد ترقی پسندی وتجدد اور عریانی کے خلاف بہت کھل کر زوردار اور شعلہ بار مضامین لکھتا ہے میں نے انہیں ایک ذہین اور سرگرم نوجوان پایا، جوش جنون اور سوز دروں نے ان کو اور سنوار دیا ہے، ہندوستان میں اس رسالہ کے قارئین کو جو اس سے روحانی تعلق، قلبی لگاؤ اور گہری محبت ہے، میں نے ان سے اس کا ذکر کیا اور

(۱) مصر کی ایک انجمن کا نام ہے جس میں زیادہ تر نوجوان مسلمان تھے۔

فحاشی وگندگی اور عریاں تصویروں کے خلاف ان کے کامیاب جہاد کی تعریف کی۔

فحش وعریاں ادب کے خلاف طاقتور جہاد کی ضرورت ہے

میں نے ان سے کہا کہ اس فحش وعریاں گندے اور بے لگام ادب کے خلاف طاقتور محاذ اور صف آرائی کی ضرورت ہے، ایسا کرنا فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔

انہوں نے بتایا کہ رسالہ (شباب سیّدنا محمدؐ) نے فحش اخبارات ورسائل کے خلاف جو بعض مضامین لکھے اور انہیں دھمکی دی اس کا اثر ہوا ایک مرتبہ مجھے استاذ فکری اباظہ نے ''المصور'' کے دفتر بلایا اور ماضی میں شائع ہونے والے مضامین کے متعلق معذرت کی اور وعدہ کیا کہ اب اخلاق کے منافی چیزوں کو اس رسالہ میں نہ شائع کریں گے اور تین سال تک اپنے وعدہ پر قائم رہے، اس کے بعد یہ رسالہ پھر اپنی پہلی حالت پر آ گیا، میں نے کہا کہ مخالفت اور دھمکی ضروری ہے، یہ مادہ پرست لوگ ایسے مزاج کے ہیں کہ ان پر دھمکی اور نقصان کا خطرہ ہی اثر انداز ہوسکتا ہے۔

انہوں نے کہا کہ شاید آپ کو تعجب ہوگا کہ ''المقطم'' وہ تنہا رسالہ ہے جس نے کبھی شراب کا اشتہار اپنے صفحات پر شائع نہیں کیا اگرچہ وہ عیسائیوں کے ہاتھ میں ہے اور انگریزوں کا دوست ہے، تاہم اس کے اس کردار کا ہم اعتراف کرتے ہیں، مصری پرچوں میں صرف یہی ایک پرچہ تصویریں اور فحش مضامین سب سے کم شائع کرتا ہے، انہوں نے کہا کہ ایک مرتبہ پاپائے رومہ کے نائب نے امیر محمد علی توفیق کو ان تصویروں کی اشاعت کی طرف متوجہ کیا جو ادب واخلاق کی منافی اور جنسی جذبات کو بھڑکانے والی ہوتی ہیں، نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی گفتگو نے ولی عہد کے جذبۂ فکر کو ابھارا اور انہوں نے ان اخبارات ورسائل کے تراشوں کے ساتھ شاہی محل میں رپورٹ پیش کی ازہر بھی اس کی اس کاروائی میں شریک ہوا۔ ہم لوگ نتیجہ کے منتظر رہے، لیکن معاملہ اسی جگہ ختم ہوگیا اور اس کے بعد کچھ پتہ نہ چلا، میں نے حسین یوسف صاحب سے گذارش کی کہ وہ اپنے ساتھیوں اور'' شباب سیّدنا محمد صلی

اللہ علیہ وسلم'' کے نوجوانوں سے ملاقات کرائیں ہم ان دونوں سے ملیں اور ان سے گفتگو کریں، انہوں نے اس کا وعدہ فرمایا اور جمعرات کو ہمیں اور بعض دیگر احباب کو دوپہر کے کھانے پر مدعو کیا ہم نے شکریہ کے ساتھ اس دعوت کو منظور کرلیا۔

مغرب سے پہلے ہم لوگ'' انصار السنۃ'' کے دفتر گئے اور وہاں سے علی عدلی المرشدی اور بعض دیگر دوستوں کے ساتھ محمد آفندی عبد الوہاب البناء کے گھر مصر جدیدہ گئے جو ''انصار السنۃ'' کے سرگرم اراکین میں سے ہیں، وہاں ہمیں ''انصار السنۃ'' کے بعض اور ارکان وہمدرد ملے ہم نے ان سے باتیں کیں پھر رات کا کھانا کھایا اور شنبہ کے دن عابدین میں واقع جمعیۃ کے دفتر میں دوپہر کے کھانے پر آنے کے وعدہ پر ہم لوگ ایک دوسرے سے جدا ہوئے۔

جمعہ ۱۰/۵/۱۳۷۰ھ، ۱۶/۲/۱۹۵۱ء

جامع ازہر میں جمعہ

ابھی تک ہمیں اس کا اتفاق نہ ہوا تھا کہ قاہرہ کی مسجدوں میں سے کسی بڑی مسجد میں جمعہ پڑھتے اور جمعہ کی نماز میں شہری رسوم کو دیکھتے، افسوس کی بات ہے کہ ہر شہر کا ایک خاص دینی رنگ اور رسم ورواج بن گیا ہے جو کسی دوسرے شہر کے غیر دینی رسم ورواج سے مختلف ہوتا ہے۔ یہ رنگ مقامی عادات واطوار سے تعلق رکھتا ہے، (اصلی دینی آداب سے اس کا کچھ تعلق نہیں)۔

چنانچہ ہم لوگوں نے طے کیا کہ آج جامع ازہر میں جمعہ پڑھیں گے، نماز جمعہ سے ایک گھنٹہ پہلے مسجد پہونچے اور دو ہلکی ہلکی رکعتیں پڑھ کر بیٹھ گئے، قاری نے سورۂ کہف پڑھنی شروع کی جس کا مصر میں زور سے پڑھنے کا معمول چلا آرہا ہے، قاری نے لاؤڈ اسپیکر پر پڑھنا شروع کیا، جیسے ہی وہ ایک آیت پڑھتا لوگ بلند آواز سے چیختے اس کی آواز کی لطافت وحسن کی تعریف کرتے اور مکرر پڑھنے کا مطالبہ کرتے۔

اس ہنگامہ شور وشغب، آوازوں کے ٹکراؤ اور بلندی سے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ہم ہندوستان کے کسی میلے یا مجلس وغیرہ میں ہیں، سب کہتے خدارا اللہ نے تمہیں جو نعمتیں دی

ہیں، اس سے ہمیں نوازنے میں بخل نہ کرو، واہ واہ، قاری کا حال یہ کہ ایک آیت پڑھتا پھر اس کو تین چار اور اس سے بھی زیادہ طرز وطریقہ سے دہراتا اور اپنی فنی مہارت کا مظاہرہ کرتا، لوگ اس پر جھومتے اور چلاتے اور ہم لوگوں کا حال یہ کہ اس عجیب وغریب صورت حال پر حیران وششدر، نہ ہم نفل پڑھ سکتے تھے اور نہ اس طرز قراءت سے لطف اندوز ہو سکتے تھے اور نہ اس کو غور ہی سے سن سکتے تھے، مجھے تعجب ہوا کہ علماء ازہر نے قرآن عظیم کی عظمت اور مسجد کے آداب کے ساتھ یہ نامناسب طریقہ اختیار کرنے کی اجازت کیسے دی، مسجد بھی وہ جو ازہر کی سب سے بڑی مسجد اور اس کا دینی مرکز ہے جہاں ہونے والی ہر بات سند بن سکتی ہے اور گاؤں اور دیہاتوں کے لئے فتویٰ کی حیثیت رکھتی ہے، سب سے بڑے اسلامی ملک کی سب سے بڑی مسجد کی یہ نماز ایسی نہ تھی جس سے کسی ذی علم مسلمان کو خوشی ہو، جمعہ کے بعد ہم لوگ شیخ امین الخطاب کے یہاں گئے وہاں سے ان کی اور شیخ محمد عثمان کی معیت میں اپنے دوست الحاج علی محمود الشریف کے گھر گئے اور وہاں علماء واحباب کی ایک جماعت کے ساتھ دوپہر کا کھانا ہوا، ان حضرات میں شیخ محمد طٰہٰ الساکت بھی تھے، انہوں نے دار العلوم ندوۃ العلماء کے کتب خانہ کو اپنی نئی کتاب " درجات الناس عند ملوکھم " ہدیہ کی۔

مغرب کی نماز الکخیا میں پڑھی یہ نمازیوں سے کھچا کھچ بھری ہوتی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ مسجد بازار میں واقع ہے ہم نے سنا کہ بڑے لوگوں کی نماز جنازہ یہاں پڑھی جاتی ہے، مسجد سے نکل کر ہم لوگ بھائی یٰسین الشریف کے ساتھ اس جگہ گئے جہاں اخوان کے منتخب، اور مخصوص حضرات سے ملنا طے تھا، یہ ایک اخوانی وکیل کا دفتر تھا، وہاں شیخ حسن البناء مرحوم کے بھائی عبد الرحمٰن البناء سے ملاقات ہوگئی، دوسرے احباب بھی آ گئے اور تعارف وگفتگو کا دور شروع ہوگیا، ہمارے بعد ہی استاذ صالح عشماوی، محمد فرید عبد الخالق اور سعد الدین الولیلی، جناب صالح قدور، محمد عبد الحمید اور عبد الحفیظ ضیفی بھی آ گئے۔

اخوان المسلمین سے میری امید

آج اخوان المسلمین کے بعض ذمہ داروں کی ایک بے ضابطہ مجلس میں میری شرکت کا اتفاق ہوا اور اخوان کی تحریک پر گفتگو کا سلسلہ شروع ہوا، میں نے کہا کہ بعض عرب ممالک کی سیر کے بعد وہاں کے حالات سے واقف ہو کر میں اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ تحریک اخوان المسلمین اپنے مجوزہ خاکے کے مطابق اگر منظم و مضبوط ہو جائے تو وہ عالم عربی کو اخلاقی گراوٹ انتشار اور تیزی کے ساتھ غار ہلاکت کی طرف بڑھنے سے انشاء اللہ بچا سکتی ہے، اسی وجہ سے میں اس کو بڑی اہمیت دیتا ہوں مجھے اس سے محبت بھی ہے لیکن عشق است و ہزار بدگمانی کے اصول پر میں اپنے خیالات و تجربے جن کو میں نے ہندوستان کی سیاسی تحریکوں کے مطالعے سے حاصل کیا ہے، ایک مخلص بھائی اور خاندان کے فرد کی حیثیت سے پیش کرتا ہوں۔

تین اہم نکات

وہ یہ ہیں کہ کسی دعوت کے لئے جو اخوان کے طرز کی ہو اور کسی تحریک کے لئے جو اخوان کی تحریک کی طرح ہو تین نکات کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے، اس سلسلہ میں پہلی بات تو یہ ہے کہ عوام کے دلوں میں مبادی ایمان کی تخم ریزی کو حسن تدبیر، تنظیم، حصول اقتدار اور انتظامی امور پر مقدم رکھنا چاہئے، اس طریقۂ کار کی درازی اور اس پر کارکنان تحریک کا ثابت قدم رہنا اور اس کے لئے جدوجہد کرتے رہنا، داعیوں اور کارکنوں کو کامیابی سے ہمکنار کرتا ہے اور درخت اپنا پکا ہوا مرغوب پھل دینے لگتا ہے لیکن جب تحریک کے چلانے والے جلدی کرتے ہیں اور اس منزل کو بہت تیزی سے طے کرنا چاہتے ہیں یا قوم میں دعوت کے بغیر اور اس کی تربیت کو پختہ کئے بغیر چھلانگ لگا کر سیاست و حکومت میں دخل دینے لگتے ہیں تو یہ درخت بارآور نہیں ہوتا، یا اس کے پھل کچے اور ناقص ہوتے ہیں، ہمارے لئے دعوت اسلامی کی ابتدائی منزل کے حالات میں بڑا سبق ہے، دعوت کے پہلے مرحلہ میں تیرہ سال مکّہ میں

صرف ہوئے اور کئی سال مدینہ منوّرہ میں لگے، عہد نبوی میں حکومت و تنظیم کی مدت دعوت و تبلیغ کی مدّت سے بہت کم تھی اور شاید اللہ نے اخوان کی اس دعوت کے ساتھ بھی خیر کا ہی فیصلہ فرمایا ہے اور ان کو دعوت کی پہلی منزل پر رہنے پر مجبور کر دیا ہے حالانکہ وہ اس وقت اقتدار کی دہلیز پر پہونچ گئے تھے، شاید یہ فیصلۂ خداوندی اس لئے ہوا کہ دعوت کا کام پختہ ہو جائے اس کے کارکن اچھی طرح تربیت یافتہ اور تجربہ کار ہو جائیں، اس کے اصول مضبوط و مستحکم ہو جائیں، یہ بڑا سنہرا موقعہ ہے، اخوان کا فرض ہے کہ اس کو غنیمت سمجھیں، اور اس سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں، دعوت کو پھیلانے، دلوں میں ایمان کا بیج بونے اور دینی لوگوں کی تربیت اور قوم کے تمام طبقوں سے رابطہ قائم کرنے میں ایک لمحہ بھی نہ ضائع ہونے دیں۔

داعیوں اور مردان کار کی تربیت

دوسرا نکتہ ایسے افراد تیار کرنا ہے جو دعوت کے کام کو سنبھالیں، اور اس کے انتظام کو چلائیں، لوگوں کی تربیت کریں اور ہر خلا کو پر کریں، ہر دعوت و تحریک یا انجمن چاہے وہ کتنی ہی مضبوط ہو، اگر وہ نئے افراد نہیں تیار کرتی ہے تو وہ خطرے میں ہے، تھوڑے ہی عرصہ میں اس کی باصلاحیت شخصیتیں یکے بعد دیگرے ختم ہوتی جائیں گی اور شخصیتوں کے معاملے میں اس کا دیوالیہ پن ظاہر ہو جائے گا۔

قلب و روح کو غذا پہنچانے کی ضرورت

تیسرا نکتہ قلب و نگاہ کو ایسی غذا پہونچاتے رہنا ہے جو داعیوں کے جوش و نشاط کو باقی رکھے، اور ان کی خرچ ہونے والی صلاحیت کا نعم البدل فراہم کرتی رہے، آدمی چراغ کی طرح ہے اگر اس کا تیل ختم ہو جائے تو وہ بجھ جائے گا، ہم نے بہت سی سیاسی تحریکوں اور دینی دعوتوں کو دیکھا ہے جن کے چلانے والوں نے اپنے آپ کو جیلوں اور طرح طرح کی مصیبتوں کے لئے پیش کیا، لیکن تھوڑے ہی عرصہ بعد ان میں سستی پیدا ہو گئی ان کا جذبۂ

اندرون سر پڑ گیا اور وہ پیچھے کی طرف پلٹ آئے بلکہ جہاں سے چلے تھے وہاں سے بھی پیچھے ہٹ آئے اور عامۃ الناس بلکہ بعض اوقات بازاری لوگوں سے بھی پست ہو گئے۔

ان تجربات سے معلوم ہوا کہ صرف وقتی جوش کا اعتبار نہیں، نہ محض قربانی پر اعتماد کیا جا سکتا ہے، کمال تو یہ ہے کہ اس کو بقاء و دوام حاصل ہو اور یہ بات روحانی تربیت اور دل کو ذکر اور حلاوت ایمانی سے معمور کر کے ہی حاصل ہو سکتی ہے۔

میں نے کہا کہ شیخ حسن البناء کی سیرت کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ ان کے پاس ایک خداداد صلاحیت تھی، وہ ایک ایسی بڑی شخصیت کے مالک تھے جسے خدا نے جماعت کی تربیت اور دعوت کی قیادت کے لئے تیار کیا تھا وہ ان تمام پہلوؤں کا لحاظ رکھتے تھے، تاہم معتمد علیہ لوگوں میں سے جو ان کے ساتھ رہے ہیں میں ان سے تفصیل سننا چاہتا ہوں اور ان کا طرز فکر معلوم کرنے کا خواہش مند ہوں۔

امام حسن البنا کی شخصیت اور ان کی خداداد صلاحیتیں

استاذ محمد فرید عبد الخالق نے شیخ کی دعوت کے ان پہلوؤں پر روشنی ڈالی، روحانی تربیت اور مردم سازی کی طرف ان کی توجہ کا ذکر کیا، اخوانیوں کی زندگی میں ان کے اثر و نفوذ اور ان کے گہرے تعلقات کا حال بیان کیا، انہوں نے بتایا کہ وہ ہر اخوانی کو مع ان کے نام کے جانتے تھے اور ان کے ذاتی حالات اور خانگی مسائل کو ایک ایک گھنٹے تک غور سے سنتے رہتے تھے، حتیٰ کہ اس وقت بھی جب کہ کام کی رفتار تیز ہو گئی اور وہ سیاسی اور انتظامی امور میں بہت زیادہ مشغول ہو گئے اس وقت بھی وہ ایک روزنامہ کی نگرانی کرتے تھے اور کبھی کبھی پوری رات جاگ کر گزار دیتے تھے، وزیروں سے ملاقات کرتے پریس کانفرنسوں میں شریک ہوتے۔

جماعت کی تربیت کی فکر

لیکن وہ اکثر فرماتے، کاش کوئی ان کاموں کی ذمہ داری سنبھال لیتا اور میں

اخوان کے لئے فارغ ہوجاتا، انہوں نے جماعت کے نظام تعلیم وتربیت کو بڑے دلکش اور سلیس انداز میں بیان کیا، اور جو باتیں میں نے عرض کی تھیں اس سے اتفاق کیا اور ان کے ساتھیوں نے بھی اس کی تائید کی، انہوں نے کہا کہ وہ ان تین اہم نکات کا پورا اہتمام کرتے ہیں وہ اس سے غافل نہیں ہیں انہوں نے یہ تجویز پیش کی کہ ہم اس کو ایک مشورہ یا رہنما اصول کے طور پر مرتب کردیں وہ اس کو شائع کریں گے، میں نے ان سے لکھنے کا وعدہ کرلیا، انہوں نے شوق ظاہر کیا کہ بار بار اس طرح کی ملاقاتوں کی ضرورت ہے، میں نے ان سے اس مقصد کے لئے اپنے شوق وآمادگی کا اظہار کیا۔

فرید عبدالخالق صاحب نے بدھ کے دن دوپہر کے کھانے پر بلایا، میں نے بے تکلف قبول کرلیا اس کے بعد مجلس ختم ہوگئی، ہر شخص خوشی واطمینان اور اپنے ساتھی سے تعلق کا جذبہ محسوس کررہا تھا۔

۱۱/۵/۱۳۷۰ھ، ۱۷/۲/۱۹۵۱ء بروز سنیچر

”مطبعة السنة المحمدية“ میں

آج ہم لوگ ”مطبعة السنة المحمدية“ گئے اور اپنا رسالہ ”المد و الجزر فی تاریخ الاسلام“ طباعت کے لئے دیا، یہاں سے ”انصار السنة“ کے دفتر گئے جہاں بعض دوستوں سے ملنا طے تھا، وہ حضرات آئے اور ان کے ساتھ ہم محمد آفندی عبدالوہاب البناء کے گھر مصر جدیدہ گئے وہاں ہمیں شیخ عبداللہ بن علی یابس نجدی مل گئے جو ”الرد القویم علی ملحد القصیم“ کے مصنف ہیں، دوپہر کا کھانا کھا کر مغرب سے قبل واپس آگئے اور ”دار الکتاب العربی“ گئے تاکہ وہاں سے ”بین العالم وجزیرة العرب“ کے کچھ نسخے حاصل کریں مگر وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ ابھی ٹائٹل نہیں چھپا ہے۔

۱۲/۵/۱۳۷۰ھ ۱۸/۲/۱۹۵۱ء بروز اتوار

''انصار السنة'' کے دفتر میں

ظہر کے وقت تک حجاز کے دوستوں کو خطوط و جواب لکھنے میں مصروف رہا۔ ظہر کے بعد ''انصار السنۃ'' کے دفتر گئے وہاں سے شیخ عبداللہ بن علی یابس کے گھر گئے جہاں دوپہر کا کھانا کھایا، شیخ عبداللہ نے اپنی کتاب ''الرّد القویم'' کا ایک نسخہ ہم کو ہدیہ کیا وہیں بیٹھے بیٹھے میں نے اس کی ورق گردانی کی اور سید قطب صاحب نے اس کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس کو پڑھا، مجھے یہ مضمون بہت پسند آیا، مضمون بہت متوازن و بلیغ ہے جس سے لکھنے والے کی قوت ایمانی گہرے علم اور توازن فکر کا اظہار ہوتا ہے میں نے قصیمی سے ملنے کی خواہش ظاہر کی بعض حضرات نے مخالفت کی لیکن صاحب خانہ نے میرے خیال سے اتفاق کیا، میرا خیال تھا کہ شاید ان سے مل کر ان کی ذہنی الجھنوں کا حال معلوم ہو۔

یہاں سے ہم لوگ پھر انصار السنۃ کے دفتر آ گئے، وہاں شیخ محمد حامد فقی ملے جو شیخ محمد بن ابراہیم بن عبداللطیف آل شیخ کی عیادت کے لئے نکلے تھے، وہ اسپتال سے نکل کر اپنے گھر جیزہ آ گئے ہیں ان کے ساتھ ہم اور مولانا عبیداللہ صاحب بلیاوی بھی نکلے اور ان سے ملاقات کی ،ان کی مزاج پرسی کی اور ان کے آپریشن کے بارے میں پوچھا، آپریشن کامیاب رہا، ان کی صحت اس وقت اچھی ہے ان سے میں نے حجاز مقدس کے دینی اخلاقی حالات سے متعلق گفتگو کی وہ میرے رسالوں کو پڑھ چکے ہیں، اپنی پسندیدگی اور میرے خیالات سے اتفاق کا اظہار کیا۔

علاّمہ محمد خضر حسین صاحب سے مُلاقات

میں اور مولانا عبیداللہ صاحب جمعیۃ الہدایۃ الاسلامیۃ کے پاس اتر گئے، اس کے چیف نگراں طٰہٰ ساکت صاحب نے ہم لوگوں سے شام کو چھ بجے آنے کے لئے کہا تھا وہاں ہم (جمعیۃ) کے صدر کلیۃ اصول الدین کے سابق شیخ واستاذ خضر حسین سے ملے، ان کے مضامین مختلف علمی

رسالوں میں چھپتے تھے اور ہم ان سے واقف تھے اور دینی وادبی علوم کے ایک ماہر کی حیثیت سے ان کو پہچانتے تھے۔ انہوں نے بیماری کے سبب حسب وعدہ وقت پر نہ پہنچنے کی معذرت کی۔

علاّمہ خضر حسین اور جامعہ ''زیتونہ'' کے بارے میں کچھ معلومات

میں نے ان سے پوچھا کہ آپ مصر میں کتنے دنوں سے ہیں؟ انہوں نے مجھے بتایا کہ مصر میں رہتے ہوئے اب تیس سال ہو رہے ہیں، میں اصل میں الجزائر کا باشندہ ہوں، میری پیدائش تیونس میں ہوئی، مصر آنے سے پہلے تقریباً دس سال سوریہ اور دیگر شہروں میں گزارے، تیونس کے جامعہ زیتونہ سے فراغت حاصل کی اور جرمنی میں بھی رہے، میں نے ان سے پوچھا جامعہ زیتونہ میں اور جامعہ ازہر میں زیادہ پرانا اور بڑا کون ہے؟ انہوں نے جواب دیا ازہر زیادہ بڑا اور پرانا ہے، طلبہ کی تعداد اور ترقی میں اس کے بعد زیتونہ کا نمبر ہے اس وقت اس میں دس ہزار طالب علم ہیں، جبکہ تیونس کی کل آبادی ۳۵ لاکھ سے زائد نہیں۔

پھر بتایا کہ انھوں نے ردّ قادیانیت پر بھی کچھ کام کیا ہے، قادیانیت اور ان کی بعض شخصیتوں کے بارے میں بعض سوالات بھی کئے اور اپنی تصنیفات میں سے بعض کتابیں ہم کو ہدیہ کیں، جن میں سے ایک ''رسائل الاصلاح'' ہے جو ان کے دینی اجتماعی اور اخلاقی مضامین کا مجموعہ ہے، یہ کتاب تین جلدوں پر مشتمل ہے ''آداب الحرب فی الاسلام'' اور ''خواطر الحیاۃ'' جو ان کے اشعار کا دیوان ہے اور ''طائفۃ القادیانیۃ'' انہیں دیکھ کر اور ان سے باتیں کر کے ہندوستان کے بہت سے باوقار اور متبحر علماء یاد آ گئے، یہاں سے ہم اپنی قیام گاہ واپس آ گئے۔

۱۳/۵/۱۳۷۰ھ مطابق ۱۹/۲/۱۹۵۱ء بروز دوشنبہ

آثار قدیمہ کی سیر

ظہر کے وقت تک خطوط کے جوابات لکھنے میں مشغول رہا اور ظہر کے بعد ہم لوگ میوزیم گئے جہاں عربی آثار قدیمہ کے چیف انسپکٹر حسن عبدالوہاب ہمارے منتظر تھے، از راہ

نوازش ہم کو عربی میوزیم میں گھمایا، فلاں چیز کہاں سے نکالی گئی، اس کی کیا اہمیت ہے، فنی نقطۂ نظر سے اس کی کیا خوبیاں ہیں، ان سب باتوں کی وضاحت کرتے جاتے تھے عربی آثار کے ساتھ ساتھ ہم نے مصر کے عربی دور کی تاریخ کا بھی مطالعہ کیا، ہم لوگوں نے ظروف اور لکڑی کے ٹکڑوں اور اسلحہ جات کے علاوہ بہت سی چیزیں دیکھیں جو فسطاط کی کھدائی سے نکالی گئی تھیں ہم نے قیاس کیا کہ وہ فاتحین مصر اور صحابۂ کرام کے زمانہ کی چیزیں ہیں، یہی ثابت بھی ہوا، استاذ حسن عبدالوہاب نے بتایا کہ یہ فاطمی عہد یا اس سے پہلے کی چیزیں ہیں، عمارتی نقش ونگار کے اچھے نمونے سنگ مرمر کے رنگین ڈھلے ہوئے پتھر، مٹی کے برتن، لکڑی کے دروازے، پیتل کے خوبصورت کام، بناؤ سنگار کی چیزیں، تابوت، منتقل ہونے والے محراب ومنبر، بُنی ہوئی چیزیں اور مصلے دیکھے، ہم نے دیکھا کہ مصر بڑھئی گیری کے کام میں بہت لائق اور ترقی یافتہ ہے، ہم نے لکڑی میں نقش ونگار اور سجاوٹ کی بڑی بڑی، انوکھی انوکھی چیزیں دیکھیں، سب سے انوکھی چیز جو ہم نے یہاں دیکھی وہ شمع دان ہیں جن کی دنیا میں مثال ملنی مشکل ہے اس میں شبہ نہیں کہ مصر کے آثار قدیمہ کا میوزیم اپنے انوکھے پن میں دنیا کے بہت سے میوزیموں سے بڑھا ہوا ہے۔

استاذ احمد حسن زیّات سے ملاقات

میوزیم سے نکل کر ہم ''الرسالۃ'' کے دفتر گئے جہاں الرّسالۃ کے اڈیٹر تاریخ الادب العربی کے مصنّف استاذ احمد حسن زیات سے ملے، میں کئی سال دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تاریخ ادب کا استاد رہا، یہ کتاب ہمارے یہاں کے درجہ ششم کے نصاب میں تھی، میں نے اس کو پڑھایا اور ایک عرصہ تک اس سے میرا لگاؤ رہا، میں مصنّف کے ادبی اسلوب اور عربی زبان وانشاء پر ان کی قدرت سے متأثر ہوا، اس وجہ سے کہ یہ کتاب ادب وتاریخ دونوں کی جامع ہوگئی ہے اور شاید ادبی پہلو، تاریخی پہلو سے بڑھا ہوا ہے میں نے اپنے ان کے اس علمی رابطہ کا ذکر کیا، یہ فطری بات ہے کہ جب انسان اپنے پودے کو پھلدار دیکھتا ہے اور اس کا سایہ اتنا پھیلتا ہے کہ

دوسرے ملکوں تک پہونچ جاتا ہے تو یقیناً اسے خوشی ہوتی ہے۔

انہوں نے بڑی کشادہ دلی اور انبساط کے ساتھ مجھ سے گفتگو کی، انہوں نے ہندوستان کی دینی حالت اس کے مدرسوں، طلبہ اور اس ملک کے عربی زبان کے مستقبل کے بارے میں مجھ سے پوچھا وہ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد اس پر تعجب کا اظہار کرتے تھے، کہ ایک ہندوستانی جس نے اپنے ہی ملک میں عربی پڑھی، کس طرح اتنی روانی اور بے تکلّفی سے عربی بولتا ہے، ہم لوگ چار آدمی تھے، انہوں نے ہم میں سے ہر ایک کو ''تاریخ ادب عربی'' کے گیارہویں اڈیشن کا ایک ایک نسخہ دیا، اور تین ''نسخے وحی الرّسالۃ'' کے دیئے ہم لوگوں نے اس قیمتی ہدیہ کو قبول کرنے سے معذرت کی، انہوں نے اصرار کیا تو ہم لوگوں نے شکریہ کے ساتھ اس کو قبول کرلیا، اس میں شبہ نہیں کہ اس ملک میں ہمیں اب تک جن ادباء و مصنّفین سے ملنے کا موقع ملا ہے یہ خوش اخلاقی اور زندہ دلی اور فیاضی میں بہت فائق ہیں۔

میں نے ان کو اپنا مضمون '' اسمعی یا مصر '' پیش کیا، انہوں نے اس کو شائع کرنے کا وعدہ کیا، جناب ساطع بک الحصری اور عادل زعیتر جو گستاف لیبان صرف کی کتاب حضارۃ العرب کے مترجم ہیں (۱) استاد احمد حسن زیات سے ملنے آئے، ایک دوسرے نے اپنا تعارف کرایا۔

اس کے بعد ہم اپنی قیام گاہ واپس ہوگئے، پہونچے تو ازہری عالم شیخ زین العابدین فرارہ کو منتظر پایا، شیخ کی دعوت کا ایک خاص طرز ہے، ان کا فکر ان پر اس قدر حاوی ہے کہ وہ ہر مسئلہ اور حادثہ کو اسی فکر کی عینک سے دیکھتے ہیں، ان کی فکر کا خلاصہ یہ ہے کہ گناہ سزاؤں کا سبب ہے، انسان کو دنیا میں جو بھی تکلیف پہونچتی ہے وہ اس کے گناہ کے سبب سے پہونچتی ہے، حتیٰ کہ پاؤں میں کانٹا چبھنا اور قدم میں ٹھوکر کا لگنا بھی گناہوں کے سبب سے ہوتا ہے، زنا قتل کا سزاوار بنتا ہے، فقر و فاقہ اور امراض خبیثہ کا سبب بنتا ہے، بچوں کو جو تکلیفیں پہونچتی ہیں، ماں باپ کے گناہ کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ انہوں نے ایک جماعت بنائی ہے خود ہی اس کے

(۱) اس کتاب کا ترجمہ ہندوستان میں سید علی بلگرامی مرحوم نے تمدن عرب کے نام سے کیا ہے۔

صدر ہیں۔ ''حتی شکة الشوکة بذنب'' کے نام سے وہ مشہور ہو گئے ہیں، اس میں شک نہیں کہ یہ دعوت ایسے ملک میں جہاں معاصی ومنکرات پھیلے ہوئے ہیں اور لوگ معاصی پر جری ہو گئے ہیں اور اس کو معمولی بات سمجھتے ہیں، مفید ہوگی۔

میں نے ان کو ''اسمعی یا مصر'' کا تازہ مقالہ جو میں نے کل پرسوں ہی ختم کیا تھا، ''الرسالۃ'' میں اشاعت کے لئے دیا، وہ بار بار اس کو دیکھتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ آپ ہی کا خط ہے؟ مجھے اس پر حیرانی تھی کہ مصری فضلاء، ہندوستان کے علماء اور عربی سے تعلق رکھنے والوں کو اس قابل نہیں سمجھتے کہ وہ خوشخط عربی لکھ سکیں، ''الرسالۃ'' کی اگلی اشاعت میں یہ مقالہ شائع ہوا، اور لوگوں نے مصر اور مصر کے باہر اس کو پڑھا۔

محمد فرید عبدالخالق کی دعوت میں

ظہر کے وقت تک لکھنے اور تصحیح کرنے میں مشغول رہا اور ظہر کے بعد میں مولانا عبیداللہ صاحب اور استاذ یٰسین الشریف کے ساتھ استاذ محمد فرید عبدالخالق کے گھر گیا، وہاں محترم محمد الغزالی، عبدالحفیظ صفی اور کلیۃ الحقوق کے استاذ ڈاکٹر توفیق شادی مل گئے ہم لوگ باتیں کرنے لگے، اثنائے گفتگو تصوف اور اس کی ابتداء پر بات چل نکلی میں نے کہا کہ ''اسلامی خلافت دونوں پہلوؤں کی نمائندگی کرتی تھی، انتظامی اور سیاسی پہلو کی بھی، اخلاقی اور روحانی پہلو کی بھی، خلافت اسلامی مسلمانوں کی زندگی میں ان دونوں چیزوں کی حفاظت اور فروغ دینے کی ذمہ دار تھی اور دونوں ہی کی بیک وقت نگرانی وحفاظت کا کام کرتی تھی، پھر جب خلافت ان لوگوں کے ہاتھ میں چلی گئی جو یہ جامعیت نہیں رکھتے تھے اور دین سیاست سے الگ ہو گیا تو خلافت یا حکومت نے صرف انتظامی پہلو پر زور دینا شروع کیا، اخلاقی اور روحانی پہلو ختم ہو کر رہ گیا، کوئی اس کا داعی نہ رہا، فرد یا جماعت کسی کی بھی اس کی طرف توجہ نہ رہی، تہذیب وتمدن، عیش وطرب، مال کی ریل پیل اور اخلاقی انحطاط کا دور دورہ ہوا، قریب تھا کہ مسلمان اس سیلاب بلاخیز کی نذر ہو جائے، مگر اللہ کے کچھ بندے میدان میں آئے اور اس دھارے سے برسرپیکار ہوئے انہوں نے اخلاقی وروحانی دعوت کو عام کیا

اور کچھ لوگوں کو اپنی آغوش تربیت میں لے کر پرسکون فضا میں تربیت دینے لگے، جب وہ تیار ہو جاتے تو ان کو اس دعوت کو پیش کرنے کے لئے وہ باہر بھیج دیتے، ان کی یہ دعوت اور کدوکاوش بارآور ہوئی اور مادہ پرستی کا زور کم ہوا، اگر یہ حضرات نہ ہوتے تو مادیت پوری طرح چھا جاتی، ڈاکٹر توفیق شادی نے کہا کہ لیکن تصوف کی بنیاد غیر اسلامی ہے، وہ اونچ نیچ کی بنیاد پر قائم ہے جس کو اسلام غلط سمجھتا ہے اور اس کی مخالفت کرتا ہے، اہل تصوف کا ایک خاص طبقہ اور مخصوص یونٹ ہے، پھر ان کے آپس میں الگ الگ طبقے ہیں، یہ شیخ ہیں، یہ ان کے خلیفہ ہیں، یہ مرید ہیں، یہ مخدوم، اور یہ خادم اور غلام ہیں، میں نے بعض خانقاہوں اور حلقوں میں غلامی اور بیگار کراتے دیکھا، مزید براں میں نے تصوف میں ہندی اور یونانی فلسفہ کے اثرات پائے جس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے، میں نے کہا یہ سب باتیں تو آخری عہد میں تصوف میں پیدا ہوئی ہیں، حضرت حسن بصری اور ان کے طبقہ کے لوگوں میں ان میں سے کوئی چیز نہ تھی، شیخ محمد غزالی نے تصوف کی دوسری چیزوں پر تنقید کی، جو اب تصوف میں پیدا ہوگئی ہیں، اور ''صوفیوں'' کے یہاں چلی آرہی ہیں، مثلاً وراثت اور بیٹوں اور پوتوں کو خلیفہ بنانا۔

تصوّف عارضی اور محدود علاج ہے

اس تبادلۂ خیال کے بعد ہم لوگ اس پر متفق ہوگئے کہ تصوف عارضی اور محدود علاج ہے، جب اسلامی زندگی اپنے صحیح ڈھانچے پر آجائے اور حقیقی اسلامی خلافت قائم ہو جائے اور اپنی انتظامی، اخلاقی اور روحانی ذمہ داریوں کو سنبھال لے تو کسی اور طریقہ اور جزوی اصلاح کی ضرورت نہیں، دوران گفتگو شیخ بہی الخولی آگئے جو اس وقت اخوان کے فکری رہنماؤں میں سے ہیں، وہ بھی اس علمی مباحثہ میں شریک ہوگئے، مجھے ان سے ملنے کا شوق تھا چنانچہ وقت تعیین کے بغیر ملاقات ہوگئی، پھر ہم لوگ کھانے پر بیٹھے اور کھانے کے بعد پرلطف مجلس ہوئی، میں نے شیخ بہی الخولی کو اپنے رسائل پیش کئے اور یکشنبہ کو آٹھ بجے پھر ملاقات

طے ہوئی، مجھ سے استاذ عبدالحفیظ صیفی نے لواء (جنرل) صالح حرب باشا (۱) سے ملنے کے لئے کہا، اس لئے کہ وہ جمعیۃ الشباب المسلمین میں میری تقریر کے سلسلے میں ان سے بات کر چکے تھے، لہٰذا انہوں نے مناسب سمجھا کہ ہماری ان کی ملاقات ہو جائے، تاکہ وقت اور موضوع کا تعین ہو جائے، چنانچہ ہم لوگ ان کے پاس گئے، اور تھوڑی دیر بیٹھے، انہوں نے مصر کے بارے میں میری رائے معلوم کرنی چاہی، میں نے کہا کہ مصر کے بارے میں برابر پڑھتا اور مشاہدہ کرتا رہتا ہوں، اس میں خوش کن اور دلخراش دونوں ہی قسم کی چیزیں پائی جاتی ہیں، انہوں نے کہا کہ مصر کے جغرافیائی محل وقوع نے فائدہ سے زیادہ اس کو نقصان پہونچایا ہے، میں نے ان سے کہا کہ اس کو نقصان پہنچانے والی چیزوں میں تاجرانہ ادب کا بڑا دخل ہے، انہوں نے کہا کہ اس کو ادب فاجر کہنا زیادہ مناسب ہوگا، ان کے پاس سابق وزیر تجارت اور بین الاقوامی غذائی کارپوریشن کے ممبر محمود توفیق حفناوی بھی تھے۔

استاذ احمد شرباصی اور ان کا محاضرہ (لکچر)

جنرل صالح حرب باشا کے پاس سے ہم لوگ اٹھے اور استاذ احمد شرباصی کے مقالہ میں شریک ہوئے وہ ایک ادیب، پرجوش اور خوش گفتار جوان ہیں، محاضرہ کا موضوع اسلام میں برتھ کنٹرول، ''تحدید النسل فی الاسلام'' تھا، محاضرہ ادبی فصاحت ورنگین بیانی میں نمایاں تھا، شرباصی صاحب نے اس بات کا اظہار کیا کہ اسلام برتھ کنٹرول کی اجازت ایسی صورت میں دیتا ہے جب ضروری وجوہ جواز پائی جائیں، پھر اس کی وضاحت کی لیکن اس وقت مصر میں برتھ کنٹرول کا کوئی محرک نہیں، ہمیں اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم ان محبوب وناز پروردہ کتوں پر برتھ کنٹرول کریں، جو موٹروں پر سوار رہتے ہیں، اور اگر مرجائیں تو عورتیں محفل نوحہ وماتم قائم کرتی ہیں، اور ان کی قبر بناتی ہیں، مصر کے اقتصادی

(۱) اللواء صالح حرب باشا یہ مصری افواج کے سابق جنرل تھے، مولانا محمد علی جوہر اور ڈاکٹر اقبال وغیرہ سے خوب واقف ہیں، اب انہوں نے اپنی پوری زندگی اسلامی کاموں کے لئے وقف کردی ہے اور جمعیۃ الشبان المسلمین (جس کے بانی ڈاکٹر عبدالحمید سعید تھے اور جس کی شاخیں مصر اور سوڈان میں پھیلی ہوئی ہیں) کے وہ صدر عام تھے۔

اوراجتماعی حالات برتھ کنٹرول کے متقاضی نہیں ہیں۔

محاضرہ ختم ہونے کے بعد ہم لوگ جنرل صالح حرب باشا کے پاس گئے اور یہ طے ہوا کہ بدھ کے دن ۷ بجے شام کو ہمارا محاضرہ ہوگا، میں نے محاضرہ کا موضوع "العالم علیٰ مفترق الطرق" اختیار کیا۔

۱۵/۵/۱۳۷۰ھ مطابق ۲۱/۲/۱۹۵۱ء بروز بدھ

دارالکتب المصریہ میں

ظہر کے وقت تک والد مرحوم کی کتاب "جنۃ المشرق ومطلع المشرق" کی تصحیح میں لگا رہا جو تاریخ ہند اس کے جغرافیہ اور اس کے متعلقات کے موضوع پر ہے، ڈاکٹر احمد امین نے مجھے یہ کتاب دی کہ میں اس کے ہندی ناموں کو درج کردوں، پھر ظہر بعد ہم لوگ دارالکتب المصریۃ گئے، ہمارے ساتھ شیخ احمد عثمان اور جناب رشاد آفندی تھے، رشاد صاحب یہاں کثرت سے آتے رہتے ہیں، اس کتب خانہ میں نوادر ومخطوطات کا جو ذخیرہ ہے اس سے وہ خوب واقف ہیں ان کے خصائص وتاریخ پر بھی ان کی اچھی نظر ہے ہمیں اپنے ساتھ لے کر اس کتب خانہ میں پھرے، یہ کتب خانہ عالم اسلام کے سب سے بڑے اور وسیع ترین کتب خانوں میں شمار کیا جاتا ہے، یہاں نوادر اور بہترین کتابیں اور خود مصنّفین کے ہاتھوں کے لکھے ہوئے مخطوطات ہیں، استنبول (قسطنطنیہ) کے کتب خانوں کے علاوہ اور کوئی کتب خانہ اس مصری کتب خانہ سے فائق نہیں ہے، میں نے وہاں بیہقی، ابن حجر، ذہبی، ابن الشجری اور الشعرانی جیسے بڑے بڑے مصنّفین کے ہاتھوں کی لکھی ہوئی کتابیں دیکھیں، ہم لوگ فہرست کے مرتب سیّد فؤاد سے ملے، ہمیں بتایا گیا کہ اس کتب خانہ میں پانچ لاکھ کتابیں ہیں، ہم لوگ مغرب سے کچھ پہلے یہ سمجھتے ہوئے کتب خانہ سے نکلے کہ اتنی مختصر مدّت کی سیر کافی نہیں، اگر ہم اس زبردست کتب خانہ سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں تو ضروری ہے کہ عرصہ تک آتے جاتے رہیں۔

شیخ حسنین محمد مخلوف سے ملاقات

بازار کی مسجدوں میں سے ایک مسجد میں ہم نے مغرب کی نماز پڑھی اور وہیں الجمعیۃ الشرعیۃ کے ایک ممبر کی دوکان پر مصر کے سابق مفتی عام شیخ حسنین محمد مخلوف سے ملاقات ہوگئی، وہ بڑی خوش خلقی اور انکساری کے ساتھ ہم لوگوں سے ملے اور ہم لوگوں کو حلوان بلایا، ہم سے ملاقات کے لئے اصرار کیا کہ ان سے ملیں اور ان کے ساتھ کچھ وقت گزاریں ہم نے ان کو بعض رسالے ہدیہ کئے، عشاء کے بعد بھائی عبداللہ العقیل اور ان کے ایک ساتھی آگئے ان دونوں کی موجودگی ہی میں انصار السنۃ کے نگراں محمد عبدالوہاب البنّا اور بھائی علی عدلی المرشدی آگئے، کچھ دیر بیٹھے پھر واپس ہوگئے۔

۱۶/۵/۱۳۷۰ھ مطابق ۲۲/۲/۱۹۵۱ء بروز جمعرات

ڈاکٹر احمد امین سے گفتگو

صبح ہی صبح استاذ محمد رشاد آگئے اور انہیں کے ساتھ ہم لوگ ڈاکٹر احمد امین سے ملے، ان کے اسکندریہ کے سفر کے بعد سے ابھی تک ان سے ملاقات نہیں کی تھی، ان کو ''جنۃ المشرق'' واپس کی، ادب اور ادباء کے بارے مین ان سے گفتگو رہی، میں نے ان چار کتابوں کے بارے میں ان کی رائے معلوم کی جن کو ابن خلدون نے اصول ادب میں شمار کیا ہے، ابوعلی القالی کی کتاب ''الامالی'' مبرد کی ''الکامل'' جاحظ کی ''البیان و التبیین'' ابن قتیبہ کی ''ادب الکاتب''۔

ادب کے اصول اربعہ کے بارے میں ان کی رائے

انہوں نے کہا کہ 'ادب الکاتب' تو خشک کتاب ہے، رہی تاریخ الکامل تو اس کے مصنّف کو انتخاب کا ملکہ نہیں اور یہ بات لطافت ذوق ہی سے حاصل ہوتی ہے بقول صاحب ''العقد الفرید'' کے کہ وہ بعض گھٹیا تر ادبی ٹکڑوں کا انتخاب کر لیتے ہیں، ان چاروں میں

سب سے بہتر ''البیان والتبیین'' ہے، میں نے کہا مگر اس کے حسن ترتیب میں نقص ہے، وہ منتشر و پراگندہ ادبی نمونوں کا مجموعہ ہے کوئی نظم و ترتیب نہیں ہے، ہندوستان کے بعض ادباء کہتے ہیں کہ'' البیان والتبیین ''نثر کا حماسہ ہے، ڈاکٹر احمد امین نے کہا المرزوقی نے حماسہ کی شرح میں بیان کیا ہے کہ اس کا نام '' البیان والتبیین '' ہے، یہ بات قرین قیاس بھی ہے اس لئے کہ ''البیان والتبیین'' میں اور اس میں کوئی فرق نہیں ہے۔

احمد امین ابوحیّان کو جاحظ پر فوقیت دیتے ہیں

پھر انہوں نے کہا کہ میں ابوحیان توحیدی کو جاحظ سے فائق سمجھتا ہوں اس لئے کہ اس کا زمانہ زیادہ گہرا تھا، میں نے کہا لیکن جاحظ کا امتیاز (جیسا کہ آپ نے اپنی کتاب '' ضحی الاسلام '' میں لکھا ہے، یہ ہے کہ وہ اپنے عہد اور معاشرہ کی سچی تصویر پیش کرتا ہے انہوں نے کہا کہ اسی طرح ابوحیان بھی اپنے ماحول و معاشرہ کے خدوخال پیش کرتا ہے پھر ان کی دوسری کتابوں کا ذکر شروع ہو گیا، احمد امین نے کہا کہ ان کی کتابوں میں ایک ''الحج العقلی'' بھی ہے، میں نے کہا یہ عجب نام ہے، اس لئے کہ حج تو اسلام کے ارکان میں اس حیثیت سے ممتاز ہے کہ وہ شوق و محبت کا نمونہ پیش کرتا ہے، انہوں نے کہا جی ہاں میں نے یہ کتاب دیکھی نہیں ہے، چاہتا ہوں کہ اس کو پڑھوں اور اس کے فکر و مقصد کو سمجھوں۔

حماسہ کی شرحیں

پھر حماسہ کی شرحوں کا ذکر آیا، ڈاکٹر احمد امین نے مرزوقی کی شرح کو تبریزی کی شرح پر ترجیح دی اس لئے کہ تبریزی کی شرح اشعار کے سمجھنے میں طالب علم کی مدد نہیں کرتی بلکہ لغوی تحقیقات و نکتے پیش کرتی ہے۔

اندلسی ادب

باتوں باتوں میں اندلسیوں کا ذکر چھڑ گیا، میں نے کہا کہ اندلس کے علم و ادب میں وہ

گہرائی نہیں ہے جو مشرق کے علم وادب میں ہے، اندلس کا علم وادب مغرب میں سطحی سمجھا جاتا ہے، ادبی پہلو علمی پہلو پر ہمیشہ غالب رہتا ہے، ڈاکٹر احمد امین نے میرے اس خیال سے اتفاق کیا۔ ڈاکٹر احمد امین صاحب کے یہاں سے ہم اس پروگرام کے ساتھ لوٹے کہ اتوار کے دن ''کلیۃ الادب'' میں ان سے ملیں گے اور کالج اور اس کے شعبوں اور کتب خانوں کو دیکھیں گے، '' العتبة الخضراء '' سے ہم مولوی عبدالرشید ندوی کے ساتھ دارالکتاب العربی گئے، اس کے مالک الحاج حلمی منیاوی صاحب نے خوش آمدید کہا وہاں شیخ محمد الغزالی اور شیخ بہی الخولی سے ملاقات ہوگئی اس غیر متوقع ملاقات سے بڑی خوشی ہوئی اور ہم لوگ بیٹھ کر باتیں کرنے لگے، میں استاذ بہی الخولی سے ملاقات کو غنیمت سمجھتا ہوں، جناب صالح عشماوی بھی آگئے شیخ بہی الخولی نے ہمارے ان رسائل کو پڑھ لیا تھا، جو میں نے اُنہیں استاد محمد فرید کے گھر پر پیش کئے تھے اس کی وجہ سے وہ قدر ومحبت سے لبریز دل اور شرح صدر کے ساتھ ملے، س میں شبہ نہیں کہ فکر وذوق کی یگانگت اور اتحاد عقیدہ طاقت ور وحانی رابطہ ہے چنانچہ وہ بے ساختہ کہہ اٹھے، شیخ ابوالحسن میں نے آپ کی صورت دیکھی تھی لیکن آپ کو پہچانا آپ کے رسالوں سے ان تقریروں کو پڑھ کر پسندیدگی وخوشی کا اظہار فرمایا، اور فرمایا کہ ان رسالوں میں میں نے مقامی اثر نہیں محسوس کیا، نہ کسی خاص شہر کی فضا کا ان پر اثر ہے جیسا کہ بعض مصنّفین کی تحریروں میں یہ بات نمایاں ہوتی ہے کہ ان کو پڑھنے والا فوراً سمجھ جاتا ہے کہ اس کتاب کا مصنّف مصری یا عراقی ہے، اس کے برعکس میں نے آپ کی تحریر میں یہ بات نہیں محسوس کی آپ کا فکر وسیع ہے، آپ کسی خاص ملک وشہر کو سامنے رکھ کر نہیں بلکہ پورے عالم اسلام کو سامنے رکھ کر لکھتے ہیں آپ کی تحریر اس ماحول سے کیوں متاثر نہیں ہوئی، جہاں بیٹھ کر آپ نے لکھا ہے اور جہاں سے تحریریں شائع ہوئی ہیں، میں نے عرض کیا کہ اس کا سبب شاید یہ ہے کہ میں نے حجاز مقدس اور عرب ملکوں کے لئے لکھا ہے، ہندوستان میرے پیش نظر نہیں تھا، اس کے بعد میں اپنی قیام گاہ کے لئے

نکلا اور ساتھ ساتھ بہی الخولی بھی میری قیام گاہ تک چلنے کے لئے نکلے، میں نے ادبًا ان سے واپس ہو جانے کی درخواست کی مگر انہوں نے انکار کیا اور فرمایا کہ میں آپ کی قیام گاہ دیکھنا چاہتا ہوں چنانچہ وہ تشریف لائے اور تھوڑی دیر بیٹھے دوران مجلس اسلام، مسلمانوں اور بعض اسلامی ملکوں سے اور تحریک اخوان المسلمین سے متعلق باتیں کرتے رہے ان کے فکر کی گہرائی دقت نظر اور قوت ایمانی سے میں متأثر ہوا۔

ظہر بعد ہم لوگ شباب سیّدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مرکز دار الارقم گئے، وہاں علماء ومشائخ کی ایک جماعت کو جن میں علاّمہ سیّد مبشر الطرازی افغانی اور کچھ ازہری علماء بھی تھے اپنا منتظر پایا ایک دوسرے سے تعارف ہوا اور تھوڑی دیر مجلس رہی، سیّد مبشر الطرازی مولانا سید سلیمان ندویؒ کے مخلص دوستوں اور ان کے محبین میں سے ہیں، پھر ہم عمارت کے کمروں میں سے ایک کمرے میں دوپہر کے کھانے کے لئے گئے، کھانے کے بعد انجمن کے شعبوں اور شاخوں میں گئے، تھوڑی دیر بیٹھ کر عورتوں کے مظاہرہ پر گفتگو کی، جس کا چرچا تھا یہ مظاہرہ قاہرہ کی نوجوان لڑکیوں نے کیا تھا، اہلِ مجلس نے اس مظاہرہ پر سخت نکیر کی، اور انجمن کے صدر نے وزیر اعظم کے نام احتجاجی تار کی عبارت تیار کی۔

جمعہ ۱۷/۵/۱۳۷۰ھ، ۲۳/۲/۱۹۵۱ء

سیّد قطب کے ساتھ

دس بجے کے بعد میں اور مولانا عبید اللہ بلیاوی صاحب دار الکتاب العربی گئے، جہاں مطبع کے مالک حلمی منیاوی اور شیخ محمد الغزالی کو اپنا منتظر پایا، یہ طے ہو چکا تھا کہ آج ہم لوگ سید قطب سے ملنے حلوان جائیں گے، حلمی منیاوی صاحب نے ان سے فون پر بات کی اور پوچھا کہ کیا آپ " ماذا خسر العالم " کے مصنّف شیخ ابوالحسن کو جانتے ہیں جواب دیا ہاں واقف ہوں، وہ " ماذا خسر العالم " بازار سے خرید کر اس کا مطالعہ کر چکے تھے منیاوی صاحب نے کہا کیا آپ ان سے ملیں گے؟ انہوں نے بڑے شوق ومسرت کے ساتھ کہا ہاں

ہاں ضرور منیاوی صاحب نے کہا ہم ان کو لے کر آرہے ہیں، ہم لوگ الحاج حلمی منیاوی کی موٹر پر سوار ہوئے اور سید قطب سے ملنے کے لئے حلوان کا رخ کیا، حلوان قاہرہ سے تیس کلومیٹر دور ہے، حلوان پہونچے تو امام خطبہ دے رہا تھا مسجد میں داخل ہوئے اور جمعہ کی نماز پڑھی، حلمی صاحب ان کا گھر بھول گئے، لہٰذا ان کے گھر کی تلاش میں شہر کی سڑکوں پر لوگوں سے پوچھتے پھرے، اندیشہ ہوا کہ اس میں بڑا وقت ضائع ہو جائے گا ہمیں خبر نہ ہوئی! حالانکہ سید قطب صاحب سامنے ہی تھے، ہم لوگ ان کے گھر گئے، میں نے عرض کیا کہ میرے ساتھ استاذ عبد الغفور عطار کا تعارفی خط تھا میں اسے گھر ہی پر بھول آیا ہوں، آپ کا تعارف انہیں کے ذریعہ ہوا وہ آپ سے بہت محبت کرتے ہیں اور اکثر آپ کا تذکرہ کرتے ہیں۔ انھوں نے فرمایا یہ ان کی محبت کی بات ہے اور محبّ کی رائے پورے طور پر معتبر نہیں ہوتی۔

سیّد قطب کی زندگی میں موڑ کا راز

میں نے ان سے کہا کہ میں تو آپ کو عقاد کے مدرسۂ فکر کے ایک بڑے ادیب کی حیثیت سے جانتا تھا، میں ''الرسالۃ'' میں آپ کے علمی مضامین اور ادبی وتنقیدی مقالے پڑھا کرتا تھا، اس اسلامی ادب کی طرف آپ کا رجحان کیسے ہوا؟ آپ کی ادبی زندگی میں اس نئے موڑ کا کیا راز ہے۔

انہوں نے کہا، اس میں شک نہیں کہ میں ادب اور ادبی اسلوب میں عقاد کا شاگرد ہوں اور الفاظ سے زیادہ فکر کی طرف توجہ دینے کے سلسلے میں ان کا ممنون کرم ہوں، صادق الرافعی اور منفلوطی کی تقلید سے مجھ کو انہوں نے موڑا ہے، لیکن ادب وتنقید، اور شعری ذوق سے ہٹا کر جس چیز نے میرا یہ ذہن بنایا وہ میرا فطری ذوق ہے، میرا ذہن برابر روح اور اس کے متعلق چیزوں کی تلاش میں رہا، میں بچپن میں بزرگوں کے حالات اور ان کی کرامات کے قصّوں کا بڑا دلدادہ تھا یہ جذبہ رفتار زمانہ کے ساتھ برابر میرے اندر پروان چڑھتا رہا، عقاد خالص فکری آدمی ہیں، وہ ہر مسئلہ کو عقل وفکر کی روشنی میں دیکھتے ہیں اور اسی انداز سے اس پر بحث کرتے ہیں، چنانچہ میں اپنے اس فطری ذوق کو دوسرے سرچشموں سے سیراب

کرنے لگا جو روح سے زیادہ قریب تھے، اسی کے نتیجہ میں ٹیگور جیسے شعراء کے کلام پڑھنے کی طرف متوجہ ہوا، دوسری بات یہ کہ میں یہ سمجھتا تھا کہ عقاد جیسے صاحب عقل اور عظیم شخصیت کے مالک حضرات وقتی فائدوں اور تقاضوں کے سامنے نہیں جھک سکتے، جیسے حکومت و بادشاہت لیکن انھوں نے اس سے مصالحت کر لی شاید اس کا سبب یہ ہو کہ وہ بہت بوڑھے ہو گئے ہیں اور بڑھاپے میں انسان ایسی چیزوں کی برداشت کی تاب نہیں رکھتا، جنھیں جوانی میں برداشت کرنا دشوار نہیں، بڑھاپے کے ساتھ ساتھ ان کے کئی سال عسرت میں گزرے، شاید انہیں چیزوں نے ان کو حکومت وقت سے مفاہمت پر آمادہ کر دیا۔

میں نے کہا عقاد جن کے بارے میں یہ خطرہ تھا کہ وہ کمیونزم کی طرف مائل ہو جائیں گے، اس کے مخالف گروپ کی طرف کیسے آ گئے انہوں نے کہا کہ اس کے دو سبب ہیں، ایک تو یہ کہ وہ سمجھتے تھے کہ کمیونزم انسانی عقل پر پہرے بٹھا دیتا ہے اور اس کو دبانے کی کوشش کرتا ہے، تصنیف و تالیف اور نئی رائے پیش کرنے کی اجازت نہیں دیتا، روحانی قدروں کا قائل نہیں، دوسرا سبب مصری کمیونزم کے بعض داعیوں اور ممبروں کی غلط نمائندگی تھی، یہ چیز ان کے لئے رکاوٹ بنی، میں نے کہا کہ وہ روحانی قدروں سے دلچسپی کس طرح لیتے تھے، جب کہ وہ خالص فکری آدمی تھے، انہوں نے کہا وہ روحانیت کو فکر و عمل کی حد تک تسلیم کرتے تھے اور کسی کو اس کی اجازت نہ دیتے تھے کہ وہ روحانی قدروں کو ممنوع قرار دے۔

سیّد قطب کی تصنیفات

اثناء گفتگو ان کی کتابوں کا ذکر ہونے لگا جیسے " العدالة الاجتماعية " اور " التصوير الفنى فى القرآن " اور " مشاهد القيامة فى القرآن " انھوں نے ان کتابوں کی تاریخ اور وہ اسباب بیان کئے جو ان کتابوں کی تصنیف کے محرک ہوئے اور بتایا کہ کس طرح انہوں نے رفتہ رفتہ اسلامی فکر کی طرف قدم بڑھایا اور اسلامیات پر ان کا مطالعہ وسیع ہوا ہم نے انہیں کے ساتھ دوپہر کا کھانا کھایا اور عصر کی نماز پڑھی اور مغرب سے پہلے پہلے قاہرہ واپس آ گئے۔

تصوّر و حقیقت کا فرق

دلچسپ بات یہ تھی کہ میں نے سید قطب کی شکل وصورت اور شباہت کا اپنے ذہن میں ایک نقشہ قائم کرلیا تھا جیسا کہ میں نے اور بہت سے مصنفین کے بارے میں کیا جن کو قابل قدر سمجھتا ہوں، نہیں معلوم دوسرے لوگ بھی ایسا کرتے ہیں یا نہیں، میں انہیں اپنے تصور میں تیس چالیس سال کے درمیان کا چھریرے بدن، چوڑے سینے مضبوط کاٹھی کا ادیب سمجھ رہا تھا، ملاقات ہوئی تو معلوم ہوا کہ وہ چھوٹے قد کے اور تیس سے کم ہی عمر کے ہیں، دارالعلوم قاہرہ کے فارغ ہیں، ان کو دیکھ کر یہ اندازہ نہیں ہوا کہ دینی موضوعات پر اس طاقت ور اسلوب کے بانی ہیں ان کی باتوں سے مجھے معلوم ہوا کہ صاف ذہن اور واضح فکر رکھتے ہیں۔

۱۸/۵/۱۳۷۰ھ مطابق ۲۴/۲/۱۹۵۱ء بروز سنیچر

کتاب ''معرکۃ الاسلام والرأسمالیۃ''

ظہر کے وقت میں لکھنے اور سیّد قطب کی کتاب ''معرکۃ الاسلام والرأسمالیۃ'' دیکھنے میں مشغول رہا، اس کتاب میں مصنّف کے قلم کی جولانی، جوش ایمانی اور اسلام کی وکالت کرنے کا انداز، مجھے بہت پسند آیا یہ اسلام کی نئی کامیابی ہے کہ اس نے اپنے پیغام کے لئے ایک ایسے صاحب قلم اور پڑھے لکھے ادیب کو مسخر کیا ہے۔

حسین یوسف کے ساتھ

ظہر کے بعد بھی میں پڑھنے لکھنے میں مشغول رہا، حسین یوسف اور عبدالوہاب صاحب نے عصر کے وقت آنے کا وعدہ کیا تھا، یہ دونوں حضرات دیر سے مغرب بعد آئے اور ۹ر بجے رات تک ہمارے ساتھ بیٹھے، ہم لوگوں نے مصر میں اخلاقی گراوٹ اور اس کے علاج کے موضوع پر گفتگو کی، ان دونوں صاحبان نے مجھے بتایا کہ شعبۂ تعلیم کے بعض لوگوں نے اور وزیر تعلیم نے کس طرح اس بات کی دعوت دی کہ مصر کے ہر ضلع میں اور شہر کے

نوجوان لڑکے اور لڑکیاں جلتے ہوئے شعلوں کا جلوس لے کر قاہرہ آئیں، چنانچہ اس کے نتیجہ میں آدھی رات کے وقت بے آبروئی وعصمت دری کے روح فرسا واقعات پیش آتے تھے اور بے حیائی کا بازار گرم ہوتا تھا لیکن ''شباب سیدنا محمد ﷺ'' نے اس حیا سوز غیر اخلاقی فعل پر احتجاج کیا اور بادشاہ کو احتجاجی تار اور مراسلے بھیجے، ان دنوں وزیر اعظم نقراشی پاشا تھے، بادشاہ نے مکمل آزادی ملنے تک اس کام پر پابندی لگادی اور اس کو بند کردینے کا حکم دے دیا اور اس کے لئے کسی خاص معرکہ آرائی کی ضرورت پیش نہ آئی، ہم نے ان دونوں حضرات سے ذاتیات اور شخصیات پر حملہ کرنے کے سلسلے میں اپنے اس خیال کا اظہار کیا کہ اس سے احتراز ضروری ہے، انہوں نے اس معاملہ میں جماعت اور رسالہ کی مجبوری، اس کے اسباب ودواعی نیز فوائد ومنافع کا ذکر کیا، ہم میں سے ہر ایک نے اپنے دلائل پیش کئے اور اس بات پر متفق ہوگئے کہ ضروری حد تک احتیاط اور اختصار سے کام لینا چاہئے اور علمی بحث ومباحثہ اور تنقید میں اعتدال کا دامن نہیں چھوڑنا چاہئے۔

دارالارقم میں جمعرات کا وعدہ تھا، جہاں میں انشاء اللہ (الدعوة وتجاربها وثمراتها فی الهند وباكستان) ہندوستان میں دعوت وتبلیغ کے تجربے اور کوششوں کے نتائج کے موضوع پر تقریر کروں گا۔

۱۹/۵/۱۳۷۰ھ مطابق ۲۵/۲/۱۹۵۱ء

کلیۃ الآدب کی سیر

۹ بجے ہم لوگ جامعہ فؤاد اول کے ''کلیۃ الآداب'' جیزہ گئے اور ڈاکٹر احمد امین سے ملے آج کالج میں ان کا لکچر تھا اس سے فارغ ہوئے تو ہم لوگوں کو کالج کے پرنسپل ڈاکٹر زکی محمد حسن کے پاس لے گئے، ہم کو ان سے ملایا اور کالج اور اس کے شعبوں کو دیکھنے کی ہماری خواہش کا ان سے اظہار کیا، انہوں نے ہمیں خوش آمدید کہا اور ''کلیۃ الاداب'' کے دستور العمل کا ایک نسخہ ہم کو دیا اور کالج کی ڈائرکٹری بھی دی۔

ڈاکٹر احمد امین نے ان سے بتایا کہ یہ مہمان کالج کے فرعونی عہد کے طرز تعمیر پر تنقید کرتے ہیں، کالج کے پرنسپل ڈاکٹر ذکی حسن نے استاذ زکریا کو ہمارے ساتھ کردیا کہ وہ ہمیں کالج اور جامعہ کے شعبوں میں گھمالائیں، ان کے ساتھ ہم نے یونیورسٹی کا کتب خانہ دیکھا، کتب خانہ کے انچارج نے ہمیں اس کے مختلف حصے اور میوزیم دکھائے اس کے بعد ہم لوگوں نے جامعہ کا بڑا ہال دیکھا، س وقت تک ہم کو جتنے ہالوں کو دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا ان سب میں یہ بڑا تھا ہمارے ساتھ جو ملازمین تھے انہوں نے بتایا کہ دنیا کی یونیورسٹیوں میں یہ دوسرے نمبر کا ہال ہے، اس میں تین ہزار نشستیں ہیں، ہمارے ساتھ جو ملازمین تھے انہوں نے داہنی سمت کے اسٹیج کی طرف اشارہ کیا، یہ بڑی شاندار نشست گاہ ہے، اس پر ایک پردہ پڑا ہوا ہے جو خودکار طریقہ پر کھلتا اور بند ہوتا ہے، ان لوگوں نے بتایا کہ " ہٰذا مجلس مولانا " (یہ ہمارے آقا کی نشست گاہ ہے) اس کی مراد ملک فاروق سے تھی، ہم لوگ اس نشست گاہ میں داخل ہوئے وہاں ہم نے شاہی محل کی شان وشوکت، زیب وزینت اور حسن وجمال کا ایک نمونہ دیکھا، ایک ایسا نمونہ جس کا اکثر ملکوں میں خاتمہ ہوگیا، اس کے بعد ہم لوگ وزیروں کی نشست گاہ سے گزرتے ہوئے ہال سے نکل آئے اور جامعہ کے مختلف شعبوں، کلیۃ الحقوق (لا کالج) اور کلیۃ التجارۃ کی عمارت پر ایک طائرانہ نظر ڈالی، ملازمین کی کثرت تعداد نے ہماری نگاہوں کو متوجہ کرلیا یہ ایسی چیز ہے جس کو ہم نے ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں نہیں دیکھا، اس میں شبہ نہیں کہ مصر اپنی ترقی اور زمانہ کے ہمرنگ ہونے کے باوجود اس پر شخصی سلطنت اور شاہی انداز کی چھاپ نمایاں ہے، حتیٰ کہ تعلیمی اداروں تک پر سرکار دربار کا رنگ غالب ہے، زندگی کی چکی شاہی خاندان کے گرد گھومتی ہے چاروں یونیورسٹیوں میں سے ہر یونیورسٹی خدیوی خاندان کے کسی فرد کی طرف منسوب ہے " جامعة فؤاد الاول " " جامعة فاروق الاول " وہاں پر " جامعة ابراهيم باشا " اور اسیوط میں " جامعة محمد علی الکبیر " اسی کی علامت ہیں۔

یونیورسٹیوں اور کالجوں میں مخلوط تعلیم

مخلوط تعلیم، ترقی یافتہ یونیورسٹیوں کا فیشن، اور آزادی وتہذیب کی علامت بن چکی ہے، یہ ذہنیت اتنی آگے بڑھ چکی ہے کہ پڑھے لکھے لوگ اس موضوع پر تنقید کا ایک لفظ سننا پسند نہیں کرتے، مرد وعورت کے اختلاط سے معاشرے میں پیش آنے والے خطرناک واقعات، دینی پابندی اور اخلاقی بیداری کے فقدان کے ساتھ ساتھ جوانوں میں جنسی جذبات وہیجان کو ابھارنے اور جنسی تسکین کی دعوت دینے والے ادب کا وجود جو دینی تعلیم اور اخلاقی قدروں کو بے وزن سمجھتا ہے بلکہ اس کا مذاق اڑاتا ہے اس کی موجودگی میں قدرتی طور پر کیسے توقع کی جاسکتی ہے کہ اختلاط کے بعد معاملہ صرف پڑھنے پڑھانے پر رک جائے گا، محبت وآشنائی اور اس کے آگے تک تجاوز نہ کرے گا، مجھے تو ڈر ہے کہ تنہا یہی بات بہت سے مفاسد کی جڑ ہوگی۔

جو شخص ان پڑھے لکھے لوگوں سے اس کے بعد بھی خیر کی توقع کرے اس سے اس کے کے علاوہ اور کیا کہا جاسکتا ہے ؎

درمیان قعر دریا تختہ بندم کردہ ای
بازمی گوئی کہ دامن ترمکن ہوشیار باش

اخوان المسلمین کے جلسہ میں میری تقریر

مغرب بعد ہم لوگ ڈاکٹر خلیل عشماوی کے مکان گئے جہاں اخوان المسلمین کے چیدہ اور مخلص لوگوں سے ملاقات ہوئی اور وہاں بے سان وگمان مجھ سے کچھ کہنے کا مطالبہ ہوا، بروقت جو کچھ میرے ذہن میں آیا میں نے ان سے عرض کیا، میں نے کہا کہ یہ آزمائش جس سے اخوان کی دعوت دوچار ہوئی ہے یہ آزمائش نہیں بلکہ میں اسے عطیہ خداوندی سمجھتا ہوں۔ "عسیٰ أن تکرھوا شیئا وھو خیر لکم" (سورہ بقرہ آیت ۲۱۶) ممکن ہے کہ ایک چیز کو تم ناپسند کرو اور وہ تمہارے لئے بہتر ہو۔

افراد کی مہم سازی

اس میں شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے داعیوں اور کارکنوں کی پیشانی پکڑ کر انہیں دعوت وتربیت کے کام کی طرف موڑ دیا، جماعت غیر قانونی قرار پانے کی وجہ سے بہت سی غلطیوں اور خطرات سے محفوظ ہوگئی، اخوانی بھائیوں کو چاہئے کہ پہلے دلوں میں ایمان کا بیج بوئیں اور دعوت کے اصولوں کو جاگزیں کرنے کے لئے اس موقع کو غنیمت سمجھیں اور رفتہ رفتہ انہیں شرعی احکام کا پابند بنائیں اور خود کو ذاتی سربلندی کی لالچ اور خواہشات سے الگ رکھیں اور دعوت کے کام کو پورے اخلاص اور بے لوثی کی اسپرٹ سے کرنا شروع کردیں اس کے لئے اس قدر منہمک اور یکسو ہوجائیں کہ ان کے دل میں جاہ ومنصب اور حکومت واقتدار کے حسین خوابوں کا تصور تک نہ آنے پائے۔

میں نے ان سے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے ایک طرف تو جاہ طلبی کی مذمت کی ہے اور دوسری طرف مسلمانوں سے بلند مقام عطا کرنے کا وعدہ کیا، فرمایا(تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَايُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا وَّالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ) (سورہ قصص آیت ۸۳) یہ آخرت کا گھر ہم ان لوگوں کے لئے بناتے ہیں جو زمین میں جاہ پسندی اور بگاڑ نہیں چاہتے۔ انجام (خیر) تو (مجھ سے) ڈرنے والوں ہی کے لئے ہے، دوسری جگہ فرمایا" وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ "(سورہ آل عمران ۱۳۹)(تمہیں بلند ہو، اگر تم سچے مومن ہو) ہم ان دونوں آیتوں سے یہی سمجھتے ہیں کہ جاہ طلبی مذموم ہے، اسے اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتا ہے لیکن وہ انعام خداوندی اور عطیہ الٰہی بھی ہے جس سے اللہ تعالیٰ سچے مومنوں اور مخلص مجاہدوں کو نوازتا ہے جب یہ مرتبہ حاصل ہوجائے تو پھر اللہ تعالیٰ کے حکموں اور شریعت کے احکام کو لوگوں اور ملک پر نافذ کرنے سے پہلے دلوں پر نافذ کریں جس درجہ میں ہم اپنے دلوں کو ان احکام کا عادی بنائیں گے اور جس حد تک وہ احکام شریعت کے سامنے اس کا پابند اور اس کے لئے سرگرم عمل ہوگا، لوگ بھی اسی قدر ان احکام کے سامنے

جھکیں گے اور اس کو خود پر منطبق کریں گے، میں نے ان لوگوں سے ان بزرگ کا قصہ بیان کیا جو ایک جنگلی درندے پر سوار ہو کر آئے تو لوگ گھبرائے اور حیرت زدہ ہو گئے ان بزرگ نے ان لوگوں سے کہا کہ تمہیں ذرا تعجب نہ ہو یہ درندہ اس لئے میرا تابع ہو گیا کہ میں اپنے رب کا تابع ہو گیا، میں نے کہا چاہے تاریخی اعتبار سے یہ واقعہ قابل حجّت نہ ہو لیکن یہ حقیقت مسلّم ہے۔

آنے والی نسلوں کی ذمہ داری

میں نے کہا آپ حضرات کے لئے یہ ضروری ہے کہ دعوت کی ذمہ داری اور اس کی نزاکت اور اہمیت کو محسوس کریں، آپ پر صرف موجودہ نسل کی ذمہ داری نہیں ہے بلکہ اسی طرح آئندہ نسل کی ذمہ داری کا بھی تعلق آپ ہی سے ہے جس طرح درخت کے پورے بوجھ اور اس کی جڑوں کی مضبوطی کا تعلق اچھے بیج سے ہوتا ہے اگر بیج خراب ہے تو درخت بھی کمزور ہوگا، جڑوں میں بھی مضبوطی نہ ہوگی، قرون اولیٰ میں ایمان وتقویٰ اور عزیمت ہی کے بیج پر یہ قوم پروان چڑھی ہے اور اسی پر اس کی نسلوں نے ترقی کی ہے، اس قوم میں ایمان ویقین اور دین کی جو طاقت ہم دیکھ رہے ہیں اس سب کا سرا صحابہ کرامؓ سے ملتا ہے اسی سے شاخیں پھوٹتی ہیں پھر ان سب کا تعلق اس کے اصل سرچشمہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایمان سے جڑتا ہے۔

استاذ بہیّ الخولی اور شیخ محمد الغزالی کی تقریر

میرے بعد استاذ بہی الخولی نے حاضرین کو خطاب فرمایا، میری تقریر پر تبصرہ کیا اور اس کی وضاحت وشرح کی مؤثر مثالوں اور قصوں سے اس کے مفہوم کو واضح کیا، فکر ونظر عزم وحوصلہ کو روحانی تربیت اور نفس کو میل وگندگی سے پاک رکھنے کی طرف متوجہ کیا، انہوں نے کہا کہ خدا کے سامنے اس کے حقوق کی ادائیگی میں بندے سے جو زیادتی وکوتاہی ہوتی ہے وہ اس کے اہل وعیال، خدام اور اہل تعلق کے برتاؤ میں ظاہر ہونے لگتی ہے انہوں نے بیان کیا کہ بعض اہل اللہ فرمایا کرتے تھے کہ میں اپنے خدام اور جانوروں کے ساتھ اپنے ساتھ سلوک میں تبدیلی دیکھ کر اپنی کوتاہیوں کا اندازہ کر لیتا ہوں، بعض اللہ والوں کی اولاد کا بیان ہے کہ جب ہم سے

کوئی حرکت ایسی سرزد ہوجاتی ہے جو ہمارے والدین کو ناگوار ہوتی تو وہ ہم پر بہت مہربان ہوجاتے اور آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر دعا کرتے، کہ اے میرے اللہ شاید میں نے تیری نافرمانی کی ہے، یا تجھے ناراض کیا ہے جس کے نتیجہ میں میرے ساتھ میرے بچوں کا سلوک بھی بدل دیا اور ان سے مجھے تکلیف پہنچی اس طرح کی بہت سی مثالیں اور حالات بیان کئے۔

میں شیخ بہی الخولی کی تقریر میں تصوف کی شیرینی محسوس کررہا تھا یہ بات ان کے صحیح اسلامی تصوف کے مطالعہ اور اس کی قدردانی کی وجہ سے تھی ان کے بعد شیخ محمد الغزالی نے تقریر کی۔

انہوں نے چند تقاضوں کے پیش نظر طرز معیشت میں وسعت اور مباحات سے فائدہ اٹھانے اور نفس کی اصلاح وتربیت اور اخلاقی پہلو کے درمیان اعتدال قائم کرنے کا نظریہ پیش کیا، میرے اور بہی الخولی کے خیالات میں توارد پر ان کو تعجب ہوا، انہوں نے فرمایا اور سامعین نے بھی اس کی تصدیق کی، کہ آج رات کی تقریر میں میں نے جو کچھ کہا وہ یہی باتیں فرما چکے ہیں، انہوں نے اپنے درس میں وہی باتیں فرمائیں جو میں نے عرض کیں۔

اس محفل میں سید سابق سے تعارف ہوا، وہ نیک نفس سمجھ دار صاحبِ علم آدمی ہیں، ان کا نام شیخ غزالی نے مفقہ الجماعۃ رکھا ہے، میں نے لوگوں سے ان کی تعریف سنی۔(۱)

دوشنبہ ۲۰/۵/۱۳۷۰ھ مطابق ۲۶/۲/۱۹۵۱ء

استاذ علی الغایاتی کے ساتھ

آج ظہر بعد ہم لوگ (منبر الشرق) کے ایڈیٹر علی الغایاتی کے پاس گئے، ان سے ملاقات ہوئے بہت زمانہ ہو چکا تھا، انہوں نے ہمیں خوش آمدید کہا اور ہم لوگوں کی بڑی عزت افزائی کی، وہاں ہماری ملاقات فتحی رضوان صاحب سے ہوئی جو مصر کے ممتاز وکلاء میں ہیں، جب انہوں نے میری کتاب ''ماذا خسر العالم'' دیکھی جو غایاتی صاحب کے پاس تھی تو انہوں نے یونیورسٹیوں میں لڑکیوں کی تعلیم اور ان کے مختلف کاموں اور ملازمتوں کو اختیار کرنے کے

---

(۱) شیخ سید سابق نے اچھی عمر پائی اور اپنی کتاب فقہ السنہ سے عالم اسلام بالخصوص عالم عرب میں مقبول ومتعارف ہوئے (مترجم)

بارے میں میری رائے معلوم کرنی چاہی میں نے کہا کہ میں اس بات کو ایک مستقل مسئلہ کی حیثیت سے نہیں دیکھتا، میرا خیال ہے کہ ایک غیر اسلامی ماحول اور اخلاقی گراوٹ میں مبتلا معاشرہ میں جہاں نہ اسلامی احکام نافذ کئے جاتے ہیں اور نہ شرعی حدود کا خیال رکھا جاتا ہے اس کی اجازت دینا درست نہیں، ہاں اگر اسلامی معاشرہ ہو، زندگی پر دینی رنگ غالب ہو، حدود نافذ ہوتے ہوں، ضمیر زندہ ہو اور اخلاقی شعور موجود ہو تو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے اور زندگی کے بعض کاموں میں عورتوں کے حصہ لینے میں کوئی حرج نہیں بشرطیکہ وہ صنف نازک کے مزاج، اس کی کمزوری اور نسوانی ذمہ داریوں سے میل کھاتا ہو۔

انہوں نے میری اس رائے کو پسند کیا، غایاتی صاحب نے میری تصویر کھینچنی چاہی میں نے جناب اسعد حسنی کی طرح ان سے بھی معذرت کردی اور ان کو اپنے ذاتی حالات دینے کا وعدہ کرلیا، حالانکہ ان حالات میں کوئی بڑا کارنامہ شامل نہیں وہ اس پر راضی ہوگئے اور اس کو شائع کرنے کی خواہش ظاہر کی۔

شیخ حسن البناء شہید کے دوست اور ساتھی بہی الخولی کا اعتراف حقیقت

مغرب بعد ہم لوگ شیخ بہی الخولی کے گھر (قلعہ) گئے، اور ان کے پاس تین گھنٹے سے زیادہ بیٹھے اس میں انہوں نے جماعت کو غیر قانونی قرار دیئے جانے سے پہلے اخوان المسلمین، ان کی تنظیم وسرگرمی، اس نرم ونازک قوم کے اخلاق پر ان کی دعوت نے جو اثر ڈالا اس کے نوجوانوں نے جس قوت وثابت قدمی ایمان وبہادری اور سنجیدگی کا مظاہرہ کیا، اس پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ ابراہیم عبدالہادی باشا (سابق وزیر اعظم مصر) جیسے شخص کا کہنا ہے کہ ان جیسے نوجوان جنھوں نے جیل میں قسم قسم کی تکلیفیں جھیلیں اور ان کے پائے ثبات میں ذرا بھی جنبش نہ ہوئی میرے پاس اسی ۸۰ بھی ہوتے تو میں ان سے پوری دنیا کو چیلنج کرتا۔

شیخ بہی الخولی نے فرمایا کہ اگر یہ دعوت نہ ہوتی تو مصر یقیناً اخلاقی گراوٹ وبدکرداری کا شکار ہوجاتا اور اس کا زوال آجاتا۔

لیکن اللہ تعالیٰ نے اس اسلامی دعوت کے ذریعہ اس کی تلافی کی اور یہ دعوت اس کے سامنے سنگ گراں بن گئی، پھر انہوں نے اپنے قائد امام حسن البناء کے ساتھ اخوان کی شیفتگی اور پورے مصر میں اس کی شاخوں کے قیام اور لوگوں کے دلوں میں ان کی محبت اور اطاعت وفریفتگی کا حال بیان کیا، انہوں نے کہا کہ ایک مصری اخبار نے تو یہاں تک لکھ دیا کہ اگر شیخ حسن البناء قاہرہ میں چھینکیں تو اخوانی ''اسوان'' میں یَرحمک اللہ کہیں گے، استاذ بہی الخولی امام حسن البناء کے ساتھی تھے ان کے ساتھ ہی دار العلوم قاہرہ میں داخل ہوئے اور آخر وقت تک ان کے ساتھی رہے، انہوں نے تحریک کی ترقی اور اس کے حالات بیان کرتے ہوئے کہا کہ اب وہ جس منزل میں ہے وہ سب پر عیاں ہے، انہوں نے شیخ کی دانائی وہوشمندی، اخلاص وسوجھ بوجھ اور دعوت سے عشق کی بہت سی مثالیں بیان کیں، ہم نے محسوس کیا کہ بہی الخولی ان سے بہت قریب ہونے کے باوجود ان کے بڑے قدرداں اور ان سے گہری محبت رکھتے ہیں، اور ان کی طاقت ورشخصیت اور بے مثال فطری صلاحیتوں سے بہت متأثر ہیں۔

مولانا عبید اللہ بلیاوی کی شیخ حسن البناء سے ملاقاتوں پر بہی الخولی کا استعجاب وتاثر

جب استاذ بہی الخولی کو معلوم ہوا کہ برادرم مولانا عبید اللہ صاحب حجاز میں شیخ حسن البناء سے بار بار ملے ہیں، تو بہت خوش ہوئے، اور متعدد بار فرمایا، میرے بھائی کیا آپ نے شیخ کو دیکھا ہے؟ کیا آپ نے انھیں تقریر کرتے ہوئے سنا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ حسن البناء اپنے دوستوں اور ساتھیوں کے دل ودماغ پر چھائے ہوئے اور محبوب لیڈر اور ہر دلعزیز قائد کی حیثیت سے ان کے قلب وجگر میں سمائے ہوئے ہیں۔

۲۱/۵/۱۳۷۰ھ، ۲۷/۲/۱۹۵۱ء بروز منگل

آج ہم لوگ '' مجلة العالم العربی '' کے دفتر گئے اور جناب احمد حسنی سے ملے، انھوں نے ہم سے ایک دو باتیں کیں پھر اپنے سکریٹری کو مقالہ املا کرانے لگے، مجھے

ان کے اپنے ان مہمانوں سے یہ بے رخی جن سے ملاقات کا وقت خود انھیں نے مقرر کیا تھا، اچھی نہ معلوم ہوئی جب کہ ہم کسی مادی غرض سے ان کے پاس نہیں آئے تھے، انھوں نے میری طرف احمد جمال الدین کی کتاب "الدیمقراطیة الجدیدة" بڑھائی اس کی فصل "الفهم الجدید للدین" کی طرف اشارہ کر کے مجھ سے اس کو پڑھنے کو کہا، میں نے اس پر ایک سرسری نظر ڈالی تو اندازہ ہوا کہ یہ کم پڑھے لکھے نوجوان ادباء کے معیار کی کتاب ہے جن کے مطالعہ میں وسعت و گہرائی نہیں ہوتی، اور جو اپنے نظریات ونتائج فکر کو ہمیشہ قرون وسطی کے تجربات کی روشنی میں قائم کرتے ہیں اور اس عہد کے سطحی خیالات کو جن میں جذباتیت زیادہ ہے اسلامی معاشرہ پر جوں کا توں نافذ کرنا چاہتے ہیں اور اسلامی ملکوں میں ان اجتماعی وسیاسی مسائل کا حل تلاش کرنے میں سرگرداں ہیں، جو حقیقتاً اسلامی معاشرہ اور مسلم ملکوں کے سرے سے مسائل نہیں ہیں، بلکہ وہ مسیحی دنیا کے مسائل ہیں، یہ وہ مسائل ہیں جن کو مسیحی کلیسا (چرچ) نے پیدا کیا ہے اور وہ کلیسا اور دربار شاہی کی کشمکش اور سینٹ پال کے وضع کئے ہوئے مذہب، اور گلیلو اور کوپرنیکس کی علمی تحقیقات کی آویزش کا نتیجہ ہیں، یہ لوگ تفریق دین وسیاست کے نظریہ کو ایک مسلمہ حقیقت مانتے ہیں، اور اس پر زور دیتے ہیں کہ مذہب ایک پرائیویٹ اور نجی معاملہ ہے اس کو سیاست سے الگ کرنا اور نجی دائرہ میں محدود کر دینا وہ غلط بنیاد ہے جس پر مغربی تہذیب اور یورپ کی سیاست قائم کی گئی ہے اور اسی کے نتیجہ میں یورپ ایک مست ہاتھی کے مانند ہو گیا ہے جو نوع انسانی کے لئے ہلاکت خیز بنا ہوا ہے، کیا یہ مصنّفین وصحافی یہ چاہتے ہیں کہ اسلامی ممالک بھی یہی غلط اقدام کریں، اس جمہوریت کی مدح سرائی ونغمہ خوانی کب تک جاری رہے گی جو دنیا کے سامنے رسوا ہو چکی ہے؟

میں نے چاہا کہ عالم عربی کے قارئین کو جو قومیت عربیہ کے فلسفہ اور مغربی نظاموں ہی کو پڑھنے کے عادی ہیں یہ معلوم ہو جائے کہ اسلام پسند مفکرین اور مومنین مخلصین عالم عربی کو کس نظر سے دیکھتے ہیں اور اُن کو اس سے کیا امیدیں ہیں۔ چنانچہ میں نے رسالہ کے ایڈیٹر

جناب احمد حسنی سے ان کے رسالہ " العالم العربی " کے لئے ایک مقالہ پیش کرنے کا وعدہ کیا جس کا عنوان ہوگا " نظر فیلسو ف الشرق الدکتور محمد إقبال إلی النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم والعالم العربی " انھوں نے اس پر مسرت کا اظہار کیا اور کسی قریبی شمارہ میں شائع کرنے کا وعدہ کیا، کیا عجب ہے کہ یہ مقالہ کچھ لوگوں کے احساسات کو جھنجھوڑ دے اور دلوں میں ایمانی حرارت پیدا کردے۔

جمعیۃ الشبان المسلمین میں میری تقریر

مغرب بعد ہم لوگ جمعیۃ الشبان المسلمین گئے آج رات کو یہاں میری تقریر تھی دروازے پر پہلے محمد الغزالی پھر معہد القاہرہ کے استاذ احمد الشرباصی ملے انھوں نے بڑے تپاک وگرم جوشی کے ساتھ خوش آمدید کہا اور فرمایا کہ میں نے آپ کی کتاب " ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین " کا مطالعہ شروع کردیا ہے کتاب کی پسندیدگی اور اس کے مضامین سے متأثر ہونے کا اظہار کیا اور اپنی تصنیفات اور رسائل کی ایک اچھی خاصی تعداد مجھے دی، ہم لوگ بیٹھ کر باتیں کرنے لگے، ازہر کلیۃ اللغۃ العربیۃ اور کلیۃ الآداب کے اساتذہ، اخوان المسلمین اور دوسری دینی انجمنوں کے لوگوں کی اچھی خاصی تعداد آگئی ازہر کی شاخوں کے مہتمم اور عالم شیخ عبد اللطیف دراز کلیۃ اللغۃ العربیۃ کے پروفیسر عبد المتعال الصعیدی (اومن بالانسان) کے مصنف عبد المنعم خلاف اور " الاسلام حائرٌ بین أهله " کے مصنف استاذ عبد اللہ السماک بھی آئے دوسرے اور بہت سے اساتذہ اور بہت سے صاحب علم حضرات آگئے، تقریر کا وقت ہوگیا اور جناب عبد اللطیف اور محترم شرباصی صاحب کے ساتھ میں جلسہ گاہ میں داخل ہوا۔

احمد الشرباصی کی تعارفی تقریر اور میری گفتگو

شیخ احمد الشرباصی صاحب آگے بڑھے اور آج کے جلسہ کے خصوصی مقرر کا تعارف کرایا، ہندوستان اور وہاں کے علمی کمالات اور خصوصیات کی تعریف کی اور فرمایا کہ حکومت

پاکستان کے وجود میں آنے پر ہماری خوشی نے ہمیں یہ بھلا دیا کہ ہندوستان میں بھی مسلمانوں کی بڑی تعداد ہے، وہاں ان کے عظیم الشان کارنامے اور بہت سی علمی یادگاریں ہیں، ہندوستان بعض اسلامی یادگاروں اور مایہ ناز کتابوں میں جو ہندوستان ہی میں طبع ہوئی ہیں جیسے کشاف اصطلاحات الفنون ہمیشہ منفرد رہے گا، عرب ممالک میں شائع ہونے سے پہلے ہندوستان ہی میں سیوطی کی کتاب "الخصائص الکبری" شائع ہوئی ہے۔

انہوں نے میری کتاب "ماذا خسر العالم" کو بھی سراہا۔

پھر میں آگے بڑھا اور (العالم علی مفترق الطرق) کے عنوان پر اپنی تقریر شروع کی۔

تاریخ انسانی اپنے پھیلاؤ اور پیچ وخم میں نیل کی طرح ہے

تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ تاریخ انسانی کے پھیلاؤ اور پیچ وخم کی تشبیہ اگر دریائے نیل سے دی جائے جو دور تک ایک ہی خط پر بہتا ہے، پھر مڑتا ہے اور پھر جاتا ہے تو بیجا نہ ہوگا، تاریخ بھی اسی طرح دو قسموں میں بٹی ہوئی ہے، دور تسلسل دور انقلاب، دور تسلسل تو یہ ہے کہ تاریخ ایک ہی رخ پر چلے اور ایک ہی دھارے پر بہے، کبھی کبھی یہ بہاؤ سیکڑوں ہزاروں سال تک قائم رہتا ہے، حکومت کی تبدیلی اور ردّ و بدل اس پر اثر انداز نہیں ہوتا اور یہ اس وقت ہوتا ہے جب فلسفۂ زندگی ایک ہو، تہذیب کی بنیاد ایک ہو اور زندگی کا نقطۂ نظر ایک ہو۔

یونانیوں کے عہد سے بازنطینیوں کے عہد تک

یہ بات یونانیوں کے عہد سے بازنطینیوں کے عہد تک برقرار رہی، اس درمیانی عہد میں زندگی کی تشکیل وتنظیم کا دارومدار حواس خمسہ اور عقل وخواہشات پر تھا، چھٹی صدی مسیحی میں اس طرز زندگی کی ناکامی اور تنگ دامانی انتہا کو پہنچ گئی، اور روز روشن کی طرح عیاں ہوگئی پھر بعثت محمدی کے ساتھ اس زندگی کا نیا باب شروع ہوا اور دنیا نے عقل وحواس اور

خواہشات کا سہارا چھوڑ کر وحی آسمانی اور قانون خداوندی کا سہارا لیا۔

بعثت محمدی سے یورپ کی قیادت تک

یہ رُخ صدیوں تک چلتا رہا اور انسانی دریا ایک رخ پر بہتا رہا، بس اس کی وسعت و تنگی اور قوت وضعف میں اتار چڑھاؤ ہوتا رہا، اس دریا کی روانی کے سامنے دو چٹانیں آئیں جو قریب تھا کہ اس دھارے کا رخ پھیر دیتیں، پہلی چٹان تو پانچویں صدی ہجری میں صلیبی جنگوں کا سلسلہ تھا لیکن عالم اسلام جس کی قیادت کی باگ ڈور سلطان صلاح الدین ایوبی جیسے قوی الارادہ اور صاحب ایمان شخصیت کے ہاتھ میں تھی، اس چٹان کو ہٹانے میں کامیاب رہا، دوسری چٹان تاتاری حملہ تھا جس میں عالم اسلام کی اینٹ سے اینٹ بج گئی لیکن اس میں اس کی روحانی اور معنوی طاقت کا بال بیکا نہ ہوسکا، دعوت اسلام تاتاریوں پر غالب اور فتحیاب ہوگئی اور وہ سب کے سب اسلام لائے، لیکن اس کے بعد ایسی بات پیش آئی جس نے اس رخ کو پوری طرح پھیر دیا اور تاریخ کے دھارے کو بدل دیا، وہ ہے عالم اسلام پر مغرب کا حملہ اور اس کے فلسفہ وحکمت، تجربات وایجادات کا تسلط ،تقریباً دوسو سال سے عالم عربی اپنے اس سرمایہ سے جو اس کے پاس تھا کام نکالتا رہا حالانکہ یہ دوصدیاں ہزاروں سال پر بھاری ہیں س لئے کہ یورپ پہلی قوموں کی بہ نسبت ان سب سے کہیں کم مدت میں اپنے آلات ومادی قوت کے ذریعہ ترقی کی انتہا کو پہنچ گیا، اس نے اس تھوڑی سی مدت میں اپنی پوری صلاحیت داؤں پر لگادی اور اس میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑی۔

مغربی قیادت کا افلاس

اب انسانی قیادت اور عالم انسانیت کی قیادت میں یورپ کی کم مائیگی اور ناکامی کھل کر سامنے آگئی ہے، سرمایہ دارانہ نظام اور کمیونزم دونوں زندگی کے اصول ونظریات اور فلسفۂ حیات پر متفق ہیں، کمیونزم کی طاقت صرف سرمایہ دارانہ نظام سے پنجہ آزمائی اور اس

کی غلط کاریوں پر روک لگانے کے لئے ہے، بس جس وقت سرمایہ دارانہ نظام ختم ہوگا، کمیونزم بھی ختم ہوجائے گا، انسانیت کمیونزم سے مایوس ہوجائے گی، اس وقت صرف اسلامی اور اسلام ہی کا نظام حیات باقی رہے گا۔

دنیا دوراہے پر

یورپ اپنے دونوں نظام حیات کے ساتھ نقطۂ عروج کو پہنچ چکا ہے اب وہ اس پکے ہوئے پھل کی طرح ہے جو اب اور تب گرنا چاہتا ہے اور دنیائے انسانیت دوراہے پر کھڑی ہے، ع

خود بخود گرنے کو ہے پکے ہوئے پھل کی طرح
دیکھئے گرتا ہے کس کی جھولی میں فرنگ

یہ اسلامی قیادت کا دور ہے، اب اگر مسلمان آگے بڑھتے ہیں اور گم کردۂ راہ دنیا کی قیادت سنبھال لیتے ہیں تو ٹھیک، ورنہ دنیا دوسرا رُخ اختیار کرے گی اور یہ رخ صدیوں اور ہزاروں سال تک چلتا رہے گا اور اسلام انسانیت کی رہنمائی سے کٹ کر رہ جائے گا۔

تقریر کے بارے میں میرا خیال

تقریر کا موضوع ایک علمی اور تاریخی موضوع تھا، میرے لئے بہتر تھا کہ تقریر قلم بند کر کے پڑھتا مگر میں نے چاہا کہ برجستہ تقریر کروں، پھر مجھے احساس ہوا کہ میری بات ان ماہ[illegible]ں کے رواج کے منافی ہے، جہاں تقریر قلم بند کر کے ہی پڑھنے کا رواج ہے وہ لوگ تو اس کے منتظر رہے ہوں گے کہ تقریر میں نے قلم بند کر لی ہے واقعہ یہ ہے کہ تقریر سے خود میں مطمئن نہیں تھا، میں نے محسوس کیا کہ مافی الضمیر کو پوری طر[illegible] ادا کر سکا اور اس اہم موضوع کا حق پورا نہ ہو سکا لیکن سامعین کا تأثر اس کے برعکس تھا، انہوں نے تقریر بڑے شوق و نشاط سے سنی۔

مقررین کے تبصرے

میری تقریر پر شیخ احمد الشرباصی پھر استاذ عبدالمتعال صعیدی نے اور ان کے بعد

محمد الغزالی اور پروفیسر عبدالمنعم خلاّف نے تبصرہ کیا جلسہ ختم ہوا تو وہ مدعوین اور انجمنوں کے حضرات نے مجھے گھیر لیا شکریہ اور مبارکباد پیش کرنے لگے اور بڑھ بڑھ کر مصافحہ کرنے لگے، یہ منظر دیکھ کر میں محسوس کر رہا تھا کہ یہ لوگ میرے علاوہ کسی اور کو مبارکباد دے رہے ہیں اور مصافحہ کر رہے ہیں اس لئے کہ آج میں اس عزت افزائی کا مستحق نہیں ہوں۔

بدھ ۲۲/۵/۱۳۷۰ھ مطابق ۲۸/۲/۱۹۵۱ء

امیر عبدالکریم خطّابی سے باتیں

دن کے آخری حصہ میں ہم لوگ امیر عبدالکریم خطابی کے پاس ''حدائق القبّۃ'' گئے بارہ تیرہ سال کی عمر سے میں اسپین وفرانس سے ان کی جہاد کی خبریں سن اور پڑھ رہا تھا، پھر میں نے اپنے دوست اور درس کے ساتھی شیخ محمد العربی مراکشی سے ان کی بہادری، ثابت قدمی اور جنگی حکمت عملی کے بارے میں بہت کچھ سنا، ایک مرتبہ امیر شکیب ارسلان نے میرے دوست مولانا مسعود عالم ندوی کو ایک خط لکھا، جس میں امیر کی جوانمردی، دلیری وشجاعت اور حوصلہ مندی کی بڑی تعریف کی اور ارشاد فرمایا کہ وہ اس وقت عالم اسلامی کی سب سے اہم اور بڑی شخصیت ہیں، ان تمام باتوں نے مجھے ان سے ملنے اور براہ راست انہیں سے ان کے حالات سننے کا شائق بنا دیا، ہم لوگ ان کے گھر پہنچے، مصری سپاہی گھر کا پہرہ دے رہے تھے، امیر کو ہمارے آنے کی اطلاع کی گئی انہوں نے پرتپاک خیر مقدم کیا ہم نے اپنا وطن بتا کر ان سے اپنا تعارف کرایا اور بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔

میں نے ان کو عالم اسلامی کے حالات سے بہت باخبر اور ہندوستان کے جغرافیہ سے نہایت واقف پایا، وہ ری یونین میں اپنے جلاوطنی کے زمانہ میں بہت سے ہندوستانی مسلمانوں سے ملے تھے جہاں وہ بیس سال رہے۔

امیر عبدالکریم کے جہاد سے متعلق کچھ معلومات

میں نے ان سے عرض کیا کہ آپ نے دوران جہاد میں کتنے رقبہ پر قبضہ کیا، انہوں

نے بتایا کہ پہلے پہل تو ہم نے پچاس مربع کلومیٹر پر قبضہ کیا، پھر بعد میں تو بہت وسیع رقبہ پر قبضہ ہوگیا، میں نے پوچھا کہ کیا ''تطوان'' پر بھی آپ کا قبضہ تھا، انھوں نے کہا کہ ہم نے اس پر حملہ کی تیاری کرلی تھی لیکن قبل اس کے کہ حملہ ہو صلح ہوگئی، میں نے پوچھا آپ کے زیر قیادت کتنے فوجی لڑ رہے تے، انھوں نے کہا کہ ہم نے چار ہزار سپاہیوں کو لے کر جہاد شروع کیا تھا پھر آخر میں ۴۰ ہزار فوجی ہوگئے تھے، میں نے کہا کہ اسپینیوں کی فوج کتنی تھی، تو بتایا کہ ابتداء میں اسپینی فوج ایک لاکھ تھی، پھر آخر میں چار لاکھ ہوگئی تھی، جس محاذ پر ہم لڑ رہے تھے وہ چھ سو کلومیٹر وسیع تھا، اس وسیع علاقہ میں ہمیں دفاع اور حملہ دونوں کی ضرورت ہوتی تھی، اور دشمنوں نے ہمارے خلاف جو اندرونی فتنے اور خانہ جنگی کی آگ لگادی تھی وہ دشمنوں کے ساتھ جہاد سے کچھ کم نہ تھی، فرمایا جنگ ۱۹۲۰ء میں شروع ہوئی اور چار سال تک اسپینیوں کے ساتھ ہوتی رہی، ۱۹۲۴ء میں فرانس نے مداخلت کی اور ۱۹۲۶ء میں ذخیرہ اور فوجی رسد ختم ہوجانے نیز سردی کی شدت اور عرصہ تک حصار کی وجہ سے صلح ہوگئی، انھوں نے بتایا کہ بعض محاذوں پر ہم کو بہت بڑا جنگی ذخیرہ ملا تھا، ایک محاذ پر ہم نے چار سو توپیں دشمن سے چھین لی تھیں، ہم نے شرعی احکام اور حدود جاری کردیئے تھے، پہلی بار چور کا ہاتھ کاٹا گیا پھر اس کے بعد چوریاں ختم ہوگئیں اور پورے طور پر امن ہوگیا، میں نے پوچھا کہ کیا آپ کے مجاہدین جہاد اور اعلاء کلمۃ کے علاوہ کوئی اور مقصد رکھتے تھے، کیا قومیت و وطنیت کا جذبہ بھی پایا جاتا تھا؟ انھوں نے کہا کہ ان میں سے اکثر دینی جہاد کے جذبہ سے کام کررہے تھے، اگر یہ بات نہ ہوتی تو ہم اتنے کامیاب نہ ہوتے اور دلوں پر یہ اثر ونفوذ نہ ہوتا، میں نے کہا کہ ہم نے سنا ہے آپ اسپینی فوج میں کمانڈر تھے پھر کوئی ایسی بات پیش آئی جس نے آپ کی دینی حمیت اور عربی غیرت کو بھڑکا دیا اور اس نفسیاتی بغاوت کے نتیجہ میں اتنا بڑا جہاد ہوا کیا یہ صحیح ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ نہ میں اسپینی فوج میں کمانڈر تھا اور نہ اس میں سے کوئی بات پیش آئی۔

میں نے پوچھا کہ آپ نے جنگی فنون کیسے سیکھے اور فوج کو اس طرح مرتب کرنے تربیت دینے ایک جدید اور مضبوط لشکر کا مقابلہ کرنے کی قوت کہاں سے حاصل ہوئی؟

انھوں نے کہا کہ جنگی فن تو ہم نے تجربہ اور مطالعہ سے سیکھا ہے، اس لئے کہ ہم ہمیشہ اسپین کے ساتھ جنگ و جہاد ہی میں رہے اور رہی جنگی ٹکنک، سوجھ بوجھ اور موقع شناسی تو یہ خداداد صلاحیت تھی اس کا تعلق مطالعہ اور کدوکاوش سے نہیں ہے، میں نے پوچھا کہ کہ کیا مغرب اقصیٰ اور ریف کے آزاد ہونے کی کوئی امید ہے؟

انھوں نے جواب دیا کہ آزادی تو یقینی ہے لیکن فرانسیسی تنگ نظر ہیں اور انگریزوں کی پالیسی ان کے مقابلہ میں لوچدار ہے، امیر نے مجھ سے فرمایا کہ پھر ملوں تو بہت سی معلومات بہم پہونچائیں گے۔

میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور ہم شہر لوٹ آئے اور پھر جمعیۃ الشبان المسلمین کے مرکز گئے جہاں شیخ احمد الشرباصی سے ملنے کا وعدہ تھا، آدھے گھنٹے سے زیادہ وہاں ٹھہرے لیکن ملاقات نہ ہوئی۔

جمعرات ۲۳/۵/۱۳۷۰ھ مطابق ۱/۳/۱۹۵۱ء

احمد الشرباصی اور احمد محمد شاکر کی کرم فرمائیاں

آج میں " المد والجزر فی تاریخ الاسلام " کے ٹائٹل کا کاغذ دیکھنے اور اچھی طباعت کی تاکید کرنے کی غرض سے "مطبعۃ السنۃ المحمدیۃ" گیا، ظہر سے تھوڑی دیر پہلے جب واپس ہوا تو معلوم ہوا کہ شیخ احمد الشرباصی ہمارے یہاں تشریف لائے تھے اور معذرت کی کہ وہ جمعیۃ الشبان المسلمین کے دفتر میں میرا انتظار کر رہے تھے، ہمارے آنے کی ان کو کسی نے اطلاع نہیں کی، ان کے ساتھ کچھ پڑھے لکھے لوگ تھے جو میری کتاب " ماذا خسر العالم " کے بارے میں بات کر رہے تھے اور میرا انتظار بھی کر رہے تھے، ان سے ملاقات نہ ہونے کا بڑا افسوس ہوا، خصوصاً جب کہ ہم دونوں ایک ہی جگہ موجود تھے، جنرل محمد صالح حرب باشا کا ملاقاتی کارڈ بھی ملا اس کا بھی بڑا قلق ہوا، وہ بیماری کی حالت میں جبکہ چڑھنا اترنا ان کی لئے مشکل

ہوتا ہے، ہماری عزّت افزائی کے لئے آئے تھے، ہم لوگ جلد ہی ان سے ملاقات کا شرف حاصل کر کے اس کی تلافی کریں گے۔ عصر بعد ہم لوگ مشہور مصنف شیخ احمد محمد شاکر کے گھر مصر جدیدہ میں واقع شارع مقریزی گئے، تھوڑی دیر ان کے پاس بیٹھے اور مغرب کی نماز پڑھی، میں نے والد مرحوم کی کتاب "معارف العوارف فی انواع العلوم والمعارف(۱)" ان کے پاس چھوڑ دی تھی، انھوں نے اس کا مطالعہ کیا اور پسندیدگی کا اظہار کیا اور دار المعارف کے لوگوں سے اس کی طباعت کے سلسلہ میں بات کی ان لوگوں نے اس کی طباعت سے اتفاق کیا، مگر یہ کہا کہ طباعت اگلے سال تک مؤخر ہوگی، اس لئے کہ اس سے پہلے سے کئی کتابیں طباعت کی منزل میں ہیں، انھوں نے مجھ سے وعدہ کیا کہ ادارہ کے ذمہ داروں سے دوبارہ بات کریں گے، مجھ سے پوچھا کیا آپ کو دار المعارف اس کا دفتر اور سرگرمیوں کو دیکھنے کا شوق ہے، میں نے کہا جی ہاں ضرور، اس ادارہ سے میں اپنے بچپن سے واقف ہوں، میں نے اس کی بہت سی مطبوعات کا مطالعہ کیا ہے، شیخ نے ادارہ کے بعض ذمہ داروں سے رابطہ قائم کیا اور ان سے طے کیا کہ ہم لوگ دوشنبہ کو پانچ بجے شام کو ادارہ دیکھیں گے۔

ہندوستان میں اسلامی دعوت وتعلم کے پانچ دور

آج رات کو شباب سیدنا محمدؐ کے مرکز دار الارقم میں تقریر کا وقت مقرر تھا، لہٰذا ہم لوگ وہاں گئے اور عشاء کی نماز وہیں پڑھی، حسین یوسف صاحب نے مجھے آگے بڑھایا، میں نے تقریر شروع کی اور ہندوستان میں دعوتِ اسلامی کے جو پانچ دور گزرے ہیں انھیں بیان کیا۔

پہلا دور (حضرت مجدد الف ثانیؒ کا دور)

مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی ۱۰۳۴ھ کا دور ہے، انھوں نے دیکھا کہ ہندوستان جس پر ایک اسلامی خاندان حکومت کر رہا ہے، وہ ہندوؤں کی تہذیب بلکہ ہندوستانی بت

(۱) یہ کتاب "الثقافة الاسلامیه فی الهند" کے نام سے ۵۹ء المجمع العلمی العربی دمشق کی طرف سے شائع ہوگئی، اور اس کا اردو ترجمہ "اسلامی علوم وفنون ہندوستان کے نام سے دار المصنفین اعظم گڈھ سے شائع ہوا

پرستی کی طرف پوری طرح مائل ہے اور یہ سب ملک کے ان پڑھ بادشاہ جلال الدین اکبر کے میلان کی وجہ سے ہو رہا ہے جس میں غیر مسلموں کی تقلید ان کو خوش رکھنے اور تمام ادیان کو ضم کر دینے کا رجحان پیدا ہو گیا اور اس کی سمجھ میں آیا، بلکہ سچ بات یہ ہے کہ اس کے ہم نشینوں نے اس کو باور کرایا کہ نبوت محمدی کا دور ختم ہو گیا، اس پر ہزار سال گذر چکے ہیں اور اب یہ اس کا دور ہے، س نے مختلف عقائد وعبادات اور دینی طریقوں کو اس طرح ملا دیا کہ دین وعقائد کا نیا مرکب تیار ہو گیا اور شریعت اسلامی کو ملک سے پوری طرح خارج کر دیا گیا اور اس کا پورا خطرہ ہو گیا کہ ہندوستان اپنے عظیم المرتبت بادشاہ اور اس کے حاشیہ نشین مادہ پرست علماء وادباء کے اثر سے بت پرستی کے رنگ میں رنگ جائے۔

مجدد صاحب نے دیکھا کہ وہ فوجی انقلاب لا سکتے ہیں نہ اسلامی حکومت قائم کرنے کے دوسرے ذرائع اختیار کر سکتے ہیں اس لئے کہ اس وقت مغل حکومت تازہ دم اور پورے شباب پر تھی اور اس میں ضعف وکہنگی کا کوئی اثر نظر نہ آتا تھا چنانچہ انھوں نے دوسرا راستہ اختیار کیا، وہ تھا دربار شاہی اور حکومت کے ذمہ داروں پر اثر ڈالنے کا راستہ، چنانچہ انھوں نے اہل حکومت سے علمی وروحانی رابطہ قائم کیا، سرہند میں بیٹھ کر ان سے خط وکتابت کرتے رہے اور ان کو نیک خواہشات اور مشورے پیش کرتے رہے بالآخر یہ پورا ماحول روحانی طور پر آپ کا گرویدہ ہو گیا، شیخ کی طاقت ور شخصیت، اخلاص وروحانیت، مادّی فوائد سے بے نیازی، اپنے ہی ملک میں اسلام کی غریب الوطنی وکسمپرسی پر ان کے درد وکرب کی کیفیت نے ان سب پر اثر ڈالا، نتیجہ یہ ہوا کہ ان لوگوں نے آپ کے طاقت ور ومؤثر خطوط کا گہرا اثر قبول کیا، حکومت کا رخ بدل گیا، ذہن ودماغ کا دھارا پلٹ گیا اور مستقبل اسلام کے لئے بہتر وسازگار ہوتا گیا، پھر شیخ کے بیٹوں اور پوتوں کے اثر سے تیموری حکومت کے تخت پر اورنگ زیب عالمگیر جیسا نیک سیرت، انصاف پسند اور فقیہ بادشاہ جلوہ افروز ہوا جس نے مسلمانوں سے گراں بار ٹیکسوں کو ختم کیا جزیہ مقرر کیا، شعائر کفر کو ختم، اور منارۂ اسلام کو بلند کیا، ہندوستانی فتاویٰ کی تدوین کا حکم دیا جو دستور حکومت بنا اور یہ سب کچھ شیخ اور ان کے بیٹوں اور پوتوں کی کدوکاوش ہی کا ثمرہ تھا۔

دوسرا دور (شاہ ولی اللہ صاحبؒ کا دور)

یہ دور حکیم الاسلام شاہ ولی اللہ دہلوی کا ہے جنھوں نے ۱۱۷۶ھ میں وفات پائی آپ نے اپنے زمانے میں شریعت کے صحیح علم کی نشر واشاعت کی طرف توجہ کی، بدعات وخرافات کی گرم بازاری کا مقابلہ کیا، معاشرہ کو صحیح اسلامی انقلاب کے لئے ہموار کیا، اپنی کتابوں میں اسلام کے سیاسی، اجتماعی نظام کو پیش کیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ایسا گروہ پیدا ہوگیا جو اسلام کو اچھی طرح سمجھنے لگا اور اس کے اندر اسلامی غیرت وحمیت کا جوش فراواں اور بگڑے ماحول کی ناپسندیدگی کا زبردست جذبہ پیدا ہوگیا۔

تیسرا دور (حضرت سید احمد شہیدؒ اور ان کے رفقاء خلفاء کا دور)

تیسرا دور شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے صاحبزادے شاہ عبدالعزیزؒ کے شاگردوں کا دور تھا جن کے سرخیل سیّد احمد شہید رائے بریلوی اور نامور مجاہد شاہ اسماعیل شہید تھے، ان حضرات نے ایک بڑی جماعت منظّم کی اور اس کی بہترین دینی اور علمی تربیت کی، پھر انھیں لے کر صوبہ سرحد کی طرف ہجرت کر گئے، ان کا مقصد یہ تھا کہ وہ ان سکھوں کو شکست دیتے ہوئے جنھوں نے پنجاب پر قبضہ کر کے مسلمانوں کو بڑی اذیتیں پہنچائی تھیں، انگریزوں کو نکالنے کے لئے ہندوستان کی طرف پیش قدمی کریں اور کتاب وسنّت کے مطابق اسلامی حکومت قائم کریں چنانچہ اس میں ان کو کامیابی حاصل ہوئی اور بہت سی جنگوں میں انھوں نے سکھوں کو شکست دے کر پشاور اور اس کے گردونواح میں شریعت کے مطابق اسلامی حکومت قائم کردی اور اسلام کے مالی اور اقتصادی نظام کو پوری طرح نافذ کردیا، لیکن افغانیوں نے اس نظام کو اپنے ذاتی اغراض ومقاصد اور جاہلی عقائد وعبادات سے ٹکراتا دیکھ کر ان کے خلاف بغاوت کردی اور اس نظام کو ناکام بنادیا اس کے بعد وادیٔ بالاکوٹ میں سکھ فوج سے مجاہدین کا معرکہ ہوا جس میں حضرت سیّد صاحب اور ان کے رفیق مولانا اسماعیل اور ان کے دوسرے بڑے بڑے ساتھی ۱۲۴۶ھ میں شہید ہوئے ان کی شہادت کے بعد جماعت کے دوسرے تمام لوگوں نے پہاڑوں میں پناہ لی، یہ حضرات اور ان کے ساتھی ہندوستان میں رہتے ہوئے حق پر ثابت قدم رہے اور

جان ومال کی قربانی دیتے رہے، ان میں کچھ حضرات شہید ہوئے کچھ جام شہادت نوش فرمانے کے منتظر رہے، لیکن ان کے پائے ثبات میں ذرا لغزش نہ ہوئی۔ ''مِنَ الْمُؤْمِنِينَ رِجَالٌ صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللَّهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُم مَّن قَضَى نَحْبَهُ وَمِنْهُم مَّن يَنتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوا تَبْدِيلاً'' (سورہ احزاب آیت ۲۳)

چوتھا دور (مدارس اسلامیہ کا دور)

اس جماعت کے پروردہ اور معتقدین کا دور ہے، جب انھوں نے دیکھا کہ انگریز ہندوستان پر غالب آچکے ہیں، حکومت مستحکم ہوچکی ہے، مسلمانوں پر انگریزوں کی فتح وکامرانی کا ہراس طاری ہے، جس تحریک کو انھوں نے ۱۸۵۷ء میں چلایا تھا، اس کی ناکامی کے بعد ان پر مایوسی چھائی ہوئی ہے اور اب اسلامی زندگی کی حفاظت، مسلمانوں کی دینی اخلاقی تربیت، مستقبل کے متعلق ان کے دلوں میں پھر سے اعتماد بحال کرنے، نیز یورپ کی تہذیبی وثقافتی فوجوں سے (جو مسلمانوں کے بچے کھچے سرمایہ اور دینی شعائر، تہذیب وثقافت کو ختم کردینا چاہتی تھیں) بچانے کی شدید ضرورت ہے تو ان سارے فتنوں کے سد باب کے لئے ان حضرات کے ذہن میں اس کے سوا کوئی اور شکل نہ آئی کہ وہ دینی مدرسے قائم کریں جو اسلام کے قلعے اور شریعت وعلوم دینیہ کے لئے پناہ گاہیں ثابت ہوں، چنانچہ انھوں نے دارالعلوم دیوبند، مدرسہ مظاہر العلوم اور دارالعلوم ندوۃ العلماء قائم کیا۔

پانچواں دور (تبلیغی جماعت اور دوسرے دعوتی کام)

انھیں حضرات کے حلقہ ارادت وارشاد اور رفقاء وتلامذہ اور ساتھیوں کا ہے ان میں سرفہرست حضرت مولانا محمد الیاس ابن محمد اسماعیل کاندھلویؒ (متوفی ۱۳۶۳ھ) ہیں، یہ دور مسلمانوں میں آزادی وبے راہ روی ایمانی وروحانی افلاس اور دینی بے حسی کا دور تھا اور انگریزی حکومت اور مغربی تہذیب نے ان پر جو اثر ڈالا تھا اور دنیاوی زندگی اور مادّہ پرستی میں انہماک ومشغولیت کا جو حال ہوچلا تھا اس کو مولانا نے شدّت سے محسوس کیا، دینی مدارس اور

حلقہ ہائے درس اس فساد وبگاڑ کے بحر بیکراں میں چھوٹے چھوٹے ناقابل ذکر جزیروں کی حیثیت رکھتے تھے جو میدان جنگ سے بالکل الگ تھے، یہ صورتحال دیکھ کر مولانا کو خیال ہوا کہ قوم کے مختلف طبقوں سے ملنا اور رابطہ قائم کرنا اور بلا کسی انتظار کے ان لوگوں کی طرف بڑھنا ضروری ہے اس لئے کہ وہ اپنے ذہنی مرض اور افلاس کو خود محسوس نہیں کر رہے ہیں چنانچہ انھوں نے ایمان واسلام کی بنیادی چیزوں کی دعوت کا کام شروع کر دیا۔

مولانا نے اپنی دعوت کا کام پوری قوت اور جوش عمل کے ساتھ شروع کیا، وہ اس دعوتی کام کے لئے گاؤں اور شہروں میں جماعتیں لے کر جاتے اور دعوت کو پھیلانے کی ترغیب دیتے، مولانا کا یہ کام ہندوستان کے اس خطّہ سے شروع ہوا جو سب سے زیادہ اجڈ، گمراہ اور اخلاقی اعتبار سے پست اور دین سے دور اور بیگانہ تھا، یہ علاقہ ہندوستان کے دار السلطنت دہلی کے جنوب میں میوات کا علاقہ تھا، مولانا نے یہاں کے لوگوں سے اپنے کام چھوڑ کر محدود وقت کے لئے وطن سے نکلنے کی دعوت دی، راہِ خدا میں نکلنے کی یہ مدّت کبھی ایک مہینہ کی ہوتی، کبھی اس سے زائد کی، مولانا نے یہ محسوس کیا کہ یہ لوگ جب تک اپنے بگڑے ہوئے ماحول اور گھریلو جھگڑوں سے باہر نہ نکلیں گے اس وقت تک نہ دین سیکھ سکیں گے، نہ ان میں اخلاقی تبدیلی آئے گی، اس خطہ کے سیکڑوں بلکہ ہزاروں آدمیوں نے مولانا کی دعوت پر لبّیک کہا اور کئی کئی مہینوں کے لئے نکلے اور ہندوستان کے مشرق ومغرب شمال وجنوب تک کی دور دراز مسافت طے کی، کبھی پیدل کبھی سواریوں پر نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے اخلاق بدل گئے، حالات زندگی کی اصلاح ہوئی ان کا دینی جذبہ بیدار ہوا اور دعوت کا کام بلا کسی مالی گرانباری اور چندہ ودفتری نظم ونسق کے ایسے سادہ طریقہ پر آگے بڑھا جو اسلام کے ابتدائی طرز دعوت وتبلیغ سے بہت ملتا جلتا تھا اور ان مخلص داعیوں اور مجاہدین اسلام کی یاد تازہ کر دیتا تھا جو اپنے سامان وضروریات سے لدے پھندے خدا کی راہ میں نکلتے تھے اور سارے اخراجات بذات خود برداشت کرتے تھے اور خالصۃً للہ مصائب ومشکلات کو جھیلتے تھے، اس تقریر کے بعد میں نے اس جماعت کے لوگوں کو اس طریقہ کار کو اپنانے اور نئے تجربہ کے لئے اٹھ کھڑے ہونے کی

دعوت دی، بعض شہروں اور مرکزوں میں میں نے خود بھی ساتھ چلنے کی خواہش ظاہر کی تا کہ اس کا تجربہ کیا جا سکے، استاد حسین یوسف نے اس پروگرام کا خیر مقدم کیا اور وعدہ کیا کہ اپنی بعض شاخوں سے اس دینی دعوت وحرکت کے لئے وقت طے کریں گے اور سفر میں نکلنے کا جو وقت طے ہوگا، ہمیں بھی اس کی اطلاع کریں گے، میرے بعد استاذ علی عدلی مرشدی نے جو سیّدہ زینب میں جماعت "انصار السنة المحمدية" کی شاخ کے صدر ہیں تقریر کی، میری تقریر پر تبصرہ کیا اور اس کے بعض اہم نقطوں کی طرف لوگوں کو متوجہ کیا۔

جمعہ ۲۴/۵/۱۳۷۰ھ مطابق ۲/۳/۱۹۵۱ء

فرانس کے ظلم و بربریت کی المناک خبر

آج کے اخبارات مسلمانوں کے لئے مراکش کی غم ناک و دل آزار خبریں لے کر منظر عام پر آئے، فرانس نے مراکش کی وطنی پارٹی کے خلاف سخت کاروائی کی، قصر شاہی کو گھیر لیا اور ہزاروں مراکشیوں کو طوق وسلاسل پہنا دیئے مراکش کے خون آشام واقعات ہی آج لوگوں کا موضوع گفتگو بنے ہوئے تھے۔

بنہا کا سفر

ہم لوگوں کا بنہا جانا طے ہو گیا وہاں کا سفر شیخ محمد الغزالی کی معیت میں ہوا، آج پہلی بار میں نے یہاں کا اسٹیشن دیکھا، دیار مصر میں یہ میرا ٹرین کا پہلا سفر تھا، مصر میں مجھے ٹرین کے سفر کا اشتیاق تھا، ہم لوگ اپنے ملک میں ٹرین کی سیٹوں اور اسٹیشنوں کی بھیڑ بھاڑ ہی کے ماحول میں پلے بڑھے ہیں، شاید میرے ٹرین کے سفر اس وقت سے شروع ہوئے جب میں طفل شیر خوار تھا، اسٹیشن پہونچا اور ٹرین پر سوار ہوا تو بچپن کی سی فرحت محسوس ہوئی۔

مصری دیہات کا نظارہ

ٹرین روانہ ہوئی اور ہم ان مصری دیہاتوں کا نظارہ کرنے لگے جن کے بارے

میں بہت کچھ سن رکھا تھا، مصری کسان ہل چلاتے ہوئے دکھائی دیئے ایک گھنٹے میں ہم لوگ بنہا پہنچے، وہاں شیخ محمد الغزالی، عبدالرّ وف صاحب، مخلص اخوانی جناب سید محمد احمد صاحب جو بنہا میں سروے ڈپارٹمنٹ میں ملازم ہیں، بنہا میں اخوان المسلمین کے سکریٹری جناب محمد عبدالحلیم عیسیٰ نے ہمارا استقبال کیا، ہم لوگ اپنے میزبان الحاج عبداللہ جو بنہا میں اخوان المسلمین کے صدر اور وہاں کے بزرگوں اور سربرآوردہ لوگوں میں ہیں، کے گھر گئے وہ اخوانیوں پر باپ کی طرح شفقت کرتے ہیں ہم ان سے ملے، کچھ دیر ان کے پاس بیٹھے، وہ ہمیں مصری لطائف سے خوش کرتے رہے، وہ اپنے جذبہ ایمانی، دینی محبت اور زندہ دلی کے سبب تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد خوش آمدید کے کلمات کہتے۔

مسجد میں میری تقریر

تھوڑی دیر بعد مسجد گئے جہاں جمعہ کی نماز پڑھی، محمد الغزالی صاحب نے خطبہ دیا، خطبہ کا موضوع تھا شخصیت کی طاقت وتاثیر جس کی طرف مومن کو توجّہ کرنی چاہئے، خطبہ میں دینی امور کے ساتھ نفسیاتی علوم پر بھی بحث ڈالی گئی تھی، نماز کے بعد میری تقریر کا اعلان ہوا میں اٹھا اور تقریر کی۔

عام انسانی زندگی اور ایمانی زندگی کا فرق

مسلمان دو پہلوؤں کے جامع ہیں عمومی انسانی زندگی جس میں دنیا کی دوسری قومیں بھی مسلمانوں کی شریک ہیں، خواہ وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم زندگی کے اس پہلو کی ضرورت وتقاضے یہ ہیں کہ لوگ کھائیں پئیں، تجارت کریں، کھیتی باڑی کریں، ملازمت کریں، اسی طرح کی اور باتیں جو انسانی اور شہری زندگی سے تعلق رکھتی ہیں۔

دوسرا پہلو مسلمانوں کے ایک خاص دعوت وپیغام کے حامل ہونے کا پہلو اور ایک خاص عقیدہ پر ان کا ایمان، یہی وہ چیز ہے جس میں مسلمان دوسری قوموں سے ممتاز ہیں

اور اسی میں ان کی قوت وطاقت اور خدا کے یہاں مقبولیت کا راز پنہاں ہے، انبیائے کرام اور خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم زندگی کے پہلے رُخ کی تشریح وتبلیغ اور اس کو نمایاں کرنے کے لئے نہیں، بلکہ دوسرے رُخ کی تشریح وتبلیغ اور اس کو نمایاں کرنے کے لئے تشریف لائے لہٰذا مسلمانوں کو اسی دوسرے پہلو کی زیادہ فکر، اور اہتمام ہونا چاہئے۔

اپنے اوپر مسلمانوں کی ستم ظریفی

خود اپنے آپ پر مسلمانوں کی یہ زیادتی تھی کہ انھوں نے دوسرے پہلو سے اپنا تعلق ختم کرلیا اور پہلے ہی رُخ سے لگ لپٹ گئے اسی کی نمائندگی کرتے رہے اسی میں غرق رہنے لگے، نتیجہ یہ ہوا کہ آج مسلمان لوگوں کی نگاہوں میں بھی گر گئے اور خدا کے نزدیک بھی ان کی قیمت گھٹ گئی، میں نے ان کے سامنے حکومت کے ملازمین کی مثال بیان کی اور کہا کہ ایک شخص بہت معمولی اور کم درجہ کا ہوتا ہے تنخواہ بھی کم پاتا ہے لیکن اس کا تعلق سرکار سے ہے وہ سرکاری وردی پہنتا ہے اور اس کا نشان بردار ہوتا ہے، اب اگر کوئی شخص اس کی توہین کرتا ہے یا اس پر دست درازی کرتا ہے تو حکومت اس سرکاری ملازم پر زیادتی کو اپنی توہین اور ہتک خیال کرتی ہے، یہ شرف جو حکومت کے ایک ادنیٰ ملازم کو حاصل ہے، بڑے سے بڑے مالدار تاجر کو نصیب نہیں، اگر اس پر زیادتی ہو تو باوجودیکہ وہ صاحب ثروت وحیثیت ہے، حکومت کو اس سے سخت ناگواری نہ ہوگی، عہد اوّل کے مسلمان یہی حیثیت رکھتے تھے، وہ حکومت الٰہی کی نمائندگی کرتے تھے، خدا کے دین سے تعلق رکھتے تھے اور اللہ والوں میں شمار ہوتے تھے جس کا اثر یہ تھا کہ زمین کے کسی خطہ میں بھی اگر کسی مسلمان کو رسوا کیا جاتا یا کوئی شخص مسلم قوم کے ساتھ ظلم وتوہین کا سلوک کرتا تو اللہ تعالیٰ ان مسلمانوں کی طرف سے اس سے سخت بدلہ لیتا، آج ہم ہیں کہ ہر ظلم وزیادتی اور ذلت ورسوائی کا نشانہ بنے ہوئے ہیں مراکش ہی کو دیکھئے اس پر بم برسائے جارہے ہیں، وہاں کے مسلمانوں کو رسوا کیا جارہا ہے فرانس کی استعماری طاقت ان کی عزّت وناموس کو پامال کررہی ہے لیکن کسی کے کان میں جوں تک نہیں رینگتی، نہ کوئی

جذبۂ انتقام ابھرتا ہے، اس رسوا کن صورتحال کو درست کرنے کے واسطے ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم زندگی کے اس دوسرے پہلو کی طرف لوٹیں، جو ہمارے لئے خاص ہے اور جو ہماری عزّت اور ہمارے شرف کا پاسباں ہے اور وہ ہے ایمان وعقیدہ، روحانیت و پیغام رسالت کا پہلو، اگر ہم ایسا کرتے ہیں تو اپنی عظمت وقوت اور عزّت وسربلندی دوبارہ حاصل کرلیں گے۔ نماز وتقریر کے بعد ہم لوگ اپنی قیام گاہ آگئے، شیخ محمد الغزالی سے ملنے کے لئے شبین الکوم کے کچھ مہمان آئے، میڈیکل ڈپارٹمنٹ میں ایکسرے کے ماہر جناب عبدالسمیع محروس صالح، شعبۂ زراعت کے انجینیر جناب علی زکی لطفی بھی تھے، دوپہر کے کھانے سے فارغ ہوئے تو بیٹھ کر باتیں کرنے لگے، اور ایک دوسرے سے تعارف ہونے لگا، احباب نے ہندوستانی مسلمانوں کے دینی، علمی اور معاشرتی حالات پوچھے اور میں نے سب احوال بیان کئے، یہ ذکر کرنا بھول گیا کہ میں نے مسجد میں شیخ محمد عبدالدائم کو دیکھا وہ ہمارے پرانے دوست ہیں، ان سے حج میں ملاقات ہوئی تھی، وہ حرم شریف میں مصلی مالکی پر ہر روز درس دیتے تھے وہ " الجمعية الشرعية " کے لوگوں میں سے ہیں، انھوں نے ایک مرتبہ مجھے مقام مالکی میں درس دینے کے لئے بلایا، حاضرین میں اکثر احباب " الجمعية الشرعية " سے تعلق رکھنے والے اور مصری تھے، میں نے ان کو اور ان کے ساتھیوں کو مکۂ مکرمہ میں اپنی قیام گاہ پر اور دینی دعوت کے موضوع پر بات کرنے کی دعوت دی، اس طرح تعلقات بڑھے اور ہم دونوں ایک دوسرے سے مل کر بہت خوش ہوئے، برادرم محمود اس وقت تک ہمارے ساتھ رہے جب تک ہم لوگ قاہرہ واپسی کے لئے ٹرین پر سوار نہیں ہوئے۔

سنیچر ۲۵/۵/۱۳۷۰ھ مطابق ۳/۳/۱۹۵۱ء

ازہر کے اخوانی طلباء میں تقریر

آج اپنی قیام گاہ ہی پر پڑھنے لکھنے میں مشغول رہا، بعد مغرب محمد دمرداشی آئے

اور اپنے ساتھ ہمیں اپنے گھر لے گئے جہاں اخوان سے ملنا اور ان ہی کے ساتھ رات گزارنا طے ہو چکا تھا، ہم لوگ پہنچے تو وہاں ازہر کے طلباء کی ایک چیدہ اور منتخب جماعت پہلے سے موجود تھی، ان میں سے اکثر کلیۃ اصول الدین کے طلبہ تھے۔

دینی امانت کی حفاظت

ہماری آج رات کی تقریر اس پیغام وذمہ داری کے متعلق تھی جس کو حضورؐ اور مسلمانوں کی پہلی نسل نے چھوڑا ہے اور جس کی ذمہ داری ایک دینی عالم پر عائد ہوتی ہے یہ دینی امانت پہلے زمانہ کے اسلامی عقیدہ اور شریعت اسلامی کی حفاظت کی مسلتزم ہے، ہمیں دیکھنا چاہئے کہ کیا آج ہمارے نوجوان علماء اور فکر اسلامی کے حامل اہل قلم اور اصحاب فکر اس ورثہ کی پوری حفاظت اور نگہداشت کر رہے ہیں، کیا وہ دین میں غلو کرنے والوں، اہلِ باطل کی فتنہ پردازیوں جاہلوں کی بے معنیٰ تاویلات کی نقاب کشائی کر رہے ہیں؟

انھیں ذمہ داریوں میں دینی ارکان وفرائض اور واجبات کی حفاظت بھی شامل ہے، ایک سچا عالم دین اور اس کی صورت وحقیقت، نظم وضبط دونوں ہی کا محافظ ہوتا ہے، اس میں وہ کسی آن ادنیٰ تغافل ولا پرواہی سے کام نہیں لیتا، عالم جس قدر خود ان ارکان کی پابندی کرے گا، ظاہر وباطن پر نظر رکھے گا، عوام بھی اسی قدر اس کا اہتمام کریں گے اور اگر وہ خود اس میں غفلت وتساہلی کرے گا تو عوام سے اس کے اہتمام کی کوئی توقع نہیں۔

ساتھ ہی دینی روح اور قلبی کیفیات مثلاً اخلاص، خدا کی ذات پر اعتماد وبھروسہ، دعا میں اس کے سامنے رونا گڑگڑانا، نماز میں خشوع وخضوع کی کیفیات یہ بھی اس دین اور وراثت نبوی کے اہم اجزاء میں سے ہیں جس میں مسلمانوں کی پہلی نسل اور صحابۂ کرام ممتاز تھے، دشمنوں پر ان کے کامیاب وفتحیاب ہونے کے اسباب میں سے ایک بڑا سبب یہ بھی ہے، ہرقل نے ایک شخص سے جو مسلمانوں کے ساتھ قید ہوا تھا کہا کہ مجھے ان لوگوں کے حالات بتاؤ، قیدی نے کہا میں آپ کے سامنے ان کا ایسا نقشہ کھینچوں گا کہ جیسے آپ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے

ہوں، وہ دن میں شہسوار اور رات میں عبادت گزار ہوتے ہیں، ذمیوں کے مال کو بے قیمت نہیں لیتے، کسی کے پاس آنا جانا ہوتا ہے تو سلام پہلے کرتے ہیں، اپنے حریف سے اس طرح جم کر لڑتے ہیں کہ بالادستی حاصل کر کے ہی دم لیتے ہیں، یہ باتیں سن کر ہرقل نے کہا: ''یہ حالات جو تم نے بیان کئے اگر یہ حقیقت ہیں تو ایک نہ ایک دن وہ ہمارے تخت وتاج پر قبضہ کرلیں گے ''۔ایک دوسرے قیدی نے ان کے حالات اس طرح بیان کئے ہیں، وہ رات کو عبادت گزار اور دن میں شہسوار ہوتے ہیں، اگر تم اپنے قریب بیٹھنے والوں سے بات کرو تو ان کے ذکر وتلاوت کے بلند ہونے والی آواز کی وجہ سے وہ تمہاری بات کو نہ سمجھ سکیں گے۔

علماء اور دین کے کارکنوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ سنّت پر عمل کریں، مردہ سنّتوں کو پھر سے زندہ کریں، ان کا رواج ڈالیں اور حدیث شریف کی رہنمائی حاصل کریں، ان کی جدوجہد، کدوکاوش، اس تحریک ودعوت کا مقصد اوّلیں، فرائض کا قیام، دین اور اس کے ارکان کی شیرازہ بندی ہونی چاہئے، اللہ تعالیٰ نے اسی کو ان کے اخلاص وقبولیت کا پیمانہ (پیرامیٹر) قرار دیا ہے، وہ فرماتا ہے:

''الذین إن مکناھم فی الارض اقاموا الصلوۃ وآتوا الزکوٰۃ وأمروا بالمعروف ونھوا عن المنکر وللّٰہ عاقبۃ الامور''

وہ لوگ کہ اگر ہم ان کو زمین وآسمان میں اقتدار دیدیں تو نماز قائم کریں گے زکوٰۃ دیں گے، بھلائی کا حکم دیں گے، برائی سے روکیں گے اور معاملات کا انجام تو خدا کے ہاتھوں میں ہے۔

یہ رات ہم نے پہلے سے طے شدہ وعدہ کے مطابق ان بھائیوں کے مہمان کی حیثیت سے ان ہی کے یہاں گزاری۔

اتوار ۲۶/۵/۱۳۷۰ھ مطابق ۴/۳/۱۹۵۱ء

جنرل صالح حرب باشا کی گفتگو

آج سید ابوالنصر حسینی بھوپالی ہم سے ملنے آئے، اس سے قبل ان کی قیام گاہ پر ہم

لوگ ان سے مل چکے تھے، مصر آنے سے پہلے وہ ہمارے گھر پر لکھنؤ میں کچھ دن رہے تھے، آج "الرسالة" میں ہمارا مضمون شائع ہوا، جس کا عنوان تھا، "اسمعی یا مصر" نیت یہ تھی کہ اس کو الگ رسالہ کی شکل میں شائع کریں گے، یہ اسلامی ملک مصر کے نام ہمارا اسلامِ محبت اور امید و اندیشے پر مشتمل پیغام تھا، ساڑھے نو بجے ہم لوگ "جمعیات الشبان المسلمین" کے مرکز گئے اور اس انجمن کے صدر عمومی جنرل محمد صالح حرب باشا سے ملے، انھوں نے بیان کیا کہ ہماری تقریر "العالم علی مفترق الطرق" کا علمی حلقوں میں بڑا چرچا ہے۔

انھوں نے ہم لوگوں سے جس انداز سے باتیں کیں وہ ان کے جوش ایمانی، سلامت فکر، دور اندیشی قومی وملی جذبات کی آئینہ دار تھیں، میں انھیں صرف ایک فوجی جنرل اور مصر کے سربرآوردہ طبقہ کا ایک فرد سمجھتا تھا، لیکن معلوم ہوا کہ ان کا مطالعہ بہت وسیع ہے، وہ بعض ایسے حقائق کو سمجھتے ہیں جس میں کبھی کبھی علماء کو زحمت پیش آتی ہے، ان کی تقریر بہت پر اثر ہوتی ہے۔

انھوں نے اسلامی ممالک سے رابطہ قائم کرنے اور اس سلسلہ میں اپنے اسلامی فرائض کی ادائیگی میں اپنی اور جمعیات الشبان المسلمین کی کوتاہی پر معذرت کی اور کہا کہ وادیٔ نیل کے اتحاد کا مسئلہ ہمارے لئے دردسر بن گیا ہے، انگریزوں نے ہم کو اس میں الجھا رکھا ہے

مصر اور مشرق وسطی کی اہمیت

پھر انھوں نے بڑی تفصیل کے ساتھ، مشرق وسطی کی سیاسی اور جنگی نقطۂ نظر سے اس کی اہمیت پر روشنی ڈالی اور اس کی زرعی وغذائی پیداوار کی کثرت اور اس کے کارآمد بنانے کے مواقع اور بڑی تعداد میں محنت کرنے والوں اور لیبر کلاس کی موجودگی نیز اسوان میں نکلنے والی کان کے نتیجہ میں لوہے کے مسئلہ میں مصر کے خودکفیل ہونے کا ذکر کیا جو دنیا کی عظیم ترین کانوں میں سے ہے، پھر انھوں نے مصر اور اسوان سے اس کے الگ ہو جانے کے بارے میں انگریزوں کے فکر واہتمام کو بتایا۔

انھوں نے کہا مشرق وسطی اور مصر سے انگریزوں کی دلچسپی کا سبب نہر سوئز نہیں ہے

جیسا کہ عام طور سے لوگ سمجھتے ہیں، بلکہ ان کی دلچسپی کے اصلی سبب دو ہیں، پہلا سبب اتحادیوں کی یہ خواہش ہے کہ اگر جنگ چھڑے تو مشرق وسطی کو روس پر حملہ کا فوجی مرکز بنادیا جائے تاکہ جنگی نقصانات اور تباہیوں سے یورپ بچا رہے، دوسرا سبب یہ ہے کہ جب وہ ہندوستان سے محروم ہوگئے، انھیں مشرق سے ہاتھ دھونا پڑا اوران کا غاصبانہ قبضہ ختم ہوا تو انھوں نے چاہا کہ اس نقصان کی تلافی افریقہ میں شہنشاہیت حاصل کرکے کی جائے سوڈان اوراس کے آس پاس کا علاقہ اس کے لئے سب سے بہتر مرکز تھا، اس لئے کہ کانوں کی کثرت مویشیوں کی فراوانی اورلڑنے والے سپاہیوں کی بہتات میں وہ بہت فائق اور کارآمد ہے، ان میں ابھی تک فطری سادگی اور بھولا پن موجود ہے، لہٰذا یہاں کی آبادکاری ناجائز فائدہ اٹھانے کے سلسلہ میں وہ عرصہ تک کے لئے مامون ہوں گے، علاوہ ازیں یہ علاقہ عیسائیت اور مغربی تہذیب کی نشرواشاعت کے لئے بھی سازگار ہے اور جب مصر سوڈان سے متحد ہوجائے گا تو افریقی شہنشاہیت کے سینے کی طرف تنے ہوئے نیزے کی حیثیت رکھے گا۔

معنوی طاقت کی اہمیت

پھر انھوں نے مسلمانوں کی معنوی قوت وطاقت کے متعلق گفتگو کی اور جنرل کاظم قرہ جی کی ایک تقریر کا حوالہ دیتے ہوئے (جو ترکی کے مانے ہوئے جنرلوں میں سے ہیں) ہمیں بتایا کہ جب میں استنبول کے فوجی ٹریننگ کالج میں پڑھتا تھا، اس وقت جنرل کاظم قرہ جی نے اپنی تقریر میں کہا تھا کہ جنگ کے وقت ترکی کو اندرونی اور بیرونی دونوں طرح کی ایسی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا جس کو بڑی سے بڑی حکومت بھی برداشت نہ کرسکتی تھی، اور نہ اپنے وجود ہی کو باقی رکھ سکتی تھی، اس وقت تمام یورپین حکومتیں ترکی سے نبرد آزما تھیں۔

لیکن اس کے باوجود ترکی نے ان تمام طاقتوں کا مقابلہ کیا اور اپنی عزت وبقا کی حفاظت کی، ترکی کی اس کامیابی کا سہرا اس فوج کے سر ہے جو نہ تو بہت زیادہ طاقتور تھی اور نہ اچھی تربیت یافتہ اور مسلح ہی تھی لیکن وہ روحانی اور معنوی اعتبار سے ممتاز تھی، کاظم قرہ جی نے کہا، جو شخص اس روح کو ختم کرنا چاہے اور معنوی طاقت کو مٹانا چاہے وہ ترکی کا دشمن ہے اسی

طرح اور بہت سی باتیں کیں۔

جنرل صالح حرب کی نظر میں قوم کا سب سے بڑا روگ

جنرل صالح حرب نے کہا کہ مصری قوم اور ہم مسلمانوں کا سب سے بڑا مرض جس نے ہم کو ہمت و جوانمردی سے محروم اور تعمیر و ترقی سے روک رکھا ہے وہ عیش و تنعم ہے جس میں ہم اس وقت مبتلا ہیں، مجھے توقع ہے کہ آپ اس موضوع کو ذہن میں رکھیں گے اور اس پر مضامین لکھیں گے۔

انھوں نے جمعیۃ الشبان المسلمین کی ہر ممکن خدمت و تعاون کی پیش کش کی ہم نے ان سے کہا کہ آپ اس موضوع پر گفتگو کرنے کے لئے زیادہ موقع دیں اور اس کے لئے وقت معیّن کر دیں، انھوں نے بدھ کے روز ساڑھے نو بجے کا وقت مقرر کر دیا اور ہم سے وعدہ کیا کہ وہ اس کا ایک خاکہ تیار کر لیں گے ہم اسی کے مطابق گفتگو کریں گے، ہم لوگ عصر کے وقت بھائی عبدالخالق پاکستانی کے یہاں گئے، انھوں نے اپنے کچھ ساتھیوں اور کلیۃ اصول الدّین وغیرہ کے طلبہ کو بلا رکھا تھا، ان میں سے ایک صاحب نے ہمارا مضمون ''اسمعی یا مصر'' پڑھ کر سنایا پھر میں نے مصر کے دیہاتوں میں دعوت کے طریقۂ کار از ہر کے طلباء اس میں کیا حصّہ لے سکتے ہیں، دعوت کے کام میں ان کے لگنے کا مستقبل پر کیا اثر پڑے گا کے موضوع پر گفتگو کی، مولانا عبید اللہ صاحب نے بھی بات کی، چنانچہ کچھ لوگ آئندہ جمعہ کو بعض دیہاتوں میں جانے کے لئے تیار ہو گئے۔

''ہندوستان میں علم حدیث'' کے موضوع پر محاضرہ

آج رات (الرابطة الاسلامية) میں ہندوستان میں علم حدیث کے موضوع پر میری تقریر تھی، حاضرین کی تعداد تو زیادہ نہ تھی، لیکن اس جلسہ میں بعض اہلِ علم اور از ہر کے علماء شریک تھے، مثلاً شیخ احمد الشرباصی، شیخ محمود حسن ربیع، شیخ عبدالمنعم النمر، فلسطین کی المجلس

الاسلامی الاعلیٰ کے دینی امور کے نگران عام اور فلسطین کی مرکزی جمعیۃ العلماء کے دفتر کے ناظم شیخ محمد صبری عابدین وغیرہ صدر جلسہ استاذ محمد شاہین حمزہ نے میرا تعارف کرایا اور میں نے تقریر شروع کی۔

درس حدیث کے ادوار کبار محدثین اور ان کے یادگار کارناموں پر روشنی ڈالتے ہوئے میں نے بتایا کہ ہندوستان میں سب سے پہلے کون علم حدیث لے کر آیا اور اس کو یہاں پھیلایا، اس سعادت میں مصر کی شرکت اور دسویں صدی ہجری میں اس کے بعض علماء کی ہند میں آمد کو میں نے سراہا، اور علمائے گجرات کا ذکر کیا، جیسے شیخ محمد طاہر پٹنی، ان کی عظیم الشان کتاب ''مجمع بحار الانوار'' شیخ عبدالحق بخاری دہلوی اور ہندوستان میں علم حدیث کی نشر واشاعت کے سلسلے میں ان کی جدوجہد پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کے بیٹوں اور پوتوں کا ذکر کیا، بارہویں صدی ہجری میں ہندوستان میں علم حدیث کے علمبردار حکیم الاسلام شاہ ولی اللہ صاحب کا ذکر کیا جنھوں نے اپنے بیٹوں، شاگردوں اور خلفاء کے ذریعہ علم حدیث کی خدمت کی اور اس ملک میں اشاعت کی، درس وتدریس اور تصنیف وتالیف کے ذریعہ اس مبارک علم کو عام کیا پھر میں نے شاہ صاحب کے اس تفوق اور امتیاز کا ذکر کیا جو ان کو فہم حدیث اور اس کی شرح کے سلسلہ میں نیز فقہ وحدیث کے درمیان تطبیق دینے اور صحیح وثابت حدیث کو فقہی مذہب پر ترجیح دینے میں حاصل ہے، خواہ وہ کسی بھی امام کا مذہب ہو انھوں نے متشدد فقہاء اور منکرین فقہ کے درمیان میانہ روی اور اسباب اختلاف کو بَیان کرنے میں فہم صائب کا ثبوت دیا اور دین کے اسرار ورموز اور شریعت اسلامی کے اصول کو واضح اور نمایاں کرنے میں ایک مثال قائم کردی، اس کے بعد میں نے علم حدیث کے سرخیل وسربراہ اور اس فن کے منتہا شاہ محمد اسحاق اور ان کے نامور شاگردوں کا ذکر کیا جیسے شاہ عبدالغنی مہاجر مدینہ منوّرہ پھر ان کے شاگرد اور شاگردوں کے شاگرد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی سے لے کر مولانا محمود حسن دیوبندی اور مولانا خلیل احمد سہارنپوری پھر ان دونوں حضرات کے شاگردوں مثلاً مولانا انور شاہ کشمیریؒ اور مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اور مولانا حسین احمد مدنی، شیخ الحدیث مولانا

زکریا صاحب کاندھلوی تک اور شاہ عبدالغنی کے دوسرے شاگرد بخاری شریف کے محشی مولانا احمد علی اور علم حدیث میں ان کی خدمات کا ذکر کیا، قاری عبدالرحمٰن پانی پتی، مولانا عالم علی مرادآبادی اور ان کے شاگرد مولانا حسن شاہ رام پوری، پھر مشہور استاذ حدیث مولانا سید نذیر حسین دہلوی اور ان کے حلقۂ درس کی وسعت اور عرصۂ دراز تک خدمت حدیث سے شغف اور طلبہ کو اس فن پر تیار کرتے رہنے کا ذکر کیا، جس میں ''غایۃ المقصود'' کے مصنّف مولانا شمس الحق ڈیانوی اور مولانا عبدالمنان نابینا وزیرآبادی، حافظ عبداللہ غازی پوری، مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری شامل ہیں، میں نے یمنی سلسلہ کو بھی بیان کیا جس کو شیخ حسین بن محسن الانصاری یمانی ہندوستان لائے نواب سیّد صدیق حسن خان اور ان کی خدمات پر روشنی ڈالی پھر آخر میں ہندوستان میں درس حدیث کی خصوصیات اور اس فن کے علماء کی امتیازی شان اس فن سے اشتغال اور حدیث کی اصل روح سے مناسبت اور نبوی طریقہ سے لگاؤ سنت پر عمل اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی پر کوشاں رہنے کا نقشہ کھینچا، اور ہندوستان کے بڑے مدارس میں علم حدیث پڑھانے کی تصویر پیش کی۔

میری اس تقریر میں تاریخی معلومات اور طبقات رجال کے سلسلہ میں استفادہ اور اقتباس کی بنیاد والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب'' الثقافة الاسلامية فی الهند ''تھی، اگر یہ وقیع کتاب جو ایک وسیع کتب خانہ کی حیثیت رکھتی ہے، نہ ہوتی تو میں اس موضوع پر معلومات سے بھرپور تقریر نہ کرسکتا، اللہ ان کو جزائے خیر دے اور ان کے مراتب کو بلند فرمائے۔

فن حدیث میں ہندوستان کی خدمات کی تعریف

اس کے بعد شیخ محمد صبری عابدین نے میری تقریر پر تبصرہ کیا اور فن حدیث میں ہندوستان کی خدمات کو سراہا اور اس فن میں ہندوستان میں جو عدیم المثال کتابیں شائع ہوئی ہیں ان کا تذکرہ کیا، مثلاً بیہقی کی السنن الکبریٰ اور ابوداؤد طیالسی کی مسند اور اس کے علاوہ دائرۃ المعارف حیدرآباد کی مطبوعات، ہندوستانی مسلمانوں کی اسلامی غیرت کی طرف توجہ دلاتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ دینی دعوت کی نشر و اشاعت کے لئے خود مرکز اسلام حجاز میں

ہندوستانی مسلمانوں کی ایک جماعت قیام پذیر ہے، ان کے بعد استاذ عبدالمنعم اسٹیج پر آئے اور انھوں نے ان خدمات و دینی کارناموں کا اعتراف کیا اور ہندوپاک کے بعض بڑے لوگوں کے اقوال اور خدمت اسلام کے سلسلہ میں ان کے شاندار کردار کا ذکر کرتے ہوئے اس کی پوری تائید کی، آخر میں صدر جلسہ اٹھے اور مقرر کے شکریہ میں ایک بلیغ تقریر کی۔

دوشنبہ ۲۷/۵/۱۳۷۰ھ، ۵/۳/۱۹۵۱ء

فرانسیسی ظلم واستبداد کے خلاف جمعیۃ الشبان المسلمین کے جلسہ میں شرکت

شام کو پانچ بجے ہم لوگ شارع مسیر و میں واقع دارالمعارف گئے اور شیخ محمد احمد شاکر سے ملے، اور دارالمعارف سے نکلنے والے رسالہ ''الکتاب'' کے چیف ایڈیٹر جناب عادل الغضبان کے پاس تھوڑی دیر بیٹھے اور دارالمعارف کے ڈائرکٹر متری سے ملے اور پریس کے شعبوں کا معائنہ کیا اور اس کی قوت کار کو دیکھا، طباعت، حروف مرتب کرنے اور جلد سازی وغیرہ کی مشینوں کو دیکھا جو جدید ترین قسم کی مشینیں ہیں، صاحب مطبع نے مصری رسالہ ''الغفران'' کا ایک نسخہ ہم کو ہدیہ کیا جس کی تخریج، تصحیح اور تحقیق ڈاکٹر بنت الشاطی نے کی ہے، ایک نسخہ صوفی عبداللہ کی کتاب ''النساء الحاربات'' اور رسالہ ''الکتاب'' کا آخری شمارہ بھی عنایت فرمایا، دارالمعارف سے شیخ احمد محمد شاکر کے ساتھ ہم لوگ جمعیۃ الشبان المسلمین کی طرف روانہ ہوگئے، آج مراکش میں فرانس کے ظلم وستم کے خلاف احتجاجی جلسہ تھا، تمام دینی پارٹیاں اور انجمنیں اس جلسہ میں مدعو تھیں اور نمائندگی کر رہی تھیں، پہلے ہم لوگ صدر کے کمرہ میں داخل ہوئے وہاں قاہرہ کے بڑے بڑے علماء مشہور لیڈران اور انجمنوں کے صدر حضرات موجود تھے جس میں مصر کے سابق مفتی اعظم حسنین محمد مخلوف، شیخ عبداللطیف دراز اور نیشنل پارٹی کے سکریٹری استاد فتحی رضوان، سوشلسٹ پارٹی کے لیڈر استاد احمد حسین اور استاد محمود محمد شاکر قابل ذکر ہیں، ان کے علاوہ اور بہت سے دوسرے لوگ مدعو تھے کچھ تجاویز ونکات لکھ لئے گئے اور جلسۂ عام کے لئے تیار کر دیئے گئے، اس مخصوص جلسہ میں مجھے ایسے مناظر نظر آئے

جس سے دل دکھا، کچھ لوگ آجا رہے تھے کچھ ایک دوسرے سے دوستوں کی طرح باتیں کر رہے تھے اور لپک لپک کر مل رہے تھے حالانکہ اس جلسہ کا مقصد مراکش کی مصیبت میں شرکت اور گہرے رنج وغم کے اظہار اور سامراجی ظلم کے خلاف غیظ وغضب کا مظاہرہ کرنا تھا، جو رنج وغم، درد والم اور سنجیدگی کے مظاہرہ کا متقاضی تھا، جلسہ کے اس منظر کو دیکھنے والا ہر شخص یہی سمجھتا کہ خوشی ومسرّت اور مبارکباد واستقبال کی مجلس شادمانی قائم ہے، بس ایک جنرل محمد صالح حرب باشا تمام حاضرین سے زیادہ رنجیدہ خاطر اور پریشان تھے۔

ہم شیخ حسنین مخلوف کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے جلسۂ عام کی طرف نکلے، ایک بہترین قاری کی زبان سے قرآن کریم کی تلاوت کے ساتھ جلسہ کا آغاز ہوا، اس جلسہ کی مناسبت سے قاری نے آیات کا بہت اچھا انتخاب کیا تھا وہ سورہ حج کی یہ آیات تھیں: ''إن اللّٰہ یدافع عن الذین آمنوا إن اللّٰہ لا یحب کل خوان کفور أذن للذین یقاتلون بأنھم ظلموا وأن اللّٰہ علی نصرھم لقدی'' (الحج آیت ۳۸، ۳۹) اور اس سے آگے کی آیتیں، تلاوت سے جلسہ پر خاموشی وخشوع قلب کی فضا چھا گئی اس کے بعد کرنل محمود لبیب بڑھے، اور حاضرین سے یہ توقع ظاہر کی کہ وہ اخوان کا نعرہ اللہ اکبر وللّٰہ الحمد نہ لگائیں گے کیوں کہ یہ جلسہ صرف اخوان کا نہیں بلکہ تمام اسلامی پارٹیوں کی نمائندگی کر رہا ہے، لہٰذا میں یہ نہیں چاہتا کہ فرانس کو یہ کہنے کا موقع ملے کہ یہ جلسہ صرف اخوان المسلمین کا جلسہ تھا پھر آواز بلند ہوئی ''اللہ اکبر وللّٰہ الحمد'' اور ایک اضطراب پھیل گیا، جنرل محمد صالح حرب اٹھے اور انھوں نے ایک پُر جوش تقریر کی، دو دو تأثر سے ان کے اعصاب بے قابو ہو رہے تھے، جلسہ کے احترام اور نظم کو باقی رکھنے میں اخوان کی تعریف کی اور فرمایا میں خود اس نعرہ کو پسند کرتا ہوں، لیکن اس وقت کی مصلحت کا یہ تقاضہ ہے کہ اس جلسہ پر صرف اخوان کا لیبل نہ ہو، اس کے بعد اشتراکی پارٹی کے صدر استاذ احمد حسین آگے بڑھے اور تقریر کی پھر استاذ سید قطب آئے اور اس جلسہ کی مناسبت سے ایک مقالہ پڑھا، جس میں فرانس کی تائید وحمایت کرنے والوں کو مخاطب کیا گیا تھا، بڑی ادبی تقریر تھی اس میں ایسے

لوگوں مندوں کو بے نقاب کیا گیا تھا جو صبح وشام فرانس کی مدح سرائی میں رطب اللسان رہتے ہیں اور اس کے بارے میں تقدس وعظمت اور بے گناہی کا تصوّر رکھتے ہیں اور ہمہ وقت اس کی محبت ودوستی کا کلمہ پڑھتے رہتے ہیں پھر انھوں نے ان درسی کتابوں کو نصاب تعلیم سے نکالنے کی تجویز پیش کی جن میں انقلاب فرانس اور آزادیٔ فکر ومساوات کے سلسلہ میں جو اثرات پڑے ہیں ان کا تذکرہ ہو، اور ان کے بجائے ایسی کتابوں کے رکھنے کی تجویز پیش کی جس میں فرانسیسی استعمار اور اس کی ریشہ دوانیوں کی تاریخ ہو دوران تقریر میں پُر جوش نعرے لگتے اور زوردار تالیاں بجتی تھیں جس سے خطیب کی آواز درمیان درمیان میں دَب جاتی تھی تھوڑے وقفہ سے حاضرین یہ نعرہ لگاتے (بے حیا ظالم فرانس مردہ باد) استاذ فتحی رضوان نے تقریر کی وہ بڑے وکلاء اور ماہر مقرّرین میں سے ہیں، اس کے بعد شیخ محمد الغزالی بلائے گئے، جب وہ اسٹیج پر آئے تو اخوان کے نعروں سے ہال گونج اٹھا، شیخ محمد الغزالی نے تقریر کی، اخوان کو نعرہ لگانے سے روکا اور فرمایا کہ ہم لوگ اس وقت جمعیۃ الشبان المسلمین میں ہیں اور حدیث شریف میں آیا ہے کہ کسی دوسرے کے گھر اور اس کے حلقۂ اثر میں امامت نہ کرنی چاہئے، یہ الفاظ سن کر اخوان خاموش ہوگئے، شیخ کی ذہانت وموقعہ شناسی اور اخوان کا جذبۂ اطاعت مجھے بہت پسند آیا، جنرل محمد صالح حرب کئی بار اٹھے اور پر جوش تقریر کی جس کا بڑا اثر ہوا انھوں نے مشرقی اور اسلامی قوموں کی خامیوں اور عیوب پر روشنی ڈالی اور اس کے عیش وعشرت اور تنعّم وفارغ البالی پر اظہار افسوس کیا جو ان قوموں کو مشکلات وپریشانیوں کے جھیلنے، اپنے آپ کو خطرات میں ڈالنے اور اپنی عزت وآزادی کی حفاظت کرنے سے روکتی ہے، انھوں نے ترکی قوم کی فوجی اسپرٹ، بہادری وجوانمردی کو بطور مثال بیان کیا، اس کے بعد استاذ محمود محمد شاکر نے تجاویز پڑھ کر سنائیں، جب انھوں نے ''الاقوام متحدۃ'' کا نام لیا تو لوگ جوش میں آگئے اور ناپسندیدگی کا اظہار کیا یہ دیکھ کر جنرل محمد صالح اٹھے اور اس لفظ کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ مراکش کا مسئلہ صرف مراکشیوں کا نہیں ہے بلکہ یہ تمام عرب اور اسلامی قوموں کا مسئلہ ہے

یہ سن کر لوگ خاموش ہو گئے، ایک تجویز یہ بھی تھی کہ فرانس اور شہنشاہیت پسند حکومتوں کی فوج میں ملازمت کے سلسلہ میں بڑے بڑے علماء سے حرمت کا فتویٰ لیا جائے، اس تجویز پر لوگوں نے خوشی واطمینان کا اظہار کیا کہ یہ تجویز ایک ایسے دشمن کے لئے ہے جو مادہ ہی پر اعتماد کرتا ہے اور صرف سیاسی مصلحت، خطرہ اور ناکامی کو اہمیت دیتا ہے، اس قومی جلسہ نے جس کو عرب ممالک میں ہم نے پہلی بار دیکھا، ان اسلامی جلسوں کی یاد تازہ کردی جو ہندوستان میں تحریک آزادی اور تحریک خلافت کے شباب کے زمانہ میں ہوا کرتے تھے، جلسہ نے میرے اعصاب اور احساسات میں ایک حرکت پیدا کردی اس لئے کہ جب میں یورپین استعمار اور اسلامی قوموں پر اس کے ظلم وزیادتی کی کوئی خبر سنتا ہوں تو یورپین قوموں کے خلاف میرے جذبات بہت بڑھ جاتے ہیں اس کا سبب یہ ہے کہ میری نشوونما ہندوستان کی تحریک آزادی اور دینی جوش وخروش کے عہد شباب میں ہوئی۔

۲۸/۵/۱۳۷۰ھ، ۶/۳/۱۹۵۱ء بروز منگل

آج پورے دن میں ایک مضمون کے لکھنے میں مشغول رہا، میں چاہتا تھا کہ یہ مضمون اخوان کے سامنے پیش کردوں اور اپنے خیال ورائے کا اظہار کروں، میں اپنی امید وآرزو اور درد والم کو ان کے سامنے رکھوں اور میں ان چیزوں کی طرف متوجہ کروں جن کو میں بہت ضروری سمجھتا ہوں، جن کی طرف ان کو پوری توجہ اور اہتمام کرنا چاہئے، اس مقالہ نے مجھ کو اور میرے فکر کو مشغول رکھا، اس جگہ سے نکلنے اور دوسرے کام میں لگنے کا موقع نہیں ملا، محمد رشاد عبدالمطلب تھوڑی دیر ہمارے پاس بیٹھے اور شام کو ہم لوگوں کو اپنے گھر بلایا ہم نے حاضر ہونے کا وعدہ کرلیا اور ان سے پتہ لے لیا، رات میں بھی لکھنے اور سوچنے میں مشغول رہا۔

چہارشنبہ ۲۹/۵/۱۳۷۰ھ مطابق ۷/۳/۱۹۵۱ء

جنرل محمد صالح حرب سے گفتگو

آج صبح ساڑھے نو بجے ہم لوگ اتوار کے طے شدہ پروگرام کے مطابق جنرل محمد

صالح حرب کے پاس گئے اور مصر کی علمی و دینی شخصیتوں کے بارے میں ایک گھنٹہ تک ان سے گفتگو کرتے رہے۔ وہ مصری علماء کی دنیاداری اور ان میں علم اور خدمت دین کی لگن، اللہ اور اس کے دین کی خاطر غصہ و بیزاری کا جذبہ نہ ہونے پر تنقید کرتے رہے، میں نے تقسیم کے بعد ہندوستانی مسلمان جس انتشار و مایوسی دین و اخلاق میں جس ضعف و تنزل کی مصیبت میں پڑے ہیں اس کا ذکر کیا پھر دین کے داعیوں نے جو خدمت انجام دی اور صحیح اسلامی دعوت کے لئے یکسو ہو کر جس لگن کے ساتھ کام کیا اور ان پیش آنے والے حالات کا جس طرح مقابلہ کیا اور مسلمانوں میں امید و اعتماد کے بحال کرنے اور قوم کے ہر طبقہ سے رابطہ قائم کرنے کی جو جدوجہد کی، پھر اس کے نتیجہ میں مسلمانوں کے دلوں اور اخلاق پر جو خوشگوار اثر پڑا اس کو اچھی طرح بیان کیا، صالح حرب صاحب کو میری یہ گفتگو بہت پسند آئی اور انھوں نے تمنا ظاہر کی کہ کاش یہی نشاط علمائے مصر اور ازہر کے لوگوں میں ہوتا میں نے ان سے کہا کہ میری خواہش ہے کہ آپ ازہر کے بڑے علماء اور ان لوگوں کو جن کا اثر و رسوخ ہے یا جن میں آپ فکر و نشاط محسوس کرتے ہیں جمع کریں تو اس زمانہ میں دین و علم کو جو خطرات درپیش ہیں ان سے بیان کروں، ان مشکلات کا میرے نزدیک جو حل ہے وہ ان کے سامنے پیش کروں نیز ان خطرات کے دور کرنے اور نئی دینی تحریک کو چلانے کا طریقہ بیان کروں، انھوں نے اس طریق فکر سے اتفاق رائے ظاہر کیا اور اس کو سراہا، وہ شیخ حسنین محمد مخلوف سے ملے انھوں نے شام کو آنے کا وعدہ کیا، ان کی مجلس میں رسالہ ''الشبان المسلمین'' کے اڈیٹر اور (جمعیۃ) کے ناظم ڈاکٹر یحییٰ احمد دردیری سے ہمارا تعارف ہوا، انھوں نے اپنی تصنیفات سے کچھ کتابیں ہم کو ہدیہ کیں، ظہر کے وقت محترم شیخ صبری عابدین ہمارے پاس آئے اور ہمارے سادہ و معمولی کھانے میں شرکت فرما کر عزت بخشی، انھوں نے ہم سے ایسے قصے بیان کئے جن سے ازہر قدیم کی تصویر سامنے آگئی اور اس وقت کے زہد و قناعت، پاکبازی و خودداری خواہشات پرستی سے دوری، کمال و وقار کا نقشہ نگاہوں میں پھر گیا۔

دارالشبان المسلمین میں

مغرب بعد ہم لوگ جمعیۃ الشبان المسلمین کے دفتر حاضر ہوئے، جنرل محمد صالح حرب کے پاس شیخ عبداللطیف دراز اور استاذ محمود محمد شاکر اور کچھ دوسرے لوگ موجود تھے، کچھ دیر بعد اشتراکی پارٹی کے صدر استاذ احمد حسین اور شیخ محمد مخلوف، شیخ احمد الشرباصی آئے اور ان تجاویز کو نافذ کرنے کے لئے کمیٹیاں بنانے میں مصروف ہو گئے جن کو کل کے جلسہ نے پاس کیا تھا پھر جنرل محمد صالح حرب میری طرف متوجہ ہوئے اور ہم دونوں الگ بیٹھ گئے، ان محترم نے مجھے بتایا کہ انھوں نے مدعوین کی ایک فہرست تیار کر لی ہے اس میں از ہر کے بڑے بڑے علماء شامل ہیں، ان لوگوں کو جمعیۃ کے مرکز میں میرے اعزاز میں دوشنبہ کو چائے پینے کی دعوت دی گئی میں نے اس عزّت افزائی پر ان کا شکریہ ادا کیا۔

استاذ محمود محمد شاکر کے ساتھ

استاذ محمود محمد شاکر (۱) کے مطالعہ و تحقیق کے متعلق مجھے جو معلومات تھیں ان کی بنیاد پر میں چاہتا تھا کہ ان سے ملاقات ہو، میری یہ بھی خواہش تھی کہ میں ان سے ملوں اور اپنی کتاب ''ماذا خسر العالم'' کا ایک نسخہ ان کو ہدیہ کروں، خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ بغیر کسی پروگرام کے دارالجمعیۃ میں ان سے ملاقات ہو گئی، وہ بڑی کشادہ دلی سے ملے اور مجھ سے مانوس ہوئے، انھوں نے بتایا کہ وہ میری کتاب ''ماذا خسر العالم'' پڑھ چکے ہیں اور خصوصیت سے باب ''العصر الجاهلی'' کو انھوں نے سب سے زیادہ پسند کیا ہے اور فرمایا کہ اس موضوع پر میں ایک مستقل کتاب لکھوں جب ان کو یہ معلوم ہوا کہ ہمارا ترکی کے سفر کا ارادہ ہے تو مصری سفارت خانہ کے مشیر استاذ یحییٰ حقی سے ملنے کی دعوت دی جو ان کے اس وقت مہمان تھے، انھوں نے کہا کہ ہم ان سے ملاقات کا کوئی وقت مقرر کر لیں

---

(۱) استاذ محمود محمد شاکر ممتاز عالم مؤرخ و ادیب کی حیثیت سے دنیائے اسلام میں معروف ہوئے، ان کا بڑا کارنامہ تاریخی اسلامی بیس (۲۰) سے زائد جلدوں پر مشتمل انسائیکلوپیڈیا ہے

گے اور آپ کو فون سے اطلاع کر دیں گے، جناب محمود محمد شاکر میں پختہ دینی رنگ وسعت علم اور ذہانت دیکھ کر مجھے ان کی ملاقات سے خوشی ہوئی۔

شیخ محمد حسنین مخلوف

اسی طرح شیخ حسنین محمد مخلوف سے بھی اچانک ملاقات ہوئی، ہم لوگوں نے جمعہ کے دن حلوان میں ان سے ملنے اور انھیں کے ساتھ کھانا کھانے کا پروگرام طے کر لیا تھا، لیکن چونکہ جمعہ کے دن کئی وعدوں کی وجہ سے مشغولیت تھی، اس لئے اس پروگرام میں تبدیلی ہوگئی اور میں نے ان سے معذرت کر دی مگر ان سے ملنے کا اشتیاق ظاہر کیا، دراصل وہ ہیں بھی ان لوگوں میں جو مجھے پسند آئے اور جن میں میں نے علم وصلاح، سنجیدگی، اخلاقی پختگی، اور خوش خلقی دیکھی، اس طرح میں نے استاذ حسنین سے عرض کیا کہ ملاقات کا کوئی وقت مقرر فرمادیں مگر چونکہ قریبی تمام دنوں کے اوقات گھرے ہوئے تھے، پروگرام طے تھے، اس لئے کوئی وقت ہم لوگ طے نہ کر سکے، عنقریب ان سے مل کر کوئی وقت انشاء اللہ طے کر لوں گا۔

جب اپنی قیام گاہ واپس آئے تو استاذ عبدالوہاب البنا اور استاذ علی عدلی المرشدی کو منتظر پایا، دونوں حضرات تھوڑی دیر بیٹھے، ہم لوگوں نے دعوت اس کی حکمت عملی اور طریقہ کار کے موضوع پر گفتگو کی، ان دونوں حضرات نے جمعہ کے دن صبح کے ناشتہ پر آنے کا وعدہ کیا۔

۳۰/۵/۱۳۷۰ھ، ۸/۳/۱۹۵۱ء جمعرات

آج پورے دن میں اس مقالہ کی تیاری میں لگا رہا جو اخوانی حضرات کے سامنے پڑھنا تھا، میں سوچتا تیز اور لکھتا سست ہوں، لہٰذا بڑا وقت لگ گیا اور مقالہ ابھی تک مکمل نہیں ہوا۔

شام کو پانچ بجے اپنے دوست محمد رشاد عبدالمطلب کے گھر گئے، اور مغرب بعد تک ان کے پاس رہے، ان کے کتب خانہ میں سیرۃ ابن ہشام اور تاریخ طبری دیکھی اور ان دونوں کتابوں سے وہ بعض اقتباسات لئے جن کی مجھے اس مقالہ میں ضرورت تھی، جو میں تیار کر رہا تھا۔

جمعہ یکم جمادی الثانی ۱۳۷۰ھ مطابق ۹/۳/۱۹۵۱ء

جمعہ ہم لوگوں نے مسجد مؤید میں پڑھا، ہماری جائے قیام سے یہی قریب کی مسجد تھی، ہم چاہتے تھے کہ ایسی مسجد میں جمعہ پڑھیں جو پرسکون اور شور غل سے خالی ہو، اس مسجد میں ہمیں سورہ کہف کو بآواز بلند اور لحن کے ساتھ پڑھنے کے سوا کوئی اور ناپسندیدہ چیز نہیں نظر آئی (الاخوان الشرعیون) کی مسجدوں کے علاوہ یہ مصر کا ایک طریقہ اور رواج چلا آرہا ہے، مؤذن امام سے کچھ فاصلہ پر لکڑی کی ایک چھوٹی سی چوکی پر بیٹھا ہوا، دونوں خطبوں کے درمیان کوئی وظیفہ پڑھتا، مگر اس کا پڑھنا سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا پڑھتا ہے۔

''جمعیۃ مکارم اخلاق'' میں

ہم لوگ الحاج جلال حسین کے جلسہ میں شرکت کی غرض سے جمعیۃ مکارم اخلاق گئے جہاں انھوں نے اپنے بعض دوستوں اور اسلامی جماعتوں کے سربراہوں کو ہم سے ملنے کے لئے بلایا تھا کہ میں ان کے سامنے ہندوستان میں دینی دعوت کے طریقۂ کار کی تشریح و وضاحت کروں، ٹی پارٹی کے بعد میری تقریر ہوئی، جس کا موضوع تھا، (رسالة المسلمين فی هذا العصر)

تبلیغی جماعت کا تعارف علماء کی مجلس میں ان کی زبان سے

اسی جلسہ میں شباب سیّدنا محمد ﷺ کے سکریٹری استاذ حسین یوسف ان کے ساتھی استاذ عبدالوہاب اور جمعیۃ العشیرۃ المحمدیہ کے صدر استاذ زکی ابراہیم اور جمعیۃ الشبان المسلمین کے صدر عمومی جنرل محمد صالح حرب باشا، شیخ احمد شرباصی، برجستہ شعر کہنے والے شاعر صادی شعلان، بخارا کے عالم زعیم سید مبشر الطرازی اور جمعیۃ مکارم الاخلاق کے بعض اراکین شریک ہوئے، استاذ صادی شعلان علماء ہند کی خوبیوں اور ان کے علمی کارناموں کا ذکر کرنے لگے، ڈاکٹر محمد اقبالؒ، سیّد سلیمان ندویؒ اور علامہ شبلی نعمانی کا بار بار ذکر کیا اور ان حضرات کی کتابوں

کے مطالعہ اور ان سے گہری دلچسپی کا اظہار کیا اور ان حضرات کے بارے میں جو مضامین ومقالات نشر کئے گئے ہیں ان کا ذکر کیا، شیخ جلال حسین نے جلسہ کا آغاز کرتے ہوئے میرا حاضرین سے تعارف کرایا اور ہندوستان میں تبلیغی جماعت کی دعوت وجدوجہد کا ذکر کیا جس کو وہ ہم لوگوں کے اس کام سے لگاؤ اور تعلق کی وجہ سے مصر میں ''الدعوة الندوية'' کہتے ہیں جس کا سبب ہم لوگوں کے ناموں کے ساتھ لفظ ندوی کا لگا ہونا ہوتا ہے، جو ندوۃ العلماء سے انتساب کو ظاہر کرتا ہے، انھوں ے نے اس دعوت سے اپنے گہرے تعلق اور ہندوپاک کی بعض شخصیتوں سے ملاقات کا ذکر کیا اس کے بعد ہم لوگ اٹھ کر ٹی پارٹی میں شریک ہوئے۔

میری گفتگو

چائے سے فارغ ہوکر میں نے گفتگو شروع کی اور کہا کہ ہندوستان عالم عربی کی تربیت کے منصب بلند پر نہ تھا اور نہ ہے، خصوصًا مصر کی رہنمائی کے منصب پر جو کہ علم اور دینی تحریکوں سے بھرا ہوا ہے لیکن عہد آخر میں کچھ حالات اور واقعات کی بنا پر ہندوستان کو امتیاز حاصل ہوا اور ان حالات اور واقعات نے ہندوستان میں دینی نشأۃ ثانیہ کی فکر وتوجہ پیدا کی جس کے اثر سے ہندوستان کو اہم نتائج حاصل ہوئے اور وہاں کے لوگوں کو ایسے طریقۂ کار اور نظام کو اپنے کی توفیق ملی جو ہر اسلامی ملک میں اختیار کرنے کے لائق اور مفید ہے۔

ہندوستان اور عرب ملکوں کی مثال

ہندوستان اور عرب ملکوں کی مثال ان دو بچّوں کی سی ہے جن میں سے ایک بچہ ماں باپ کے زیر سایہ ان کے پیار ومحبت کی گود میں پلتا ہے اور ناز ونعم میں جوان ہوتا ہے، اور اس کو زندگی کے بہتر مواقع حاصل ہوتے ہیں، اس کو غور وفکر اور جدت خیال کی ضرورت نہیں پڑتی اور وہ سکون اطمینان قلب کے ساتھ نشو ونما پاتا ہے۔

یہ ان ملکوں کی مثال ہے جو اپنی آزاد حکومتیں رکھتے ہیں، دوسرا بچہ غریب وبے سہارا ہے اس کو ماں باپ کے ورثہ میں کچھ نہیں ملا، اب وہ فطری طور پر سوچنے اور خطرات مول لینے

کی جدوجہد اور اپنے ارادے وقوت کے بل بوتے پر زندگی کے میدان میں راہ پیدا کرنے پر مجبور ہوتا ہے جس کو مالداروں اور حکام کے لڑکے نہیں حاصل کر پاتے، یہی مثال ہندوستان کی ہے، اب اگر ہندوستان کی دینی ترقی اور اس کی اسلامی تحریکات میں کوئی ایسی چیز ہے جو نگاہوں کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے اور قدر وتقلید کا استحقاق رکھتی ہے تو اس کا سبب یہی ہے۔

پھر میں نے ان اسباب کو بیان کیا اور ان کی وضاحت کی جنھوں نے ہندوستان کو دینی دعوت کے بارے میں سوچنے پر مجبور کیا اور نئے تجربات کی صلاحیت بخشی۔

کچھ مشترک ومختلف باتیں

پھر میں نے اس عام دینی دعوت کی نشو ونما کی اساس اور ابتدائی چیزوں کا ذکر کیا، اس کے بعد اس دعوت اور عالم اسلام اور عرب ممالک کی اصلاحی دعوتوں میں جو چیزیں مشترک ہیں یا اس دعوت سے مختلف ہیں ان کا ذکر کیا جو چیزیں مشترک ہیں ان کو تو میں نے چھوڑ دیا اور جو چیزیں مختلف ہیں ان کی وضاحت وتشریح کی منجملہ ان تمام باتوں کے جس میں ہندوستان کی دینی دعوت ممتاز ہے، مسلمانوں کے دلوں میں ایمان کے بیج بونے اور اس کی فکر کرنے کو سب سے مقدم رکھنا ہے پھر بغیر کسی انتظار وتاخیر کے عوام کے پاس خود جانا اور ان میں اسلام کے عہد اول کے طریقہ اور اس زمانے کے داعیوں کے طرز پر دعوت کو پھیلانا، میری گفتگو کا سلسلہ جاری ہی تھا کہ فضا میں نماز مغرب کے لئے مؤذن کی صدا گونجی اور میں نے اپنی تقریر جاری رکھی پھر یہ طے ہوا کہ اس تقریر کی تکمیل منگل کے دن (جمعیۃ الشبان المسلمین) میں اسلامی انجمنوں کے سربرآوردہ لوگوں کی موجودگی میں ہو، اس کے بعد ہم لوگ نماز کے لئے کھڑے ہوئے۔

عہد حاضر میں مسلمانوں کا پیغام

انھوں نے کہا کہ ۹/مارچ مصر کی تاریخ کا یادگار ورق ہے، اسی تاریخ کو مصر کے

تین آدمیوں نے انگریزوں کو ملک سے نکلنے اور مصر کی آزادی کا مطالبہ کیا تھا، یہ مصر کا قومی دن ہے مگر یہ تاریخی دن بھولا بسرا اور نا قابل ذکر ہو گیا ہے، ہمیں اس سے خوشی ہوگی ہم (جمعیۃ مکارم الاخلاق) کی سرگرمی اور اس کے نئے دور کا آغاز آج کے مبارک دن سے کریں، اسی طرح ہماری یہ بھی خواہش ہے کہ آج مبارک دن ہم اپنی سرگرمیوں کا افتتاح آپ کے مقالہ سے کریں اس کے بعد انھوں نے دینی دعوت اور پاکستان سے اپنے تعلق وہاں کی سرگرمی اور مفید نتائج کا ذکر کیا، مغرب کے بعد جب دوبارہ جلسہ ہوا تو مجھ سے فرمائش کی گئی کہ میں اپنی تقریر شروع کروں چنانچہ میں اپنی تقریر شروع کی، تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ انسانی زندگی کے دو پہلو ہیں، ایک فطری اور پیدائشی پہلو ہے جو ہر انسان کے لئے یہ ضروری قرار دیتا ہے کہ وہ کھائے پیئے اور روزی حاصل کرے، بیمار ہو تو دوا علاج کرے، علاوہ ازیں انسانی زندگی کی دوسری فطری اور طبعی چیزیں۔

دوسرا پہلو ایمان کا پہلو ہے اور وہ ہے احکام کو اپنے خالق سے لینا اور اس پر عمل کرنا، انسان یہ سمجھے کہ کیا حرام اور کیا حلال، کہاں سے کمائیں، کمانے اور روزی حاصل کرنے اور مال جمع کرنے کا شرعی طریقہ کیا ہے اور وہ کون سے طریقے ہیں جن کا اختیار کرنا ممنوع ہے، اس زندگی کا مقصد کیا ہے اس عالم کا انجام کیا ہوگا، کس چیز سے اللہ خوش ہوتا ہے اور کس بات سے ناراض ہوتا ہے، انبیاء کرام انسانی زندگی کے پہلے رخ کو بیان کرنے کے لئے نہیں بھیجے گئے، یہ تو ایک فطری پہلو ہے، انسان اپنی فطری صلاحیت کی بنا پر ان کو معلوم کر لیتا ہے اور واقف ہو جاتا ہے (واوحی ربك إلى النحل أن اتخذی من الجبال بیوتا) اور تمہارے رب نے شہد کی مکھیوں کو سمجھایا کہ تو پہاڑوں میں گھر بنا، انبیاء کرام اس کے اندر نشاط اور گرمی پیدا کرنے اور اس کی طرف زیادہ توجہ دینے کے لئے نہیں بھیجے گئے، دنیا اس ایمانی پہلو پر طبعی پہلو کے غالب آنے کو برداشت کرتی رہی، بارہا یہ پہلو زیادہ وسعت اختیار کر گیا اور اس پہلو کے زیادہ بڑھ جانے کی وجہ سے انسانیت طرح

طرح کے امراض، مصائب اور زلزلوں سے دوچار ہوئی! انبیاء کرام اس غرض سے بھیجے جاتے ہیں کہ دوسرے پہلو کی وضاحت کریں اور حد سے بڑھے ہوئے مادی پہلو کا حق دلوائیں اور دونوں پہلوؤں کے درمیان صحیح توازن قائم کریں۔

اگر آپ مسلمانوں کے پیغام کو جاننا چاہتے ہیں تو اس زمانے پر نظر ڈالئے اور اس کا جائزہ لیجئے جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث فرمائے گئے پھر اس زمانے کی زندگی کا جائزہ لیجئے۔ اگر یہ باتیں کہ زندگی مکمل اور مالا مال تھی بلکہ یہ انسان کی زندگی کے ایمانی پہلو پر چھا گئی تھی اور اس کا خاتمہ کر کے اس کو بھولا بسرا بنا دیا تھا، پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تجدید فرمائی، اس کو حیات بخشی اور اس کی طرف دعوت دی اور ایک ایسی قوم کو وجود بخشا جو برابر اس کی داعی اور محافظ رہی اور اس پر اپنی توجہ صرف کرتی رہی، اگر یہ بات آپ کو نظر آتی ہے تو سمجھنا چاہئے کہ وہی مسلمانوں کا ہر زمانے میں پیغام ہے اور یہی اس زمانے کا بھی پیغام ہے، غزوۂ بدر کے موقعہ پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کے حق میں دعا و سفارش میں اسی بات کی طرف اشارہ فرمایا تھا: ''اللّٰھم إن تھلك ھذہ العصابة لم تعبد'' اے خدا اگر تو نے اس چھوٹی سی جماعت کو ہلاک کر دیا تو پھر کبھی تیری عبادت نہ ہوگی، اس دعا میں آپ نے وہ حقیقی مقصد بیان فرما دیا، جس کے لئے مسلمان قوم وجود میں آئی اور جو انھیں کے دم سے قائم رہے گا۔

علماء ہند کے مناقب کا اعتراف

یہ تقریر ایک گھنٹہ سے زائد جاری رہی بعض لوگوں نے تو مجھے یہ بتایا کہ پورے دو گھنٹہ تک جاری رہی لیکن مجھے محسوس نہیں ہوا کہ وقت کس طرح گزر گیا، میرے بعد استاذ صادی شعلان اسٹیج پر آئے اور تقریر پر تبصرہ کیا، ہندوستان میں اور یہاں کے علماء کی تعریف کی، ڈاکٹر محمد اقبال اور مولانا سید سلیمان ندویؒ کی بھی تعریف کی، اور یہ بتایا کہ سید صاحبؒ کی کتاب سیرۃ النبیؐ عالم اسلام کے کتب خانہ میں سیرت کے موضوع پر سب سے بڑی

کتاب ہے اور برجستہ بہت سے اشعار کہے جو بروقت آمد کے نتیجہ میں تھے، ان میں آورد نہیں تھی، ان کے بعد استاذ احمد الشرباصی آئے اور امت مسلمہ کے موجودہ حالات پر بلیغ ادبی انداز میں تقریر کی پھر ہمارے دوست احمد عثمان کے شکریہ کے الفاظ پر جلسہ ختم ہوا۔

ہفتہ ۲/۶/۱۳۷۰ھ، ۱۰/۳/۱۹۵۱ء

استاذ عبدالعزیز کامل کے ساتھ

آج نو بجے ہم لوگ محبّ عزیز عبداللہ العقیل کے ساتھ استاذ عبدالعزیز کامل کے یہاں شبرا گئے، مجھے ان سے ملنے کا بڑا شوق تھا، اور ان کو برابر پوچھتا رہتا تھا، کبھی معلوم ہوتا کہ سوڈان گئے ہیں اور کبھی پتہ چلتا کہ وہ شبین الکوم میں مدرسۃ المعلمین میں پڑھا رہے ہیں، اسی طرح ہوتا رہا حتیٰ کہ آج برادرم عبداللہ العقیل نے ان سے ملاقات کا وقت مقرر کرلیا، ہم لوگ استاذ عبدالعزیز کامل سے ان کے گھر پر ملے، دیر تک گفتگو رہی، گفتگو ہندوستان میں دعوتی نظام وتربیت اور ایسی اچھی کتابوں کی تصنیف کی ضرورت سے متعلق رہی جو اسلامی فکر اور اسلامی طرز زندگی کی وکالت وتشریح کریں ہندوپاک کے اسلامی مفکرین میں ربط وتعلق اور اسی طرح مصر کے مفکرین میں تعلق اور ساتھ ہی ساتھ اسلامی تہذیب اور علمی سرمایہ میں دونوں ملکوں کے ثقافتی تبادلہ کا بھی ذکر رہا، انھوں نے اقبال کی شخصیت اور ان کے اسلامی فکر واشعار کے پیغام سے مصریوں کی ناواقفیت پر اظہار افسوس کیا میں نے ان کو بتایا کہ اقبال کے پیغام وشاعری پر کلیۃ الادب یا دارالعلوم میں میں تقریر کرنے کو تیار ہوں انھوں نے یہ تقریر دارالعلوم میں کرنے کو ترجیح دی، انھوں نے (ماذا خسر العالم) پر اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا اور بتایا کہ اس کتاب کو اخوان کے نظام مطالعہ میں شامل کردیا گیا ہے، اس کتاب میں یورپ کی تاریخ اخلاق، اس کے نشوونما اور ترقی اور یونانی ورومی اخلاق کے اس میں اثر کی جو تفصیلات آئی ہیں ان سے اتفاق کیا اور کہا کہ وہ یورپ کے موجودہ نفسیات کو سمجھنے میں معاون ہوگی، گفتگو مختلف موضوعات پر رہی اور یہ نشست دیر تک جاری رہی، میں نے استاذ

عبدالعزیز کی شخصیت میں ایک پڑھا لکھا، صاحب ایمان باوقار اور فطری صلاحیتوں سے مالا مال شخص پایا، جن پڑھے لکھے لوگوں سے میں واقف ہوں ان میں انھیں سب سے بہتر پایا، علوم جدیدہ کی یونیورسٹیوں نے جو افراد پیدا کئے ہیں ان کے بہترین لوگوں میں ہیں، وہ شبین الکوم میں ایک مدرسہ میں مدرّس ہیں اور جغرافیہ میں ڈاکٹریٹ کی تیاری کر رہے ہیں، وہ اخوان کے تربیتی نگراں سمجھے جاتے ہیں، ہم نے ان سے واپسی کی اجازت چاہی مگر انھوں نے رکنے اور دوپہر کا کھانا کھانے پر اصرار کیا ہم نے منظور کرلیا، انھوں نے ہمیں اپنے مطالعہ وتصنیف کے کمرہ میں تنہا چھوڑ دیا کہ لکھ پڑھ لوں، ظہر بعد ہم لوگوں نے کھانا کھایا اور دونوں ساتھ ساتھ ہم اپنی قیام گاہ کو چلے، ان کا کسی سے ملنا طے تھا انھوں نے اسی طرف کا رخ کیا، ہمارا گذر صدیق مکرم علی محمود الشریف کی دوکان کے پاس سے ہوا، ان صاحب سے سلامت کی درخواست کی اور اپنی قیام گاہ آئے۔

سات بجے ہم لوگ بھائی یٰسین کے ساتھ ازہر کے کلیۃ اصول الدین میں فلسفہ کے استاذ ڈاکٹر محمد یوسف موسیٰ کی ملاقات کے خیال سے ''شارع الملک المظفر جیزہ'' گئے ڈاکٹر محمد یوسف موسیٰ ان لوگوں میں سے ہیں جنھوں نے میری کتاب ''ماذا خسر العالم'' کو پڑھا اور اس کو پسند کیا ہے، میں چاہتا تھا کہ ان کی معلومات وتبصرہ سے فائدہ اٹھاؤں، لہٰذا میں نے ان سے یہ ملاقات طے کی، وہ بڑی کشادہ دلی اور خندہ پیشانی سے ملے۔

ڈاکٹر محمد یوسف موسیٰ سے باتیں

ڈاکٹر صاحب نے مجھے بتایا کہ انھوں نے میرا رسالہ ''اسمعی یا مصر'' پڑھا اور بہت پسند کیا، میری کتاب ''ماذا خسر العالم'' کے بارے میں بتایا کہ میں نے شائع ہوتے ہی اسے صبح کو خریدا اور رات کو سونے سے پہلے پوری کتاب پڑھ ڈالی اور سرورق پر یہ لکھ دیا کہ صبح کتاب خریدی اور رات کو سونے سے پہلے ختم کرلی۔

گفتگو مصر کے طریقۂ تعلیم پر چل نکلی انھوں نے کہا کہ مصری تعلیم دو متوازی کیمپوں

(دینی وعصری) میں بٹی ہوئی ہے، اور اس نے ہمارے لئے بہت سی برائیاں پیدا کردی ہیں، بتایا کہ میں نے اس طریقۂ تعلیم کی تردید میں ایک مضمون لکھا جو الاہرام میں شائع ہوا اور ازہر کے حلقوں میں ناپسندیدگی اور مخالفت کی نگاہوں سے دیکھا گیا میں اپنے اس خیال پر ابھی تک قائم ہوں کہ تعلیم میں وحدت ہونی چاہئے اور اس کو اسلامی ثقافت کی مضبوط بنیاد پر قائم ہونا چاہئے، ڈاکٹر صاحب نے اس رائے کا اظہار کیا کہ ازہر کو حالات کی تبدیلی کے ساتھ طرز تعلیم میں کیمبرج اور آکسفورڈ یونیورسٹی کی طرح سے ترمیم واصلاح کرتے رہنا چاہئے کہ یہ دونوں بھی ازہر کی طرح دینی مدرسے تھے، ازہر کی طرح ان میں بھی دارالاقاموں کا نظم ہے۔

ازہر کے لئے ان کی تجویز

ازہر کے لئے ضروری تھا کہ وہ عصری تعلیم کو اپناتا اور ملک کے اندر تعلیم کا وہی تنہا سرچشمہ ہوتا پھر وہ علیحدہ علیحدہ طبقے جن میں آپس میں اتصال نہیں ہے، نہ پیدا ہو پاتے، چنانچہ ازہر میں وہ بھی ہیں جو دینی تعلیم حاصل کرتے ہیں لیکن ان میں حکومت کی صلاحیت نہیں ہوتی اور کالجوں و یونیورسٹیوں سے فارغ شدہ وہ لوگ ہیں جو حکومت کرتے ہیں مگر دین سے ناواقف ہیں، پھر ہم لوگوں کی گفتگو اس موضوع پر رہی کہ پاکستان کی سرکاری زبان عربی ہوتی، اور اس سلسلہ میں جو دشواریاں ہیں ان کی بھی بات ہوئی، ڈاکٹر صاحب سے ہمارا تعارف ہوا وہ وزارت تعلیم میں ملازم ہیں پھر شیخ محمد طٰہٰ الساکت آگئے اور تھوڑی دیر بعد ان سے ہم نے اجازت لی اور اپنی قیام گاہ واپس آگئے۔

مجھے خیال ہوا کہ دوشنبہ کے جلسہ استقبالیہ میں پڑھنے کے لئے ایک مقالہ تیار کرلوں جس کو موضوع " الدعوة الاسلامية فى الهند وتطوراتها " ہو۔ اس کے ذریعہ میں اس سنہرے موقع سے فائدہ اٹھا کر علماء ازہر اور اس دعوت پر لبیک کہنے والوں کو یہ پیغام پیش کروں یہ خیال میرے ذہن وفکر پر چھا گیا اور میں آدھی رات تک لکھنے میں مشغول رہا اور اس وقت تک نہ سویا جب تک تھک کر چور اور لکھنے سے مجبور نہ ہوگیا۔

اتوار ۳/۶/۱۳۷۰ھ، ۱۱/۳/۱۹۵۱ء

شیخ احمد الشرباصی کے سوالات

۹ بجے شیخ احمد الشرباصی آگئے اور میرے تعلیمی مراحل نشوونما اور حالات زندگی معلوم کرنے کی خواہش ظاہر کی میں اس پر راضی ہوگیا وہ پوچھنے اور نوٹ کرنے لگے۔ انھوں نے سوالات کی بوچھار کردی اور میری زندگی کے چھوٹے بڑے رطب ویابس سبھی حالات حتیٰ کہ کھیل کود، میرے ناپسندیدہ کھانے، زندگی کے یادگار دن جن بیماریوں میں مبتلا ہوا، وہ شخصیتیں جن سے میں متأثر ہوا، جو کتابیں مجھے پسند آئیں، مصر کی خوبیوں اور خامیوں کے متعلق میری رائے، غرض یہ کہ کہی ان کہی، سب پوچھ ڈالا، اور بے ساختہ میں بول اٹھا "مالهذا الكتاب لا يغادر صغيرة ولا كبيرة إلا احصاها" یہ کیسی مکمل دستاویز ہے جس نے چھوٹی بڑی کسی بات کو نہ چھوڑا سب پر حاوی ہے، میں نے ان کا مقصد نہ سمجھا، اور پوچھا کہ یہ معلومات حاصل کرکے کیا کریں گے؟ انھوں نے جواب دیا کہ ہوسکتا ہے کبھی آپ کے متعلق کچھ لکھنا ہو یا تقریر کرنی ہو تو یہ تفصیلات میرے لئے معاون ہوں گی، جب تک اٹھے نہیں اپنے لطائف وظرائف، زندہ دلی وخوش گفتاری سے ہم لوگوں کو برابر ہنساتے اور خوش کرتے رہے (چنانچہ انھوں نے انھیں معلومات سے میری کتاب "ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمين" کے مقدمہ میں میرا تعارف کراتے وقت فائدہ اٹھایا۔

دوشنبہ ۴/۶/۱۳۷۰، ۱۲/۳/۱۹۵۱ء

احمد لطفی السّید سے باتیں

شرباصی صاحب تشریف لے گئے اور میں اس مقالہ کی تیاری میں مشغول ہوگیا جس کو استقبالیہ جلسہ کے لئے لکھ رہا تھا، تین بجے ہم لوگ مصر جدیدہ میں شارع الملک عبد العزیز کے ارادہ سے نکلے جہاں محمود محمد شاکر سے ملنا تھا، یہ جگہ ہماری قیام گاہ سے دور ہے، چار بجے کا وقت مقرر تھا۔ ہم شارع سعید جانے والی ٹرام پر بیٹھے اور چار بجے کے بعد پہنچ گئے

اوران کے دوست یحییٰ حقی سے ملے جو ترکی میں مصری سفارت خانہ کے نئے مشیر (اڈوائزر) ہیں، اتفاق سے جناب عبدالرحمٰن بدوی سے ملاقات ہوگئی جو ''جامعہ ابراہیم'' میں فلسفہ کے استاذ ہیں۔ میں نے ان کو علامہ اقبال کی علمی چیزوں سے واقف پایا، میں نے ان کے اندر (روحانیت) (SPIRITUALISM) کا شوق اور اس سے تأثر محسوس کیا جو فلسفہ سے اشتغال رکھنے والے بعض لوگوں میں پایا جاتا ہے اور جس کا مقصد روح انسانی کے مطالعہ اور اس کے عجائبات اور جسم و مادہ سے آزادی کی دریافت ہے اور جس کا مشاہدہ ہندو بدھ سنیاسیوں اور یوگیوں کی تحریروں اور تجربات میں ملتا ہے، فلسفہ کے یہ طالب علم ان چیزوں سے اس سے زیادہ متأثر ہوتے ہیں۔ جتنا کہ اسلام کے متوازن اور عملی تعلیمات سے، انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا اس روحانی فلسفہ پر ہندوستانی مسلمانوں کی تصنیفات پائی جاتی ہیں۔ اور فلاں فلاں کی طرح ان کا مطالعہ اس موضوع پر وسیع ہے کچھ ایسے لوگوں کا نام لیا جنھوں نے یورپ میں روحانیت کے موضوع پر کتابیں لکھی ہیں۔ میں نے ان کو مخدوم شیخ شرف الدین یحییٰ منیری، اور امام ربانی شیخ احمد سرہندی کے مکتوبات کے مطالعہ کا مشورہ دیا، انھوں نے مجھ سے خواہش کی کہ میں ان کے لئے یہ کتابیں مہیّا کردوں، میں نے ان سے کہا کہ عملی زندگی میں فلسفہ کی حیثیت وہی ہے جیسے کسی ملک میں کسی ملک کے قونصل خانے ہوتے ہیں جو زندگی کے معاملات میں دخل نہیں دیتے نہ معاشرہ کے افراد سے ان کا کوئی رابطہ ہوتا ہے، وہ ایک فکری وخیالی سیر وتفریح ہے اس کے برخلاف نبوت زندگی کے رخ کو موڑتی اور تاریخ کے دھارے کو بدلتی ہے وہ زندگی کے قلب وجگر میں سرایت کرجاتی ہے یہی وجہ ہے کہ فلسفہ کوئی اصلاحی کام نہیں کرسکا اور نہ انسانی زندگی میں کوئی انقلاب لاسکا۔ وہ زندگی کے میدان سے الگ تھلگ محض قیاس وگمان کی دنیا میں رہتا ہے۔

اقبالؔ کہتے ہیں کہ جو فلسفہ خون وجگر سے نہ لکھا گیا ہو وہ مردہ و بے روح یا جاں بہ لب ہے، اس مجلس سے اٹھنے سے پہلے میں نے ان سے گذارش کی کہ آپ قرآن مجید کا

ایک ایسی کتاب کی طرح مطالعہ کیجئے جس سے آپ اس سے پہلے آشنا نہیں تھے بلکہ وہ ایک نئی کتاب ہے جو آج نازل ہوئی ہے۔ یہ وہ کتاب نہیں جو بچوں کے مکتبوں میں پڑھی جاتی ہے اور ہر روز اس کا ورد کیا جاتا ہے۔ بلکہ وہ ایک دوسری کتاب ہے جس کا آپ نے آج ہی انکشاف کیا ہے۔ مجھے خدا کے ذات سے امید ہے کی اگر قرآن کریم خالی الذہن ہو کر سنجیدگی سے پڑھا جائے تو وہ انسان کے ذہن پر چھا جاتا ہے اور نفس انسانی کی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے پھر کسی اور چیز کے لئے اس میں گنجائش باقی نہیں رہتی۔ فلسفہ اس کے سامنے ایک سراب کی طرح نظر آنے لگتا اور بڑے بڑے فلسفی اس کو بالشتیے اور بچے نظر آتے ہیں جو موتیوں سے بھرے ہوئے سمندر کے ساحل پر سیپ سے کھیل رہے ہوتے ہیں۔ ہم لوگ محمود شاکر صاحب کے یہاں سے نکلے اور اپنی قیام گاہ واپس آ گئے اور رات گئے تک مقالہ کی تیاری میں مصروف رہے۔ دس بجے ہم موجودہ نسل کے استاذ اور مجمع (فؤاد الاول اللغة العربية) کے صدر استاذ احمد لطفی السید سے ملنے گئے ہم لوگ ان سے ان کے اکیڈمی کے دفتر میں ملے ان کے اندر میں نے اسلامی ممالک میں یورپ کی تعلیم و تربیت سے جو پہلی نسل تیار ہوتی ہے اس طرز کا ایک بزرگ دیکھا۔ اسی فکر و ثقافت کی وہ نمائندگی کرتے ہیں اور جدید تعلیم کے سلسلہ میں وہی نقطۂ نظر رکھتے ہیں اور اس کی طرف سے پورا دفاع کرتے ہیں۔ ہم نے ان کے روپ میں بالکل وہی شخصیت پائی جو علی گڑھ کے اس عہد اوّل کے فارغین میں سے ہو۔ جس وقت سید احمد خاں نے اس کو قائم کیا تھا۔

عہد ماضی اور عہد حاضر کے اخلاق کا فرق

میں نے ان سے پوچھا کہ یونیورسٹی کی تعلیم سے آپ اس کے اخلاق و نتائج کے بارے میں مطمئن ہیں؟ انھوں نے کہا بے شک میں مطمئن و پر امید ہوں، ماضی کے مقابلہ میں اخلاق برابر ترقی کر رہا ہے اور اچھا ہوتا جا رہا ہے، اس میں شبہ نہیں کہ پہلے ظاہری اخلاق اور چال ڈھال بہت اچھے اور عمدہ تھے لیکن یہ سب کچھ خوف و دباؤ کی فضا میں ہوتا تھا،

میرا نظریہ یہ ہے کہ جو چیز خوف و دباؤ کے اثر سے ہو وہ کوئی وقعت نہیں رکھتی ہزار ہا سال بلکہ اس سے زائد عرصہ کے بعد ملک پر سے بدیسیوں کا تسلط ختم ہوا، اور آزادی نصیب ہوئی لہٰذا اخلاق اچھے ہو گئے ہاں یہ بات ضرور ہے کہ اب کچھ عیش و تنعم پیدا ہو گیا ہے اور آزادی کا غلط استعمال ہو رہا ہے اور یہ فطری بات ہے جو اپنے وقت پر ختم ہو جائے گی۔

طالب علم کی مثال پنجرے کی اس چڑیا کی سی ہے جو آزادی کے بعد ادھر ادھر اڑتی ہے اور اپنی طاقت کو پھر سے بحال کرتی ہے، بہر حال میں آزادی کے غلط استعمال کو غلامی پر ترجیح دیتا ہوں۔ اخلاقی بگاڑ اور تربیت کے سلسلہ میں تعلیم کی ناکامی اور اچھی نسل کو وجود میں لانے کا فیصلہ قبل از وقت ہے۔

میرا نظریہ یہ ہے کہ بچہ کی تربیت اول اول باپ کی گود میں ہوتی ہے۔ جب آج کا بچہ کل تربیت کرنے والا باپ بنے گا تو جو نسل اس کی تربیت میں پروان چڑھے گی وہ اس نسل سے اچھی ہوگی۔

میں نے کہا خدا آپ کی امیدیں بر لائے اور آپ کے ان جوانوں سے آنکھوں کو ٹھنڈک بخشے۔ لیکن مجھے ڈر ہے کہ حالات بد سے بدتر ہو جائیں گے اس لئے کہ جو پود ہماری یونیورسٹی سے نکل رہی ہے وہ آوارہ اور بے لگام ہے، اس کی کچھ بھی اصلاح و تربیت نہیں تو پھر کیسے ہم یہ توقع رکھیں کہ مستقبل حال سے بہتر ہوگا؟

وہ جواباً بولے میں یہ سمجھتا ہوں کہ علم پھیل جائے گا تو حالات کو درست کر دے گا۔ میں فطرت انسانی سے بدگمان نہیں، میں سمجھتا ہوں کہ سرشت بشری فطرۃً درست ہے جب ردعمل ختم ہو جائے گا تو وہ اپنی صحیح حالت پر آ جائے گی۔

کیا یونیورسٹیاں اخلاقی تربیت میں کوتاہی کر رہی ہیں؟

میں نے کہا کہ یہ اسلام کا نظریہ ہے لیکن یونیورسٹیاں اخلاقی تربیت کی طرف توجہ کرنے میں بڑی کوتاہ ہیں، انھوں نے کہا لیکن میں تلقین و رہنمائی کا قائل نہیں، اونچا کیریکٹر

اور اچھا عملی نمونہ زیادہ مؤثر ہے۔

میں نے کہا یونیورسٹیوں کی کوتاہی سے میری مراد اخلاقی درس وتلقین میں کوتاہی نہیں ہے، اس کے اثر انداز ہونے پر میرا عقیدہ نہیں اس بارے میں تو میں آپ ہی کا ہم خیال ہوں، یونیورسٹی اچھے اساتذہ کے انتخاب، عملی نمونہ اور مثالی اخلاق کے پیش کرنے میں ناکام ہے، یہ بات مجھ کو ان یونیورسٹیوں کے مستقبل کے بارے میں اخلاقی پہلو کی طرف سے شک میں ڈالتی ہے، انھوں نے کہا کہ مصر میں یونیورسٹی کی تعلیم ۳۳ سال سے جاری ہے، اس قلیل مدت میں اس کی ناکامی کی رائے قائم کرنا قبل از وقت ہے، اس میں مزید انتظار کرنا چاہئے اور دیکھنا چاہئے۔

میں نے کہا کہ ہندوستان میں جدید علوم اور یونیورسٹی کی تعلیم مصر سے کہیں پرانی ہے لیکن مصر کی یونیورسٹی کی تعلیم اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں۔

نقص نظام تعلیم میں ہے

اس صورتحال سے ہم کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ نقص وخامی نظام تعلیم میں ہے، جب تک یہ نقص دور نہ ہوگا تعلیم اپنا یہی پھل دیتی رہے گی۔ نقص دراصل معلومات اور اخلاق میں عدم توازن کے سبب سے ہے۔

میں نے ان سے پوچھا کہ آپ سید جمال الدین افغانی سے ملے ہیں اور ان سے پڑھا ہے جواب میں فرمایا کہ میں قسطنطنیہ میں ان سے ایک ماہ پڑھا ہے۔ یہ درس عام تھا مجھے اس درس سے بڑا فائدہ پہنچا اور فکر میں وسعت پیدا ہوئی، احمد لطفی باشا کے پاس ''کلیۃ الحقوق'' میں دینیات کے استاذ شیخ عبدالوہاب بے خلاف اور منصور فہمی باشا سے ملاقات ہوگئی، محترم احمد لطفی باشا صاحب نے اکیڈمی کی مطبوعات کا ایک مجموعہ عنایت فرمایا ہم نے ان کا شکریہ ادا کیا اور واپس آگئے۔

استقبالیہ جلسہ میں

پونے پانچ بجے ہم لوگ جمعیۃ الشبان المسلمین پہونچے، معزز مہمانوں میں زیادہ قابل ذکر امیر عبدالکریم خطابی اوران کے بھائی امیر محمد عبدالکریم خطابی مصر کے سابق مفتی اعظم اور (ھیئۃ کبار العلماء) کے رکن شیخ حسنین محمد مخلوف ازہر کے ہیئۃ کبار العلماء کے رکن شیخ محمد عبداللطیف دراز، ازہر کے ممتاز علماء کے صدر اور ہیئۃ کبار العلماء کے رکن شیخ محمد شربینی، شیخ مبشر الطرازی، ہیئۃ کبار العلماء کے رکن ڈاکٹر محمد عبداللہ دراز، کلیۃ الشریعۃ کے استاذ شیخ احمد فہمی، ڈاکٹر محمد یوسف موسیٰ، دارالعلوم قاہرہ کے استاد عبدالمنعم النمر، استاذ احمد الشرباصی، ازہر کے وعظ وارشاد کے نگراں استاذ محمد عبدالتواب، استاذ عبدالقادر مختار، استاذ عبدالمنعم خلاف، شیخ سعید الشرباصی، ازہر کے وعظ ارشاد کے نگراں شیخ علی رفاعی اور خود جنرل محمد صالح حرب جو اس جلسہ کے داعی تھے، ہم لوگ چائے کی میز پر بیٹھ گئے جو بہت لمبی اور پھولوں سے سجی ہوئی تھی، جنرل محمد صالح حرب اٹھے اور اس ناچیز کے لئے عزت افزائی کے کلمات کہے اور اپنی اور مہمانوں کی طرف سے خوش آمدید کہا پھر استاذ احمد شرباصی کے نام کا اعلان کیا، انھوں نے اختصار کے ساتھ صالح حرب کی باتوں کے ہم معنی باتیں کہیں جس میں انھوں نے یہ بھی ذکر کیا کہ شیخ ابوالحسن نے الدعوۃ الاسلامیۃ وتطوراتھا کے موضوع پر اس جلسہ کے لئے ایک مقالہ لکھا ہے۔

جلسہ میں میرا مقالہ

اس کے بعد میں اٹھا اور میں نے جنرل محمد صالح حرب کی اس محبت اور مہمان کی عزت افزائی کا شکریہ ادا کیا، پھر میں نے کہا معزز مہمان اور علماء کبار، آپ کا یہ وقت جس میں آپ نے حاضر ہوکر رونق بخشی، بڑا قیمتی وقت ہے، یہ وقت ایک امانت ہے مجھے اندیشہ ہوا کہ مجھ جیسے کم مایہ شخص کی عزت وقدر افزائی میں یہ سنہرا وقت ضائع نہ ہوجائے، اس لئے میں نے اس جلسہ کے لئے مقالہ تیار کرلیا ہے امید ہے کہ وہ اس خسارہ کا بدل ثابت ہوگا اور

ذمہ داری کی جو گراں باری میں محسوس کر رہا ہوں اس کو ہلکا کر دے گا۔

اس کے بعد میں نے اپنے مقالہ میں کہا کہ میری خواہش ہے کہ یہ جلسہ جس کو جنرل محمد صالح حرب نے میری حقیر ذات کے لئے اس تصور کے ساتھ منعقد کیا ہے کہ وہ ایک ایسے مسلمان کی عزت افزائی کا جلسہ ہے جو علم اور دین سے گہرا تعلق رکھنے والی ایک اسلامی قوم کا فرد ہے۔ یہ کسی ایک فرد کی عزت افزائی نہیں بلکہ علم، اس ہندوستان کی مسلم قوم کی قدر دانی ہے جس کے خاندان سے تعلق کا شرف مجھے حاصل ہے میں نے چاہا کہ ان کو اور ان کے ان معزز مہمانوں کو سلام و رحمت بھیجوں جنھوں نے علم اور ایک باعزت قوم سے تعلق کے سبب اس نام پر مجھے حاضری کا شرف بخشا ہے، اس حسن سلوک اور ذرہ نوازی کے شکریہ اور نعمت کا اعتراف میرے لئے ضروری ہے۔

حضرات میں نے بہت سوچا کہ آپ کو کیا تحفہ پیش کروں، میری آج کی گفتگو کیا ہو۔ اگر میں آپ سے کسی عام علمی و دینی موضوع پر گفتگو کروں تو وہ سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہوگا، مجھے یاد پڑا کہ پرانے زمانے میں بھی اور آج بھی دستور یہی رہا ہے کہ مسافر اپنے ملک کی جو عمدہ چیز اور بہترین سمجھی جاتی ہے اس کو ہدیہ پیش کرتا ہے اگرچہ معمولی اور سہل الحصول ہو، نہ یہ کہ کسی دوسرے شہر کے بازار سے کوئی چیز خریدے اور اس کو وہاں کے رہنے والوں کو ہدیہ کرے خواہ وہ کتنی ہی قیمتی کیوں نہ ہو۔

اس اصول اور عادت کے پیش نظر میں نے سوچا کہ میری آج کی گفتگو کا موضوع ہندوستان میں اسلامی دعوت کی تاریخ اس پر جو دور گزرے اس میں جو طریقہ کار فرما رہا اور جو ردوبدل ہوتا رہا اور جس جدت طرازی سے کام لیا جاتا رہا میں اس کو بیان کرنے کی کوشش کروں۔

یہاں سے میں نے اصل موضوع پر گفتگو شروع کی اور اس ملک میں پہلی اسلامی دعوت کا ذکر کیا جس کو صوفیائے کرام اور داعیوں نے اس ملک میں پھیلایا پھر میں نے بیان کیا کہ مغل حکومت کا رخ اسلام سے الحاد و کفر کی طرف کیسے پھر گیا، اس دھارے کو موڑنے اور اس ملک میں دین کی تجدید کے لئے مشیت خداوندی نے شیخ احمد سرہندی کو کس طرح

کھڑا کیا اور کس طرح ان کی تجدید اور ان کی اولاد کی تربیت سے اکبر کے تخت پر اورنگ زیب عالم گیر جیسا بادشاہ نظر آیا پھر حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی نے عقلوں کو ہموار کرنے اور علم دین کی بنیاد پر صالح اسلامی انقلاب لانے کی جو جدوجہد کی اس کا ذکر کیا، پھر حضرت سید احمد شہید اور مولانا اسماعیل شہید کے جہاد شرعی، حکومت کے قیام میں ان کی عظیم الشان کوششیں اور علماء کا دینی مدارس کے قائم کرنے پر مجبور ہونے کا تذکرہ کیا پھر وہ اسباب بتائے جو ندوۃ العلماء کے قیام کے محرک ہوئے اور اس کے بعد ایک نئی جماعت (جماعت تبلیغ) کے پیدا ہونے کی کیا ضرورت پیش آئی جس کے بانی مولانا محمد الیاسؒ صاحب کاندھلوی تھے، جس کا مقصد دینی دعوت کو پھیلانا عامۃ المسلمین کے دلوں میں ایمان کا بیج بونا اور ان کی دینی تربیت کرنا ہے، حاضرین نے اس مقالہ کو باوجود طویل ہونے کے بہت شوق سے سنا اور اس کے شائع کرنے کی تجویز پیش کی اور اس پر جلسہ ختم ہوگیا۔

سہ شنبہ ۵/۶/۱۳۷۰ھ مطابق ۱۳/۳/۱۹۵۱ء

علامہ اقبال کے فکر و پیغام کی عالم عربی میں اشاعت کرنے میں کوتاہی

استاذ صادی شعلان آئے اور بیٹھ کر علامہ اقبالؔ کے اشعار کا عربی ترجمہ سنانے لگے، مجھے اس کتاب کا ایک نسخہ ہدیہ کیا جس کی تالیف میں یہ بھی جناب محمد حسن اعظمی کے ساتھ شریک تھے، کتاب کا نام "فلسفة اقبال والثقافة الاسلامية فى الهند وباكستان" ہے اس کے اخیر میں ایک اور کتاب ہے جو علامہ شبلیؒ اور ان کی عظیم کتاب سیرۃ النبی سے متعلق مقالات پر مشتمل ہے اس میں مولانا سید سلیمان ندویؒ کے بھی کچھ مقالات کا ترجمہ شامل ہے، جناب صادی شعلان کو ہندوستانی علوم وفنون سے بڑا شغف ہے، وہ فارسی جانتے ہیں، انھیں اقبالؔ کے بہت سے اشعار یاد ہیں وہ اس وقت ان کی مشہور مثنوی "پس چہ باید کرد اے اقوام شرق" کا ترجمہ کر رہے ہیں اس میں شبہ نہیں کہ اقبالؔ کا یہ مجموعہ کلام ان کے فکر و پیغام کا جامع ہے، امّت مسلمہ سے وہ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں اس میں وہ سب کچھ آگیا ہے، اللہ تعالیٰ صادی شعلان کو اس کا مکمل ترجمہ کرنے کی توفیق دے۔ انھیں اشعار کے ترجمہ پر بڑی قدرت حاصل

ہے حالانکہ وہ بہت مشکل کام ہے ان کو اقبال کے آخری دیوان اور ارمغان حجاز کا بڑا شوق ہے، یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ پاکستان اپنے عظیم بانی کے تعارف اور عالم اسلامی میں ان کے فکر کو پھیلانے میں برابر کوتاہی کا شکار رہا ہے، استاذ صادی شعلان جیسے لوگ اس بات کے مستحق ہیں کہ حکومت یا علمی اکیڈمیاں اقبالؔ کے فکر کو عالم عربی میں منتقل کرنے میں ان کی مدد کریں جو اقبالؔ سے کہیں زیادہ ٹیگور کا جانتا ہے۔ یہ عربوں سے زیادہ ہندوپاک کے لئے شرم کی بات ہے کہ انھوں نے اقبالؔ کا تعارف نہیں کرایا، صادی شعلان واپس گئے تو دوازہری استاذ شیخ حسن الشرباصی اور شیخ عبدالمنعم النمر آئے اور دیر تک بیٹھے رہے ہم لوگ دینی دعوت اور دیہاتوں اور گاؤں میں اس کے پھیلانے اور شہر وحوالی شہر میں جماعتوں کی نقل وحرکت کے سلسلے میں گفتگو کرتے رہے۔

دینی مدارس کے طلبہ کس طرح کام کریں؟

میں نے ان دونوں حضرات سے کہا کہ دینی مدارس کے طلبہ کو جذباتی تحریکوں سے روکنے اور تخریبی دعوتوں کا نشانہ بننے سے بچانے اور ان میں روح وعمل کی سرگرمی پیدا کرنے کا تنہا یہی ایک راستہ ہے، ان دونوں حضرات نے اس بات سے اتفاق کیا لیکن اس تنظیم ونشاط میں جو مشکلات حائل ہیں اخوان المسلمین کے غیر قانونی قرار دیئے جانے کا قوم کے ذہن وفکر پر جو اثر پڑا ہے اور اس نے دینی دعوتوں اور خالصۃً للہ دعوت کا کام کرنے والوں کے اندر جو مایوسی وبددلی پیدا کردی ہے اس کا عذر پیش کیا لیکن انھون نے اس کو تسلیم کیا کہ چھوٹے اور محدود پیمانہ پر اس کام میں کوئی حرج نہیں ہے۔ شیخ احمد الشرباصی نے وعدہ کیا کہ اس موضوع پر ازہر کے واعظ شیخ محمد الغزالی سے بات کریں گے کہ وہ دیہات وگاؤں کے حالات سے اپنے دوستوں کی بہ نسبت زیادہ واقف بھی ہیں اور اس سے ان کا زیادہ تعلق بھی ہے۔

علماء مصر وعلماء ہند میں علمی روابط پیدا کرنے کی تنظیم

شیخ احمد الشرباصی نے ایک ایسی تنظیم کی تجویز رکھی جو علمائے ہندوپاک اور علمائے

مصر کے درمیان کتب ورسائل، اخبار ونشریات، تحریر وخطابت وغیرہ کے ذریعہ ربط وتعلق پیدا کرے، استاذ عبدالمنعم النمر نے ان کی تائید کی اور بتایا کہ مجھ سے تعارف حاصل کرنے سے پہلے وہ ہندوستان کی دینی تعلیمی تحریکوں سے بالکل ناواقف تھے، ہندوستان میں علم حدیث کے موضوع پر ''الرابطۃ الاسلامیۃ'' میں اپنے مقالہ میں میں نے جن شخصیتوں کا ذکر کیا انھوں نے ان کا کبھی نام تک نہ سنا تھا، شیخ احمد الشرباصی نے یہ بھی تجویز رکھی کہ طلباء ازہر اور دوسرے اسلامی ممالک کی یونیورسٹیوں کے طلبہ میں باہمی خط وکتابت ہونی چاہئے تاکہ یورپ کے طلبہ سے خط وکتابت کے بجائے مسلمان نوجوانوں میں رابطہ پیدا ہو اور وہ اسلامی قافلہ سے وابستہ ہوجائیں، انھوں نے بتایا کہ کالجوں اور یونیورسٹیوں کے اکثر طلباء یورپ کی یونیورسٹیوں کے طلبہ سے خط وکتابت کرتے ہیں، مصری کالجوں اور یونیورسٹیوں کے اکثر طلباء کے دوست اور مراسلہ نگار یورپ میں ہیں، ان کو ان کے اساتذہ اس بات پر آمادہ کرتے ہیں بلکہ یہ ذوق اس حد تک آگے بڑھ چکا ہے کہ مدارس نسواں کی استانیاں تک لڑکیوں کو آمادہ کرتی ہیں کہ یورپ کی طالبات یا طلباء سے خط وکتابت کریں۔ بعض طالبات یہاں ہیں اور ان کے دوست یورپ میں ہیں، ہم لوگ اس بات پر متفق ہوگئے کہ شیخ احمد الشرباصی ازہر کے ان طلباء کے نام اور پتہ لکھنا شروع کردیں اور ان کی خصوصیات اور امتیازی صفات بتائیں جو خط وکتابت کرنا چاہتے ہیں اور میں ہندوپاک کے مسلم طلباء کے نام اور پتے لکھنے کا فریضہ انجام دوں، استاذ عبدالمنعم النمر نے (اوجز المسالک مصنفہ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی) کے کچھ اجزاء ناشرین کو دکھانے کے واسطے لے لئے شاید وہ اس کی اشاعت کے واسطے تیار ہوجائیں۔ عصر بعد ہم لوگ ''لجنۃ التالیف والترجمۃ والنشر'' گئے تاکہ لجنۃ کے ناظم جناب عبدالمتعال آفندی سے ملاقات کریں وہ ''دارالکتاب العربی'' کے پریس میں الحاج حلمی منیاوی کے پاس تھے، انھوں نے قاہرہ میں میرے موجود ہونے کی خبر سنی تو مجھ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی ہم دیر تک رکے رہے مگر واپس نہ آئے، بالآخر ہم لوگ جناب بہی الخولی سے ملنے کے لئے وقت مقررہ کے مطابق قلعہ محمد علی گئے ہم ان کے پاس مغرب سے لے کر نو بجے کے بعد تک بیٹھے استاذ منیر بک

اور وزارت تعلیم کے ڈائرکٹر احمد عطیہ بھی آ گئے میں نے ان دونوں حضرات سے تعارف حاصل کیا۔

میں نے استاذ بہی الخولی کا مضمون پڑھا جو (تحت ظلال التوحید) کے عنوان سے الدعوۃ کے آخری شمارہ میں شائع ہوا تھا، بڑا اچھا تھا آیات کی تشریح اور حقائق کے تجزیہ میں میں نے اس میں ابن قیم کے خیالات کی جھلک پائی، یہ بات ان میں ابن قیم کی کتابوں سے شغف اور قرآن میں انھیں کے طرز پر غور وفکر کرنے کی وجہ سے آئی، شیخ بعض آیتوں کی ہم سے تشریح کرتے رہے اور اپنے دلنشیں انداز میں قرآن میں حیاۃ کے معنی کی وضاحت فرماتے رہے یہ گفتگو بڑی پر مغز اور دل ودماغ کے لئے بہترین غذا تھی۔

مغرب بعد احباب شیخ احمد الشرباصی کی تقریر میں سخت تکان کی وجہ سے میری عدم شرکت کی معذرت پر الشبان المسلمین گئے، ان کے مقالہ کا عنوان تھا ''عبقرية المكفوفين في التاريخ'' ''علمی دنیا میں نابینا علماء کی عظمت''

بدھ ۶/۶/۷۰ مطابق ۱۴/۳/۱۹۵۱ء

میں نے قیام وآرام اور جناب بہی الخولی کی باتوں کو سننے کو ترجیح دی، اور بھائی یٰسین کے ساتھ نو بجے رات کے بعد واپسی ہوئی۔

شیخ احمد ماضی ابوالعزائم کے گھر لے جانے کے لئے شیخ عبدالمنعم النمر ظہر کے وقت ہمارے پاس آئے تاکہ ہم لوگ ان کے ساتھ دوپہر کا کھانا کھائیں، ہم لوگ شیخ احمد ابوالعزائم کی موٹر پر گئے اور ان کے ساتھ کھانا کھایا وہاں استاذ محمود جبر بھی موجود تھے جن کو شاعر اہل البیت کہا جاتا ہے، شیخ احمد ماضی ابوالعزائم نے اپنے والد کی تصنیفات اور منظومات میں سے کچھ چیزیں ہم کو ہدیہ کیں ہم لوگوں نے ان کے والد کی قبر کی زیارت کی، ان کی قبر پر ہم نے ایک کتبہ دیکھا جس میں لکھا ہوا تھا (يا ابا العزائم مددك) ہم لوگوں نے اسے ناپسند کیا اور کہا یہ کسی طرح جائز نہیں یہ بات توحید سے میل نہیں کھاتی سورہ فاتحہ میں (اياك نعبد واياك نستعين) میں ہمیں جو حکم دیا گیا ہے، یہ اس کے مطابق نہیں ہے، جس کو

ہم بار بار نماز میں دہراتے ہیں ہم نے ان میں وہ ناپسندیدگی اور خشونت نہیں دیکھی جو ایسے مواقع پر بریلی وبدایوں کے حضرات میں پائی جاتی ہے۔

شیخ عبدالوہاب خلّاف سے باتیں

عصر کے بعد ہم لوگ کلیۃ الحقوق کے استاذ شریعت اسلامی شیخ عبد الوہاب خلّاف (۱) سے ملنے ان کے گھر شبرا گئے، ان سے علمی تاریخی گفتگو رہی، انھوں نے کہا کہ احمد لطفی السید باشا سے آپ کی گفتگو کا انداز مجھے پسند آیا میں محسوس کر رہا تھا کہ آپ کا اور ان کا پیمانہ مختلف ہے، آپ کے نزدیک اخلاق کا پیمانہ ومعیار قرآن ہے اس میں جو اچھا وبہتر ملے وہ آپ کے نزدیک بھی خوب وخوشتر ہے، وہ یہ معیار نہیں رکھتے۔

مصر میں اخلاقی گراوٹ کے اسباب

اس ملک میں اخلاقی گراوٹ کا سب سے بڑا سبب فرانس سے واپس آنے والے لوگ ہیں، میرے خیال میں انگریزی تہذیب سنجیدگی ومتانت میں فرانسیسی تہذیب سے ممتاز نظر آتی ہے۔ میں نے ان سے پوچھا کیا آپ نے شیخ محمد عبدہ سے پڑھا ہے، تو انھوں نے جواب دیا کہ میں ازہر کے رواق عباسی میں ان کے سورۃ النساء کے درس میں شریک ہوا اس وقت آیت ”حرمت علیکم امھاتکم “ کی تفسیر ہو رہی تھی جس کا سلسلہ آیت ”لاخیر فی کثیر من نجواھم “تک چلا اسی اثناء میں وہ مرض الموت میں مبتلا ہوئے اور انتقال ہوا۔

شیخ عبدالوہاب شیخ محمد عبدہ کے طریقۂ درس کو بیان کرتے ہیں

شیخ عبدالوہاب نے شیخ محمد عبدہ کے درس کی خوبی بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ شیخ

---

(۱) شیخ عبدالوہاب خلاف مصر کے فاضل یگانہ شخصیت سے اصول فقہ پر ان کی کتاب اصول الفقہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے نصاب درس میں ہے (مترجم)

بڑے وجیہ خوبرو، داڑھی اور دلکش آواز والے تھے، طلبہ اور حاضرین مجلس ان سے اکتاتے نہیں تھے، وہ دلچسپ لطیف نکتہ سنجیوں سے اہل مجلس کو باغ باغ کرتے رہتے اور اکتاہٹ کو دور فرماتے رہتے، وہ نحو اور بلاغت کا زیادہ خیال نہیں کرتے تھے، بلکہ قرآن حکیم کی طرف اصل توجہ فرماتے کہ ان کے نزدیک یہی سرچشمۂ ہدایت ہے اور ہمیشہ اپنے دعوے کے ثبوت میں قرآن کریم کی یہ آیت پیش کرتے" ذلك الكتاب لا ريب فيه هدى للمتقين " اور فرماتے اللہ تعالیٰ نے قرآن کی یہ صفت نہیں بیان کی کہ اس نے قرآن بلاغت یا نحو کے لئے اتارا ہے بلکہ فرمایا ہے کہ اس کو ہدایت ورہنمائی کے لئے اتارا ہے۔

وہ اساتذہ جن سے شیخ عبدالوہاب متأثر ہوئے

میں نے پوچھا ازہر کے اساتذہ میں کس نے آپ کو متأثر کیا ہے؟ جواب دیا کہ شیخ محمد عبدہٗ کے علاوہ اور حضرات ہیں جن میں پہلے تو شیخ عبداللہ دراز ہیں جو ازہر کے سامنے والی مسجد میں منطق پڑھاتے تھے، وہ بڑے فصیح اللسان اور شیریں زبان تھے، دوسرے شیخ ابراہیم الجبالی جن کا ابھی تھوڑے ہی دنوں پہلے انتقال ہوا ہے اس کے بعد مدرسۃ القضاء الشرعی کا قیام عمل میں آیا اور میں نے اس میں داخلہ لے لیا جس کے اساتذہ میں ازہری علماء اور جدید تعلیم یافتہ اساتذہ دونوں ہی قسم کے لوگ تھے، نتیجۃً میری تعلیم بھی دو مختلف الخیال فکروں کا مجموعہ ثابت ہوئی اور یہ میرے لئے بہتر ہی ہوا۔

امام لیث بن سعد کا مذہب کیوں نہ باقی رہا؟

میں نے کہا امام لیث بن سعد بہت بڑے فقیہ تھے بعض لوگ ان کو امام مالک پر بھی فوقیت دیتے ہیں پھر ان کے مذہب کو بقا کیوں نہ نصیب ہوئی؟ وہ کیوں ختم ہو گیا؟ اور اس کے پیرو باقی نہ رہے انھوں نے کہا کہ مذہب کے پھیلنے اور باقی رہنے کے لئے دو سبب ہوتے ہیں، پہلا تو یہ کہ صاحب مذہب خود اپنے مذہب کو مدون کرے، اور اس کو لکھ لے، دوسرا یہ کہ اس مذہب سے کوئی حکومت دلچسپی لے اور اس کی نشر واشاعت کرے، مذہب حنفی

کو یہ دونوں باتیں میسّر آئیں، اس کو امام محمد الحسن الشیبانی نے مدون کیا اور لکھا اور یہی قاضی ابو یوسف کا مذہب تھا، عہدہ وقضاء ایسے شخص کو دیا جاتا جو حنفی ہوتا اور امام لیث ابن سعد کے بعد ان کے مذہب کی نشر واشاعت کسی نے نہ کی۔

مصر میں مذہب شافعی کیسے پھیلا

مذہب حنفی ہی پورے مصر میں چلتا رہا، سب اسی کے پیرو تھے، یہاں تک کہ امام شافعی مصر آئے جو غیر معمولی ذہن وذکاوت کے مالک تھے، وہ آل حکم کے مہمان ہوئے پھر ان کا مذہب مصر میں پھیلا اور چھا گیا، اس کے بعد جب فاطمی مصر میں آئے تو انھوں نے مسجد ضرار کی طرح ازہر کو قائم کیا جو مصر میں چوتھی مسجد ہے، امام شافعیؒ مسجد فسطاط میں درس دیتے تھے اب فاطمی اس بات پر مجبور ہوئے کہ اس رجحان ومسلک سے ہم آہنگی پیدا کریں، لہٰذا انھوں نے فقہ جعفری کی تعلیم کے ساتھ فقہ شافعی کی تعلیم کو بھی شامل کیا، فقہ جعفری کی تعلیم فاطمی خلیفہ خود دیتا تھا پھر جب ایوبیوں کی حکومت قائم ہوئی تو انھوں نے شافعی فقہ سے دلچسپی لی اور فقہ شافعی کی ہمت افزائی کی گئی اور بالآخر ملک میں اسی کا چلن ہوا۔

علماء کا مرض

شیخ عبدالوہاب کے گھر سے ہم لوگ جمعیۃ الشبان المسلمین گئے جہاں بڑے بڑے علماء اور ازہری شیوخ کی ایک پارٹی موجود تھی وہ لوگ ایک کمیٹی کے قیام پر بحث کر رہے تھے جو اسلام کے مالی، سیاسی اور اجتماعی نظام کی تشریح میں کتابیں لکھے مگر وہ کسی بات پر متفق نہ ہو سکے، ان کے مباحثہ میں میں نے اخلاص کی کمی محسوس کی، اسی سبب سے ہمیں اسلامی ممالک میں دین کی طرف سے خطرہ محسوس ہوتا ہے، دنیا کے حالات، لوگوں میں سخت اضطراب وبے چینی کا پایا جانا اور ہمارے گردوپیش کی دنیا کی برق رفتاری اور تغیر پذیری، اس بات کی طالب ہے کہ حق گوئی وبیباکی اور غیر معمولی قوت ارادی کا مظاہرہ کیا جائے اور یہ بات دینی گروہ اور اسلام

کے حامیوں میں نہیں پائی جاتی، میں نے پورے زور سے کہا کہ قوم اور خصوصاً دینی اور علمی حلقہ اجتماعی قوت اور عملی تعاون کی صلاحیت کے حصہ کو کھو چکی ہے، اس صورتحال میں کوئی بڑا کام نہیں ہوسکتا سوائے ان معدودے چند لوگوں کے جن کے جذبات واحساسات پر دعوت کا پورا غلبہ ہے، یہ وہی لوگ ہیں جو کسی کا انتظار کئے بغیر اپنے فرائض کی انجام دہی کے لئے کھڑے ہوتے ہیں۔

پنجشنبہ ۷/۶/۷۰ مطابق ۱۵/۳/۱۹۵۱ء

عجائب گھر کی سیر

آج زراعتی میوزیم کی سیر کا دن مقرر تھا، ہم لوگ ''انصار السنۃ'' کے دفتر میں جمع ہوئے وہاں سے جناب عبدالوہاب البناء جناب علی عدلی مرشدی، بھائی عبدالوہاب اور دیگر دوسرے احباب کی معیت میں میوزیم کے لئے نکلے مگر معلوم ہوا کہ آج چھٹی کا دن ہونے کی وجہ سے میوزیم بند ہے، چنانچہ محمد عبدالوہاب کی رائے ہوئی کہ ہم آج دن حدیقۃ الحیوانات (زو) کی سیر میں گذاریں۔ ہم لوگوں نے اس رائے سے اتفاق کیا اور زو (Zoo) گئے، فضا بڑی دلکش وپر بہار تھی، وہاں ہم لوگ مختلف قسم کے جانوروں، درندوں اور خوبصورت چڑیوں کے درمیان سیر کرتے رہے، سب سے زیادہ تعجب خیز چیز جو میں نے یہاں دیکھی سمندری درندے اور بن مانس تھے ان وحشی جانوروں اور درندوں کے پاس سے گزرتے ہوئے ہمیں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان اکثر یاد آیا ''ولقد کرمنا بنی آدم حملناھم فی البر والبحر ورزقناھم من الطیبات وفضلناھم علیٰ کثیر ممن خلقنا تفضیلا'' (سورۃ الاسراء آیت ۷۰) ترجمہ: '' ہم نے اولاد آدم کو عزت بخشی اور ان کو خشکی وتری میں چلایا اور انھیں اچھا رزق دیا اور ان کو اپنی مخلوقات میں بہتوں پر بڑھا دیا''۔ قرآن کی یہ آیت بھی بار بار یاد آتی رہی ''لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم'' (سورۃ التین آیت ۴) بلاشبہ ہم نے انسان کو بہت خوب پیدا کیا۔

استاذ عبدالوہاب البناء نے اپنے ساتھ قسم قسم کے کھانے لے لئے تھے، جو پوری ایک جماعت کے لئے کافی تھا، ہم نے ظہر کی نماز پڑھی اور لان پر بیٹھ کر کھانا کھایا قدرت کے حسن و جمال وصاف ستھری ہوا اور اس پر کھانے کی لذّت، ان سب چیزوں نے لطف کو دوبالا کر دیا۔ کھانے کے بعد ہم مخلص احباب اور محبت کرنے والے ان دوستوں کے شکریہ کے ساتھ واپس ہوئے جنھوں نے ہمیں اس مہمان نوازی اور سیر کی عزت بخشی۔

عصر بعد ہم لوگ حلمیہ جدیدہ میں واقع بھائی عبدالخالق کے گھر گئے، جہاں ازہری طلبہ کی ایک جماعت سے ملاقات ہوئی اور ہم نے ان سے گاؤں اور دیہاتوں میں دعوت دین اور ہفتہ واری سفر کے موضوع پر بات کی، ان لوگوں نے سفر کے لئے قلیوب کا انتخاب کیا۔

مغرب بعد ہم لوگ جناب رشاد صاحب کے گھر گئے اور وہاں تھوڑی دیر بیٹھے پھر وہاں سے ''لجنۃ التالیف والترجمۃ والنشر'' گئے اور ڈاکٹر احمد امین صاحب سے ملے، وہ حضرات اپنی ہفتہ واری مجلس میں تھے، وہاں ہمارا جناب توفیق الحکیم اور ''المواقف الحاسمۃ فی تاریخ الاسلام'' کے مصنّف عبداللہ عنان سے تعارف ہوا، ہم اس علمی مذاکرہ میں شریک رہے جو بعض نفسیاتی بیماریوں اور علامتوں کے موضوع پر ہو رہا تھا، پھر ڈاکٹر احمد امین صاحب نے موضوع بدل دیا اور اسلامی ملک مراکش پر فرانس کے ظلم و جور کے موضوع پر گفتگو کرنے لگے، اور سوالیہ انداز میں کہا کہ اگر یہ ظلم کسی اسلامی ملک کی طرف سے یورپ کے کسی گاؤں پر ہوتا تو یورپ کیا رویہ اختیار کرتا؟ پھر جناب عبداللہ عنان صاحب نے بیان کیا کہ ترکوں کی طرف سے ارمن قوم اور مسیحی آبادی اور یورپ کے شہروں کو کوئی معمولی گزند بھی پہنچتا تو یورپ تلملا اٹھتا تھا، ''جمعیۃ'' کے ارکان نے اس پر اتفاق کیا کہ یورپ میں صلیبی روح اب زندہ وطاقت ور ہے، توفیق الحکیم صاحب کو جو اعزازی طمغے دیئے گئے تھے اس پر ناگواری کا اظہار کیا جب کہ فرانس ان دنوں ہمارے مراکشی بھائیوں پر ظلم و جور کے پہاڑ توڑ رہا ہے، اس کے بعد سلسلۂ گفتگو ہندوستان و پاکستان کی طرف مڑ گیا، اور حاضرین نے ان دونوں ملکوں میں عربی زبان اور دینی تعلیم کے متعلق سوالات کئے، میں نے اپنی معلومات ان کے سامنے پیش کیں، عبداللہ عنان

صاحب نے حاضرین کے سامنے کشمیر کی اہمیت کو تفصیل سے بیان کا اور مشرقی ومغربی پاکستان کے حالات پر روشنی ڈالی، ان کی گفتگو سے معلوم ہوا کہ وہ ہندو پاک اور ان دونوں ملکوں کی پوزیشن، جغرافیہ اور سیاسی مسائل سے بہت باخبر ہیں۔

جمعہ ۸/۶/۱۳۷۰ھ مطابق ۱۶/۳/۱۹۵۱ء

قویسنا میں میری تقریر

آج ہم لوگوں نے شیخ محمد الغزالی کے ساتھ قویسنا کا سفر کیا ہم قاہرہ سے بنہا کی ٹرین پر سوار ہوئے، بنہا پہنچ کر موٹر پر بیٹھے اور قویسنا میں اترے کچھ دیر اپنے میزبان جناب عشماوی احمد سلیمان کے یہاں ٹھہرے ہمارے اردگرد بنہا کے نوجوان تھے انھیں میں عبداللہ محمد حسن بھی تھے جن سے حجاز میں تعارف ہوا تھا۔ اور مختلف اجتماعات اور دوستوں سے تعارف وملاقات کی مجلسوں میں ہمارے ساتھ تھے حج کے اس موقع پر جو احباب آئے تھے ان میں عبداللہ محمد حسن سب سے زیادہ نشیط ومتحرک تھے، میں برابر ان کی تلاش میں رہا اور یہ فکر رہی کہ ان کی جائے قیام معلوم ہو، ان کا پتہ ہم سے کھو گیا تھا، ہمارے دوست عبد الدائم صاحب نے انھیں بتا دیا تھا کہ ہمارا قویسنا کا قصد ہے لہٰذا ''عزیزیۃ'' سے وہ ہم سے ملنے آئے، اس ملاقات سے ہم دونوں کو خوشی ہوئی، عشماوی صاحب کے یہاں سے ہم لوگ مسجد آ گئے اور جمعہ پڑھا، خطبہ شیخ محمد الغزالی نے دیا، نماز بعد مجھے تقریر کرنے کو کہا، میں سورہ عصر کی تفسیر بیان کرنا چاہتا تھا مگر ایسا اتفاق کہ خطبہ میں غزالی صاحب نے اسی کی تفسیر بیان کی، پھر میں نے غزالی صاحب نے نماز میں جو سورہ پڑھی تھی اسی میں سے ایک آیت کی تفسیر بیان کی وہ آیت تھی ''یاایھا الذین اٰمنوادخلوا فی السلم کافۃ ولا تتبعوا خطوات الشیطٰن انہ لکم عدو مبین'' (سورۃ بقرہ آیت ۲۰۸) '' اے ایمان والو! تم اسلام کی لڑی میں پوری طرح داخل ہو جاؤ، شیطان کے قدموں کی پیروی نہ کرو وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے''۔ پھر میں نے وضاحت کی کہ انسان اپنے رَب کا حریف ومخالف

کیسے ہوتا ہے؟ میں نے ان کو ڈرایا کہ وہ اللہ کے ساتھ جنگ میں نہ پڑیں، میں نے کہا اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کہ مسلمان جب تک مسجد میں رہتا ہے اپنے رَب سے صلح کرنے والا ہوتا ہے اور جیسے ہی مسجد سے نکلتا ہے خدا سے جنگ کرنے والا بن جاتا ہے، اس کے اس وقت تناسب جو مسجد سے باہر گزارتا ہے زیادہ ہوتا ہے، لہٰذا ہر شخص یہ دیکھے کہ اس کی زندگی میں جنگ کا کیا تناسب ہے اس کو چاہئے کہ وہ خدا کے ساتھ جنگ نہ کرے اور صلح میں داخل ہو جائے مسلمان جب تک پوری طور پر صلح میں داخل نہ ہو جائیں نہ وہ نصرت خداوندی کے مستحق ہو سکتے ہیں نہ اپنے لئے رحمتیں حاصل کر سکتے ہیں، میرے بعد شیخ احمد سلیمان عشماوی نے ایک پر جوش و بلیغ تقریر کی جس میں انھوں نے بتایا کہ اخوان المسلمین کی آزمائش نے ان کے ایمان وحوصلہ، قوت ونشاط اور تحریک کے پھیلاؤ اور اثر ورسوخ کو بڑھا دیا، مجھے معلوم ہوا کہ ان کو جیل میں بہت زیادہ اذیتیں پہونچائی گئیں، ہم لوگ اپنی قیام گاہ واپس ہوئے، ہمارے گرد جوانوں جمگھٹا تھا، وہ غور سے غزالی صاحب کی باتوں کو سن رہے تھے، غزالی صاحب اس موقع کو غنیمت جان کر ان سے اسلام کی نشأۃ ثانیہ اور تحریک اخوان المسلمین اور نوجوانوں کی ذمہ داری سے متعلق باتیں کر رہے تھے، مجھے غزالی صاحب کی دینی وسعت فہم اور ہمہ گیر نظریہ سے خوشی ہوئی، سننے اور ملنے والوں میں اکثر مدارس ثانویہ کے طلبہ تھے، سب کی نگاہیں غزالی صاحب پر لگی ہوئی تھیں اور وہ بہت غور سے ان کی باتیں سن رہے تھے اور ان کے چہروں پر تأثر ظاہر ہو رہا تھا، پھر ہم کھانے پر بیٹھ گئے، حاضرین میں سے اکثر لوگ شریک طعام ہوئے، صاحب خانہ بہت خوش تھے، کھانے سے فارغ ہو کر غزالی صاحب پھر باتیں کرنے لگے، غزالی صاحب باتیں کرتے رہے اور طلبہ وقویسنا کے دیگر حاضرین ان کی باتیں سنتے رہے حتیٰ کہ عصر کی اذان ہوئی، عصر کی نماز پڑھی، صاحب خانہ سے اجازت لی اور مغرب بعد قاہرہ پہنچ گئے۔

سنیچر ۹/۶/۱۳۷۰ھ مطابق ۱۷/۳/۱۹۵۱ء

صبح سویرے استاذ صادی شعلان آ گئے وہ جب بھی آتے ہمارے عظیم شاعر ڈاکٹر

اقبال کی یاد تازہ ہوجاتی اور اسلامی ہند کے جھونکوں میں سے ایک جھونکہ آجاتا ایسا جھونکا جو اپنے ساتھ ایمان کی خوشبو اور شوق ومحبت کی مہک لئے ہوئے ہوتا ہے وہ ہمیں مولانا روم کا ایک قصیدہ سنانے لگے جو ایک رومی کی امیر المومنین حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضری اور لوگوں سے قصر خلافت پوچھنے پھر حضرت عمرؓ کے پاس پہنچنے اور ان کو ایک کھجور کے نیچے نہایت سادہ انداز میں بیٹھے دیکھا تھا اور اس منظر کا اس پر رعب طاری ہوگیا تھا اس نے دل ہی دل میں بات کی تھی اور اس رعب وہیبت کا سبب پوچھا تھا، انھوں نے اس قصیدہ کا عربی میں ترجمہ کرلیا تھا اسے پڑھ کر سنایا اور میرے رسالہ (من العالم إلی جزیرة العرب ومن الجزیرة إلی العالم) کے اشعار میں ترجمہ کی خواہش ظاہر کی، میں نے انھیں ''اسمعی یا مصر '' کا ایک نسخہ ہدیہ کیا وہ اس کو بھی عربی اشعار میں منتقل کرنے کو تیار ہوگئے، انھوں نے منگل کے دن واپس آنے کا وعدہ فرمایا تاکہ میرے لئے اقبال کے بعض اشعار کا عربی اشعار میں ترجمہ کریں۔

شیخ حسنین محمد مخلوف کے گھر میں

بارہ بجے ہم لوگ حلوان کے لئے روانہ ہوگئے اس لئے کہ مصر کے سابق مفتی اور ہیئۃ کبار العلماء کے رکن شیخ حسنین محمد مخلوف کے دولت خانہ حلوان میں دوپہر کے کھانے پر مدعو تھے، راستہ بھر ہم لوگ گاؤں اور دیہات کے منظر سے لطف اندوز ہوئے سفر دلچسپ رہا پہونچے تو شیخ ہمارے منتظر تھے، ہم لوگوں کو خوش آمدید کہا اور ہماری آمد سے خوش ہوئے اور مجھے بتایا کہ کھانے پر ابراہیم عامر صاحب کو بھی بلایا ہے اس اچانک خبر سے مجھے خوشی ہوئی اس لئے کہ ابراہیم عامر صاحب دہلی ریڈیو اسٹیشن پر تھے اور مجھ سے لکھنؤ میں ملے تھے، اور ہندوستان میں عربی زبان کی تعلیم اور ادب عربی کی تعلیم سے متعلق ایک انٹرویو لیا تھا جس کو انھوں نے دہلی ریڈو اسٹیشن سے میری آواز میں نشر کیا وہ دار العلوم ندوۃ العلماء بھی آئے تھے، طلبہ کی عربی انجمن میں بھی شریک ہوئے، اور اخبار ''المصری'' میں اس کا بڑے اچھے انداز میں ذکر کیا تھا، میں دہلی ریڈیو اسٹیشن پر ان سے ملا تھا قاہرہ میں ملنا چاہتا تھا مگر پتہ نہیں

تھا، مفتی صاحب نے اپنے گھر پر بے سان وگمان ہم دونوں کو ملا دیا، تھوڑی ہی دیر میں احمد عثمان صاحب بھی آ گئے، ہمارے ساتھ وہ بھی مدعو تھے، تھوڑی دیر بعد ابراہیم صاحب آ گئے دونوں ایک دوسرے سے مل کر خوش ہوئے اور ہندوستان کی یادوں اور ملاقاتوں کو تازہ کیا، پھر ہم کھانے کے لئے اٹھے۔ مفتی حسنین مخلوف صاحب ہم لوگوں کی ملاقات سے بہت مسرور تھے، ہم کو بڑی مسرت تھی، کھانے کے بعد چائے کا دور چلا اور باتیں شروع ہوگئیں، دوشنبہ کے دن ابراہیم صاحب سے ہندوستانی سفیر سے ملنا طے ہوا، ابراہیم صاحب نے بتایا کہ محترم منصور فہمی باشا مجھ سے ملنا چاہتے ہیں " المجمع اللغوی " میں احمد لطفی السید باشا کے دفتر میں اتفاقاً ہماری ملاقات ہوگئی میں نے اس ملاقات کا خیر مقدم کیا اور منگل کا دن ان سے ملاقات کے لئے طے ہوا۔

ہم لوگوں نے ان سے اجازت چاہی تو انھوں نے اپنے رسالوں اور مضامین میں سے کچھ چیزیں اور اپنے والد کی بعض تصانیف ہدیہ کیں۔

اندھی تقلید جنون سے کم نہیں

ہم لوگ عثمان صاحب کے ساتھ حلوان کا باغ دیکھنے کے لئے نکلے، باغ میں بودھ مت کے مجسّموں کو دیکھ کر میں حیرت زدہ رہ گیا، اس کے علاوہ مجسّموں کی ایک پوری لائن تھی، میں نے اپنے عزیز دوست احمد عثمان صاحب سے کہا اس اسلامی مملکت میں جس کو اللہ نے بتوں سے پاک کیا ہے ان مجسّموں کے نصب کرنے کا کیا محرک ہے؟ کیا آپ بہترین چیز چھوڑ کر بدترین چیز اختیار کرنا چاہتے ہیں۔

انھوں نے طنز کرتے ہوئے کہا یہ باغ جاپانی طرز پر بنایا گیا ہے اور اس کی کوشش کی گئی ہے کہ یہ باغ ہر چیز میں جاپانی باغوں کا مقابلہ کرے حتیٰ کہ تصویروں میں بھی ہو بہو اس کا نمونہ ہو، ہمارے مصری حضرات نے ان مجسّموں پر ہزاروں پاؤنڈ صرف کئے ہیں، ہم نے کہا

''لا حول ولا قوۃ الا باللہ '' غیروں کی تقلید بھی اچھا خاصا پاگلپن ہے۔قاہرہ پہنچنے کے بعد ''الدعوۃ'' کے دفتر گئے اور صالح عشماوی صاحب اور سعد الدین الولیلی سے ملے، ہم دفتر ہی میں تھے کہ عبدالخالق فرید صاحب آ گئے، اس اتفاقی ملاقات سے بڑی مسرت ہوئی، تھوڑی دیر بعد اجازت لی اور اپنی قیام گاہ واپس آ گئے، اور میں اپنے اس مقالہ کی آخری سطریں پوری کرنے میں مشغول ہو گیا جس کو اخوانی دوستوں کے سامنے پڑھنا چاہتا تھا۔

۱۰/۶/۱۳۷۰ھ، ۱۸/۳/۱۹۵۱ء اتوار

گیارہ بجے کے بعد تک بعض خطوط کے جوابات لکھانے اور اس مقالہ کی تیاری میں لگا رہا، جس کو عشماوی صاحب کو دکھانا چاہتا تھا، ۱۲/ بجے ''الدعوۃ'' کے دفتر میں عشماوی صاحب سے ملاقات کی، وہاں ان اخوانی دوستوں سے بھی ملا جو جیل سے نکلے تھے اور عدالت نے ان کے بے خطا ہونے کا فیصلہ دے دیا تھا، میں نے عشماوی صاحب کو اپنا مقالہ دکھایا انھوں نے اسے پسند کیا اور یہ طے ہوا کہ میں پہلے اس کو اخوانی دوستوں کے مخصوص جلسہ میں پڑھوں، اس کے بعد وہ ''الدعوۃ'' میں شائع ہو، اس کے بعد ہم اپنی قیام گاہ واپس آ گئے، اور عصر کے بعد '' العشیرۃ المصریۃ '' گئے، اور اس کے روح رواں زکی ابراہیم صاحب سے ملے، انھیں کے ساتھ مغرب کی نماز پڑھی، وہاں مصر کے بعض مشائخ طریقت کے متعلق علم ہوا اور میں نے ان مشائخ اور ان کے پیشوا جناب احمد الصاوی سے ملاقات کا شوق ظاہر کیا، اتوار کے بعد زکی ابراہیم صاحب نے ہم کو دوپہر کے کھانے پر بلایا، واپسی میں ہمارا پاکستانیوں کی انجمن کی طرف سے گذر ہوا، ہم نے پاکستانی سفیر محمد عبدالستار سیٹھ سے سلام و دعا کی اور اپنی قیام گاہ واپس آ گئے۔

دوشنبہ ۱۱/۶/۱۳۷۰ھ مطابق ۱۹/۳/۱۹۵۱ء

شیخ محمد صادق مجدّدی کے ساتھ

صبح کو جناب سعد الدین الولیلی صاحب نے شرف ملاقات بخشا ان کے بعد ہی

عشماوی صاحب بھی آ گئے اور دونوں حضرات نے میرے ساتھ ناشتہ کیا، پھر بیٹھ کر بے تکلف دوستوں کی طرح باتیں کرنے لگے، کچھ دیر بعد ان دونوں حضرات نے جانے کی اجازت چاہی اور چلے گئے، ہم لوگ ابراہیم عامر صاحب کے انتظار میں رہے اور وہ نہ آئے ،شاید کوئی غیر معمولی رکاوٹ پیش آ گئی، اس کے بعد ہم لوگ ''دار الکتاب العربی'' چلے گئے اور وہاں سے ''اسمعی یا مصر'' کے کچھ نسخے لئے اور پریس کے مالک حلمی صاحب کے پاس گئے کہ وہ طباعت کے مصارف قبول کرلیں مگر انھوں نے انکار کیا، ہم نے کاغذ کی لاگت دینی چاہی انھوں نے اس سے بھی انکار کیا۔

عصر بعد عبد اللہ کابلی ہمارے پاس آئے اور ہم لوگ ان کے ساتھ افغانستان کے سفیر محمد صادق مجدّدی کی ملاقات کے لئے نکلے، محلّہ ''زمالک'' میں واقع افغانی سفارتخانہ میں ان سے ملاقات ہوئی اور دیر تک ان سے گفتگو رہی، انھیں کے پیچھے ہم لوگوں نے مغرب کی نماز پڑھی اور ان کے دونوں صاحبزادوں سے تعارف ہوا، اس ملاقات سے ہم لوگ بہت خوش ہوئے، مجدّدی صاحب صرف افغانی حکومت کی نمائندگی نہیں کرتے، بلکہ اس عظیم خاندان کی بھی نمائندگی کرتے ہیں جس کا ہندوستان کے ہر مسلمان پر احسان ہے، ہمارے ان سے قدیم دینی وروحانی رشتے ہیں، ہمارے جد امجد سید شاہ علم اللہ نقشبندی سید آدم بنوری کے خلیفہ تھے اور وہ طریقہ مجدّدیہ کے بانی امام ربّانی شیخ احمد سرہندی کے خلیفہ تھے۔(۱)

سہ شنبہ ۱۲/۶/۱۳۷۰ھ مطابق ۲۰/۳/۱۹۵۱ء

استاذ مصطفیٰ مومن سے ملاقات

دس بجے ہم لوگ استاذ مصطفیٰ مومن کے پاس گئے، ۱۹۴۷ء میں دہلی میں میں ان

---

(۱) بعد میں میں اس خاندانی کی.....زندگی اسلام اور مسلمانوں کی طرف سے شیخ صبغۃ اللہ مجددی نے کی جن کا افغان جہاد میں بڑا رول رہا تھا اور مجاہدین کی حکومت قائم ہونے پر وہ اول صدر منتخب ہوئے تھے۔ یہ بھی ان کے پوتے تھے اور حضرت بنوریؒ سے نیازمندانہ عقیدت رکھتے تھے (مترجم)

سے مل چکا تھا، وہ ایشیائی کانفرنس میں اخوان المسلمون کے نمائندے کی حیثیت سے آئے تھے، صدیق مکرم مولانا عمران خاں ندوی ازہری کے ساتھ میں ان سے کئی بار ملا تھا اور ہم میں سے ہر ایک دوسرے کو پہچانتا تھا ان کے بارے میں میں نے پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ اخوان المسلمون سے بے تعلق ہوگئے ہیں اور اب رسالہ ''الزمان'' میں مضامین لکھتے ہیں، لیکن تنہا یہ بات میری ملاقات کی راہ میں حائل نہ ہوئی، اس لئے کہ میں نے ان کو ایک ذی علم سرگرم اور فطری صلاحیتوں سے مالا مال مرد مومن پایا تھا، انسانی زندگی بڑی پر پیچ اور متضاد عناصر سے مرکب ہے، آدمی آسانی کے ساتھ کسی دوسرے کی مشکلات اور اس کے فکری نشیب وفراز کو نہیں سمجھ سکتا، بہر حال میں ان سے ملا، دونوں نے ایک دوسرے کو پہچان لیا اور گزرے ہوئے دنوں کی یادہ تازہ ہوگئی۔ میں نے ان سے بے تکلف کہا کہ میں آپ سے ان مصطفیٰ مومن کی حیثیت سے مل رہا ہوں جو اخوان المسلمین کی نمائندگی کے لئے ہمارے ملک ہندوستان آئے تھے نہ کہ رسالہ ''الزمان'' کے مضمون نگار اور عام ادیب ومصنف کی حیثیت سے۔

وہ دہلی کے تھوڑے دنوں کے قیام کو برابر یاد کرتے رہے، اس زمانہ کے واقعات اور ان مجلسوں کا ذکر کرتے رہے جس میں ہماری ایک دوسرے سے شناسائی ہوئی، انھوں نے ''الزمان'' میں شائع کرنے کے لئے مضمون کا مطالبہ کیا تو میں نے ان سے وعدہ کرلیا، وہ ہمیں اپنی موٹر پر ہماری قیام گاہ موسکی تک چھوڑنے آئے ساڑھے چھ بجے '' کلیۃ التجارۃ '' کے طالب علم ابراہیم حسن ابراہیم آگئے، اور مجھے کچھ سوالات دیئے کہ ان کا جواب دوں، میں نے ان سے اس کا وعدہ کرلیا۔

چہار شنبہ ۱۳/۶/۱۳۷۰ھ مطابق ۲۱/۳/۱۹۵۱ء

کلّیۃ الشریعۃ میں

صبح ۹ بجے ہم لوگ کلیۃ الشریعۃ دیکھنے گئے ہم لوگ تھوڑی دیر جناب عیسیٰ منون صاحب شیخ الکلیۃ کے دفتر میں بیٹھے، محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایک بیدار مغز اور لائق منتظم ہیں،

یٰسین الشریف صاحب نے بتایا کہ وہ فلسطینی ہیں، اور ''ہیئۃ کبار العلماء'' اور ''لجنۃ الفتوی'' کے رکن ہیں، انھوں نے اپنی شخصیت اور طلبہ پر اثر کے سبب اس پر قابو پالیا کہ کلیہ میں تعلیم ایسے وقت میں برابر جاری رہے جب کہ دوسری کلیات میں اسٹرائک چل رہی تھی اور تعلیم بند تھی، پھر اصول کے درس میں شریک ہوئے، شیخ عبداللہ موسیٰ اسنوی کی کتاب ''منہاج الوصول فی علم الاصول'' پڑھا رہے تھے، وہ خود ہی ایک سوال قائم کرتے پھر کسی کتاب سے مدد لئے بغیر اس پر بحث کرتے، اس میں شبہ نہیں کہ وہ اپنی تقریر میں بڑی قوت ومہارت کا ثبوت دے رہے تھے ، ازہر کے طریقہ تعلیم کی اجمالی معلومات حاصل کر کے ہم لوگ باہر نکل آئے، ہمارا تأثر ازہر کے دینی مقام کے شایان شان نہ تھا، ہم لوگوں نے وہاں کوئی ایسی دینی روح وفضا نہیں محسوس کی جو سلف کی یاد تازہ کرے اور علماء کی زندگی اور سیرت وکردار سے ہم آہنگ ہو، ہم لوگوں نے ایسا محسوس کیا کہ ہم کسی عصری یونیورسٹی کے شعبۂ علوم مشرقیہ میں ہیں، جس میں نہ روح کی لطافت ہے اور نہ دینی علوم (قرآن وحدیث) کی سکینت نہ اس کے وہ روح پرور جھونکے جس کو ہندوستان کے دینی مدارس میں داخل ہونے والا شخص فوراً محسوس کر لیتا ہے، جہاں تک داڑھی کا تعلق ہے تو ہمارے ازہری علماء نے اس کے غیر ضروری ہونے پر گویا اجماع کر لیا ہو، ہم نے جو کچھ دیکھا اس سے رنجیدہ وکبیدہ خاطر ہو کر واپس ہوئے ہم اپنے ذہنوں میں یہ شک لئے ہوئے واپس ہوئے کہ ازہر اس زمانہ میں بھی اپنا پیغام ادا کر سکتا ہے اور اپنے مقام کی حفاظت کر سکتا ہے، میں مولانا عبیداللہ صاحب کے ساتھ ہندوستان کے دفتر معلومات گیا کہ ابراہیم عامر صاحب سے ملیں اور دوشنبہ کے دن وعدہ کے مطابق نہ پہونچنے کا سبب معلوم کریں۔ ہم بیٹھ کر انتظار کرنے لگے وہ کچھ دیر بعد آئے اور اپنا عذر بیان کیا اور بتایا کہ وہ آج ہم لوگوں سے ملنے گئے تھے مگر وہاں کوئی نہ ملا، اس کے بعد میں ہندوستانی سفارتخانہ میں مسٹر ملہوترا اور پریس اٹیچی سفارتخانہ ہند سے ملا، اردو اخبار ''قومی آواز'' کے ایڈیٹر حیات اللہ انصاری صاحب(۱) ہندوستان کے صحافیوں کے وفد کے ایک رکن کی حیثیت سے مصر آئے تو اپنے بعض دوستوں

---

(۱) حیات اللہ انصاری کا تعلق فرنگی محل لکھنو سے تھا، ان کا تحریک آزادی ہند میں حصہ رہا تھا مہاتما گاندھی اور جواہر لال نہرو وغیرہ سے اچھے مراسم تھے۔

سے کہا کہ وہ میری ان سے ملاقات کرادیں، میں ان سے ملا اور اپنے سفر مصر اور جن شخصیتوں سے ملا، مصری احباب میں جو گرم جوشی وجذبۂ اکرام دیکھا اس سفر میں میری عربی تعلیم نے جو میں نے ہندوستان کے ایک مدرسہ میں حاصل کی تھی جس کی ذمہ داران حکومت کے نزدیک کوئی حیثیت نہیں، سب کچھ میں نے تفصیل سے بیان کیا، میں نے ان سے کہا کہ ان عرب ممالک میں ہمیں اپنی بات پہونچانے میں عربی تعلیم نے ہماری کتنی مدد کی، میں نے ان سے کہا کہ ہمارے ملک کے سربراہوں کو چاہئے کہ ان مدارس کی اہمیت کو سمجھیں اور عربی زبان کی تعلیم کی ہمت افزائی کریں، بہت کہنے اور سمجھانے کے بعد عربوں کو یقین آتا ہے کہ ہندوستان میں بھی انسان عربی زبان سیکھ سکتا ہے اس میں لکھ اور بول سکتا ہے، بغیر اس کے کہ وہ اس زبان کے گہوارہ میں ایک دن کے لئے بھی گیا ہو، مصریوں کو اس پر یقین نہیں آتا تھا کہ میں نے ازہر میں تعلیم نہیں حاصل کی ہے اور مجھے اس سے پہلے کسی عرب ملک کے سفر کا اتفاق نہیں ہوا ہے، میری عربی تعلیم ساری کی ساری ہندوستان کی ہے اور مصر پہلی بار آیا ہوں، میں نے یہ ساری تفصیل اس انداز پر بیان کی کہ ہندوستان کے ذمہ داران حکومت کو اس موضوع پر لکھیں اور متوجہ کریں، ممکن ہے کہ ان کا رویہ ان مدارس کے بارے میں بدل جائے اور ان مدارس سے ان کی بے اعتنائی میں فرق آئے، ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے بعد کوئی خیر کی صورت پیدا فرماوے۔

تین بجے ظہر کے وقت ہمارے پاس طلبہ آگئے بعض ''کلیۃ اصول الدین'' کے تھے بعض ''کلیۃ الآداب'' اور بعض ''کلیۃ اللغۃ العربیۃ'' وغیرہ کے یہ طلبہ دیر تک بیٹھے سوالات کرتے رہے اور میں جواب دیتا رہا۔

مغرب کی نماز ہم نے مسجد سیّدنا حسین میں پڑھی اور مشہور قاری عبد اللہ الصیفی سے ملے اور ان کی معیت میں کچھ دیر احمد عرفہ صاحب کے کمرے میں نشست رہی قاری صاحب نے سورہ حم السجدہ، کی کچھ آیات پڑھ کر عزت افزائی کی، ہم لوگ گفتگو میں مصروف رہے وہیں جلال حسین بک آگئے کہ ہمارے ساتھ '' دار العشیرۃ المصریۃ ''چلیں، وہ اس مجلس میں ہمارے ساتھ عشاء کی نماز تک بیٹھے میں نے محسوس کیا کہ بہت سے دینداروں

کے دل میں شہر کے سر برآوردہ اور مالدار لوگوں کی ضرورت سے زائد عزّت ہے اور ایسی منہ دیکھی بات کرتے ہیں جو چاپلوسی کی حد تک پہنچ جاتی ہے۔

دارالعشیرۃ المحمدیۃ میں جماعت کی تشکیل

ہم لوگ ''دار العشیرۃ المحمدیۃ'' گئے، جناب جلال بک کی ''دار العشیرۃ المحمدیۃ'' میں آمد اچانک تھی اس آمد سے ذکی ابراہیم صاحب خوش ہوئے ہم لوگ ''دار العشیرۃ المحمدیۃ'' کے ذمہ دار کے دفتر سے نکل کر تقریر ہال میں گئے جہاں ذکی ابراہیم صاحب نے العشیرۃ المحمدیۃ کے مقاصد اور اہل صفہ کے نقش پر اس کے قیام اور اس شہر میں اس کی طرف سے بے توجہی پر ایک بلیغ تقریر کی ان کے بعد محترم جلال بک نے موقع ومحل کے مناسب برجستہ تقریر کی اور واپسی کی اجازت لی پھر میں نے تقریر کی جس میں میں نے حاضرین کو عوام سے ربط وتعلق پیدا کرنے کی طرف متوجہ کیا اور ان سے یہ کہا کہ مصری دیہاتوں کی طرف ہفتہ وار جماعت کو نکلنے کا نظام قائم کریں، میرے بعد استاذ عبدالعلیم آئے اور انھوں نے عوامی لیڈروں کے انداز کی تقریر کی جو عوام کے اندر جوش وخروش پیدا کرنے کے لئے بڑے ولولہ انگیز انداز میں کی جاتی ہے اس کے بعد ذکی ابراہیم صاحب اٹھے اور ان کی تقریر کی تائید کی، تقریر اسی قسم کی تقریروں میں تھی جن کو سن کر بالکل کورے واپس ہونے کے لوگ عادی ہو چکے ہیں اس مرض سے خطیب وسامع کوئی خالی نہیں۔

واعظ کا ہر ایک ارشاد بجا تقریر بہت دلچسپ مگر
آنکھوں میں سرور عشق نہیں چہرے پر یقیں کا نور نہیں

وہ ایسی شعلہ بار تقریروں کے عادی ہو چکے ہیں جس کا عشر عشیر بھی عہد اول میں قیامت برپا کر دیتا تھا اور اس سے لوگوں کی زندگی کا ڈھانچہ بدل جاتا تھا، اب عوام اس کے عادی ہو چکے ہیں کہ ان زوردار تقریروں کو سنیں، واہ واہ کریں اور دامن جھاڑ کر اٹھ جائیں میں نے استاذ عبدالعلیم سے کہا ہم لوگوں کو کسی عملی نتیجہ پر پہونچنا چاہئے، میں دلوں کو متأثر دیکھ رہا ہوں،

اس وقت کسی بات پر ان کا آمادہ ہوجانا کچھ بعید نہیں، لہٰذا انھوں نے حاضرین سے کہا کہ وہ جمعہ کے دن دیہاتوں کے سفر میں نکلنے کے لئے کچھ وقت دیں، چنانچہ آئندہ جمعہ کو عامرہ کی طرف نکلنا طے ہوگیا اور بہت سے حاضرین نے اس جماعت میں نکلنے کا وعدہ کیا۔

پنجشنبہ ۱۴/۶/۱۳۷۰ھ مطابق ۲۲/۳/۱۹۵۱ء

استاذ بہی خولی کی کتاب ''تذکرۃ الدعاۃ''

دس بجے استاذ بہی الخولی آئے اور ایک گھنٹہ تک رہے میں نے ان کو اپنا مقالہ ''الدعوۃ الاسلامیۃ فی الھند وتطوراتھا'' پڑھ کر سنایا، انھوں نے اپنی کتاب ''تذکرۃ الدعاۃ'' کے ترجمہ کی تجویز پیش کی، میں نے اس کے لئے اپنی آمادگی کا اظہار کیا۔

ازہری طلبہ کے ساتھ

عصر بعد ہم لوگ بھائی عبدالخالق صاحب پاکستانی کے گھر گئے، ہمارے پہونچنے سے پہلے ان کے پاس ازہر سے ملحق کالجوں کے کچھ طلبہ آچکے تھے، میں نے ان کے سامنے تقریر کی کہ ایمان کو غذا پہونچانے کے لئے ایمانی جذبات کی پرورش بہت ضروری ہے اور شہروں کی فضا اس کے لئے ناسازگار ہے، میں نے ان سے کہا تربیت کے اس پہلو کی طرف ہماری پوری توجہ نہیں، حالانکہ ہم عوام سے کچھ کم اس کے ضرورت مند نہیں ہیں، میں نے ان سے اس تربیت کے بعض پہلوؤں کی وضاحت کی جس میں سیرت کی کتابوں کا مطالعہ صحابۂ کرام کے حالات وواقعات کا مطالعہ شہر کی اس مسموم فضا سے طلبہ کو لے کر شہر کے مضافات واطراف میں نکلنا اور دین کی دعوت دینا شامل ہے، میں نے ان کو بتایا کہ ہم لوگ ''قناطر خیریہ'' جانے والے ہیں وہ ساتھ چلیں تو ہمیں مسرّت ہوگی، ان سب نے نکلنے کا وعدہ کیا، بھائی عبدالخالق صاحب کے گھر سے ہم لوگ جنرل محمد صالح حرب سے ملنے کے لئے جمعیۃ الشبان المسلمین گئے لیکن وہ موجود نہیں تھے، ہم لوگ تھوڑی دیر استاذ عبدالقادر مختار کے پاس

بیٹھے اور اپنی قیام گاہ واپس آ گئے۔

جمعہ ۵۱/۶/۷۰ مطابق ۲۳/۳/۱۹۵۱ء

''قناطر خیریہ'' کی سیر

سات بجے ہم لوگ باب الحدید میں واقع قاہرہ کے بڑے اسٹیشن گئے تاکہ پہلے سے طے شدہ نظام کے مطابق جناب محمد عبد الوہاب البناء اور علی عدلی المرشدی کے ساتھ ''قناطیر خیریہ'' کا سفر کریں، لیکن ہم دیر سے پہونچے اور ٹرین چھوٹ گئی، مجبوراً پھر شبرا آ گئے، ہم لوگ موٹر پر سوار ہوئے اور قناطر پہونچ گئے، وہاں ہندوستانیوں کی بورڈنگ کے نگراں مولانا لقمان ندوی سے ملاقات ہوئی، ہم لوگ قناطر کے باغوں میں گھومے پھرے، پارکوں کی سیر اور درختوں و پھولوں کے درمیان کچھ چہل قدمی کی، ہم نے بندھ کے عظیم نظام کا مشاہدہ کیا جس کے ذریعہ مصر کو یہ موقع ملا کہ نیل کے پانی سے فائدہ اٹھائے اور اپنے کھیتوں اور باغات کو سیراب کرے، اس نظام کو قائم کرنے والوں نے نیل کے پانی سے واقعی بڑا فائدہ اٹھایا ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ پورا علاقہ گھنے باغات میں تبدیل ہو گیا، اس میں داخل ہوتے ہی کشمیر کے شالیمار اور نسیم باغ اور نشاط باغ کی یاد تازہ ہو گئی، اس میں شک نہیں کہ یہاں کے بعض باغات اپنی شادابی اور حسن و جمال میں کشمیر کے باغات کی ہمسری کرتے ہیں، بس اتنا فرق ہے کہ کشمیر کے بعض باغات طبقہ دار ہیں، اور ہر طبقہ یا پلاٹ جداگانہ رنگت رکھتا ہے، یہ سفر بڑا پر لطف رہا جو ہمارے مخلص دوست استاذ محمد عبد الوہاب البناء اور استاذ مرشدی کی عنایت و محبت کا نتیجہ تھا، اللہ تعالیٰ ان دونوں کو جزائے خیر دے۔

جیسا کہ کل طے ہو چکا تھا اسی کے مطابق طلباء کی جماعت بھی پہونچ گئی، ان کے ساتھ راستے سے قلیوب کے بھی کچھ لوگ ہو گئے تھے، ہم لوگوں نے اسٹیشن سے ملی ہوئی مسجد میں جمعہ پڑھا، مسجد کے خطیب جماعۃ الشرعیہ سے تعلق رکھتے تھے، انھوں نے نماز سے پہلے توحید پر ایک مفید اور بہتر تقریر کی، جمعہ کے بعد اس مسجد کے سب لوگ جمع ہو گئے اور میں نے نماز

کے بعد مختصر تقریر کی اس کے بعد استاذ عبدالوہاب البناء نے ہماری جماعت کے بارے میں گفتگو کی اور بتایا کہ اس کا موضوع توحید پر زور، شرک اور غیر اللہ سے مدد طلب کرنے کی نفی، اور خدا سے دعا طلب کرنے کی دعوت وغیرہ ہے اس کا بڑا اچھا اثر ہوا۔

نکلہ میں جماعت کے ساتھ کچھ وقت

نماز بعد ہم لوگ ''نکلہ'' گئے، ہم سے پہلے مولوی معین اللہ ندوی اور مولانا عبید اللہ بلیاوی وہاں جا چکے تھے وہیں ہم لوگوں نے جماعت کے ساتھ کھانا کھایا، اس گاؤں کی آبادی چار ہزار یا اس سے کچھ زیادہ ہوگی ''انصار السنۃ المحمدیۃ'' سے تعلق رکھنے والے وہاں بہت سے لوگ ہیں بلکہ اس کی ایک پوری شاخ قائم ہے، تقریر کے لئے ایک خاص ہال ہے وہاں ہم اپنے بھائیوں سے ملے انھوں نے ہماری بڑی عزّت کی اور ہمارے چاروں طرف جمع ہوگئے، ہم نے ان میں بڑی اچھی صلاحیت محسوس کی، عصر کے بعد میں نے ان کے سامنے ایک مختصر تقریر کی جس میں میں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر جو انعام کرتا ہے ان میں سب سے بہتر و بڑا انعام نعمت توحید ہے جس سے ایسے لوگ بھی محروم ہوئے جن سے زیادہ کوئی نبی سے قریب نہ تھا، یہ اللہ کی دین ہے جس کو چاہتا ہے دیتا ہے، یہ ایسی نعمت ہے جس پر بڑا شکر ادا کرنا چاہئے اور شکر ادا کرنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ آدمی لوگوں میں دینی دعوت اور نشر و اشاعت کا کام کرے۔

''الدعوۃ'' کے دفتر میں

مغرب سے پہلے ہم ٹرین پر سوار ہوئے، میں جناب صالح عشماوی کے وعدہ کا پابند تھا، یہ طے تھا کہ میں ساڑھے چھ بجے ''الدعوۃ'' کے دفتر پہونچوں اور یہاں سے کسی دوست کے ساتھ اس جگہ جاؤں جہاں مکتب الارشاد کے اراکین سے ملاقات ہو۔'' الدعوۃ'' پہنچنے میں تاخیر ہوگئی، وہاں عبدالحفیظ صفی کو اپنا منتظر پایا، ان کے ساتھ جسٹس منیر دلتہ کی کوٹھی پر پہنچنے کے لئے جیزہ کا راستہ اختیار کیا وہاں اخوانی احباب اور ان کے ذمہ دار اور اعلیٰ عہدہ

داروں کا یک منتخب مجمع ملا، اس میں صالح عشماوی، عبدالحکیم عابدین، فرید عبدالخالق، احمد حسن الباقوری جو بعد میں اخوان سے علیحدہ ہوکر جمال عبدالناصر کے عہد میں عرصہ تک وزیر اوقاف رہے، منیا کے معہد دینی کے پرنسپل، کرنل محمود لبیب اور جسٹس منیر دلۃ عبدالحفیظ صفی اور دیگر حضرات موجود تھے۔

صالح عشماوی نے حاضرین سے میرا تعارف کرایا اور بتایا کہ میں نے اس جلسہ کے لئے ایک مقالہ تیار کیا ہے، حاضرین نے اس کو شرف قبولیت بخشا اور میں نے اپنا مقالہ پڑھ کر سنایا، مقالہ کا موضوع تھا" أريد أن أتحدث إلى الاخوان " اخوان سے کچھ صاف صاف باتیں، حاضرین نے مقالہ کو بہت غور اور توجہ سے سنا، ان کے چہروں سے اس کا اثر ظاہر ہو رہا تھا میں مقالہ ختم کر چکا تو عبدالحکیم عابدین صاحب "اخوان کے مشہور خطیب جو امام شہید کے حقیقی بہنوئی اور عرصہ تک اخوان کے سکریٹری جنرل رہے" نے تقریر کی اور بڑے لطیف انداز میں میرے مقالہ کی پذیرائی کی، انھوں نے اس مقالہ میں شیخ حسن البناء کی فکر کی سچی تصویر اور جھونکا محسوس کیا، انھوں نے کہا وہ اور ان کے ساتھی اس برادرانہ رہنمائی سے بہت خوش ہیں اور اس کی بڑی قدر کرتے ہیں، انھوں نے اس مقالہ کے شائع کرنے کی اجازت چاہی، میں نے بڑی خوشی سے منظور کرلیا۔

شنبہ ۱۶/۶/۱۳۷۰ھ مطابق ۲۴/۳/۱۹۵۱ء

اقبال کے بعض اشعار جو میں نے صادی شعلان کو سنائے تھے وہ ان کا ترجمہ لے کر آئے میں نے ان کو "جاوید نامہ" کے بعض وہ فارسی اشعار سنائے جن کو میں بدھ کو دارالعلوم کے مقالہ میں بطور استشہاد پیش کرنا چاہتا تھا، انھوں نے ان اشعار کو ایک کاغذ پر ٹائپ کرلیا پھر میں نے عجیب منظر دیکھا وہ نابینا ہیں مگر بینا کی طرح لکھ رہے تھے اور مشین کام کر رہی تھی، تھوڑی ہی دیر میں ہم نے کاغذ پر کچھ ابھرے ہوئے نقوش دیکھے جو ایک کے اوپر ایک نقطہ کی شکل میں نظر آرہے تھے جیسے بعض نقطے بغل میں تھے صادی شعلان اس کو اس طرح پڑھ

رہے تھے جیسے لکھا ہوا کاغذ پڑھا جاتا ہے، ہم نے جو فارسی اشعار سنائے تھے ان کو انھوں نے ترنم سے پڑھ کر سنایا، بارہ بجے ہم لوگ شیخ بہی الخولی کے پاس قلعہ محمد علی گئے، وہاں اتفاقاً سعید رمضان صاحب مل گئے، ہم دونوں ایک دوسرے سے مل کر خوش ہوئے اور دیر تک باتیں کرتے رہے، یہ اس وقت حکومت پاکستان کی طرف سے مراکش جارہے تھے کہ وہاں کے حالات کا مطالعہ کریں اس سفر میں وہ فرانس، اسپین اور انگلینڈ بھی جانے والے تھے، ایک گھنٹہ بعد صاحب خانہ بہی الخولی صاحب آگئے، ان کے مہمان بھی آئے جن میں عبدالخالق اور منیر دلۃ ابوالمجد عبدالماجد، بنہا کے عبدالحکیم عیسیٰ تھے ہم لوگ کھانے کے لئے بیٹھے، بہی الخولی صاحب نے بڑا تکلف کر رکھا تھا اور بڑے اخلاص ومحبت کے ساتھ ہماری طرف کھانا بڑھا رہے تھے اور اس برادرانہ ملاقات اور ساعتِ سعید سے وہ بہت خوش تھے، عصر کی نماز وہیں پڑھی اور اپنی قیام گاہ واپس آگئے۔

یک شنبہ ۱۷/۶/۱۳۷۰ھ مطابق ۲۵/۳/۱۹۵۱ء

آج میں اپنے اس مقالہ کی تیاری میں مشغول رہا جو دارالعلوم میں اقبال پر پڑھنا تھا، وقت تھوڑا کام زیادہ، وہ کتابیں جن کی ضرورت تھی نا قابل حصول، بڑی تلاش وجستجو کے بعد صرف بانگ درا اور مقالات کے دو مجموعے حکمتِ اقبال اور شاعر الشرق دستیاب ہو سکے جو پروفیسر انور بیگ نے انگریزی میں لکھے تھے، چنانچہ اپنی معلومات اور انھیں کتابوں پر اکتفا کیا اور بنامِ خدا لکھنا شروع کر دیا اور اللہ تعالیٰ نے مدد فرمائی۔

نوجوان مشائخ کے ساتھ

ظہر کے بعد ہم لوگ دارالعشیرۃ المحمدیۃ گئے پھر وہاں سے شیخ ابراہیم کے گھر پہنچے جو بقول ان کے زندوں کے شہر اور شہر خموشاں کے درمیان برزخ کی حیثیت رکھتا ہے اور یہ جدید قاہرہ کے بالکل آخری کنارے پر واقع ہے، وہاں ہمیں کچھ مہمان موجود ملے، کچھ بعد میں آئے جن میں اکثر شیوخ ومعززین تھے، ذکی ابراہیم صاحب نے مختلف سلسلوں کے شیوخ

وسجادہ نشینوں کا ایک منتخب مجمع اکٹھا کرلیا تھا اگر چہ وہ جوان تھے تاہم ان میں بعض پڑھے لکھے اور ادیب تھے، یونیورسٹیوں سے فارغ تھے، جیسے سلسلۂ تفتازانیہ کے شیخ استاذ تفتازانی، یہ جوان ازہر وجامع فؤاد دونوں کے تربیت یافتہ کلیۃ الآداب کے فارغ اور ڈاکٹریٹ کی تیاری میں مشغول تھے، انھیں دیکھ کر پنجاب کے ماڈرن مشائخ کی یاد تازہ ہوگئی جن کو کسی محنت وکدوکاوش کے بغیر وراثۃً منصب مشیخت مل گیا، ان کی روحانی تربیت ہوئی نہ اصلاح۔

کھانے کے بعد ہم لوگ بیٹھے تو اس وقت کے سلاسل اور مشائخ کی ذمہ داریاں کے متعلق میں نے کچھ باتیں کیں، میں نے کہا کہ ان کی اصل طاقت خواہشات نفس کے قید وبند سے آزادی، مادہ پرستانہ قوتوں پر غلبہ پانے اور لوگوں کے جاہ ومال سے بے نیازی برتنے میں پوشیدہ ہے، صرف اسی کے ذریعہ وہ موجودہ مادی ذہنیت سے لڑائی لڑ سکتے ہیں اور اس کے داعیوں کو شکست دے سکتے ہیں اور اپنے دینی وروحانی فرائض کو ادا کر سکتے ہیں، اہل زمانہ کی تقلید یا ان میں گھل مل کر اور دور جدید کے دھاروں میں بہ کر وہ کچھ بھی نہیں کر سکتے، اس لئے تحریک ودعوت اور جوش ونشاط ضروری ہے، ورنہ وہ ضائع ہو جائیں گے اور تہذیب جدید ان کو اسی طرح نگل جائے گی جس طرح وہ اب تک بہت سے مشائخ وعلماء کو نگل چکی ہے، ہم اپنے دوست ذکی ابراہیم کا شکریہ ادا کرتے ہوئے نکلے جنھوں نے اتنا زیادہ ہمارا اکرام کیا اور ایسے منتخب حضرات سے ملاقات کرائی، مجھے شدید تکان اور بخار محسوس ہوا، لہٰذا اپنی قیام گاہ ہی پر رہا، مگر تقریر تیار کرنے سے چارہ کار نہ تھا، لہٰذا کچھ لکھا لیکن میں نے دیکھا کہ تقریروں کی تیاری میں بڑا تکان ہوتا ہے، مضمون میری فکر کو مشغول کر لیتا ہے اور سارا وقت اس کی نذر ہو جاتا ہے، میرا مزاج یہ ہے کہ جب کسی کام کی ذمہ داری لے لیتا ہوں تو اس کو سرسری طور پر نہیں کرتا جیسا کہ بہت سے صحافی اور مصنفین کرتے ہیں، میں اس پر قناعت نہیں کرتا کہ آسانی سے جو کچھ ہو جائے کرلوں بلکہ میں موضوع کا احاطہ کرتا ہوں اور اس کام کو بہترین قالب میں ڈھالنے اور سنوارنے کی کوشش کرتا ہوں لہٰذا اس کی تیاری میں اپنی پوری

طاقت صرف کر دیتا ہوں، یہ میری ایسی مزاجی کیفیت ہے کہ میں اس کے خلاف کرنے پر قادر نہیں۔تقریر کی تیاری نے بہت تھکا دیا لیکن اس سے بہت فائدہ ہوا۔

جناب رشاد عبد المطلب نقشبندی خانقاہوں میں سے کسی خانقاہ کے جلسۂ میلاد میں لے جانے کے لئے آ گئے میں نے ان سے معذرت کر دی۔

دوشنبہ ۱۸/۶/۱۳۷۰ھ، ۲۶/۳/۱۹۵۱ء

مولانا عبید اللہ بلیاوی نے ''اریدان اتحدث الی الاخوان'' سنایا

ظہر کے وقت تک میں تقریر کی تیاری میں مشغول رہا، ظہر کے وقت عبد اللہ العقیل آ گئے، ہمارے ساتھ ظہر کی نماز پڑھی اور اپنے ساتھ گھر لے گئے، انھوں نے اور ان کے ساتھی یعقوب عبد الوہاب نے لذیذ کھانا تیار کیا تھا، یہ کھانا ہمارے ہندوستانی کھانے سے ملتا جلتا تھا ہم نے ذوق کے ساتھ کھایا ان دونوں دوستوں کے اخلاص و محبت نے کھانے کے لطف کو دوبالا کر دیا، کھانے میں ہمارے رفقاء کے علاوہ ان دونوں عراقی بھائیوں کے ساتھ احمد عسال بھی تھے، کھانے کے بعد ہم لوگ بیٹھے اور مولانا عبید اللہ صاحب نے ہمارا مضمون '' أريد أن أتحدث إلى الإخوان '' پڑھ کر سنایا، احمد دمرداشی صاحب بھی آ گئے، عصر کی نماز پڑھ کر ہم اپنی قیام گاہ واپس آ گئے اور پھر تقریر کی تیاری میں لگ گئے۔

سہ شنبہ ۱۹/۶/۱۳۷۰ مطابق ۲۷/۳/۱۹۵۱ء

سید محمود حافظ کی روح پرور قرأت

ظہر سے پہلے مقالہ کی تیاری سے فارغ ہوا اور بڑی راحت و ہلکا پن محسوس کیا، عصر بعد ''کلیۃ اصول الدین''، ''کلیۃ الآداب'' اور ''کلیۃ اللغۃ العربیۃ'' کے تین طالب علم آ گئے، ہمارے دوست محمود حافظ صاحب (جو مکہ مکرّمہ میں سرکاری پریس کے مدیر فنی ہیں) نے عزت بخشی اور مغرب تک ہمارے پاس رہے مغرب کی نماز پڑھائی، ان کی قرأت اور ان کے پیچھے

نماز پڑھنے کے ہم مشتاق رہتے تھے، انھوں نے نماز پڑھائی تو مکّہ مکرّمہ کا ایک روح پرور جھونکا آ گیا۔

سید قطب کا ''اسمعی یا مصر'' پر تاثر

مغرب بعد ہم لوگ جمیعۃ الشبان المسلمین گئے، وہاں مصر کے نامور مسلم ادیب سید قطب سے ملاقات ہوگئی، انھوں نے پہلی ملاقات کے بعد دوبارہ نہ ملنے کی شکایت کی اور فرمایا کہ میں نے آپ کا رسالہ (اسمعی یا مصر) یعنی ''سن اے مصر'' پڑھا، مجھے امید ہے کہ مصر سنے گا، میں نے کہا کہ اگر آپ نے سن لیا تو پورے مصر نے سن لیا۔

آج سید قطب کی کتاب (التصویر الفنی فی القرآن) پر شیخ احمد الشرباصی کے مقالہ پڑھنے کا دن مقرر تھا، انھوں نے بہت اچھے انداز میں کتاب کا تجزیہ کیا اور ان کے پر مغز اور مفید مقالہ سے سب لوگ محظوظ ہوئے میں نے سید قطب صاحب کو منگل کے دن اپنے مقالہ پڑھنے کی خبر دی تو انھوں نے آنے کا وعدہ کیا اور ہم اپنی قیام گاہ واپس آ گئے۔

چہار شنبہ ۲۰/۶/۱۳۷۰ھ مطابق ۲۸/۳/۱۹۵۱ء

ڈاکٹر اقبال پر میرا مقالہ

ظہر سے قبل اپنی تقریر میں اقبال کے بعض اشعار کے ترجمہ کے اضافہ میں مشغول رہا، جس کو میں نے دار العلوم کے لئے تیار کیا تھا، عصر بعد ہم لوگ دار العلوم کے طالب عالم احمد علی عبد اور بھائی یٰسین الشریف کے ساتھ دار العلوم کے لئے روانہ ہوئے، اور پانچ بجے سے پہلے پہونچ گئے اور اس کے دفتر میں بیٹھے، دار العلوم میں تاریخ اسلامی کے پروفیسر محمد مبروک سے ملاقات ہوئی، وہ دار العلوم کی تاریخ اور مصر میں اس کی اہمیت اور کردار کے بارے میں گفتگو کرتے رہے، لکھنؤ میں دار العلوم ندوۃ العلماء اور اس کی امتیازی خصوصیات اور خدمات کے بارے میں بھی گفتگو ہوتی رہی، اس کے بعد ہم لوگ علی باشا مبارک ہال

میں داخل ہوئے جو طلباء وسامعین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا، پروفیسر محمد مبروک نے میرا تعارف کرایا اور میں نے اپنا مقالہ پڑھنا شروع کیا۔

اخوانی نعروں اور پرجوش تالیوں کی گونج میں تقریر بار بار روکنی پڑتی اور مقالہ نگار کی آواز دب کر رہ جاتی، اخوانی عنصر جلسہ میں زیادہ نمایاں و پرجوش تھا، ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اقبال کا کلام اور اس پر تبصرہ ان کے دل کی آواز اور احساس کی ترجمانی کر رہا ہے، مقالہ نے ان کے دینی جذبات کو ابھار دیا، تسکین بخشی اور انھوں نے بڑی قدر اور جوش کے ساتھ اس کا خیر مقدم کیا، مقالہ ختم ہوا تو پروفیسر مبروک نے ایک مختصر تقریر کی پھر ایک طالب علم نے ایک قصیدہ پڑھا اس کے بعد استاذ فرید عبدالخالق نے ایک پرجوش تقریر کی اس کے بعد ہم لوگ دفتر آ گئے جہاں مغرب کی نماز پڑھی، نماز کے بعد ہم لوگ اقبال، جدید نسل، نیز عالم اسلام کے متعلق معاملات پر باتیں کرنے لگے، اس گفتگو میں ''کلیۃ اصول الدین'' کے استاذ فلسفہ ڈاکٹر محمد یوسف موسیٰ نے بھی حصہ لیا۔

اخوان المسلمین کے سکریٹری جنرل استاذ عبدالحکیم عابدین دار العلوم کے استاذ ادب پروفیسر عمر الدسوقی، استاذ فرید عبدالخالق وغیرہ بھی شریک گفتگو رہے۔

پروفیسر عمر الدسوقی ان لوگوں میں سے تھے جنھوں نے مقالہ کو بہت پسند کیا، وہ اقبال کی شخصیت سے بہت متأثر تھے، انھوں نے مقالہ کی اصل روح و بنیاد کو سمجھا۔ انھوں نے کہا کہ اقبال کو ان کے ہمعصروں میں جو چیز سب سے ممتاز کرتی ہے وہ ان کا پیغام ہے، انھوں نے اپنے پیغام اور درد دل کو قوم تک پہونچانے کے لئے شاعری سے کام لیا، افسوس کا مقام ہے کہ ہمارے موجودہ شعراء صاحبان میں پیغام نہیں۔

انھوں نے کہا کہ میں نے جدید عربی شاعری پر ایک کتاب لکھی ہے۔

دسوقی صاحب ہمارے استاذ ڈاکٹر تقی الدین ہلالی کے شاگردوں میں ہیں انھوں نے بون یونیورسٹی (جرمنی) میں ان سے پڑھا ہے، وہ ہمارے دوست مولانا مسعود عالم صاحب ندوی سے واقف نکلے، وہ ۱۹۳۶ء میں الفتح کے مقالہ نگاروں میں سے تھے۔

جامع قادریہ میں

دار العلوم سے ہم لوگ جامع قادریہ گئے کہ اخوان کے ایک تربیتی پروگرام میں شریک ہوں، عشاء کی نماز پڑھی اور بیٹھ گئے، بہی الخولی صاحب کے آنے میں تاخیر ہوئی تو اخوانی احباب نے مجھ سے تقریر کرنے کو کہا، چنانچہ میں نے ایمان کی تربیت اور اس کو غذا پہونچانے کے موضوع پر تقریر کی، پھر بہی الخولی صاحب آگئے اور انھوں نے درس دیا، جس میں بعض آیات کی تفسیر و تطبیق کی، تقریر علمی بلندی اور فہم قرآنی کی غماز تھی، تاخیر سے ہم لوگ اپنی قیام گاہ واپس آگئے۔

پنج شنبہ ۲۱/۶/۱۳۷۰ھ مطابق ۲۹/۳/۱۹۵۱ء

ازہر کا پیغام کیا تھا؟

چار بجے ہم لوگ استاذ فرید عبد الخالق کے گھر گئے، آج شام ۵ر بجے ''جبہۃ علماء ازہر'' کے اراکین سے ہمارا ملنا طے تھا، لہٰذا ہم دیر تک بیٹھ نہ سکے کہ طلبہ سے باتیں کرتے لہٰذا ہم جبہۃ ازہر کے لئے نکلے، جب ہم لوگ وہاں پہنچے تو ازہر کے بڑے بڑے علماء کی ایک جماعت موجود تھی، شیخ احمد الشرباصی آگے بڑھے اور یہ تجویز رکھی کہ ہندوستان سے جبہۃ (کمیٹی) کا ثقافتی ربط ہو اور ازہر اور ہندوستان کے دینی مدارس کے طلبہ میں باہم خط و کتابت ہو، دعوتی سفروں کی تنظیم ہو، دیہات اور گاؤں میں دینی کام کا آغاز کیا جائے پھر میں اٹھا اور ان کی اس تقریر کا مناسب جواب دیا، میں نے ازہر سے باہر دینی دعوت کے کام کی طرف ان کو متوجہ کیا اور قوم کو دین کی بنیادی باتوں کے قبول کرنے کے لئے تیار کرنے اور ان کی دینی تربیت کرنے پر زور دیا۔

میں نے کہا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے کی مدارس کی جڑیں ان کے اندر ہیں، اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ وہ ان کے باہر ہیں اور عوام کے دلوں میں پیوست ہیں، جب قوم زندہ ہوتی ہے تو مدارس اپنی غذا و سیرابی اسی مٹی سے حاصل کرتے ہیں اور آباد و شاداب ہوتے

ہیں، جب قوم یا معاشرہ مرجھا جائے اور اس میں غذائیت وسیراب کرنے کی صلاحیت باقی نہ رہے تو مدرسہ کی رگوں، شاخوں اور پتّوں میں بھی پژمردگی آجائے گی اور پھر مصنوعی طریقوں سے شادابی اور تازگی کا بحال کرنا ممکن نہ ہوگا، جب قوم میں دینی رجحان اور دین کی فکر ہوگی اور علم کی ضرورت کا احساس پایا جائے گا تو فطری طور پر مدارس کی طرف اس کا رجحان بڑھے گا اور جب قوم دین سے رخ پھیر لے گی اور اس کی طرف سے بے توجہ ہوجائے گی تو اس کے نتیجہ میں لازمی طور پر وہ مدارس سے بھی بے تعلق ہوجائے گی، لہٰذا عوام میں دینی بیداری، اور علم کا احساس پیدا کرنا بہت ضروری ہے، اگر یہ بات پائی جاتی ہے تو آپ یقین رکھیں کہ قوم کو مدارس کی تعمیر وتوسیع سے کوئی چیز نہیں روک سکتی، مدارس کو اس کی طرف سے ہر طرح کا تعاون وہمت افزائی اور توجہ حاصل ہوگی اور اگر ایسا نہیں ہے تو مدرسے الگ تھلگ جزیروں کے مانند ہوں گے، قوم ان کی باغی اور ان کے خلاف ہوگی تعاون تو کُجا وہ ان کے راہ کا روڑا بنے گی۔

دوسری بات یہ ہے کہ اسلامی ممالک سے آنے والے طلباء کی طرف توجہ دینا، ان کو اسلامی تہذیب کے سانچے میں ڈھالنا، ان کی دینی واخلاقی تربیت کرنا اور ان کی اخلاقی اصلاح کی طرف توجہ دینا بھی ازہر کی ذمہ داری ہے۔ طلباء کے یہ وفود اور جماعتیں اسلامی وغیر اسلامی ملکوں سے ازہر کا رُخ اسی وجہ سے کرتی ہیں، انھیں یہ امید ہوتی ہے کہ ''ازہر شریف'' سے جو دنیا کی سب سے بڑی دینی یونیورسٹی اور دین کا مرکز ہے، ان کو ہر طرح کی تقویت اور رہنمائی حاصل ہوگی لیکن ان کی امیدیں اکثر بارآور نہیں ہوتیں۔

آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ عالم عربی اور عالم اسلام کے نوجوان آوارہ وآزاد مارے مارے پھر رہے ہیں اور بے مقصد زندگی گزار رہے ہیں، انھیں کوئی مربّی ورہنما نہیں ملتا، یہ بڑا دینی المیہ اور ازہر پر ایک بدنما دھبّہ ہے، اگر ازہر اور اس کے علماء ان نوجوانوں کو صحیح رُخ پر لگائیں اور موقع کو غنیمت سمجھیں تو یہ ان کا بڑا کارنامہ ہوگا۔

اس تقریر کی ''جبہۃ'' کے اکثر اراکین نے تائید کی، ان خیالات سے اتفاق کیا اور

یہ طے ہوا کہ جمعہ کے دن اس مجلس کے ہونے والے جلسہ میں ان تجاویز وخیالات پر اچھی طرح غور کیا جائے گا۔

دین کی حفاظت، ملحدین کے ناپاک عزائم کو ناکام بنانے اور حفاظت قرآن کے سلسلہ میں ''جبہۃ'' نے بلاشبہ اہم خدمات انجام دی ہیں اس کی سرگرمی اور فرض شناسی کا اندازہ ایک کتاب ''الفن القصصی فی القرآن'' پر تنقید اور لڑکیوں کی آزادی و بے باکی کی مخالفت اور اس طرح کی دوسری باتوں سے کیا جاسکتا ہے، اس جلسہ میں ''جبہۃ'' کے صدر کے علاوہ جماعت ''کبار العلماء'' کے رکن شیخ محمد الشربینی، ''کلیۃ اصول الدین'' کے پروفیسر جناب ابراہیم نجار، جامعۃ فؤاد کلیۃ الآداب کے استاذ احمد الشائب، شیخ محمود خلیفہ، شیخ یوسف شلبی، ڈاکٹر محمد یوسف موسیٰ، جناب احمد علی، صالح بکیر اور شیخ عبدالعظیم برکت اور دوسرے ممتاز اہل فکر ادباء شریک تھے۔

جمعہ ۲۲/۶/۱۳۷۰ھ، ۳۰/۳/۱۹۵۱ء

عزیزیہ میں

صبح سویرے گھر سے نکلے اور شیخ محمد الغزالی کے ساتھ ہم لوگوں نے ''بنہا'' کا سفر کیا وہاں ہمیں الحاج عبداللہ نبراوی کے یہاں جانا تھا۔ ہم اچانک ان کے یہاں پہونچے، ہماری اس اچانک ملاقات سے نبراوی صاحب بہت خوش ہوئے اور اس طرح شوق ومحبت سے استقبال کیا، جیسے بزرگ خاندان اور اعزہ اپنے چھوٹوں کا استقبال کرتے ہیں، وہ ایسے مسرور تھے جیسے ہم کوئی بیش قیمت تحفہ لائے ہوں، اس اچانک ملاقات کی خوشی کو وہ چھپا نہ سکے، ہماری ضیافت وناشتہ کے لئے گھر میں ہنگامہ مچادیا، ان کے اس سلوک نے شفقت پدرانہ اور عرب مہمان نوازی کی یاد تازہ کردی۔

''بنہا'' سے ہم لوگ عزیزیہ کی ٹرین پر سوار ہوئے، وہاں پہونچے تو اخوان کی ایک بڑی تعداد ہماری منتظر تھی، ہم ایک جلوس کی شکل میں الحاج عبداللہ عامر کے فارم گئے اور

وہاں بیٹھے، قریب کے گاؤں اور آبادیوں سے لوگوں کی ٹولیاں کی ٹولیاں چلی آرہی تھیں، ایسا محسوس ہورہا تھا جیسے کوئی خوشی کی تقریب ہے، تھوڑی تھوڑی دیر میں آنے والوں کی نئی نئی آوازیں بلند ہوتیں، یہ عزیزیہ کے لئے ایک یادگار دن تھا۔ پھر ہم دوستوں کی ایک بڑی جماعت کے جلو میں مسجد کے لئے اس طرح نکلے کہ ہمارے گرد دوست واحباب کے بڑے بڑے ہالے بنے ہوئے تھے، شیخ محمد العز نے نماز پڑھائی اور تقریر کی، اس کے بعد میں نے تقریر کی، مسجد سے نکل کر عبداللہ عامر کے مکان میں نشست ہوئی اتنے میں کھانا آگیا، ایک بڑی تعداد نے جو دوسو کے قریب رہی ہوگی، الحاج عبداللہ کے دسترخوان پر کھانا کھایا، کھانے کے بعد جب بیٹھے تو احباب میرے رسالہ (اسمعی یا مصر) پر جھپٹ پڑے، جب رسالہ کے نسخے ختم ہوگئے تو ملاقاتی کارڈوں کے لینے کا سلسلہ شروع ہوا اور مجھ سے مطالبہ شروع کیا کہ اس پر دستخط کردوں، ان کے شوق وطلب کو دیکھ کر میں نے دستخط کردیئے، یہاں سے نکل کر ہم نے استاذ محمد غزالی صاحب کو چھوڑ دیا اور ایک اخوانی دوست کے یہاں ٹھہرے، میں بہت تھک چکا تھا وہاں مغرب کے قریب تک رہا، وہاں سے نکلے تو اردگرد دوستوں کا ہجوم تھا، ان کے درمیان ہمارے دوست الحاج عبداللہ محمد محسن، الحاج عبدالدائم الشمونی، اور الحاج عبداللہ عامر تھے، یہ حضرات بار بار خیر مقدمی الفاظ کہتے اور تھوڑی تھوڑی دیر پر اپنی محبت کا اظہار کرتے، اور نعرے بلند ہوتے، اس طرح ہم الحاج عبداللہ عامر کے فارم پہونچ گئے اور قریب کی ایک مسجد میں مغرب کی نماز پڑھی، نماز اپنی سوز بھری آواز میں جناب السید راضی صاحب نے پڑھائی، اس کے بعد پھر ہم الحاج عبداللہ عامر کے گھر واپس آگئے، اور اب پھر ملاقاتی کارڈوں کا سلسلہ شروع ہوگیا، کچھ دوستوں نے کارڈوں کو سنبھال کر رکھ لیا تھا، انھوں نے دستخط کرنے اور بطور یادگار کچھ اور لکھنے کا مطالبہ کیا، میں نے ان کے شوق کو پورا کیا، بعض اہل مجلس نے ہندوستان کے متعلق کچھ سوالات کئے میں نے جوابات دیئے، شام کو ہم لوگ اسٹیشن کے لئے روانہ ہوئے تو ساتھ میں احباب کا ایک ہجوم تھا جو ٹرین چھوٹنے کے بعد ہی ہم لوگوں سے الگ ہوا، جس شوق اور گرم جوشی سے وہ ملے اس نے ہندوستان میں خلافت

تحریک کی یاد تازہ کردی اور اخلاص ومحبت کی ناقابل فراموش تصویر پیش کی۔

شنبہ ۲۳/۶/۱۳۷۰ھ مطابق ۳۱/۳/۱۹۵۱ء

سیّد قطب کے ساتھ

ہم لوگ استاذ سیّد قطب سے ملنے کے لئے حلوان گئے اور وقت مقررہ سے لیٹ پہونچے، چار بجے کا وقت مقررہ تھا وہ ہمارے انتظار میں تھے، انھوں نے میرے مقالہ (محمد اقبال شاعر اقبال) کا ذکر کیا اور کہا کہ اس مقالہ سے میں بہت خوش ہوا، مجھے اقبال کی فکر اور اپنے نقطۂ نظر میں حیرت انگیز یکسانیت محسوس ہوئی، یہ یکسانی مضامین وخیالات سے متجاوز ہوکر الفاظ وتعبیرات تک پہونچ گئی، خصوصًا ان چیزوں میں جو روح ووجدان سے تعلق رکھتی ہیں، مجھے اقبال اور ان کے کلام کے پڑھنے کا بڑا شوق ہے اسی وجہ سے میں نے اپنی کتاب (لحظات مع الخالدین) کی تالیف کو مؤخر رکھا ہے، ہمیں یقین ہے کہ آپ اقبال پر شائع ہونے والی کتابوں اور ان کے کلام کو مہیّا فرمائیں گے میں نے ان سے وعدہ کیا، انھوں نے اس امید کا اظہار کیا کہ میں مصر چھوڑنے سے قبل برابر مقالے پڑھتا رہوں گا، پھر زیر تالیف ان کی نئی کتاب (الاسلام دین السلام) کا ذکر ہونے لگا پھر وہ اس کے کچھ اوراق جو اس وقت تک لکھے ہیں لے کر آئے اور پڑھ کر سنایا، میں نے ان سے کہا کہ آپ ہندوپاک کے سفر کا ارادہ نہیں رکھتے؟ فرمایا کیوں نہیں اس کے سیر کے دو محرک ہیں، ایک دینی اور دوسرا طبعی، رہا دینی محرک تو ظاہر ہے میری یہ خواہش ہے کہ اس عظیم مسلم قوم کو دیکھوں، طبعی ذوق کا محرک یہ کہ میری چھٹی پشت میں میرے دادا ہندوستانی تھے اور میرے خاندان میں ہندوستانی رنگ وروپ پشتہا پشت سے ابھی تک چلا آرہا ہے، ہم لوگ اس بات سے بہت خوش ہوئے اور ان پر زور دیا کہ وہ یہ سفر ضرور کریں، ان کی تصنیفات میں سے جو چیزیں باقی رہ گئی تھیں وہ انھوں نے ہدیہ کیں، مثلاً (النقد الادبی 'کتب وشخصیات' 'طفل من القریة' 'اشواك' میرے ساتھیوں کو العدالة الاجتماعیة فی الاسلام اور التصویر الفنی فی

القرآن اور مشاهد القيامة فى القرآن ہدیہ کیں، مجھ کو یہ کتابیں وہ پہلی ملاقات میں دے چکے تھے، میں نے ان سے کہا کیا" ماذا خسر العالم " پڑھنے کی آپ کے وقت میں گنجائش ہوگی؟ تو انھوں نے جواب دیا کہ میں نے اس کو پڑھنا شروع کر دیا تھا اور وہ ابتدائی فصلیں جن میں قبل از اسلام کے ادیان، اور اس وقت کی عقلی و اخلاقی حالت سے بحث کی گئی ہے پڑھ چکا ہوں، یہ مباحث فکر کو روشن کرتے ہیں، مگر اس کے بعد (مجلس مذاکرہ) کے کسی رکن نے اس غرض سے لے لیا کہ اس پر مقالہ پیش کریں، آئندہ جمعہ کو اس کا پروگرام ہے پھر میں نے ان سے اجازت لی اور مصر آ گئے۔

یکشنبہ ۲۴/۶/۱۳۷۰ھ مطابق ۱/۴/۱۹۵۱ء

ازہر کے ترک طلباء سے باتیں

ہم نے بھائی ضیاء الدین علوی ترکی سے جو ہمارے دوست علی علوی آفندی ثم مدنی کے بھائی ہیں، یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ ازہر کے ترک طلباء کا ایک جلسہ کریں، جس میں ہمیں ان سے بات کرنے اور تعارف حاصل کرنے کا موقع ملے (۱) چنانچہ انھوں نے مغرب بعد بغداد ہوٹل میں ایک جلسہ کیا جس میں ترک طلباء کی اچھی تعداد جمع ہوگئی ان کی ملاقات اور تعارف سے ہمیں بڑی مسرّت ہوئی اور ان میں زندگی و نشاط دیکھ کر تقریر کرنے کا داعیہ پیدا ہوا، اور ان کے شاندار ماضی، اسلاف کے حسن کردار نیز ان کے یادگار اسلامی کارناموں کی تصویر نگاہوں میں پھر گئی، میں نے محسوس کیا کہ اس عظیم قوم کے یہ نوجوان مصر میں ضائع ہو رہے ہیں، یہاں ان کو نہ کوئی ہمّت افزائی کرنے والا ملتا ہے نہ علمی میدان میں مدد کرنے والا اور دینی فکر و رجحان پیدا کرنے والا نظر آتا ہے، وہ اس شاداب و زرخیز کھیتی کی طرح ہیں، جس کی نہ کوئی سنچائی کرنے والا ہے، نہ دیکھ بھال و حفاظت کرنے والا، جانور اس میں چرتے اور اس کو تباہ کرتے ہیں۔

---

(۱) اس زمانہ کے ترک طلبہ میں جو ازہر میں پڑھ رہے تھے حضرت مولاناؒ سے قریبی ربط قائم کرنے والوں میں شیخ امین سراج خاص طور پر ممتاز ہوئے، انہوں نے حضرت مولاناؒ سے حکمت دعوت کا جو طریقہ سمجھا اس کو ترکی میں اختیار کیا جس کے شاندار نتائج آج دنیا کے سامنے ہیں (مترجم)

میں نے تقریر شروع کی اور ترکوں سے ہندوستانی مسلمانوں کو جو روحانی تعلق ہے اور تحریک خلافت کے زمانہ میں ترکوں کی خاطر انھوں نے جو مصائب وآلام جھیلے ان پر روشنی ڈالی نیز تاریخ اسلام میں ترکوں نے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں اور اپنی یادگاریں چھوڑی ہیں ان کا ذکر کیا، پھر میں نے کہا: عزیز طلبہ! آپ کی ذمہ داری بہت بڑی اور اہم ہے میں نہیں سمجھتا کہ دوسرے مسلم نوجوانوں کی ذمہ داری اتنی اہم ہوسکتی ہے، جتنی آپ کی، جب آپ اپنے ملک واپس جائیں گے تو آپ کو ایسی پر پیچ مشکلات اور نازک مسائل سے سابقہ پڑے گا جس سے دوسرے اسلامی ملکوں کے نوجوانوں کو سابقہ نہیں پڑتا، اسی طرح مصر میں بھی آپ کی ذمہ داری زیادہ ہے، مصر میں رہنے اور دینی تعلیم حاصل کرنے کا ایک زرّیں موقع آپ کو ملا ہے، نفس کی اصلاح وتربیت اور اسلام کو اچھی طرح سمجھنے کا اس سے بہتر موقع آپ کو نہیں ملے گا، مگر ساتھ ہی ساتھ آپ اس کا بھی یقین رکھیں کہ یہاں آپ کی کوئی مدد نہ کرے گا، آپ کی مدد تو بس آپ کا احساس ذمہ داری اور جذبۂ خود شناسی ہی کرسکتا ہے، لہٰذا آپ خود اپنے بہی خواہ مخلص ووفادار بنیں، آپ یہ سمجھ لیں کہ آپ کا ہر لمحہ جس کو آپ اس ملک میں گزار رہے ہیں وہ آپ کی قوم کی ملکیت ہے، اور آپ اس کو اپنی قوم کے اندوختہ میں سے خرچ کررہے ہیں، آپ اس کے خرچ میں احتیاط سے کام لیں اور اس کو ضائع کرنے سے بچائیں اور اس کو خوب سوچ سمجھ کر خرچ کریں، آپ اس قوم کے بارے میں خدا سے ڈریئے جس نے آپ کو بھیجا اور آپ پر اعتماد کیا، اور آپ سے امید وآس لگائے بیٹھی ہے، پھر میں نے ان کو بتایا کہ وہ اس موقع کو غنیمت جانیں اور اس سے فائدہ اٹھائیں، میں نے ان کو کچھ مشورے دیئے اور نصیحتیں کیں۔

منجملہ ان باتوں کے جو میں نے ان سے کہیں، ایک بات یہ بھی تھی کہ آپ کی ذمہ داری یہ ہے کہ آپ اسلام کو اچھی طرح سمجھیں، اس کا طریقہ یہ ہے کہ آپ قرآن وسنّت اور سیرت نبوی کا مطالعہ کریں، میں نے ان کو تلاوت قرآن پاک اور اس میں غور وفکر کرنے کا طریقہ بتایا اور کہا کہ یہ سمجھ کر قرآن پڑھیں کہ جیسے ابھی اترا ہے اور ہمارے ہی لئے اترا ہے، میں نے کہا اس طریقۂ تلاوت سے آپ قرآن پاک کا صحیح مطلب اخذ کرسکیں گے، اور اس میں آپ کو مزا آئے گا۔

آپ روحانی واخلاقی تربیت کا بھی خیال رکھیں، فرائض کی پابندی کریں اور اخلاقی آزادی سے بچیں نیز اوقات کو ضائع کرنے سے پرہیز کریں لایعنی و بے سود باتوں سے دور رہیں، آپ کے لئے ہمہ وقت یہ سوچتے رہنا بھی ضروری ہے کہ جب آپ یہاں سے اپنے وطن واپس جائیں گے تو اس کی دینی خدمت کس طرح کریں گے آپ ابھی سے اس کے لئے تیاری کریں، اس تیاری کے وسائل میں سے مختلف اسلامی ممالک کی دینی تحریکوں، مجددین کی تاریخ اور تعلیم کے خاکوں اور تحریک ودعوت کے طرز اسلوب سے واقفیت پیدا کریں، یہاں کے زمانۂ قیام میں اس کی مشق کرتے رہنے کی ضرورت ہے، آئندہ جلسہ میں انشاء اللہ بعض اسلامی ملکوں کی کچھ دینی تحریکوں کی وضاحت وتشریح کروں گا۔

پھر میں نے ان کو بعض ان کتابوں کے مطالعہ کا مشورہ دیا جو اسلامی فکر کی وضاحت اور دینی روح کو بیدار کرتی ہیں، صحیح اسلامی فکر اور ان مسائل کا سامنا کرنے کے لئے تیار کرتی ہیں جو اس وقت رونما ہو رہے ہیں، بعض حاضرین نے ان کتابوں کے نام نوٹ کر لئے اور جن کتابوں کا مشورہ دیا گیا تھا ان کو پڑھنے کا شوق ظاہر کیا۔

اس کے بعد علی ارسلان نامی ایک ترک طالب علم نے جس کے چہرے سے ذہانت وہوش مندی کے آثار نمایاں تھے میری تقریر پر اپنی ترکی زبان میں تبصرہ کیا۔

اس جلسہ سے ہمیں بہت مسرت ہوئی کاش کہ اس کا سلسلہ جاری رہتا اور دوسرے ملک کے طلباء بھی ایسے جلسوں کا اہتمام کرتے جیسے سوڈانی، اریٹری، اور مراکشی فلسطینی اور ان کے علاوہ دوسرے ملکوں کے طلباء، میرا یہ نظریہ ہے کہ صرف علم ومطالعہ ہرگز کافی نہیں، جب تک کہ اس کے ساتھ کوئی پیغام وفکر، مقصد وروح اور دینی رجحان نہ ہو اور یہ بات ان غیر رسمی مجلسوں اور ان شخصیتوں کے بغیر ممکن نہیں جو فی سبیل اللہ اس خدمت کو انجام دیتے ہیں، ازہر میں جو مسائل ہیں ان کے ہوتے ہوئے میں نہیں سمجھتا کہ اس کام کے لئے ان کو فرصت ملے گی۔

دوشنبہ ۲۵/۶/۱۳۷۰ھ مطابق ۲/۴/۱۹۵۱ء

ہمارے دوست شیخ علی محمود الشریف شبرا میں اپنے مکان کے ایک اہم حصّہ کی تعمیر سے

فارغ ہوئے اور اپنے متعلقین کے ساتھ وہاں منتقل ہو گئے، ہم لوگوں کو اس نئے گھر میں کھانے پر مدعو کیا، ہم نے ان کی دعوت قبول کر لی، انھوں نے اپنے بعض دیگر دوستوں کو بھی بلا رکھا تھا، کھانے سے فارغ ہو کر ظہر بعد تک ہم انھیں کے یہاں رہے پھر اپنی قیام گاہ واپس آ گئے، آج میں بہت تھکا ہوا تھا، پچھلی رات نیند پوری نہیں ہوئی تھی لہٰذا گھر آیا اور دوبارہ باہر نہ نکلا۔

سہ شنبہ ۲۶/۶/۱۳۷۰ھ مطابق ۳/۴/۱۹۵۱ء

عبدالرحمٰن عزام (سکریٹری جنرل عرب لیگ) سے ملاقات

صبح کو استاذ محمد رشاد عبدالمطلب ہمارے یہاں سے گزرے اور ہم کو بتایا کہ انھوں نے آج ۱۲ر بجے کے وقت محترم عبدالرحمٰن عزام باشا سے ملاقات کا وقت طے کیا تھا، ایسا ہی ہوا، ہم لوگ عرب لیگ کے صدر دفتر گئے، دفتر میں میرے موجود ہونے کی کسی نے اطلاع نہ کی، وقت مقررہ ختم ہونے کے قریب ایک ملازم نے ان کو بتایا تو انھوں نے فوراً مجھے بلا لیا اور معذرت کی کہ مجھے آپ کے یہاں ہونے کی اطلاع نہیں ہوئی اور کہا کہ اس وقت وزیر خارجہ محترم صلاح الدین کی ملاقات کا وقت مقرر ہے مجھے کوئی دوسرا وقت چاہئے جس میں بیٹھنے اور بات کرنے کا زیادہ وقت ملے، میں نے ان سے اس کا وعدہ کر لیا اور ان کو ''ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین'' کا ایک نسخہ اور دوسری چھوٹی کتابیں ہدیہ کیں، شیخ محمود شویل مکی کا خط بھی ان کی خدمت میں پیش کیا، اور یہ خواہش ظاہر کی کہ دوسری ملاقات سے قبل کتاب کا آخری باب پڑھ لیں انھوں نے اس کا وعدہ کیا۔

شیخ احمد محمد شاکر کے مکان پر

عصر بعد ہم لوگ شیخ احمد محمد شاکر کے یہاں گئے اور مصر جدیدہ میں واقع ان کے مکان پر ان سے ملاقات کی اور مغرب تک ان کے پاس بیٹھے، انھوں نے خواہش ظاہر کی کہ جس دن ہم مناسب سمجھیں ان کے ساتھ دوپہر کا کھانا کھائیں، انھوں نے یہ امید ظاہر کی کہ ہمارے دوست شیخ محمد بن مانع مدیر تعلیم مملکت سعودیہ کے بیٹے احمد بھی آئیں گی۔ فرمایا کہ وہ اس سلسلہ میں ان سے بات کر کے وقت مقرر کریں گے، میں نے ان سے والد

صاحب مرحوم کی کتاب ''معارف العوارف'' کی طباعت کے لئے بات کی، مطبوعات کا ایک لمبا پروگرام پہلے سے بن جانے کی وجہ سے دار المعارف نے اس کی طباعت سے معذرت کردی وہاں سے ہم اپنی قیام گاہ آ گئے۔

چہار شنبہ ۲۷/۶/۱۳۷۰ھ مطابق ۴/۴/۱۹۵۱ء

فلسطینی طلبہ کے جلسہ میں

میں نے بھائی یٰسین شریف سے خیال ظاہر کیا تھا کہ وہ فلسطینی طلبہ کا ایک جلسہ کریں انھوں نے ان کی انجمن کے ہفتہ وار اجتماع کے موقع کو غنیمت سمجھا اور مجھے وہاں کی دعوت دی، میں اس اجتماع میں حاضر ہوا اور میں نے کچھ بات بھی کی، اضمحلال کی وجہ سے تقریر میں طبیعت نہیں چلی، منجملہ ان باتوں کے جو کچھ میں نے کہا، ایک بات یہ بھی تھی کہ اللہ کی مدد آنے کے کچھ معین اسباب ہیں جن کا قرآن مجید میں ذکر ہے، اس مدد کے لئے ایمان واخلاص کے ساتھ اعلاء کلمۃ اللہ کے جدوجہد کرنا بھی ہے، ''ولینصرنّ اللّٰہ من ینصرہ'' اللہ تعالیٰ اس کی یقیناً مدد کرے گا، جو اللہ کی مدد کرے گا (یعنی اس کے واسطے جدوجہد) جہاد وتحریک کے لئے ایمان واحتساب کا ہونا ضروری ہے، جس کا مقصد خدا کی رضامندی اور اس کے حکم پر عمل کرنے کے سوا اور کچھ نہ ہو۔

مسلمان لیڈروں پر تنقید

مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ ہمارے اکثر لیڈر اور سیاسی تحریکوں اور پارٹیوں کے رہبر اس فکر وروح سے خالی اور مادی وذاتی فوائد یا قومی ووطنی جذبات میں ڈوبے ہوئے ہیں، انھوں نے یورپ کی سیاسی تحریکوں اور انقلاب کی تاریخ پڑھی، تو اسلامی ممالک میں بھی اس کی تنقید واعادہ کی تدابیر اختیار کیں، اور اسلامی جہاد کے میدان میں اس کو فٹ کرنے کی کوشش کی، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کو انھیں پر چھوڑ دیا اور ذلیل ورسوا کیا، اب پھر

سے دینی روح کو تازہ کرنے اور فضائل وثواب کے استحضار کی ضرورت ہے تا کہ ہم اللہ کی مدد اور توفیق کے مستحق ہو جائیں۔

ہم فلسطین کو دشمن کے پنجے سے کیسے چھڑائیں

میں نے ان سے کہا کہ آپ اس کا پورا یقین رکھیں کہ حکومتیں و دیگر قومیں آپ کی کوئی مدد نہیں کریں گی، لیکن جب آپ کے دلوں میں صداقت ہوگی اور عزائم صحیح ہوں گے، مسئلہ فلسطین آپ کے فکر واحساس اور خواہشات ومرغوبات پر چھا جائے گا تو آپ اپنی مدد خود کر سکیں گے۔

آپ کی اور دوسری حکومتوں اور قوموں کی مثال کتے اور ہرن کی سی ہے کتے نے ہرن سے کہا کہ میں تم کو کیوں نہیں پکڑ پاتا جب کہ میں بہت تیز دوڑتا ہوں، ہرن نے کہا اس کا سبب یہ ہے کہ تم اپنے آقا کے لئے دوڑتے ہو اور میں اپنے لئے دوڑتا ہوں۔

یہ حکومتیں فلسطین کے مسئلہ میں ایسی سنجیدہ اور باعمل نہیں بن سکتیں جتنا کہ خود آپ اپنی تربیت کریں اور فرض کو اچھی طرح ادا کریں تا آنکہ اپنے محبوب وطن کو دشمنوں سے چھین نہ لیں۔

(کلیۃ اللغۃ العربیۃ) کے طالب علم فتحی بلعاوی نے اس تقریر پر تبصرہ کیا اور بڑی بلیغ وجوشیلی تقریر کی جو مستقبل میں اس طالب علم کے اچھے مقرر بننے کی غماز تھی، اگر تنہا خطابت اس مصیبت کی ماری قوم کو فائدہ پہنچا سکتی، مگر معاملہ اس کا الٹا ہے۔

پنج شنبہ ۲۸/۶/۱۳۷۰ھ مطابق ۵/۴/۱۹۵۱ء

ترک طلبہ کے ساتھ

آج جناب استاذ بہی الخولی، استاذ محمد الغزالی اور الحاج حلمی منیاوی نے شرف ملاقات بخشا اور ہمارے ساتھ ناشتہ کیا، بڑی اچھی و پر لطف ملاقات رہی، میں دن بھر کلیۃ الآداب کے لئے یوم اقبال پر مقالہ کی تیاری میں مشغول رہا، نہ جانے کیوں مقالہ میں طبیعت نہیں چل رہی تھی، اس کا تیار کرنا دشوار ہو گیا، لیکن میں اپنے فکر سے اس طرح لڑتا رہا

جیسے گہرے کنوئیں سے پانی کھینچنے والا اور چٹان تراشنے والا شخص پریشان ہوتا ہے، مگر مقالہ بھی لکھنا ضروری تھا، میں نے مقالہ پڑھنے کا وعدہ کرلیا تھا، یونیورسٹی کے طلبہ سے خطاب کرنے کا زریں موقع تھا جسے ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتا تھا، اللہ مدد فرمائے۔

عصر بعد ہم لوگ بھائی عبدالخالق پاکستانی کے پاس گئے اور ان کے مہمان طلبہ ساتھ بیٹھنے سے معذرت کی، پانچ بجے ''جبہۃ علماء ازہر'' جانا طے تھا، چنانچہ ہم لوگ وہاں کے لئے روانہ ہوئے، وہاں ازہر کے بڑے بڑے علماء موجود تھے، مغرب تک ان حضرات کے ساتھ نشست رہی، اور آئندہ جمعہ کو ہونے والے ان کے جلسہ میں شرکت کا وعدہ کر کے واپس آئے، سات بجے کے بعد ہم لوگ بغداد ہوٹل پہنچے جہاں ترک طلباء کا اجتماع طے تھا، تھوڑی دیر تک ہم لوگوں نے انتظار کیا جب سب طلباء آگئے تو میں نے تقریر کی اور ان کے سامنے اپنے ملک کو واپس جانے کے بعد دعوت کے طریقہ کار کی تشریح کی اور ان کو نصیحت کی کہ اپنے ملک پہونچتے ہی زندگی کے جھمیلوں میں پڑنے سے قبل اس سے پیشتر کہ وہ کسی اور دعوت کا شکار ہوں یا کسی دوسرے میدان کے کاموں میں لگیں فوراً دعوت وتبلیغ کے کام میں لگ جائیں، میں نے ان سے کہا کہ دعوت وارشاد کے ذریعہ عوام اور قوم سے رابطہ قائم کرنا ضروری ہے۔

عوام پڑھے لکھے طبقہ سے بیک وقت رابطہ قائم کرنا

میں نے ان سے ہندوستان کی دینی دعوت، اس کی طریقۂ کار، شہروں اور گاؤں کی ہفتہ وار وماہانہ سفروں کے نظام کو بیان کیا، یونیورسٹیوں اور کالجوں کے طلباء نیز پڑھے لکھے طبقے سے خصوصی ملاقاتوں اور ادبی وعلمی جلسوں کے ذریعہ رابطہ قائم کرنے کے فوائد اور ایسے دینی رسالوں اور مقالات کے متعلق باتیں کیں جو ان میں دینی روح بیدار کرتے ہیں اور ان کے ذہن کو دینی رُخ پر لاتے ہیں، میں ن ان سے تعلیم یافتہ طبقے اور جوانوں کی طرف سے بے توجہی، ان کا دینی ذہن بنانے اور ان کی اسلامی تربیت کی طرف سے صرف نظر کرنے کے سبب، قوم وملت پر جو مصیبتیں اور آزمائشیں گزریں، ان پر روشنی ڈالی اور ان کے دل

ودماغ پر اثر انداز ہونے کا طریقہ بیان کیا اور یہ کام جس استعداد، علم ومطالعہ، ثقافت ومعلومات کا متقاضی ہے، اس کی نشاندہی کی اوران دونوں طبقوں سے رابطہ قائم کرنے پر زور دیا اور کہا کہ اس کے لئے تیاری اور جدوجہد بڑی ضروری ہے تاکہ وہ وطن عزیز کو اس مصیبت سے بچاسکیں جن میں وہ ماضی میں دین وسیاست کی تفریق اور دین دار اور جدید طبقہ کے درمیان کشمکش اور دیندار طبقہ کو زندگی کے میدان سے الگ کردینے اور حکومت کو غیر دینی رخ پر ڈالنے سے نازل ہوئی ہے، الحمدللہ میرے اس تقریر کا دلوں پر اچھا اثر پڑا۔

ضیاء الدین علوی ترکی نے تقریر کے خاص خاص پہلوؤں کو نوٹ کرلیا اور اس کا ترکی زبان میں ترجمہ کرکے آئندہ جلسہ میں پڑھنے کا وعدہ کیا، علی ارسلان ترکی نے تقریر پر تبصرہ کیا اور دیگر تمام طلباء نے بڑے اخلاص ومسرّت اور نہایت پذیرائی کے ساتھ اس کا استقبال کیا۔

جمعہ ۲۹/۶/۱۳۷۰ھ مطابق ۶/۴/۱۹۵۱ء

دیہات کا سفر

صبح کو ہم لوگ ''دارالعشیرۃ المحمدیۃ'' گئے اور وہاں جناب ذکی ابراہیم اور ان کے ساتھیوں سے ملے، ہم لوگوں نے عامرہ کے ارادے سے حامول کا سفر کیا، ہم ہرے بھرے کھیتوں کے درمیان سے گزر رہے تھے، فضا بہت خوشگوار تھی، ہوا صاف شفاف، لطیف وسبک گام، بڑا پرلطف سفر رہا، ہمیں ایسا محسوس ہوا کہ جیسے ہم ہندوستان کے کسی خوبصورت گاؤں میں ہیں، ہم لوگ مسجد گئے، استاذ ذکی ابراہیم نے نماز پڑھائی اور جمعہ کا خطبہ دیا، نماز بعد میں نے ایک تقریر کی، جناب ابوالمواہب محمد وہبی نے تقریر پر تبصرہ کیا اور جناب محمود جسر نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل بیت کی شان میں ایک قصیدہ پڑھا، اس کے بعد ہم لوگ محترم احمد مصطفیٰ فقی کے گھر گئے جو قصبہ کے چودھری تھے، انھیں کے یہاں دوپہر کا کھانا کھایا، کھانا سادہ اور لذیذ تھا، ضلع منوفیہ کے واعظ جناب صابر الفقی کی عیادت کے لئے شبرابلولہ میں واقع ان کے گھر گئے، عامرہ کے کئی احباب ہمارے ساتھ گئے، ہماری آمد سے وہ بہت خوش ہوئے اور بڑی محبت سے ملے، رات اپنے ہی یہاں گزارنے اور تقریر

کرنے کا اصرار کیا ہم نے معذرت کردی اور حامول کے اسٹیشن کو روانہ ہوئے، ہمارے ساتھ عامرہ اور شبرا بلولہ کے بہت سے لوگ اسٹیشن تک آئے، ہم ٹرین پر سوار ہوئے، مغرب اور عشاء کے درمیان قاہرہ پہونچ گئے۔

شنبہ یکم رجب ۱۳۷۰ھ مطابق ۷/۴/۱۹۵۱ء

انڈونیشی یونین کے دفتر میں

مولانا عبید اللہ صاحب نے استاذ ذوالکفل محمد انڈونیشی سے انڈونیشی یونین کی عمارت میں انڈونیشیوں کا ایک جلسہ کرنا طے کرلیا تھا جس میں میں صرف انڈونیشیوں کے سلسلہ میں خطاب کروں، جناب ذوالکفل ''ماذا خسر العالم'' پڑھ چکے تھے اور اس کے معترف تھے، انڈونیشی یونین میں ہماری آمد پر خوش آمدید کہا، ہم لوگ لاظوغلی میدان میں واقع یونین کے دفتر کو روانہ ہوئے وہاں استاذ ذوالکفل اور ان کے ساتھیوں نے ہمارا استقبال کیا، میں انڈونیشی بھائیوں کی سرگرمی اور ذہانت سے بہت عرصہ سے متأثر تھا، ان کے یہاں کے کچھ طلبہ ہمارے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں پڑھتے تھے، وہ اپنی محنت اور سنجیدگی وچستی میں ممتاز تھے، مجھے سماٹرا کے ہونہار طالب علم محمد عدنان ندوی برابر یاد آتے رہے وہ ان بہترین طلبہ میں تھے جنھوں نے اپنے زمانۂ طالب علمی میں دارالعلوم سے فائدہ اٹھایا اور ہندوستان میں رہ کر اردو پڑھی، اقبالؔ کے کلام کا مطالعہ کیا، ہندوستان اور اس کی اسلامی تہذیب پر کتابیں لکھیں۔

اسلامی ممالک کی رہنمائی میں نوجوانوں کا کردار

ہم لوگ تھوڑی دیر یونین کے دفتر کے ایک کمرہ میں بیٹھے، حاضرین سے تعارف حاصل کیا جس میں اکثر ازہر کے طلباء تھے، پھر کمرہ سے نکلے اور لکچر ہال میں داخل ہوئے فؤاد یونیورسٹی کے لاکالج کے ایک انڈونیشی نوجوان نے جس کی پیدائش قاہرہ کی ہے، میرا تعارف کرایا، ان کی زبان عربی اور بڑی فصیح ہے، پھر میں اٹھا اور موقع کی مناسبت سے تقریر کی جو

میرے پرانے خیالات اور مطالعہ وتجربات پر مشتمل تھی ، میں نے ان سے کہا کہ اس وقت مسلمانوں کی نگاہیں انڈونیشیا کی جدید العہد حکومت کی طرف لگی ہوئی ہیں ، یہ اپنی اہمیت اور اسلامی آرزوؤں میں پاکستان کی شریک ہے اگر یہ دونوں نئی اور طاقتور حکومتیں اٹھ کھڑی ہوں تو تاریخ میں بہت بڑا کردار ادا کرسکتی ہیں اور عہد حاضر میں اسلام کے پیغام کا حق ادا کرسکتی ہیں لیکن یہ بات تعلیم کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے اور دونوں ملکوں کے طرز تعلیم کو از سر نو مرتب کرنے نیز حکومت ومحکمہ کے لوگوں میں اسلام کے پیغام پر اعتماد ویقین اور اس کی اصل روح سے پورے طور پر ہم آہنگ ہونے پر موقوف ہے جس کے لئے حکومت کے وسائل اور قوم کی طاقت کو پوری اسلامی زندگی اور اس کے احکام کی طرف موڑنا ضروری ہے انڈونیشی نوجوانو! اس ذمہ داری کی گرانباری تم پر زیادہ ہے، اگر تم اسلامی تعلیمات کو اپنے اندر سمولوگے اور اپنے ملک میں اس کا اچھا نمونہ پیش کروگے، حکومت کے ذمہ داروں ملک کے نظم ونسق چلانے والوں اور صاحب علم اور پڑھے لکھے طبقہ سے پختہ ومضبوط تعلق پیدا کروگے، ان کے ذہن ودماغ پر اچھا اثر ڈالوگے، علم وادب، تہذیب وثقافت اور ان تمام چیزوں پر چھا جاؤگے جو تمہارے ملک کے نوخیز دماغوں اور دلوں پر اثر انداز ہوتی ہیں ، جب تم ان تمام چیزوں کو اسلامی پیام کے تابع کرلوگے، اس کو اسلامی فکر وتربیت کا ذریعہ اور وسیلہ بناؤگے، تم اپنی ذہانت ومہارت، علمی وقار وادبی لطافت کے ذریعہ ملک کے فکر وادب اور میدان صحافت پر فرمانروائی کی صلاحیت پیدا کروگے تو تمہارے ذریعہ یہ وسیع ملک اسلامی فکر کو اپنائے گا اور اسلام کی بہت بڑی خدمت انجام دے گا، لیکن اگر تم علمی وروحانی تیاری اور اپنے پیغام کا حق ادا کرنے میں کوتاہی کروگے، افراد وقوم اور حکومت وشعبۂ تعلیم کے ذمہ داروں سے رابطہ قائم کرنے اور ان کے دل ودماغ اور ملک کی تعلیمی وادبی قیادت کرنے میں تساہلی سے کام لوگے تو اس حکومت کے قیام سے ہم کو اور اسلام کو کوئی بڑا فائدہ نہیں پہونچائے گا، حکومتوں کے وجود میں آنے اور ان کے باقی رہنے میں کوئی کمال نہیں، خوبی وکمال اس میں ہے کہ اس کی تنظیم ، دینی بنیاد اور اس کے صحیح نمونے اور اسلام کی اچھی نمائندگی پر ہو، میری تقریر پر اسی طالب علم نے تبصرہ کیا جس نے ابتداء میں

تعارفی کلمات کہے تھے، اس نے مجھ سے کچھ سوالات کئے، میں نے ان کا جواب دیا، اس کے بعد ہم انتظار کر کے کمرہ میں آگئے، جناب ذکی ابراہیم اور ان کے ساتھ مصر میں طریقۂ تیجانیہ کے شیخ طریقت حافظ احمد التیجانی آئے، مغرب میں حافظ التیجانی کے پیرو ہزاروں کی تعداد میں ہیں، انھوں نے میری آمد کی خبر سن لی تھی، میں ان سے مکہ مکرّمہ کے جید عالم سیّد علوی عباس مالکی کے گھر مل چکا تھا، وہ موسکی میں ہماری جائے قیام پر ملنے آئے تھے، ان کو معلوم ہوا کہ ہم انڈونیشی یونین میں ہیں تو ملنے تشریف لائے، تھوڑی دیر ہم لوگ بیٹھے پھر انڈونیشی بھائیوں سے اجازت لی اور اپنی قیام گاہ واپس آگئے، شیخ تیجانی نے بھی ہماری قیام گاہ پر تشریف لانے کی عزّت بخشی، تھوڑی دیر ہمارے ساتھ بیٹھے اور منگل کے دن مغرب بعد اپنے یہاں آنے کا وعدہ لے کر واپس تشریف لے گئے۔

اتوار ۲/۷/۱۳۷۰ھ مطابق ۸/۴/۱۹۵۱ء

المحلۃ الکبریٰ کا سفر اور ایک ناخوشگوار واقعہ

احمد عثمان صاحب اور عبدالرحمٰن علی جانو سے المحلۃ الکبریٰ کا سفر طے ہوگیا تھا جہاں ہم دو دن گزاریں گے، اور قاہرہ میں باب الحدید میں واقع اسٹیشن کی مسجد میں ملنا طے تھا، ہم وقت پر وہاں پہونچ گئے، احمد عثمان صاحب آئے، کچھ ناگزیر اسباب کی بناء پر ان کا قاہرہ میں رہنا ضروری ہوگیا، لہٰذا سفر سے معذرت کردی، ہم کو اس سے افسوس ہوا اس لئے کہ ہم چاہتے تھے کہ یہ سفر ہندوستان کے تبلیغی سفروں کا ایک نمونہ ہو، اس میں ہم سفر اور دعوت وتبلیغ کے نظام میں تطبیق دیں گے، اس میں ہم دعوت اور عوام سے ملنے کی مثال پیش کریں گے، مجبوراً ہم نے ان کا عذر قبول کرلیا، استاذ عبدالرحمٰن جانو آئے اور ہمارے ساتھ المحلۃ الکبریٰ گئے انھوں نے اپنے دوست ڈاکٹر سعید طبیب الاسنان (ڈنٹسٹ) سے جو الجمعیۃ الشریعۃ کے سرگرم رکن اور المحلہ میں اس شاخ کے صدر ہیں، طنطا سے ٹیلی فون پر بات کرلی تھی اور ہمارے آنے کی ان کو اطلاع کردی تھی، ڈاکٹر سعید نے اپنے احباب کے ساتھ ہمارا استقبال کیا، ہم لوگوں نے الجمعیۃ

کی مسجد میں مغرب کی نماز پڑھی، یہاں سے ان کے گھر گئے جہاں رات کا کھانا کھایا، استاذ جانو اس کے بعد ہی مصر واپس ہوگئے اور ہم لوگوں نے اپنے میزبان اور المحلہ کی الجمیعۃ کے صدر ڈاکٹر محمد سعید کے ساتھ الجمیعۃ کی مسجد میں عشاء کی نماز پڑھی، یہ ہماری زندگی کی سب سے طویل نماز تھی، نماز بعد ہم نے تقریر کی جس میں ہندوستان میں دعوت وتبلیغ کا جو کام ہم کر رہے ہیں، اور اس دعوت سے جو نتائج برآمد ہوئے انھیں کے بیان پر اکتفا کی اور حاضرین کو المحلہ میں اس دعوت کو چلانے، گاؤں اور دیہاتوں میں نکلنے اور کام کرنے کی دعوت دی، بفضلہٖ تعالیٰ تقریر کا اچھا اثر ہوا، ایسا محسوس ہوا جیسے الجمیعۃ الشرعیہ کے رفقاء کسی عملی دعوت وتحریک کے پیاسے تھے، ڈاکٹر محمد سعید نے اس دعوت کو خوش آمدید اور لبیک کہا، اس جلسہ میں ایک ایسی بات پیش آئی جس نے سازگار فضا کو ذرا مکدر کر دیا، جلسہ میں اخوان المسلمین کے بھی بعض لوگ موجود تھے، میری تقریر کے دوران بعض باتوں سے زیادہ متاثر ہو کر انھوں نے اخوان کا مخصوص نعرہ اللہ اکبر وللہ الحمد لگایا جس سے ڈاکٹر محمد سعید خفا ہوئے اور ان کو غصہ آ گیا اور اعلان کیا جو شخص یہ نعرہ لگانا چاہے وہ مسجد سے نکل جائے، محبّ عزیز یوسف القرضاوی ہم سے ملنے کے لئے آئے تھے، چنانچہ اخوانی احباب نکل گئے اور ان کے ساتھ یوسف القرضاوی بھی نکل گئے، اس واقعہ سے مجھے افسوس ہوا، ڈاکٹر صاحب نے اس واقعہ کے بارے میں میری رائے معلوم کی، میں نے کہا نرمی برتنا زیادہ مناسب تھا، اب ان کا غصہ ٹھنڈا ہوا، شرمندہ ہوئے اور افسوس کیا اور کہا کہ وہ بے قابو ہوگئے اور ہاتھ سے اعتدال وتوازن کا دامن چھوٹ گیا، ان کے اعتراف اور جذبۂ اخلاص سے مجھے خوشی ہوئی، پھر ہم اپنی قیام گاہ واپس آ گئے اور رات آرام سے گذری۔

دوشنبہ ۳/۷/۱۳۷۰ھ مطابق ۹/۴/۱۹۵۱ء

یوسف القرضاوی کا تعلق

نماز فجر جمعیۃ کی مسجد میں پڑھی، نماز کے بعد ڈاکٹر صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ درس دوں میں نے تعمیل کی، درس کے بعد حاضرین نے اشراق کی دو رکعت نماز پڑھی پھر مسجد

میں بعض ورزشیں اور مشقیں کیں، معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر محمد سعید اپنے کام میں بہت سرگرم ہیں اور مصر کے اندر الجمعیۃ الشرعیۃ کی شاخوں میں المحلۃ الکبریٰ کے صدر کی توجہ کے سبب سب شاخوں سے زیادہ سرگرم اور ترقی کی راہ پر گامزن ہے، اس کا انحصار ہمیشہ انجمنوں کے صدر حضرات اور کارکنوں کے جذبۂ شوق وعمل پر ہوا کرتا ہے جب کسی جماعت میں کوئی چست وسرگرم اور بااثر شخصیت ہوتی ہے تو پوری جماعت فعال وسرگرم ہوتی ہے، اگر اس کا برعکس ہو تو نتیجہ بھی الٹا ہوتا ہے، کل جو مقالہ پڑھنا تھا اس میں ایک ٹکڑے کے اضافہ اور اس کی تکمیل میں مشغول رہا، جمعیۃ کی مسجد میں ظہر کی نماز پڑھی، عزیزی یوسف القرضاوی آ گئے، ڈاکٹر صاحب ان سے بڑی گرم جوشی اور معذرت کے ساتھ ملے اور مصافحہ کیا، ڈاکٹر صاحب کے بعض مہمانوں اور یوسف القرضاوی کے ساتھ دوپہر کا کھانا کھایا۔

عصر بعد میں نے عورتوں کے اجتماع میں تقریر کی، میرے ذوق ومزاج کی ایک یہ بھی خصوصیت ہے کہ خطبہ جمعہ اور عورتوں کے اجتماع میں اچھی طرح تقریر نہیں کر سکتا، جلسہ میں درمیان درمیان میں شور وشغب، عورتوں کی باتیں اور بچوں کے رونے کی آوازیں آتی رہتی تھیں، جو عورتوں کی مجلس کی لازمی خصوصیت ہیں، اس سے ان کی کوئی محفل خالی نہیں ہوتی، مغرب کی نماز الجمعیۃ کی مسجد میں پڑھی اور مختصر تقریر کی جو عملی قدم اٹھانے اور دعوت کے اصل طریقہ کار اور ہندوستانی داعیوں کے تجربات پر مشتمل تھی، ذوق وشوق سے سننے والے حاضرین نے تقریر کی تعریف کی اور سراہا، پھر ہم اسٹیشن کے لئے نکلے، جمعیۃ کے اراکین اور شہر کے لوگوں کی ایک جماعت ہمارے ساتھ اسٹیشن آئی، اور انھوں نے بڑے اخلاص ومحبت کے ساتھ ہم کو الوداع کہا، اللہ تعالیٰ انھیں جزائے خیر دے۔

سہ شنبہ ۴/۷/۱۳۷۰ھ مطابق ۱۰/۴/۱۹۵۱ء

کلیۃ الآداب میں میرا مقالہ

جامعہ فؤاد الاول (قاہرہ یونیورسٹی) کے کلیۃ الآداب میں آج میری تقریر کا دن

تھا، جلسہ کا وقت ۱۲ر بجے رکھا گیا تھا، جلسہ کے منتظمین نے یہ وقت غالباً اس لئے مقرر کیا تھا تا کہ جامعہ کے طلبہ بھی اسباق ختم ہونے کے بعد اس میں شریک ہوسکیں حالانکہ وہ درس سے اکتاہٹ اور تکان کا وقت ہوتا ہے، کھانے کا بھی یہی وقت ہے۔

ہم لوگ مصطفیٰ عبدالرازق ہال میں داخل ہوئے یہ ایک بہت ہی وسیع ہال ہے، یہاں مجھے حاضرین وطلبہ کی بہت بڑی تعداد نظر آئی، آج کے مقررین کے ساتھ میں بھی اسٹیج پر بیٹھ گیا، مقرّرین میں کلیۃ الآداب کے استاذ عثمان امین، ڈاکٹر محمد محمود الصیاد، استاذ عبدالمنعم کرمی شامل تھے، علوبہ باشا اور پاکستان کے سفیر جناب عبدالستار سیٹھ دوسرے سامعین کے ساتھ تشریف لائے۔

جامعہ کی بہت سی طالبات بھی جلسہ میں آئیں اور طلبہ کے درمیان مل کر بیٹھ گئیں، ڈاکٹر عثمان امین آگے بڑھے اور ڈاکٹر محمد اقبال پر اپنا مقالہ پڑھا ان کے بعد ڈاکٹر محمد محمود الصیاد بڑھے اور تقریر کی، ان کی تقریر پر بار بار نعرہائے تحسین بلند ہوئے۔

زندگی کا ایک تلخ تجربہ اور سبق

ڈاکٹر صیاد کی تقریر کے بعد استاذ عبدالمنعم کرمی آئے، دلوں میں اتنی اکتاہٹ پیدا ہوگئی اور بھوک کا ایسا غلبہ ہوا جس کو آج کے نوجوان نہیں برداشت کرسکتے، چنانچہ انھوں نے اس تقریر کے مختصر کرنے اور جلد ختم کردینے کی خواہش ظاہر کی، استاذ کرمی کے بعد میری تقریر تھی میری پوزیشن تو بہت نازک تھی، طلبہ کا پیمانۂ صبر لبریز ہو چکا تھا جس کا کوٹہ پڑھے لکھے نوجوانوں میں ہمیشہ تھوڑا اور جلد ختم ہوجانے والا ہوتا ہے، مزید برآں میں اجنبی و پردیسی تھا، وہ مجھے پہچانتے بھی نہ تھے اور میری ظاہری شکل وصورت بھی ان کے ذوق ومزاج سے میل نہیں کھاتی تھی اور نہ ان میں کوئی جذبۂ اکرام وتعظیم پیدا کرسکتی تھی، ستم بالائے ستم جن صاحب نے میرا تعارف کرایا، انھوں نے نہ تو میرا نام لیا اور نہ یہ بتایا کہ میں ہندوستان کا رہنے والا ہوں کہ اسی کے ذریعہ باہر کے مہمانوں سے تقریر کو غور سے سننے اور احترام کرنے کا اپنا حصہ

حاصل کرتا، بے رغبتی کے یہی اسباب کیا کم تھے اس پر مستزاد یہ کہ میری تقریر کے بعد حکومت پاکستان کے متعلق فلم پیش کی جانے والی تھی اور میں ان کے ذوق سینما بینی اور اس کے لطف ومزہ میں حائل ہو رہا تھا، میں تقریر کے لئے اٹھا اور ڈاکٹر محمد اقبال کی سیرت پر اپنا مقالہ شروع کیا، ڈاکٹر عثمان نے مجھ سے کہا کہ اس بحث کو ختم کروں اور اصل موضوع پر بات شروع کروں، میں نے بڑی کبیدہ خاطری کی حالت میں مقالہ پڑھنا شروع کیا، تھوڑا سا پڑھنے کے بعد مجھے ان کی طرف سے اشارہ ملا کہ مختصر کروں، وہ طلباء کے چہروں پر اکتاہٹ محسوس کر رہے تھے اور ان کی کانا پھوسی کو سن رہے تھے، چنانچہ مجھ کو مقالہ مختصر کرنے اور جلد ختم کر دینے کو کہہ رہے تھے، میں نے ان کی بات نہ مانی اور اس امید میں مقالہ پڑھتا رہا کہ وہ سامعین کو اپنی طرف متوجہ کرے گا اور ان میں شوق وپسندیدگی پیدا کرے گا، مقالہ جن بلند مضامین اور بلند وپر مغز مواد پر مشتمل تھا، مجھے اس پر پورا اعتماد تھا کہ وہ سامعین کو اپنی طرف متوجہ کر لے گا، میں نے حاضرین کو مخاطب کر کے کہا کہ میں آپ کا مہمان ہوں، آپ کی دعوت پر آیا ہوں، مجھے امید ہے کہ آپ مجھے کچھ وقت دیں گے تاکہ میں مقالہ پورا کر سکوں، مگر میں نے محسوس کیا کہ میری بات غور سے نہیں سنی گئی، میرے بازو میں اس جلسہ کے ذمہ دار بیٹھے تھے جو مجھ سے اس مقالہ کو ختم کر دینے کا اشارہ فرما رہے تھے جو بطیب خاطر نہیں سنا جا رہا ہے، اتنے میں ایک شخص آ کے مجھ سے کہتا ہے کہ پاکستانی روزنامہ ''ڈان'' کے ایڈیٹر الطاف حسین صاحب جو صحافی وفد کے رکن ہیں تقریر کریں گے، اس کے بعد تو میری قوت برداشت جواب دے گئی اور میں بہت ہی آزردہ خاطر وبددل ہو کر جھنجھلا کر بیٹھ گیا، آج مجھے بے اعتنائی وبے توجہی کا ایسا سابقہ پڑا جس سے عمر بھر میرا واسطہ نہ پڑا تھا، آج کے لئے میں نے ایسا مقالہ تیار کیا تھا جس میں بہت تکان ہو گئی تھی اور کوئی اسے غور سے سننے والا نہیں ملا، فلموں کے پیش کئے جانے سے پہلے میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ باہر نکل آیا، استاذ عبدالحکیم عابدین بھی میرے ساتھ ہو لئے میرے پیچھے پیچھے شیخ عبدالوہاب خلاّف آئے اور مجھ سے

معذرت کی، میں نے معاملہ کو ہلکا کر کے تحمل کا مظاہرہ کیا، میں نے کہا کوئی حرج نہیں، بعد میں میں نے بعض لوگوں کو کہتے سنا کہ یہ ناگفتہ بہ صورت حال عیسائی طلبہ کی کوشش سے پیدا ہوئی اس لئے کہ مقالہ میں صراحت کے ساتھ مسلمانوں کی اہمیت بڑھائی گئی تھی، اس میں بعض ایسی عبارتیں بھی تھیں جو غیر مسلموں پر گراں گزرنے والی تھیں، مثلاً اقبالؔ کا قول ''اے مسلمان صرف تیرا وجود حقیقی ہے تیرے علاوہ جو کچھ ہے کھوٹا سکہ اور دھوکہ میں ڈالنے والی سراب (چمکتی ریت) ہے''، اسی طرح کی اور باتیں، میں سمجھتا ہوں کہ اس حادثہ کے اسباب طبعی اور معمولی تھے، جس کا تعلق وقت مقرر کرنے کا غلط اندازہ اور مقالہ پر علمی رنگ غالب ہونے سے ہے، اور ہر ایسی بات جو نوجوانوں کو محنت اور غور وفکر کی دعوت دے وہ ناپسندیدہ اور گراں ہوتی ہے، بہر کیف اس ڈرامہ کا یہ باب ختم ہوا اور اس سے میں نے مفید سبق حاصل کیا، اگرچہ وہ کچھ تلخ رہا خدا سے دعا ہے کہ اس سے مجھ کو نفع پہونچائے، جناب عبدالحکیم عابدین صاحب مجھے اپنے گھر لے گئے جہاں دوپہر کا کھانا کھایا وہ برابر میری دلجوئی اور عزت افزائی کرتے رہے، حتیٰ کہ ہم اپنی قیام گاہ واپس آگئے، مغرب بعد ہم لوگ شیخ حافظ التیجانی کے یہاں گئے، جناب ذکی ابراہیم صاحب بھی آگئے، کھانے سے فارغ ہو کر اللہ کے مخلص، پاک دل اور صاحب قلب بندوں اور ان کی خصوصیات سے متعلق باتیں کرنے لگے۔

چہارشنبہ ۵/۷/۱۳۷۰ھ مطابق ۱۱/۴/۱۹۵۱ء

دارالمنار اور اس کے مالک

آج ہم لوگوں نے اپنے دوست شیخ احمد الشرباصی کے ساتھ الھلال کا دفتر دیکھنے اور ان کے گھر کھانا کھانے کا پروگرام طے کر لیا تھا، جامع سیدہ زینب کے پاس ہم لوگ اکٹھا ہوئے اور الہلال کے دفتر کو چلے، راستہ میں ادارہ المنار سے گزر ہوا اسے دیکھ کر اس کے عظیم المرتبت بانی علامہ سید رشید رضا کی یاد تازہ ہوگئی، میں اس کے پاس رک گیا اور شیخ احمد الشرباصی کو مخاطب کر کے ابوتمام کا یہ شعر پڑھا۔ ؎

ما فی وقوفك ساعة من بأس
تقضی ذمام الاربع الادراس

(کیا حرج ہے کہ تم ذرا دیر ٹھہر جاؤ اور ان مٹے ہوئے محبوب نشانات کے حقوق ادا کرلو) اور المنار کے مکتبہ میں داخل ہوگئے اور تھوڑی دیر اس کی مطبوعات کو دیکھتے رہے۔

دارالہلال کی سیر

راستہ سے ''الاسلام حائر بین أھلہ'' کے مصنف جناب عبدالسمان ساتھ ہولئے اس کے بعد دارالہلال کے دفتر میں داخل ہوئے، اس کا حال ہمارے دوست شیخ احمد الشرباصی کے قلم سے لکھا ہوا ہدیہ ناظرین ہے، انھوں نے فرمایا دارالہلال میں استاذ جرجس خلیل اور اس کے نمائندے نے ہمارا استقبال کیا تاکہ اس کے وسیع حصہ میں ہم کو گھمائیں، ہم لوگ تھوڑی دیر الہلال کی پہلی شاندار منزل کے بڑے ہال میں بیٹھے، شعبۂ مضامین وشعبۂ خریداری وغیرہ کی طرح اس ہال میں بھی دفتر اطلاعات اور زائرین کے آرام کرنے کا کمرہ بھی ہے، ہم لوگوں نے دارالہلال کے شعبۂ کمپوزنگ سے گھومنا شروع کیا، وہاں ہم نے کمپوزنگ کے دو طریقے دیکھے، پہلا طریقہ تو مختلف خانوں سے حروف کو لے کر پہلے جملے پھر سطروں کے سٹ کرنے کا تھا، جو پرانہ اور عام طریقہ ہے۔

دوسرا طریقہ مختلف پرزوں پر مشتمل ایک بہت بڑی خودکار مشین کے ذریعہ پگھلے ہوئے سیسہ سے تیزی کے ساتھ حروف کا ڈھالنا، کمپوزیٹر کا حرف کے ایک مخصوص بٹن کو دبا دینا کافی ہوتا ہے، پھر وہ مشین برابر حروف ڈھالتی جاتی ہے، پرزہ خود سے جملے اور سطریں بناتا اور مسلسل خود حروف کو مرتب کرتا جاتا ہے، اصطلاح میں اس مشین کو (انٹرٹائپ مشین) کہا جاتا ہے، اس کے بعد ہم لوگ پروف ریڈنگ کے شعبہ میں گئے، جہاں کمپوز شدہ مضمون کی سطروں وحروف نیز کمپوزیٹر کی چوک سے رہ جانے والی غلطیوں پر اطمینان حاصل کرنے کی غرض سے اس کے پروف کو دیکھا جاتا ہے، اس کے بھی ہم لوگوں نے دو طریقے دیکھے، پہلا

طریقہ تو یہ ہے کہ نیوز پیپر پر پروف لے لیا جاتا ہے، پھر تصحیح ومراجعت کی جاتی ہے، دوسرا طریقہ بہت باریک اور صاف چکنے کاغذ پر پروف لینے کا ہے یہ پیتل کی پلیٹ کے ذریعہ سے ہوتا ہے جس پر خاص کیمیاوی طریقہ سے کاغذ کے حروف کا عکس آجاتا ہے، پھر اس پلیٹ پر کاغذ کی شیٹ کو گھمایا جاتا ہے تو پلیٹ کے حروف کاغذ پر چھپ جاتے ہیں۔

یہاں سے ہم لوگ شعبۂ تصویر میں گئے جہاں ہم نے دیکھا کہ مختلف سائز اور الگ الگ شکلوں کی کس طرح تصویر لی جاتی ہے اور پھر ہر تصویر اپنی جگہ سٹ کردی جاتی ہے، اس کے بعد تصویریں (رتوش) تصویر کی درستگی اصلاح وخوبصورت بنانے کی جگہ منتقل ہوجاتی ہیں، جس کا کام یہ ہے کہ تصویر میں جو نقص یا عیب ہو اس کو درست کرے، اس پر تحسین وتزئین کی کچھ چیزیں پھیری جاتی ہیں، کبھی اس پر قدرتی رنگ پھیرا جاتا ہے جس سے وہ ہو بہو اصل کے مطابق ہوجاتی ہے، تصویر کشی کے مقررہ اصول وطریقۂ طباعت اور مختلف علمی وسائل ہیں جو طباعت کے درمیان اس پر رنگ کی روشنائی پھیرتے ہیں، ہم نے پیتل کی پلیٹیں بھی دیکھیں جو مشین پر چڑھانے کے لئے تیار کی گئی تھیں ان پر سطریں بنی ہوئی تھیں، صفحات کے نمبر پڑے ہوئے تھے، طباعت ختم ہونے کے بعد بھی ہم نے ان پلیٹوں کو دیکھا ان کو خاص کیمیاوی طریقہ سے صاف کردیا جاتا ہے تاکہ دوبارہ ان کو استعمال کیا جاسکے، ہم لوگوں نے چھپائی کی زبردست وحیرت ناک مشینیں دیکھیں جن کو (روٹو گرافر) کہا جاتا ہے، یہ بہت بھاری اور بڑے حجم کی مشینیں ہیں، اس میں ایسے سامان اور پرزے فٹ ہیں جو رسالہ کو چھاپتے موڑتے اور تیار شکل میں نکالتے جاتے ہیں، یہ اس طرح ہوتا ہے کہ اس کے ایک طرف کاغذ کے دو بنڈل لگادیئے جاتے ہیں اور دوسری طرف مختلف رنگوں میں چھپا ہوا مکمل اخبار نکلتا جاتا ہے۔ اس طرح یہ مشین ایک گھنٹہ میں آٹھ ہزار کاپیاں چھاپ دیتی ہے۔

پھر اسی طرح ہم نے جلد سازی، سلائی اور بڑھے ہوئے حصّہ کی کٹائی کا شعبہ بھی دیکھا، اخباروں کے شماروں کو لفافوں میں رکھ کر خریداروں کے نام ڈاک بھیجنے کا کام جو

شعبہ کرتا ہے اس کو بھی دیکھا، سیر کے درمیان ہم کو معلوم ہوا کہ دار الہلال عربی زبان میں المصور ، الاثنین ، الهلال ، تین پرچے نکالتا ہے اور ایک رسالہ فرانسیسی زبان میں (ایماج) نکالتا ہے، سنیما سے متعلق ایک رسالہ جس کا نام الکواکب ہے، اور اسی طرح ماہانہ ناول بھی شائع کرتا ہے جو روایات الہلال کے نام سے معروف ہے یہ تو دار الہلال کے دلچسپ سیر کے بارے میں استاذ احمد الشرباصی نے لکھا، میں نے کارکنوں سے ہفتہ وار رسالہ المصور کی تعداد اشاعت کے بارے میں پوچھا تو ان لوگوں نے بتایا کہ اس کی اشاعت سوا لاکھ ہے، اس ادارہ کی سیر اور اس کی حیرت انگیز کارکردگی وسرگرمی کے مشاہدہ کے درمیان میں دیکھتا اور اس بات پر افسوس کرتا رہا کہ یہ طباعت اور ادب کا عظیم الشان مرکز اور یہ عظیم ادارہ جس نے نشر واشاعت کے سلسلے میں ان اسباب وآلات اور بے شمار دولت کو لگا رکھا ہے، یہ کوئی پیغام اور دعوت نہیں رکھتا، یہ عوام کے اخلاق اور ایمان کو نقصان پہنچا کر کاروبار اور رزق حاصل کرنے کا ذریعہ ہے فحش وعریاں تصویریں اور جذبات کو بھڑکانے والے رومانی افسانے وقصّے ، اور ایسے مضامین شائع کرتا ہے جو پڑھنے والے کو کوئی سنجیدہ فائدہ اور اخلاق وتربیت کا نفع نہیں پہونچاتے ، ہر ہفتہ ومہینہ اس ادارہ سے ان مطبوعات کا سیلاب امنڈتا ہے اور پورے عالم عربی کو لپیٹ میں لے لیتا ہے اور حجاز تک پہونچتا ہے، بلکہ پردہ نشینوں تک پہنچ کر دل ودماغ کو مسموم کرتا ہے، نوعمروں اور کم سنوں تک کو خراب کرتا ہے، نوجوانوں کا تو ذکر ہی کیا؟ جب تک میں اس ادارہ کی سیر کرتا رہا میرے ذہن وفکر میں یہی خیال گردش کرتا رہا، اس کے علاوہ میری سمجھ میں کوئی اور صورت نہیں آئی، کہ میں ادارہ کے ذمہ داروں اور المصور کے نگراں استاذ فکری اباظہ باشا کو اپنے رسالہ (اسمعی یا مصر) کے کچھ نسخے ہدیہ کروں، شاید کہ وہ میری قائم مقامی کرے اور میرے احساس وامید کی ترجمانی کرے، جب ہماری یہ سیر ختم ہوئی تو ہم لوگوں نے مسجد سیدہ زینب میں ظہر کی نماز پڑھی اور اپنے دوست شیخ احمد الشرباصی کے گھر گئے، یہیں ڈاکٹر یوسف موسیٰ بھی آگئے، اور ہم لوگوں نے کھانا کھایا، جس کو ہمارے دوست احمد الشرباصی کے اخلاق،

ان کے گھر والوں کی توجہ اور ڈاکٹر یوسف موسیٰ کی موجودگی نے بڑا مزیدار بنادیا، کھانے کے بعد بھی یہاں رکے، اور دینی علمی موضوع پر گفتگو کرتے رہے، یہاں قیام مصر کے اوقات میں سے ایک پرلطف اور خوشگوار وقت گذرا۔

جمعرات ۶/۷/۱۳۷۰ھ مطابق ۱۲/۴/۱۹۵۱ء

شیخ حسنین محمد مخلوف کی عیادت

کل شیخ احمد الشرباصی سے معلوم ہوا کہ شیخ حسنین محمد مخلوف نے ان کو اطلاع دی ہے کہ وہ کئی دنوں سے بیمار ہیں، اس وقفہ میں ہم سے ملاقات نہ کرسکنے کی معذرت کہلا بھیجی ہے، اس خبر سے ہم لوگوں کو افسوس ہوا اس لئے کہ شیخ ان لوگوں میں سے ہیں جن میں ہم ایک قلبی کشش محسوس کرتے ہیں، ہم لوگ ان کی عیادت کے لئے حلوان حاضر ہوئے ہم نے دیکھا کہ شیخ احمد الشرباصی ہم لوگوں سے پہلے وہاں پہنچے ہوئے ہیں، ہم لوگ شیخ کے پاس ایک گھنٹہ بیٹھے، ان کو عرق النساء کی شکایت ہے، اس مرتبہ اتنی شدید تکلیف تھی کہ صاحبِ فراش ہوگئے، بستر پر بھی سہارے کے بغیر حرکت نہیں کرسکتے، مگر یہ سخت بیماری بھی ان کو علمی دینی فقہی باتیں کرنے سے باز نہ رکھ سکی۔

حافظ ابن قیم نے زاد المعاد میں عرق النساء کے بارے میں جو لکھا ہے اس کا ذکر کیا، ان دواؤں کے بارے میں گفتگو کی جن کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا ہے، اس کا شریعت میں کیا مقام ہے، حقیقت موت اور صبر کے بارے میں باتیں کیں، ان کی گفتگو مخلص مومنین کے انداز کی گفتگو تھی۔

ایک گھنٹہ کے بعد ہم لوگوں نے اس خیال سے کہ ان کو طویل عیادت سے تکلیف نہ ہو اجازت چاہی اور شیخ احمد الشرباصی کی معیت میں واپس ہوئے، ان کے ساتھ سفر دلچسپ رہا، اس سفر میں ہم لوگوں نے ازہر کے سابق شیوخ اور شیخ الازہر شیخ مصطفیٰ عبد الرازق کے حالات طلبہ کے ساتھ حسن سلوک اور شیخ مصطفیٰ مراغی کی خودداری اور دل کی بڑائی اور

بااثر ہونے کے متعلق باتیں کیں۔

سیدہ زینب اسٹیشن سے ہم لوگ جدا ہو گئے، شیخ احمد الشرباصی یہیں اتر گئے اور ہم لوگ باب اللوق اسٹیشن پر اترے اور شارع ابراہیم باشا میں استاذ وہبہ سے ان کے مکتبہ ہی میں ملے، میں نے ان سے اپنے بعض رسائل کی طباعت کے سلسلے میں معاملہ کیا تھا۔

اریٹریوں میں ہماری تقریر

ہماری خواہش پر ازہر میں پڑھنے والے اریٹری طلباء دار العلوم قاہرہ میں جمع ہوئے، میں اس جلسہ میں حاضر ہوا، ان طلباء سے مل کر خوشی ہوئی اور ان سے باتیں کرنے میں جی لگا، مجھے یہ توقع ہے کہ لوگ جو اس وقت قافلۂ حیات سے بچھڑ گئے ہیں اور سمٹ سمٹا کر رہ گئے ہیں، جب اسلامی پیام کو سینہ سے لگائیں گے اور اسلامی دعوت میں لگ جائیں گے اور اس سے ان کا ایمان مضبوط و پختہ ہو جائے گا تو ان کا بھی زمانہ آئے گا، میں نے اسی موضوع پر تقریر کی اور اس کی ابتداء حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول سے کہ (إن الله يرفع بهذا الكتاب اقواما ويضع به اٰخرين) بے شک اللہ تعالیٰ اس کتاب کے ذریعہ بہت سی قوموں کو بلند کرتا ہے، اور دوسروں کو گراتا ہے، میں نے تاریخ کی روشنی میں اس کی مثالیں پیش کیں، طلباء نے اس تقریر کو بڑے غور سے سنا اور اس کا استقبال کیا اور ہماری عزت افزائی کی، ان کا مقرر تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد پاکستان کی اس کوشش کا شکریہ ادا کرتا تھا جو پاکستان نے ان کے مسئلہ کو اقوام متحدہ میں پیش کرنے کے سلسلے میں کی تھی، بعض طلباء نے مجھ سے کہا کہ میں نے "ماذا خسر العالم" کے کئی نسخے خرید کر اپنے وطن بھیجے ہیں۔

ترکوں کے جلسہ میں

یہاں سے ہم لوگ بغداد ہوٹل گئے جہاں ترک طلباء سے ملے اور بھائی ضیاء الدین علوی نے میری سابقہ دونوں تقریروں کا ترکی زبان میں ترجمہ پڑھ کر سنایا ان کا ارادہ ہے کہ ان دونوں تقریروں کو ترکی کے بعض دینی رسالوں کو اشاعت کے لئے بھیجیں، اس کے بعد

میں نے برجستہ تقریر کی جو سابقہ مضمونوں کو تازہ کرنے کی غرض سے پہلی دونوں تقریروں کا خلاصہ تھی، بھائی علی ارسلان نے میری تقریر پر تبصرہ کیا اس کے بعد میں نے سنتریس کے مختصر سفر میں اپنے ساتھ ان کو نکلنے کی دعوت دی، امتحان کے قریب ہونے اور ان ترک طلباء کی عربی زبان میں کمزور ہونے کی وجہ سے امتحان کی مشکلات کے باوجود بعض طلباء نے اس کو منظور کیا، طلبہ کی ایک جماعت ہماری قیام گاہ تک ہم کو چھوڑنے آئی اور ہماری جگہ دیکھی، محمد امین ترکی اس دینی تعلیمی طرز فکر سے بہت خوش تھے اور کہہ رہے تھے کہ یہ طرز فکر وہ ترکی کے دو فاضل استاذ علی حیدر اور محمود جودت سے حاصل کرتے تھے لیکن مصر میں یہ روحانی غذا اور فکر ور جحان نہیں پاتے۔

جمعہ ۷/۷/۱۳۷۰ھ مطابق ۱۳/۴/۱۹۵۱ء

سنتریس میں

صبح کو بھائی عبدالغنی مجوب ہم کو سنتریس لے جانے کے لئے آگئے، اس سفر میں ہمارے ساتھ جانے کے لئے پانچ ترک طالب علم بھی آئے، شبرا سے ہم ایک ایسی موٹر میں سوار ہوئے جو ہم کو سنتریس لائی جو ضلع منوفیہ میں قناطر خیریہ کے بعد ایک خوبصورت گاؤں ہے اس کا مرکزی مقام اشمون ساحل نیل پر واقع ہے اس میں ایک عربی علوی خاندان رہتا ہے (اہل السنۃ) کی مسجد میں ہم لوگوں نے جمعہ کی نماز ادا کی، اخوان المسلمین کے رکن استاذ محمد ماضی نے خطبہ دیا، بھائی عبدالغنی نے جمعہ کا خطبہ دینے اور نماز پڑھانے کے لئے ان کو قاہرہ سے بلایا تھا، نماز بعد میں نے ایک تقریر کی جس میں میں نے ہفتہ میں ایک عام دینی درس کا نظام قائم کرنے، شہر کی دینی حالت کے خیال رکھنے، اور جو لوگ مسجد میں نہیں حاضر ہوتے یا ان میں دینی فرائض کی ادائیگی میں سستی اور کمزوری نظر آتی ہے ان سے رابطہ قائم کرنے اور نرمی اور ملاطفت کے ساتھ ان کو دینداری اختیار کرنے اور مسجد آنے کی دعوت دینے پر ابھارا، لوگوں نے اس کو منظور کرلیا، وہ لوگ درس اور اس تحریک کی نگرانی کے لئے بھائی عبدالغنی کے چچا الحاج

عبدالعظیم محجوب کے انتخاب پر متفق ہوگئے، جمعہ کے بعد ہم لوگ الحاج عبدالعظیم کے یہاں گئے اور دوپہر کا کھانا کھایا، جس کا اس شریف گھرانے کے لوگوں نے اہتمام کیا تھا، گھر کے لوگوں نے ہالہ کی طرح سے ہم کو گھیر لیا، عزت واکرام اور خدمت کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی، یہاں سے ہم عصر کی نماز کے لئے نکلے اور تھوڑی دیر بھائی عبدالغنی کے دوسرے چچا جناب عبد السمیع یوسف طبوضی کے پاس بیٹھے، وہ سنتریس کے مدرسۃ الاولیۃ کے نگراں ہیں، پھر ہم بس کے ذریعہ قاہرہ کو روانہ ہوئے بہت پرلطف سفر رہا، ہمارے ترک بھائی اس سے بہت خوش ہوئے انھوں نے مصری دیہاتی زندگی اور سادہ دل مصری مسلمانوں کے اخلاق کا اچھا نمونہ دیکھا۔

جبہۃ علماء ازہر میں

ہم لوگ جبہۃ علماء ازہر کے جلسے میں پہونچ گئے، تاخیر کے سبب لوگ ہماری آمد سے مایوس ہوچکے تھے، اسلامی ممالک کے بھیجے ہوئے طلباء کے موضوع پر ان کے ساتھ ہم بھی گفتگو میں شریک ہوئے، گفتگو یہ تھی کہ الجبہۃ ان طلباء میں دینی رجحان پیدا کرنے اور ان کا تعاون کرنے کی ذمہ داری سنبھالے اور ان کے لئے ایک خاص جگہ متعین کردے جس میں وہ لوگ اکٹھا ہوا کریں اور جبہۃ کے نمائندے کی حیثیت سے ایک یا کئی استاد ان جلسوں میں حاضر ہوں اور ان کی نگرانی کریں، ڈاکٹر یوسف موسیٰ نے اس تجویز کی بڑی پرزور تائید کی اور اسی کی مناسبت سے کام کا ایک خاکہ تیار کیا جس کو آئندہ جلسہ میں اراکین جبہۃ کے سامنے پیش کریں گے۔

اس جلسہ میں جامعہ فؤاد اول کے کلیۃ الآداب کے استاذ اور جبہۃ علماء ازہر کے رکن استاذ احمد شائب بھی آئے، انھوں نے بڑی گرمجوشی سے میرا خیر مقدم کیا اور فرمایا کہ اپنی ادبی وتاریخی تصنیفات کے کچھ نسخے مجھ کو ہدیہ کریں گے اور وہ ہم کو شیخ احمد الشرباصی کے ذریعہ پہنچ جائیں گے جو ان کے پاس آتے جاتے رہتے ہیں، اور وہیں شیخ منصور رجب سے ملاقات ہوئی جو کلیۃ اصول الدین میں اخلاق وعلم النفس کے اسسٹنٹ پروفیسر ہیں اور صرف مجھ سے ملنے اور ملاقات ہی کی غرض سے آئے تھے، انھوں نے العتبۃ تک ہمارے ساتھ آنے کی عزت بخشی اور ہم کو اپنا پتہ دیا۔

شنبہ ۸/۷/۱۳۷۰ھ مطابق ۱۴/۴/۱۹۵۱ء

بعض شخصیات کے بارے میں ڈاکٹر احمد امین سے باتیں

آج ہم برادرم مولوی معین اللہ کے ساتھ جیزہ میں واقع الادارۃ الثقافیۃ گئے، کیونکہ ڈاکٹر احمد امین سے ملے ہوئے بہت دن ہو گئے تھے ہم لوگ ان سے ان کے دفتر ہی میں ملے، ذکر مسلمانوں کا چل نکلا، انھوں نے فرمایا کہ مسلمانوں میں قائدانہ صلاحیت رکھنے والی شخصیت کی کمی ہے، میں نے کہا، شیخ حسن البناء کے بارے میں کیا رائے ہے؟ انھوں نے کہا بڑی طاقتور اور فطری صلاحیتوں سے مالا مال شخصیت تھی، فرمایا حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ زمانۂ طالب علمی میں بڑے شرمیلے تھے، میں نہیں سمجھتا تھا کہ وہ کبھی خطیب اور مقرر ہوں گے مدرسہ قضا میں وہ میرے شاگرد تھے، دیکھتے ہی دیکھتے وہ اپنی شخصیت اور زور خطابت سے یکا یک ملک پر چھا گئے، ہر جگہ ان کو بات کی قدرت حاصل تھی، اگر عوام میں ہوتے تو ان کے ذہن و دماغ پر چھا جاتے، اور جب پڑھے لکھے لوگوں میں ہوتے تو ایسی تقریر کرتے جو ان کو پسند آتی اور ان پر اثر انداز ہوتی، یہ ان کا حال تھا، اگر اخوان المسلمین کے لوگ اخلاقی اور اجتماعی اصلاح میں لگے رہتے تو ایک بڑا کام ہوتا، میرے سوال پر کہ ان کے مستقبل کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ انھوں نے کہا کہ ان کو کوئی زبردست شخصیت میسر آ گئی اور ان کی اصلاحی سرگرمی و دینی دعوت جاری رہی تو وہ کامیاب ہوں گے اور ان کو یہ شخصیت نہ مل سکی، اور وہ سیاست میں پھنس گئے تو معاملہ کچھ اور ہی ہوگا، میں نے کہا کہ میرے خیال میں تو سعد باشا زغلول بھاری بھرکم شخصیت کے مالک تھے؟ تو انھوں نے جواب دیا کہ ہاں! وہ ان لوگوں میں تھے جو سننے سے تعلق رکھتے ہیں پڑھے نہیں جا سکتے وہ دینی جذبہ کے بھڑکانے میں کامیاب نہیں ہو سکتے تھے، وہ تو بس ایک قوم پرست وطن دوست آدمی تھے، فرمایا کہ ایک مرتبہ میں ان سے ان کے دفتر میں ملا، انھوں نے مجھ سے باتیں کیں، یہ گفتگو ایک عمومی گفتگو تھی، تاہم میرا دل جوش و ولولہ سے اتنا بھر گیا، اور یہ جذبہ حد سے اتنا تجاوز کر گیا کہ میں کسی موٹر یا ٹرام پر نہیں سوار ہو سکا، جوش میں پیدل ہی چلتا رہا، سید جمال الدین افغانی بھی بڑی مؤثر شخصیت کے مالک تھے، دل کو

جوش وحرارت سے بھر دیتے تھے، حالانکہ ان کی زبان میں لکنت تھی۔

بچوں کی تعلیم کے بارے میں گفتگو

پھر گفتگو بچوں کی تعلیم اور ان کے لئے نصاب تعلیم مرتب کرنے کے موضوع پر چل پڑی، انھوں نے کہا کہ بعض مدارس میں بچوں کو ایسا مضمون پڑھاتے ہیں جس کی نہ ان کو ضرورت ہے اور نہ وہ ان کی عمر وعقل کے مناسب ہے، مثلاً میرے چھوٹے بچے نے ایک مدرسہ میں پڑھا اور اس نے نماز جنازہ کی دعا یاد کرلی ہے حالانکہ وہ ابھی اس منزل سے دور ہے، پھر انھوں نے انگریزوں کے طرز تعلیم کی تعریف کی جو وہ بچوں کے لئے مقرر کرتے ہیں، فرمایا میں بچوں کا انسائیکلو پیڈیا پڑھتا ہوں، اس کو ان کی عمر وعقل کے مطابق پاتا ہوں، ان کے قصے دلچسپ ہوتے ہیں، میں نے استاذ کامل کیلانی کا ذکر کیا تو انھوں نے ان پر بھی تنقید کی، اور فرمایا کہ وہ اپنے قصوں میں بعض وقت ادبی عبارتیں لاتے ہیں، پھر میں نے ان سے قصص النبیین کا ذکر کیا تو انھوں نے کہا کہ دار الہلال نے مجھ پر ہارون رشید کی سیرت لکھنے کی ذمہ داری ڈالی، اس کا یورپ میں بڑا چرچا تھا، اس بارے میں کتاب ''الف لیلۃ ولیلۃ'' کو بڑا دخل ہے اس نے ان کو بہت سی حکایتوں کا ہیرو بنادیا ہے، وہ رات کو ٹوہ لگانے نکلتا تھا، شاید کہ ان قصوں کے بیان کرنے والوں نے ابن مقفع کا انجام دیکھا، چنانچہ انھوں نے بہت سے قصے گڑھ لئے اور ان کو ایک ہیرو کی شکل میں پیش کیا۔

المحلۃ الکبریٰ کا سفر

آج کا دن المحلۃ الکبریٰ کے سفر کا دن تھا، جیسا کہ پہلے سفر میں طے ہو چکا تھا ہم نے شیخ احمد الشرباصی سے کہا تھا کہ وہ اس سفر میں ساتھ ہوں، انھوں نے اس درخواست کو منظور کرلیا تھا، ہم لوگ اسٹیشن کی مسجد میں جمع ہوئے اور چھ بجے والی ٹرین سے روانہ ہوکر مغرب بعد طنطا پہونچ گئے اور شہر گئے وہاں مسجد السید احمد البدوی (۱) میں عشاء کی نماز پڑھی اور اس کو

(۱) مصر کے مشہور شیخ جن کو مصر میں وہی شہرت ومقبولیت حاصل ہے جو تقریباً ہندوستان میں خواجہ معین الدین اجمیری کو۔

دیکھا، راستہ میں رات کا کھانا کھایا، ٹرین نے ہم کو المحلۃ پہونچادیا، ہم لوگ وہاں تاخیر سے پہونچے، لہٰذا رات میں بھائی ڈاکٹر محمد السعید احمد کے مہمان ہوئے وہ ہماری اور شیخ احمد الشرباصی کی آمد سے بہت خوش ہوئے جو اپنے مضامین ومقالوں کی وجہ سے بہت مشہور ہیں۔

یکشنبہ ۹/۷/۱۳۷۰ھ مطابق ۱۵/۴/۱۹۵۱ء

نبروہ میں جماعتوں کی تشکیل

اہل السنۃ کی مسجد میں ہم لوگوں نے فجر کی نماز پڑھی، بعد نماز میں نے تقریر کی اور حاضرین سے درخواست کی کہ وہ ایک دینی دعوت کے سفر میں جو ہم کرنے والے ہیں ہمارا ساتھ دیں، احباب کی نظر انتخاب نبروہ پر پڑی، یہ نہایت مناسب انتخاب تھا فوراً احباب نے ایک بڑی موٹر حاضر کی جس میں تقریباً پچاس آدمی سوار ہوئے، شیخ احمد الشرباصی نے ساتھ دینے سے معذرت کی اور وہ قاہرہ واپس آگئے، ہم لوگ نبروہ پہونچے تو جمعیۃ الشرعیۃ کے لوگ اور شہر کے دوسرے مخلص حضرات ہمارے گرد جمع ہوگئے، پھر ہم لوگ مسجد گئے اور میں نے حاضرین سے اس سفر کا مقصد اور آداب ونظام کی وضاحت کی، ظہر بعد لوگ کئی جماعتوں میں تقسیم ہوگئے اور ہر جماعت قریب کے گاؤں کے لئے روانہ ہوگئی تاکہ یہاں کے مسلمانوں سے ملے اور ان میں دینی دعوت کا کام کرے، اور انھیں نبروہ میں شام کے جلسہ میں آنے کی دعوت دی، مجھ کو اور میرے ہندوستانی ساتھیوں کو ''الجمعیۃ الشرعیۃ'' کے ایک مہربان رکن نے دوپہر کے کھانے کی دعوت دی اور بڑا اصرار کیا چنانچہ ہم نے دوپہر کا کھانا انھیں کے یہاں کھایا، اپنے گھر آنے اور دعوت قبول کرنے سے وہ بہت خوش تھے اور بار بار اس کا اظہار کرتے تھے، عصر بعد ہم لوگ ڈاکٹر صاحب کے ساتھ لوگوں سے ملنے اور بازار اور دوکانوں پر جاکر ان کو رات کے جلسہ میں آنے کی دعوت دینے کے لئے نکلے لوگ بڑے تپاک وخوش دلی کے ساتھ ملتے اور خوش آمدید کہتے، بہت سے لوگ آتے اور قہوہ اور مٹھائی سے ہماری تواضع کی کوشش کرتے، ہم معذرت کردیتے اور کہیں قبول بھی کرلیتے۔

تبلغی جماعت میں یوسف القرضاوی کی مناسب تقریر

مغرب سے پہلے ہم لوگ مسجد واپس آ گئے، نبروہ اور گاؤں کے لوگ جمع ہوئے اور میں نے تقریر کی، آج رات کے مقرّرین میں شیخ یوسف القرضاوی بھی تھے جو المحلۃ الکبریٰ کی ایک مسجد میں امام ہیں، انھوں نے مناسب تقریر کی جس میں کسی جماعت کی مخالفت میں کوئی بات نہیں تھی، ان کے بعد ڈاکٹر محمد السعید احمد نے تقریر کی اور پہلے کی طرح ان کو جوش آ گیا اور ہنگامہ برپا ہو گیا، اخوان المسلمین کے لوگ چیخنے اور احتجاج کرنے لگے اور ایک ہی تقریر پر جلسہ ختم ہو گیا اور اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو لڑائی سے بچالیا۔

دوشنبہ ۱۰/۷/۱۳۷۰ھ مطابق ۱۶/۴/۱۹۵۱ء

مولانا عبید اللہ بلیاوی کا مستورات میں بیان

صبح کو فجر بعد میں نے کچھ باتیں کہیں، برادران عبد الرشید، مولوی معین اللہ اور مولانا عبید اللہ بلیاوی صاحب نے تقریریں کیں، ہم لوگوں نے اپنے کل کے میزبان کے یہاں ناشتہ کیا اور اہل نبروہ سے رخصت ہوئے وہ ہمارے ساتھ ساتھ چل رہے تھے اور خلوص وگرمجوشی کے ساتھ مصافحہ کر رہے تھے، ہم نے المحلۃ الکبریٰ آنے کی دعوت دی، انھوں نے آنے کا وعدہ کیا اس کے بعد المحلۃ لوٹ آئے اور دن یہیں گذارا، مولانا عبید اللہ صاحب بلیاوی نے عورتوں کے جلسہ میں تقریر کی، عشاء بعد میں نے تقریر کی، نبروہ کے تقریباً پچاس آدمی آئے تھے اور جلسہ کے بعد واپس ہوئے، ہم لوگ بہت رات گئے سوئے۔

سہ شنبہ ۱۱/۷/۱۳۷۰ھ مطابق ۱۷/۴/۱۹۵۱ء

مصر کی کاٹن مل کی سیر

ہم لوگ مصر کی کاٹن مل کی سیر کو گئے، یہ مصر میں بننے اور کاتنے کا سب سے بڑا مل ہے، اور دنیا کے بڑے ملوں میں شمار ہوتا ہے، برادرم ڈاکٹر محمد سعید نے بتایا کہ انھوں نے

مصر کے مشہور ٹیکسٹائل مِل کے مینجر سے مِل کر اور اس کے شعبوں اور عمارتوں کو دیکھنے کی اجازت لے لی ہے، انھوں نے جناب طٰہٰ صاحب سے میرا تعارف کرایا جو مِل کے اونچے گریڈ کے ملازمین میں سے ہیں، یہ طے ہوا کہ ہم آٹھ بجے مِل کی سیر کریں، ہم طٰہٰ صاحب سے ملے انھوں نے کمپنی کے ٹیکنکل ڈائرکٹر سے میرا تعارف کرایا جو فرانسیسی ہیں، ہم تھوڑی دیر ان کے پاس بیٹھے ان کی ہماری گفتگو کا ذریعہ انگریزی زبان تھی، اس کے بعد ہم مِل کے شعبوں کو دیکھنے نکلے، یہ مصر کا سب سے بڑا ٹیکسٹائل مِل ہے، یہ ایک عظیم کارخانہ ہے، جو اس قابل ہے کہ مصر اس پر فخر کرے، تعمیراتی منصوبوں اور بڑے صنعتی اور تجارتی اداروں کے سلسلے میں مشرقیوں کی تیاری کی یہ جیتی جاگتی تصویر ہے، اس زبردست منصوبہ کا سہرا جس نے مصر اور اہل مصر کو عظیم فائدہ پہونچایا، زبردست پیداوار اور اقتصادی تنظیم بخشی، مصر کی اہم اور ماہر اقتصادیات شخصیت مرحوم طلعت حرب باشا کے سر ہے۔

یہ مِل پورا ایک شہر ہے جو ایک وسیع رقبہ میں پھیلا ہوا ہے، اس سیر میں استاذ طٰہٰ ہمارے ساتھ رہے جو مِل کے مختلف حصّوں، قسم قسم کی مشینوں اور ان کے کاموں کو بتاتے جاتے تھے جو جدید ترین طرز کی تھیں، ان پر بڑے جنگی میدان کے ٹینکوں اور توپوں کی طرح لوہے کی چادریں چڑھی ہوتی تھیں، ہم لوگ کاتنے بننے، ایک شکل سے دوسری شکل میں تبدیل کرنے، رنگنے اور چھاپنے، دھاریاں اور لکیریں بنانے والی مشینوں کے پاس سے گزرے اور دیکھا کہ روئی اور تاگہ کتنی مختلف دشوار اور طویل منزلوں کو طے کرتا ہوا کئی کئی مراحل و مقامات سے گزر کر آخری منزل پر پہونچتا اور بُنے بنائے کپڑے کی صورت میں نکلتا ہے، آدمی بڑی سہولت کے ساتھ اس کپڑے کو بازار سے حاصل کر لیتا ہے اور اس کو اس کا ذرا بھی خیال نہیں آتا کہ اس کپڑے نے کتنی لمبی مسافت طے کی ہے، وہ ان کو پہنتا ہے لیکن اس کو ان مشکلات کا ذرا بھی خیال نہیں آتا جو اس کپڑے کے پیچھے جھیلی گئی ہیں جو اس کا تن ڈھاکتا اور اس کو زینت بخشتا ہے، ہمیں معلوم ہوا کہ کمپنی ہر سال کئی کروڑ میٹر کپڑا تیار کرتی

ہے، ہم لوگ کارخانہ کی خوبصورت مسجد کے پاس سے گزرتے ہوئے اس عظیم الشان Mess مِس (دارالطعام) کی طرف منتقل ہوگئے جس کو کمپنی نے کارخانہ کے ملازمین کے لئے بنایا ہے، اس Mess میں کھانے کی تین ہزار نشستیں ہیں اور ایک دن کے کھانے کی فیس دو قرش ہے، ہم لوگ باورچی خانہ گئے اور پکانے کے نظم کو دیکھا، پکانے اور کھانے کی جگہ نہایت صاف ستھری ہے اور اس میں اصول صحت اور جراثیم کے مارنے کا پورا اہتمام ہوتا ہے، پھر ہم لوگ کھیل کود اور ورزش کے شعبہ میں گئے، وہ ترقی یافتہ اور نہایت جدید طرز پر قائم ہے، اس شعبہ کے نگراں نے جو یورپ کے تربیت یافتہ ہیں ہم کو اس کی شاخوں میں گھمایا اور ہم لوگوں نے ورزش کی سرگرمی کا مشاہدہ کیا، پھر اسپتال کی طرف گئے، یہ اسپتال حسن نظام میں بڑے اسپتالوں کے مماثل ہے، اس اسپتال میں ہر بیماری کا ایک شعبہ اور وارڈ ہے، اس طرح منھ ناک اور کان آنکھ کی بیماریوں کے الگ الگ شعبے ہیں اور ہر شعبہ کا الگ الگ خاص راستہ ہے اور ہر شعبہ میں ایک آؤٹ ڈور ہے، جس میں مریض اپنی باری کا انتظار کرتے ہیں تاکہ مختلف قسم کے مریضوں میں اختلاط نہ ہو کہ بیماریاں ایک سے دوسرے کو لگ جائیں، کارخانہ کے ہر ملازم کے لئے ضروری ہے کہ مہینہ میں ایک مرتبہ طبّی معائنہ کے لئے جایا کرے، ہم لوگوں نے ہر ملازم کا ایک خاص رجسٹر اور دستخط دیکھے، اسپتال کے سرجیکل وارڈ میں بہتر ۷۲ بیڈ ہیں، ہم لوگ بعض کمروں میں داخل ہوئے، مریضوں سے ملے اور ان کی عیادت کی۔

یہاں سے ہم لوگ ایک خاص موٹر پر ملازمین کا وہ بڑا شہر دیکھنے گئے، جس کو کمپنی نے بنایا ہے جو بارہ لاکھ مصری پاؤنڈ سے تیار ہوا ہے اور تقریباً ۶۷ (فدان) ایکڑ میں پھیلا ہوا ہے، اس میں ایسے مکانات ہیں جس میں پانچ سو پچاس شادی شدہ ملازمین مع اپنے اہل وعیال کے رہ سکتے ہیں، اور سترہ سو غیر شادی شدہ لوگ رہ سکتے ہیں، اس شہر میں ایک اسپتال ہے، جائے تفریح، پبلک غسل خانہ، لڑکوں اور لڑکیوں کا علحدہ علحدہ ایک مدرسہ، اسپتال اور کھیل کے

میدان ہیں، ایک بازار ہے جہاں ملازمین اپنی ضروریات کی چیزیں خریدتے ہیں، ہم لوگ کمپنی اور مدینۃ العمال کی سیر سے واپس ہوئے وہاں ہم نے جو کچھ دیکھا اور سنا اور جن شعبوں سے گزرے ان سے جی بھر گیا، یہ سب دیکھ کر ہمیں بڑی خوشی ہو رہی تھی کہ کمپنی کا نظام مسلمان چلا رہے تھے اور کمپنی مشرقی اور ملکی ہے، ہم کو توقع ہے کہ حقیقت شہرت کے مطابق ہوگی، ظہر کے وقت ٹرین سے ہم نے سفر کیا اور عصر سے قبل بحمد اللہ بخیریت قاہرہ پہونچ گئے۔

جمعرات ۱۳/۷/۱۳۷۰ھ مطابق ۱۹/۴/۱۹۵۱ء

ڈاکٹر منصور فہمی باشا سے باتیں ان کی ابتدائی زندگی کے حالات

آج عصر بعد ہم لوگ ''انصار السنۃ المحمدیۃ'' کے دفتر گئے کہ شیخ محمد حامد فقی کے بارے میں معلوم کریں، وہ ریاض گئے ہوئے تھے اور کافی عرصہ ہو گیا تھا، وہ ہمیں اپنے دفتر ہی میں مل گئے اور اپنے حالات سفر سنائے، یہاں سے ہم لوگ ڈاکٹر منصور فہمی سے ملنے شارع محمد عبد المنعم ''الجیزۃ'' گئے، ہم جب جب بھی ان سے ملنے کی کوشش کرتے، یا ٹیلیفون سے بات کرنا چاہتے تو کوئی نہ کوئی ایسی بات پیش آجاتی کہ نہ ان سے ملاقات ہو پاتی، نہ ٹیلیفون پر رابطہ قائم ہوتا، اس مرتبہ قسمت نے یاوری کی، ڈاکٹر صاحب موجود اور ہمارے منتظر تھے ہم لوگ ایک بہت بڑے اور شاہانہ انداز سے سجے ہوئے کمرے میں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے، میرے پوچھنے پر انھوں نے اپنی پہلی زندگی، اور سابقہ رجحان کو بیان کیا اور فرمایا کہ وہ پہلے دین کے باغی اور مخالف تھے، اس بارے میں بحث و مباحثہ اور ضرورت پر قوت کے استعمال تک میں ان کو باک نہیں ہوتا تھا، ایک مرتبہ ازہر کے ایک سوڈانی عالم کے بارے میں سنا کہ وہ ان کو کافر کہتے ہیں اور ان کے خون کو مباح سمجھتے ہیں، یہ طاقت ور بھی تھے چنانچہ ایک قہوہ خانہ میں ان کے پاس گئے اور ان کے مقابلہ پر آمادہ ہو گئے، وہ گھبرا گئے، ان کے جی میں جو کچھ آیا ان کو کھری کھری سنا کر واپس ہوئے۔

علماء ان کو کافر اور برا بھلا کہتے تھے، یہ چیز ان کو دین سے دور کرتی تھی اور اس کی

مخالفت پر آمادہ کرتی تھی، وہ جامع ازہر کے شیخ حسونہ کی سمجھداری کا برابر ذکر کرتے رہے کہ ایک مرتبہ شیخ کے پاس ایک عالم ان کو لے گئے اور ان سے میرے بعض نظریات وخیالات کو جو دین اور مقام رسالت کے خلاف تھے بیان کیا، شیخ حسونہ، ڈاکٹر فہمی سے بڑی نرمی سے ملے اور فرمایا، آدمی کبھی غلطی کر جاتا ہے اور اس سے لغزش ہو جاتی ہے، شیخ نے ان پر لعن طعن نہیں کی، خوش اخلاقی کی اس ملاقات نے ان کے دل پر اثر کیا اور ان کا جذبۂ بغاوت سرد پڑ گیا۔

ڈاکٹر فہمی میں دینی رجحان پیدا ہونے کے اسباب

میں نے ڈاکٹر فہمی سے پوچھا کس چیز نے آپ کے دل کو متأثر کیا اور آپ کے فکر کو دین کی طرف موڑا؟ فرمایا کہ اس کا سبب قدرتی تھا، مغربی تہذیب کی ناکامی نے مجھ پر اثر کیا، خاص طور سے عائلی نظام اور خاندانی تعلقات کی کمزوری نے بہت متأثر کیا عائلی نظام میں انتشار کا زندگی اور تہذیب پر بہت دوررس اثر پڑتا ہے، میں نے کہا کہ تہذیب وثقافت کی ناکامی کا اثر سب سے پہلے گھریلو نظام میں انتشار کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے، انھوں نے کہا جی ہاں، اور تخریب پسند مذاہب جیسے وجودیت وغیرہ ہمیشہ اس کے لئے کوشاں رہتے ہیں کہ مشرق اس میں مغرب کی تقلید کرے، یہ سارے مذاہب اخلاق سے خالی گری ہوئی مغربی تہذیب کی پیداوار ہیں، اس تہذیب وثقافت کی پیداوار نہیں ہیں جس نے علوم وفنون کو وجود بخشا اور معاشرہ کو منظّم کیا، انھوں نے کہا ہندوستان کے مقابلہ میں مصر کے لوگوں میں مغربی تہذیب کی طرف زیادہ رجحان پایا جاتا ہے ہندوستان میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جنھوں نے اس تہذیب سے بغاوت کی اور اس کے سخت مخالف ہو گئے، مصر میں یہ بات نہیں پائی جاتی، میں نے ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ تقریباً پندرہ سال پہلے میں نے آپ کا ایک بہت طاقتور مقالہ پڑھا تھا، اس کے اثرات ابھی تک ذہن میں باقی ہیں، وہ مقالہ سال کے اختتام اور نئے سال کی آمد پر تھا، انھوں نے کہا جی ہاں، اس مقالہ کا کئی لوگوں نے ذکر کیا، وہ مقالہ مضامین کے ایک مجموعہ میں جو (خطرات نفس) کے نام سے شائع ہوا ہے

موجود ہے پھر آں محترم اٹھے اور اس کا ایک نسخہ مجھے ہدیہ کیا، فرمایا یہ جوانی کے جذبات وخیالات ہیں، اس میں آپ کوئی فکر ودین نہ تلاش کریں لیکن اس کی خامیوں کے باوجود اس کو پڑھیں اس لئے کہ یہ واردات قلب اور حدیث دل کی ڈائری ہے۔

ڈاکٹر فہمی کا ادبی مقام

معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر فہمی کا بڑا روشن ادبی مستقبل تھا، ان میں یہ صلاحیت تھی کہ مصر کے نمایاں ادباء کے گروہ میں اپنا مقام پیدا کر لیتے، لیکن وہ لکھنے پڑھنے میں زیادہ لگے ہی نہیں، بس مطالعہ اور گوشۂ تنہائی کو ترجیح دی، ان کے مضامین اگر چہ کم ہیں مگر دلچسپ، عام فہم اور ہلکے پھلکے ہوتے ہیں، وہ فصیح الفاظ کے انتخاب اور عمدہ عبارتوں کی ترتیب میں منفلوطی سے متأثر معلوم ہوتے ہیں، بڑی مفید گفتگو اور طویل نشست کے بعد ہم لوگ ان کے پاس سے واپس ہوئے۔

جمعہ ۱۴/۷/۱۳۷۰ھ مطابق ۲۰/۴/۱۹۵۱ء

جمعہ ہم نے دارالارقم میں پڑھا، وہاں پہنچے تو استاذ یوسف کھڑے حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز کی سیرت پر تقریر کر رہے تھے، نماز بعد مجھ سے تقریر کرنے کو کہا، میں نے انھیں کی تقریر پر تبصرہ کیا، ہم لوگ تھوڑی دیر ان کے دفتر میں بیٹھے اور حاضرین مجلس سے تعارف حاصل کیا، حسین یوسف صاحب نے منگل کے دن تشریف لانے کا وعدہ کیا، عصر بعد ہم لوگ جلال حسین صاحب کے گھر الجیزہ گئے، انہوں نے پاکستانی صحافیوں کو چائے پر مدعو کیا تھا ہمیں بھی دعوت دی تھی، وہاں بعض دوستوں سے تعارف ہوا، پاکستانی سفارتخانہ کے نئے صحافی شریف الحسن صاحب سے ملاقات ہوئی، انھوں نے میری بعض اردو وعربی کی کتابوں سے مجھ کو پہنچان لیا، وہ میرے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے واقف تھے، اس سے پہلے بھی انھوں نے مجھ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تھی مگر میں مل نہ سکا تھا، آج بلا وقت طے کئے ملاقات ہوگئی، مغرب کی نماز کے بعد ہم لوگ واپس ہوئے۔

شنبہ ۱۵/۷/۱۳۷۰ھ مطابق ۲۱/۴/۱۹۵۱ء

یوم اقبال کے جلسہ میں عباس محمود عقاد سے ملاقات

صبح سویرے ''الادارۃ الثقافیۃ'' گئے، یہاں سے جمعیۃ الشبان المسلمین گئے اور ڈاکٹر یحییٰ احمد الدردیری سے ملے اور معلوم ہوا کہ میرا مقالہ ''الدعوۃ الاسلامیۃ فی الھند وتطوراتھا'' جون سے قبل نہیں شائع ہوگا، میں نے ان سے دوسری جگہ شائع کروانے کی اجازت لی انھوں نے اجازت دے دی اور ہم نے وہاں سے مشہور ادیب اور انشاپرداز استاذ محب الدین الخطیب (سابق مدیر الفتح) سے ملنے کے لئے روضہ کا رخ کیا، ان سے الگ کتابچہ کی شکل میں اس کا شائع کرنا طے ہوگیا، یہاں سے ہم حجاز کے گورنمنٹ پریس مینجر (حال وارد مصر) جناب سیّد محمود حافظ سے ملنے گئے، وہیں دن کا کھانا کھایا اور دیر تک بیٹھے، ہم لوگوں نے پریس کلب میں مغرب کی نماز پڑھی اور یوم اقبال کے جلسہ میں حاضر ہوئے، یہاں پہلی مرتبہ مصر کے مشہور ادیب اور صاحب اسلوب و نامور مصنّف استاذ عباس محمود العقاد کو دیکھا اور اقبال پر ان کی تقریر اور دوسرے اساتذہ کے مقالے سنے، ہمیں اس کا افسوس ہوا کہ ان میں سے کسی نے اقبال کو اچھی طرح نہیں پڑھا ہے اور نہ ان کے پیغام وجذبات کو سمجھ سکے ہیں، اس لئے کہ اقبال کی انگریزی کتابیں اور مقالات ان کے پیام کو نہیں ادا کرتے اور نہ ان کے فکر کو پیش کرتے ہیں، ان میں تو محض فلسفہ وتصوف اور علم کلام وسیاست سے متعلق بحثیں ہیں، اس صورتحال سے دوچار ہونے کے بعد اقبال پر جو مقالات میں نے یہاں پڑھے تھے ان کو شائع کرنے کا پختہ ارادہ ہوگیا گو وہ چھوٹے اور مختصر ہیں، استاذ عباس محمود العقاد نے جلسہ ختم ہونے کے بعد مجھ سے ملنے اور اپنے گھر پر خصوصی ملاقات کا وقت مقرر کرنے کے لئے کہا تھا، لیکن مجھے بخار کا اثر محسوس ہو رہا تھا، جس کے ابتدائی اثرات ظاہر ہونے لگے تھے، میں نے بہتر سمجھا کہ بخار بڑھنے سے پہلے اپنی قیام گاہ واپس ہو جاؤں چنانچہ بے ملاقات چلا آیا۔

یکشنبہ ۱۶/۷/۱۳۷۰ھ مطابق ۲۲/۴/۱۹۵۱ء

طبیعت کی ناسازی اور علاج ومعالجہ

آج میں بخار سے متاثر و پریشان رہا قابل تحریر کوئی بات نہیں ہوئی سوائے اس کے کہ پاکستانی کلب میں جناب عبدالستار سیٹھ سے ملاقات کی، انھوں نے بڑے شوق وبشاشت کے ساتھ میرا استقبال کیا اور فرمایا کہ میں آپ سے ملنے کا بہت مشتاق تھا اور آپ کا پتہ معلوم نہیں تھا، یا تو آپ اپنا پتہ بتاتے کہ آپ سے ملتا یا آپ اپنی تشریف آوری سے نوازتے، یوم اقبال کے موقع پر یونیورسٹی میں آپ کا پتہ معلوم نہ کرسکا۔

دوشنبہ ۱۷/۷/۱۳۷۰ھ مطابق ۲۳/۴/۱۹۵۱ء

آج ہم لوگ جمعیۃ الشبان المسلمین گئے اور جمعیۃ کی شاخوں میں تقسیم کرنے کے لئے اپنے رسالہ (اسمعی یامصر) اور (من غارحرا) کے کچھ نسخے دیئے اور ادارہ لجنۃ التالیف والترجمۃ کے مرکز بھی گئے، اور جناب عبدالمتعال آفندی سے ملے اور رسالۃ الدعوۃ کے دفتر سے گذرے اور صبری عابدین سے ملاقات کی، انھوں نے جمعرات کو دوپہر کے کھانے پر مدعو کیا، ان کے پاس سے اپنے دوست ڈاکٹر خلیل عشماوی صاحب کے گھر گئے، ساتھ میں اخوان المسلمین کے صدران کے بھائی صالح عشماوی صاحب تھے، ڈاکٹر صاحب ہی کے یہاں ہم لوگوں نے دوپہر کا کھانا کھایا، میں نے ڈاکٹر صاحب سے بار بار بخار آجانے کا ذکر کیا، انھوں نے اچھی طرح ڈاکٹری معائنہ کیا اور اگلے دن بلایا۔

سہ شنبہ ۱۸/۷/۱۳۷۰ھ مطابق ۲۴/۴/۱۹۵۱ء

آج قابلِ تحریر کوئی چیز یاد نہیں پڑتی۔

چہارشنبہ ۱۹/۷/۱۳۷۰ھ مطابق ۲۵/۴/۱۹۵۱ء

ڈاکٹر عشماوی صاحب کے یہاں گئے، ہم میں سے ہر ایک کا معائنہ اور ملیریا پیچش

اور انمیا (خون کی کمی) اور جگر کی خرابی کے لئے بہت سی دوائیں لکھ دیں، ساری دوائیں اور انجکشن خود ہی پیش کئے، دواؤں کے استعمال اور انجکشن لینے کے لئے ایک طویل ٹائم ٹیبل بنایا، میری صحت کے سلسلے میں اپنے فکر وقلق کا اظہار کیا اور مجھ سے مصر میں قیام کرنے کو فرمایا تاکہ اچھی طرح میرا علاج کرسکیں، میں نے زیادہ دنوں تک رہنے سے معذوری ظاہر کی، البتہ دواؤں کے استعمال کا وعدہ کیا، ان کے پاس سے ہم لوگ ان کے لطف وعنایت اور اخلاص کے شکر گذار ہوکر واپس ہوئے، دوپہر کا کھانا آج بھی انھیں کے ساتھ کھایا۔

پنجشنبہ ۲۰/۷/۱۳۷۰ھ مطابق ۲۶/۴/۱۹۵۱ء

شیخ صبری عابدین کی قیام گاہ پر

کل سے ملیریا کی دواؤں کے اثر سے مجھے شدید متلی اور بے چینی رہی اور پورا دن بے کیفی میں گذرا، آج شیخ صبری عابدین کے یہاں کھانا کھانے کا وقت مقررہ بھی آگیا، لہٰذا رفقاء کے ساتھ مصر جدیدہ گیا راستہ میں ہمیں ازہر کے عالم محمد ابوالعیون مل گئے بڑی گرمجوشی سے ہمارا خیر مقدم کیا اور شیخ صبری کے گھر کی طرف ہماری رہنمائی کی وہ راستہ بھر مصریوں کی اخلاقی گراوٹ اور ان کی بے حیائی کا شکوہ کرتے رہے اور انجمن تحفظ قرآن کریم کے جلسہ کی روداد بیان کرتے رہے اور بتاتے رہے کہ لڑکیاں کس قدر بے پردہ تھیں، لاؤڈ اسپیکر پر مغرب کی اذان ہوئی مگر اذان ہوجانے کے باوجود جلسہ والوں نے مغرب کی نماز مؤخر کی اور اتنی مؤخر کی کی استاذ ابوالعیون کو ناگواری ہوئی اور انھوں نے حاضرین میں سے کچھ لوگوں کو ساتھ لے کر الگ نماز پڑھ لی، انھوں نے اپنی جیب سے میرا رسالہ ''اسمعی یا مصر'' نکالا اور فرمایا کہ میں اس کو برابر ساتھ رکھتا ہوں واپسی میں ہمیں اپنے گھر آنے کی بڑی تاکید فرمائی ہم نے اس کی تعمیل کی اور محترم صبری عابدین صاحب کے یہاں فلسطینی کھانا کھایا، مقلوبہ(۱) اور کھانے کے دوسرے انواع واقسام تناول کئے، کھانے سے فارغ ہونے کے بعد چائے

(۱) پلاؤ کی ایک قسم جس میں گوبھی یا کرم کلا شامل ہوتا ہے۔

کا دور شروع ہوا اور ان تصاویر کے دیکھنے میں کچھ وقت گذرا جو انھوں نے یمن کے سفر میں کھینچی تھیں، وہ وہاں کے بے مثال مسجدوں اور مناظر کی نقشہ پیش کر رہی تھیں، شیخ صبری عابدین صاحب کی دلچسپ باتوں سے دل بہل گیا، ہم لوگ شیخ صبری عابدین کے گھر سے ان کی کرم فرمائی پر مشکور واپس ہوئے اور راستہ میں شیخ ابو العیون کے گھر پر رکے اور کچھ ٹھنڈے مشروبات پیے، پھر اپنی قیام گاہ واپس آ گئے۔

جمعہ ۲۱/۷/۱۳۷۰ھ مطابق ۲۷/۴/۱۹۵۱ء

میرا اور مولانا عبید اللہ بلیاوی صاحب کا بے چینی اور اضطراب کا حال

آج کا دن بڑی پریشانی، بے چینی و اضطراب میں گزرا، ایک عرصہ سے ایسی بے چینی یاد نہیں دل میں طرح طرح کے افکار و خیالات گردش کرتے رہے اور ذہن و دماغ پر چھائے رہے، یہ بات اختلاج قلب کے بڑھ جانے کے سبب پیدا ہوئی جو گرم دواؤں کے استعمال اور ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق کھٹی چیزوں، میوؤں اور فرحت بخش مشروبات کو نہ استعمال کرنے کے نتیجہ میں تھے، جی میں آیا کہ تفریح کروں، چنانچہ عزیزی مولوی عبد الرشید ندوی کے ساتھ العتبۃ گیا وہاں شیخ محمد مظہر مکی ندوی سے ملا، اور پھر برلمان ہوٹل گیا جہاں محترمی شیخ اسحاق علی جان دہلوی اور ان کے بھائی الحاج اسماعیل دہلوی سے ملا، ان قدیم شناساؤں سے مل کر جن کی ملاقات سے حجاز مقدس کے روح پرور جھونکے محسوس ہوئے، طبیعت پر اچھا اثر پڑا، اضطراب و بے چینی میں کمی محسوس ہوئی، جمعہ کی نماز جامع ازہر میں پڑھی اور مولوی عبد الرشید کے ساتھ ازہر کی سڑک پر چہل قدمی کی، میں اپنی دلی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا، کبھی میں اس کیفیت پر غالب آ جاتا اور کبھی یہ کیفیت مجھ پر غالب آ جاتی، پھر میں ہندوستانیوں کے ہاسٹل میں گیا اور سکون کی امید میں ہاسٹل کے نگراں مولانا لقمان ندوی کے پاس بیٹھا، کمرہ واپس ہوا تو رفیق سفر مولوی عبید اللہ صاحب کا بھی میرا ہی جیسا بلکہ اس سے بھی برا

حال تھا، ہم دونوں ایک ہی کشتی کے سوار تھے۔

شنبہ ۲۲/۷/۱۳۷۰ھ مطابق ۲۸/۴/۱۹۵۱ء

امام وخطیب حرم مکی شیخ عبدالرزاق حمزہ سے ملاقات

آج طبیعت میں کچھ نشاط وانبساط نہ ہونے کی وجہ سے اور دل میں الجھن واضطراب کے سبب روزنامچہ نہ لکھ سکا، مولانا عبیداللہ کی یادداشت کی مدد سے جو کچھ لکھوں گا اس میں مئی کے آخری دن کسی قابل ذکر بات سے خالی ہوں گے، آج شیخ حامد فقی سے ان کے دفتر میں ملا، شیخ عبدالرزاق حمزہ ''خطیب حرم مکی'' سے اچانک ملاقات ہوئی جو اپنے وطن مصر آئے ہوئے تھے، ہم لوگ ان دو ہم وطنوں کے طرح ملے جن کی عرصہ کے بعد ملاقات ہوئی ہو، حجاز مقدس ہمارے رگ وریشہ میں وطن عزیز کی طرح سما گیا تھا، میں نے حجاز مقدس کے متعلق بہت سے سوالات کئے، اور انھوں نے وہاں کے بہت سے حالات سنائے، وہاں الجزائر کے مفتی اور سابق وزیر اوقاف سے ملاقات ہوئی، میں نے ''ماذا خسر العالم'' کا ایک نسخہ ان کو مہیا کرنے کا وعدہ کیا، اگلے دن شیخ محمد عبدالرزاق کے ساتھ دارالعلوم کے پرنسپل جناب ابراہیم مصطفیٰ سے ملنا طے کیا۔

یکشنبہ ۲۳/۷/۸۰ھ مطابق ۲۹/۴/۱۹۵۱ء

مولانا عبیداللہ صاحب کے ساتھ کچھ اہم باتیں

آج مولانا عبیداللہ کے ساتھ مطبعۃ السلفیۃ روضہ گئے، اور رسالہ (الدعوۃ الاسلامیۃ) کے پروف کی تصحیح کی اور وہاں سے الادارۃ الثقافیۃ جیزہ گئے اور ڈاکٹر احمد امین سے ملے اور ان سے معلوم کیا کہ والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب جنۃ المشرق (۱) کے بارے میں کیا طے

---

(۱) یہ کتاب ''الھند فی العھد الاسلامی'' دائرۃ المعارف حیدرآباد اور پھر دارعرفات رائے بریلی کی جانب سے شائع ہوگئی ہے، اس کا اردو ترجمہ ہندوستان اسلامی عہد میں'' کے نام سے مولانا ڈاکٹر شمس تبریز خاں کے قلم سے اور انگریزی ترجمہ اور تلخیص INDIA MUSLIM RULE DURING'' کے نام سے جو جناب محی الدین صاحب کے قلم سے مجلس تحقیقات ونشریات لکھنؤ نے شائع کیا ہے۔ (مترجم)

ہوا، انھوں نے کہا کہ استاذ محمد فرید ابوحدید (کمیٹی نے جن کے سپرد کتاب کے جائزہ لینے کا کام کیا تھا) کی رائے ہے کہ کتاب وقیع اور بڑے اچھے مواد پر مشتمل ہے، لیکن ہندوستان میں انگریزی دور کے بعد کی تاریخ کے تکمیلی ابواب کے اضافہ کی متقاضی ہے اگر آپ اس اضافہ کی زحمت کریں تو کتاب کی طباعت میں کوئی رکاوٹ نہیں، میں نے کہا میں اس کے لئے تیار ہوں، میں انجمن کے دفتر سے کتاب لے لوں گا، یہاں سے ہم لوگ ''انصار السنۃ'' کے مرکز گئے جہاں شیخ عبدالرزاق حمزہ سے ملے اور ساتھ ساتھ دارالعلوم گئے وہاں ابراہیم مصطفیٰ اور دارالعلوم کے بعض اساتذہ سے ملے، جناب عمر الدسوقی نے اپنی کتاب '' الفروسية عند العرب '' کا ایک نسخہ مجھے ہدیہ کیا، آج دوپہر کا کھانا مولانا لقمان صاحب ندوی کے یہاں ہوا، انھوں نے ایک افغانی بزرگ کے تعاون سے افغانی کھانا تیار کیا تھا، محفوظ آفندی نے مجھ سے کہا کہ میں اپنی نئی کتاب (إلی الاسلام من جدید) کی ہر فصل میں پڑھنے والوں کے لئے مقدمہ کے طور پر مختصراً کچھ پیش لفظ لکھ دوں لیکن میں نے اپنے کو لکھنے سے مجبور پایا، یہ جذبہ ان دنوں ایسا سرد پڑا جیسے اب کبھی لکھنے کی امنگ ہی پیدا نہ ہوگی، لہٰذا میں نے سوچا کہ اس سلسلہ میں اپنے فاضل دوست شیخ احمد الشرباصی سے مدد لوں، جن کو لکھنے میں کچھ زیادہ دشواری اور زیادہ غور وفکر کی زحمت پیش نہ آئے گی، چنانچہ میں ان کے گھر پر ان سے ملا اور اس کی خواہش ظاہر کی، انھوں نے بغیر کسی تردّد کے اس کو منظور کرلیا، محترم سفیر پاکستان سے پاکستانیوں کے کلب میں ملے اور حاجی اسحاق اور حاجی اسماعیل سے برلمان ہوٹل میں ملاقات کی اور ان کے ساتھ ہندوستانی کھانا کھایا۔

دوشنبہ ۲۴/۷/۱۳۷۰ھ مطابق ۳۰/۴/۱۹۵۱ء

مصر میں جشن شمّ النّسیم

آج شم النسیم کا دن تھا، یہ مصر کا مشہور ملکی تہوار ہے، ایسے ہی جیسے ہمارے ملک ہندوستان میں بسنت اور ایران میں نوروز ہوتا ہے، یہ دن ایسا ہوتا ہے جس میں قوم اپنے جامہ سے باہر ہوکر، اور تمام آداب واخلاق بالائے طاق رکھ کر تفریح اور لہو ولعب میں بدمست

ہوجاتی ہے، ہم نے دیکھا کہ لوگ تنہا اور ٹولیوں کی شکل میں نیل کی طرف جارہے ہیں، مرد اور عورتیں سبھی پارکوں کی طرف روانہ ہیں، ان میں سے بہتیرے آج کے دن اپنے وقار و ذاتی رکھ رکھاؤ کا لبادہ بھی اتار دیتے ہیں، اور ادب وتہذیب اور ثقافت سے بغاوت کر جاتے ہیں، جگہ جگہ آپ کو شراب کی بو آئے گی، آج شیخ حامد فقی نے اپنے گھر پر دوپہر کے کھانے پر مدعو کیا، اتفاق یہ کہ بلا ارادہ یہ جشن شم النسیم کا دن تھا، متعدد دوسرے مہمانوں کے ساتھ ہم نے کھانا کھایا، دسترخوان پر کئی قسم کی پکی ہوئی مچھلی موجود تھی۔

میں الحاج حلمی منیاوی کے پریس گیا اور اپنی کتاب (شاعر الاسلام الدکتور محمد اقبال) کے پروف کی تصحیح کی جس کو بھائی وہبہ حسن مالک مکتبہ اپنے یہاں سے شائع کریں گے، میرے مضامین کے خلاصے لے کر جس کی کل ہی میں نے درخواست کی تھی، اچانک شیخ احمد الشرباصی صاحب آگئے، مجھے یہ توقع تھی کہ وہ اس کو ایک دن میں پورا کردیں گے لہٰذا بڑی خوشی ہوئی، دیکھا تو یہ خلاصے بہت جامع، فصیح وبلیغ، مضامین اور ان کے مقاصد سے ہم آہنگ تھے، اس میں شک نہیں کہ شیخ احمد الشرباصی حیرت انگیز طور پر سریع الفکر، برجستہ اور عمدہ لکھنے پر قادر ہیں۔

سہ شنبہ تا پنجشنبہ ۲۵/۲۶/۷/۱۳۷۰ھ، ۱/۲/۳/۵/۱۹۵۱ء

ان تین دنوں میں کوئی قابل ذکر بات پیش نہیں آئی۔

جمعہ ۲۸/۷/۱۳۷۰ھ مطابق ۴/۵/۱۹۵۱ء

جامع ظاہر بیبرس جاشنگیر میں

محترم شیخ صبری عابدین ہماری قیام پر ہم سے ملے انھوں نے دو مرتبہ ہمیں ملاقات کا شرف بخشا ہم لوگ ان کے ساتھ ظاہر بیبرس گئے وہ راستہ میں تاریخی آثار بتاتے جاتے تھے، جن عمارتوں اور مسجدوں کے پاس سے گزرتے ان کی تاریخ بیان کرتے، انھیں عمارتوں میں سلطان صلاح الدین کی خانقاہ بھی تھی، جس کے کثیر اور بڑے اوقاف کی وجہ سے اس کی تولیت کے حصول کی خاطر بڑے بڑے علماء ومشائخ میں کشمکش ہوتی تھی، ہم لوگ جامع

بیبرس پہنچے اور وہیں جمعہ پڑھا، یہ وہی جامع ہے جس کے اوقاف کے متولی امام سیوطی بھی رہ چکے ہیں م، ایک مرتبہ انھوں نے وقف کی آمدنی میں سے ان لوگوں کو دینے سے انکار کر دیا جو وقف کرنے والے کی شرائط کے مطابق علم وذکر نہیں کرتے تھے، بلکہ بیکاری میں اپنا وقت گزارتے تھے، چنانچہ یہ لوگ آپ سے باغی ہوگئے اور آپ کو جامع کے بیچ واقع ایک حوض میں ڈال دیا جس سے آپ بڑی مشکل سے نکل سکے۔

نقشبندی بزرگ شیخ تمام نقشبندی کی زیارت

نماز بعد ہم لوگ شیخ تمام نقشبندی سے ملے وہ شیخ امین بغدادی کے خلیفہ ہیں جو مصر کے بڑے نقشبندی مشائخ میں سے تھے، اور جن کے سر اس ملک میں اس سلسلہ کی اشاعت کا سہرا ہے، یہاں ہم کو ہمارے دوست محمد رشاد کامل مل گئے جو اکثر شیخ کے پاس آجایا کرتے ہیں، دلچسپ اتفاق کہ شیخ محمد صبری عابدین نے ہم سے اجازت چاہی اور بتایا کہ وہ مصر جدیدہ میں کچھ احباب کے ساتھ کھانے پر مدعو ہیں، ہم نے بھی ان کو بتایا کہ ہم بھی ایک جگہ مدعو ہیں، محترم صبری عابدین صاحب اپنی سمت کو چلے اور میں الحاج حلمی کے پاس گیا تاکہ ان کے اور ان کے ساتھیوں شیخ محمد غزالی اور استاذ سید سابق کی ہمراہی میں دعوت میں جاؤں جب داعی کے گھر میں داخل ہوتا ہوں تو کیا دیکھتا ہوں کہ شیخ صبری عابدین بھی وہاں موجود ہیں، شیخ مفتی امین الحسینی بھی ہیں جو ابھی جلد ہی پاکستان وافغانستان کے سفر سے واپس آئے تھے، سفیر افغانستان شیخ محمد صادق مجددی اور سربرآوردہ لوگوں کی ایک جماعت موجود ہے، شیخ صبری عابدین ہم کو دیکھتے ہیں اور ہم ان کو ایک دوسرے سے رخصت ہونے کے بعد بے سان وگمان پھر دونوں کی ملاقات ہوگئی۔

مفتی امین الحسینی سے ملاقات اور ان کی روحانی بلندی

مفتی امین الحسینی نے میرے تذکرہ کی بنا پر اپنی فراست وذہانت سے مجھے پہچان لیا

اور بہت پرتپاک خیر مقدم کیا، اپنے پہلو میں بیٹھالیا لطف ومحبت سے باتیں کرتے رہے اور حاضرین کے سامنے دیر تک محبت سے میرا تذکرہ کرتے رہے، میں نے انھیں یاد دلایا کہ لکھنؤ میں آپ سے اس وقت ملا تھا جب آپ محمد علی علوبہ باشا کے ساتھ لکھنؤ آئے تھے اور دارالعلوم ندوۃ العلماء میں آپ کے اعزاز میں جلسہ ہوا تھا یہ ۳۳؍۳۴ھ کی بات تھی، اب انھیں اپنی آمد یاد آگئی، دسترخوان میں ان کے پہلو ہی میں بیٹھا برابر میرا خیال رکھا اور میری طرف متوجہ رہے، میں نے ان کو خوش خلقی، روحانی بلندی اور غیر معمولی یادداشت کے اونچے مقام پر پایا، اس میں شبہ نہیں کہ وہ اس عہد کے مسلمان زعماء وقائدین میں اونچا مقام رکھتے ہیں اور سادات بنی ہاشم کے اخلاق کا پرتو ہیں۔

شنبہ ۲۹/۴/۱۳۷۰ھ مطابق ۵/۵/۱۹۵۱ء

ہم لوگ الروضہ گئے اور رسالہ ''الدعوۃ الاسلامیۃ'' آخری بار تصحیح کے لئے ساتھ ساتھ لائے اور ''دارالکتاب العربی'' کے پریس گئے اور ''شاعر الاسلام الدکتور محمد اقبال'' کتابچہ کے پروف کی تصحیح کی، اس کے بعد جلال حسین صاحب کے دفتر گئے اور ہندوستان سے آئی ہوئی ڈاک حاصل کی، ظہر بعد ہم لوگ حلوان گئے اور شیخ حسنین محمد مخلوف کی عیادت کی، یہاں شیخ احمد الشرباصی سے ملاقات ہوگئی، شیخ محترم کے گھر سے ہم لوگ استاذ سید قطب کی ملاقات کو گئے، ان سے ملے ہوئے عرصہ ہوگیا تھا، پتہ ہم قیام گاہ ہی پر بھول گئے لہٰذا بہت گھومنے پھرنے اور تحقیق ودریافت کے باوجود بھی ان کا گھر نہ پاسکے اور قاہرہ واپس آگئے۔

یکشنبہ ۳۰/۷/۱۳۷۰ھ مطابق ۶/۵/۱۹۵۱ء

مفتی رجب کا دعوت نامہ

ہم لوگ دارالکتاب العربی گئے، وہاں ہمیں محترم مفتی امین الحسینی صاحب کا خط ملا جس میں منگل کے دن مصر جدیدہ میں اپنے گھر پر کھانے کی دعوت دی تھی، آج شاہ فاروق کی

شادی کا دن تھا، پورا قاہرہ دُلہن بنا ہوا تھا، دار السلطنت قاہرہ کے اطراف ونواح سے آنے والوں اور تفریح کرنے والوں سے بھرا ہوا تھا، بجلی کے قمقموں سے شہر جگمگا رہا تھا، گھروں، دوکانوں اور کوٹھیوں پر ایسا چراغاں تھا کہ اگر اس کو پورے ملک مصر پر تقسیم کر دیا جائے تو پھر کسی مکان اور جھونپڑے میں تاریکی اور نہ کسی راہ گیر کو ٹھوکر لگے اور نہ کسی گلی میں اندھیرے کا نشان ملے، ٹیم ٹام پر جو دولت خرچ کی گئی تھی اگر اس کا عشر عشیر بھی پورے ملک پر تقسیم کر دیا جائے تو نہ کوئی بھوکا رہے نہ ننگا،، خدا کو منظور تھا کہ مصر کے قیام میں اس جشن مسرت پر بھی نظر پڑ جائے اور عبرت حاصل ہو ورنہ ہم نے توکل شرباصی صاحب سے ''جبہۃ علماء الازہر'' کے معائنہ کا وعدہ کیا تھا، مگر اس مختصر فاصلہ کو طے کرنے میں بھی بھیڑ بھاڑ اور سواریوں کا ہجوم ختم ہونے کا نام نہیں لیتا تھا، چنانچہ شارع ازہر کا راستہ کاٹ کر ہم بڑی مشکلوں سے وزارت داخلہ کی سڑک پر آ گئے جہاں ''الجبھۃ'' کا مرکز ہے، ہمارا راستہ قصر عابدین کی طرف سے تھا، اس طرح ہم نے بلا ارادہ شاہی شادی کے تزک واحتشام کو دیکھ لیا، ہم لوگ ''الجبھۃ'' پہنچے اور ڈاکٹر محمد یوسف موسیٰ سے ملے، ان کی ملاقات ہی اس پر مشقت سفر کا حاصل تھی، انھوں نے میری زیر طبع کتاب (الی الاسلام من جدید) سے متعلق گفتگو کی انھوں نے کہا شاید ان تمام مضامین ومقالات کے درمیان جو مختلف انداز ومواقع پر لکھے گئے ہیں، جو بات قدر مشترک ہے وہ یہ خواہش کہ مسلمانوں میں ان کے دین وپیغام کے بارے میں پھر سے اعتماد ویقین کو بحال کیا جائے، میں نے کہا جی ہاں، میں ڈاکٹر صاحب کی دقت نظر اور سلامت فکر سے بہت متاثر ہوا، اپنی قیام گاہ واپس آنے سے پہلے سے بھی زیادہ مشکلات کا سامنا ہوا، شدید بھیڑ سے دم گھٹنے لگا، قیام گاہ پہنچے تو تھک کر چور تھے۔

۱/۲/۸/۱۳۷۰ھ، ۷/۸/۵/۱۹۵۱ء

دوشنبہ اور سہ شنبہ کے دو دنوں میں کوئی قابل تحریر بات اس کے سوا نہیں ہے کہ کتب خانہ ازہر دار الکتاب العربی اور العشیرۃ المحمدیۃ جانا اور شبرہ میں شیخ عبد المنعم النمر (۱) سے ان کے

(۱) شیخ عبد المنعم النمر وزیر اوقاف مصر رہے اور ہندوستان سے ان کا گہرا تعلق علمی وثقافتی رہا دار العلوم دیوبند میں محاضر بھی رہے اور ندوۃ العلماء بھی تشریف لائے، ہندوستانی تاریخ پر ان کی کتابیں ہیں (مترجم)

گھر پر ملاقات اور سعودی عرب میں تعلیم کے مدیر عام شیخ محمد بن صانع کے صاحبزادہ اور ان کے بھائی شیخ عبدالعزیز سے شارع فؤاد الاول پر ایڈن ہوٹل میں ملاقات کرنا ان دو دنوں کا مشغلہ تھا۔

چہار شنبہ ۳/۸/۱۳۷۰ھ مطابق ۹/۵/۱۹۵۱ء

حضرت مفتی امین الحسینی کی ضیافت

آج ہم لوگ حضرت مفتی امین الحسینی کے پاس شارع محمد علی مصر جدیدہ گئے اور کچھ معزز مہمانوں کے ساتھ ان کے یہاں دن کا کھانا کھایا، کھانا بڑا لذیذ وعمدہ اور قریب قریب ہمارے ہندوستانی ذوق کا تھا، مفتی صاحب کی باتیں بھی ان کی عادت کے مطابق شیریں ولطیف تھیں جو اُنس ولطف کو دوبالا کر رہی تھیں، کھانے کے بعد حضرت مفتی صاحب نے اتوار کو گیارہ بجے اپنے دفتر میں ذاتی گفتگو اور نجی مجلس کے لئے بلایا میں نے اس دعوت کو بخوشی قبول کر لیا اس لئے کہ میں خود ہی موقع کا منتظر تھا۔

پنجشنبہ تا شنبہ ۴، ۵/۶/۸/۱۳۷۰ھ مطابق ۱۰، ۱۱، ۱۲/۵/۱۹۵۱ء

سوائے شیخ حسن البناء کے والد شیخ احمد عبدالرحمٰن البناء سے ملاقات کے ان تین دنوں میں کوئی اور خاص ملاقات نہیں ہوسکی جو قابل ذکر ہو، شنبہ کے روز برادران مکرم یوسف قرضاوی، محمد دمرداشی، عبداللہ العقیل اور محترم شیخ احمد الشرباصی اور ڈاکٹر خلیل عشماوی ہم لوگوں سے ملے۔

یکشنبہ ۷/۸/۱۳۷۰ھ مطابق ۱۳/۵/۱۹۵۱ء

مفتی صاحب سے گفتگو، حسن البناء کی تعریف اور اخوانیوں کی قربانیوں کا اعتراف

ہم لوگ محترم مفتی امین الحسینی سے ملنے شارع رمسیس پر واقع ان کے دفتر مصر جدیدہ گئے، مصر میں جتنی ملاقاتیں ہوئیں ان میں یہ سب سے دلچسپ اور اچھی ملاقات تھی، اگرچہ ملاقات نے دل کو زخمی، اور غموں کا تازہ کر دیا محترم مفتی صاحب نے ایک خصوصی مجلس میں

ہمارے ساتھ دیر تک باتیں کیں، انھوں نے جہاد فلسطین کی تاریخ یہودیوں کے جارحانہ وناپاک عزائم حتی کی مدینہ منوّرہ اور یہودیوں کی پرانی آبادی خیبر تک قبضہ کی خواہش کا اظہار اور علی الاعلان اس کا مطالبہ اور اس کے لئے پورے طور پر تیاری وآمادگی کا اظہار، مسلمانوں کے ساتھ انگریزوں کا نفاق اور چالبازی، ان کے دل میں چھپے ہوئے بلکہ ان کی باتوں اور کردار سے ظاہر ہونے والے صلیبی جذبات کے متعلق باتیں کیں۔

(قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَاءُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ وَمَا تُخْفِي صُدُورُهُمْ أَكْبَرُ)

اور ان ساری مکاریوں کے مقابلہ میں مسلم قوم کی سادہ لوحی اور بہت جلد دام فریب میں آجانے کا ذکر اور عرب حکومتوں کی مجرمانہ غفلت اور اس کے انجام اور صیہونی خطرات سے لاپرواہی وغیرہ کا ذکر کیا جو برابر اس کے وجود کو چیلنج کر رہے تھے، عرب بادشاہوں کے اپنے ذاتی اغراض ومقاصد اور عیش وتنعم میں انہماک، المیہ فلسطین کے ذمہ دار ہونے کے باوجود عرب لیگ کی خاموشی اور فلسطینی مجاہدین کو ہتھیار سے خالی کردینے اور عرب خطوں کو یہود کے حوالہ کردینے اور غیرت مند بہادر فلسطینی مجاہد قوم کو جہاد نہ جاری رکھنے اور ان کو کچھ بھی فائدہ نہ پہونچانے بلکہ ان کی جگہ پر قابض ہوجانے کی دلخراش حقیقت کو بیان کیا اور خود جو مصائب جھیلے ان کو بیان کیا اور بتایا کہ انگریزوں نے مسلمانوں ہی کو آلۂ کار بنا کر انھیں کس طرح گھیرا، اور انھیں ایک الگ تھلگ حصہ میں جو دنیا سے کٹا ہوا تھا، بند کردیا تاکہ وہ قضیۂ فلسطین کے بارے میں آزادی کے ساتھ اپنی ذمہ داری پوری نہ کرسکیں، وہ ان کے ہاتھوں کو کس طرح باندھ کر ان کے اور فلسطینی قوم کے درمیان حائل ہوگئے، حتیٰ کہ مصر اور غزّہ کے لوگوں سے ملنے جلنے پر پابندی لگادی، انھوں نے بتایا کہ ایک مرتبہ کس طرح وہ چپکے سے غزّہ گئے، اور ان لوگوں نے پھر انھیں مصر واپس کردیا اس کا ذکر کیا کہ غزّہ کے پناہ گزیں کس بھوک وپیاس اور عیسائی تبلیغ اور کمیونسٹ پروپیگنڈے کا شکار ہوئے، اور کس طرح ان کو پناہ گزینوں سے ملنے اور اسلامی دعوت کے فریضہ کو انجام دینے کی اجازت دینے سے انکار کیا، وہ ڈاکخانہ کے صہیونی کارکنوں کے ذریعہ ان کی ڈاک کو پہونچنے سے کس طرح روکتے تھے،

انھوں نے ان کے بارے میں کیسی کیسی غلط و بے بنیاد باتیں گڑھ لیں تا کہ وہ بدنام ہوں اور فلسطینیوں کا ان پر سے اعتماد اٹھ جائے لیکن ان سب باتوں کے باوجود ہم لوگ جہاد جاری رکھنے کا پختہ ارادہ رکھتے ہیں، چاہے جس طرح بھی ہو ہم اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہیں، اللہ کی رحمت سے تو کافر ہی مایوس ہوتے ہیں علامہ مفتی امین الحسینی کا لہجہ اور باتیں بڑی غم ناک اور درد انگیز تھیں، وہ تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے آنسوؤں کو روکتے رہے وہ اپنی ہمّت کی بلندی اور تحمل میں مشہور ہیں، ان کی گفتگو سے مجھے اندازہ ہوا کہ مسلمانوں کا زوال حقائق سے ان کی ناواقفیت اور ایسی شخصیتوں سے بے تعلقی و ناپسندیدگی کس انتہا کو پہنچ چکی ہے اور استعماریوں کی سیاست کتنی کامیاب ہے اور اس نے نگاہوں پر کس طرح پردہ ڈال رکھا ہے اس نے قلب و ضمیر کو خرید لیا ہے، عقل و فکر سے کھیل رہی ہے، بس خدا ہی خیر کرے، میں محترم مفتی صاحب کے پاس سے غمزدہ اور شکستہ دل ہو کر واپس ہوا، ان کی باتوں سے مجھے پتہ چلا کہ گذشتہ مسلمان قائدین و مصلحین کا جو انجام ہو چکا ہے، مفتی صاحب بھی اس سے نہیں بچ سکے۔

مفتی صاحب نے شیخ حسن البناء شہیدؒ کی بڑی تعریف کی اور مسئلہ فلسطین کے بارے میں اخوانی مجاہدین کی کوششوں کو سراہا اور ان کی جوانمردی، قوت ایمانی، اور جوش وخروش کا ذکر کیا اور فرمایا کہ بعض اوقات تو ایک اخوانی دسیوں یہودیوں کا مقابلہ کرتا تھا۔ حضرت مفتی صاحب کے یہاں سے دیر میں لوٹے، ہم لوگ اپنے ایک دوست احمد المیمنی کے یہاں مدعو تھے، پہنچے تو مہمانوں کو منتظر پایا، اس تاخیر پر معذرت کی فاروقی صاحب اور سیّد ابوالنصر بھوپالی صاحب کے ساتھ کھانا کھایا۔

دوشنبہ ۸/۸/۱۳۷۰ھ مطابق ۱۴/۵/۱۹۵۱ء

سوڈانی وفد کے جلسۂ استقبالیہ میں

ہم لوگوں نے شیخ احمد الشرباصی کی معیت میں جمعیۃ الشبان المسلمین کی سیر کی، اس کے صدر عمومی جناب محمد صالح حرب باشا سے ملنا طے کر لیا تھا، جو عرصۂ دراز کے بعد اسوان سے واپس آئے تھے، جب ہم لوگ دار الجمعیۃ میں ان کے دفتر کے اندر داخل ہوئے تو وہاں ہم

کو کچھ معزز مہمان ملے جن میں بادشاہ کے سکریٹری جن کو اس جلسہ میں ان کی قائم مقامی کرنا تھا ، اور جناب محمد علوبہ باشا بھی تھے، محترم محمد صالح حرب باشا اپنی عادت کے مطابق بشاشت وگرمجوشی سے ملے اور مجھ کو بادشاہ کے سکریٹری اور علوبہ باشا کی طرف بڑھایا، علوبہ باشا نے فرمایا کہ وہ مجھے پہچانتے ہیں۔

میں نے ان حضرات کو اپنی کتاب (شاعر الاسلام) کا ایک نسخہ ہدیہ کیا جو ابھی چندروز پہلے پریس سے نکلی تھی، علامہ مفتی امین الحسینی صاحب تشریف لائے اور مجھ سے محبت اور تپاک سے ملے اور جناب علوبہ باشا کی طرف اشارہ کر کے فرمایا یہ سیّد ابوالحسن ہیں جو ہم سے لکھنؤ کے ہوٹل میں ملے تھے اور ہم کو دارالعلوم ندوۃ العلماء لے گئے تھے۔ علوبہ باشا نے تائید کی اور فرمایا کہ مجھے یاد ہے، ایسے ہی افغانستان کے سفیر برائے مصر محترم سیّد محمد صادق مجدّدی تشریف لائے، میں نے ان کو (الدعوۃ الاسلامیۃ وتطوراتھا فی الہند) کا ایک نسخہ ہدیہ کیا اس کے بعد جناب صالح حرب باشا صاحب نے اٹھنے کا اشارہ کیا، ہم لوگ اٹھے اور دارالجمیعۃ کے ورزشی میدان کا رخ کیا اور سب سوڈانی مہمان آ گئے، ہم لوگوں نے ورزشی کھیلوں، جمناسٹک اور فوجی پریڈ کو دلچسپی سے دیکھا، اس کا دلوں پر گہرا اثر پڑا، میرا معاملہ یہ ہے کہ اپنی صحت کی کمزوری اور فوجی ورزشی کاموں سے الگ رہ کر پرورش پانے کے باوجود اس کے مظاہرہ کو دیکھ کر جھوم اٹھتا ہوں، اس منظر کو دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ ماحول اور جنگی فضا کس طرح سپاہیوں کے دلوں میں اثر انداز ہوتی ہے اور مجھے یقین آ گیا کہ اگر میں اس فضا میں ہوتا تو اس کے دلنواز داعیہ کو قبول کرنے سے باز نہ رہتا۔

پھر ہم لوگ ایک بہت بڑے ہال کی طرف شام کا کھانا کھانے کے لئے گئے، کھانا بڑا پر تکلف وشاہانہ تھا، میں شیخ احمد الشرباصی اور ازہر کے ''کلیۃ اللغۃ'' کے پرنسپل کے ساتھ بیٹھا اور مولانا عبید اللہ صاحب دوسرے مہمانوں کے ساتھ بیٹھے۔

کھانے سے فراغت کے بعد ہم لوگ دوسرے ہال کی طرف نکل گئے جہاں موسیقی کی تیاری اور حضرت بلالؓ کے واقعہ کو اسٹیج کرنے کے انتظامات دیکھے، ہم لوگ معذرت کر کے یہاں سے نکل آئے۔

سہ شنبہ ۹/۸/۱۳۷۰ھ مطابق ۱۵/۵/۱۹۵۱ء

سوڈانی وفد کی ملاقات

رات کے جلسہ میں بعض سوڈانی مہمانوں سے ملاقات ہوئی، مولانا عبیداللہ صاحب نے گذشتہ سوڈان کے سفر میں ان سے متعارف کرایا تھا، انھوں نے ہم کو الجزیرہ ہوٹل میں بلایا اور ہم نے صبح وہاں جا کر ملاقات کی، وہاں ہم محترم احمد آدم ''خلیفہ'' محترم مجذوب صاحب اور ہاشم صاحب سے ملے اور ان سے گذارش کی کہ وہ اپنے سوڈانی بھائیوں کو جمع کریں ہم ان سے تعارف حاصل کریں اور دینی باتیں کریں، چنانچہ انھوں نے ہم کو اگلے دن دعوت دی۔

مولانا محمد صادق مجددی سفیر افغانستان کی تشریف آوری

آج ہماری حقیر قیام گاہ پر عالی مرتبت مولانا محمد صادق مجددی سفیر افغانستان نے شرف ملاقات بخشا، تھوڑی دیر ہمارے پاس بیٹھے اور دوبارہ پھر تشریف آوری کا وعدہ فرمایا، ان کی اس عزّت افزائی اور تواضع کی بڑی قدر آئی وہ ہمارے ملک کے عظیم مجدد امام ربانی حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی کے خاندان سے ہیں۔

سید مبشر طرازی کے ساتھ مجلس

اسی طرح آج ہم شارع خیرت میں محترم سید مبشر الطرازی سے ملے اور ایک گھنٹہ ان کے یہاں مجلس رہی۔

چہار شنبہ ۱۰/۸/۱۳۷۰ھ مطابق ۱۶/۵/۱۹۵۱ء

الجزیرہ ہوٹل میں سوڈانی وفد سے ملے مگر وہ ملاقات نہ ہو سکی جو مقصود تھی۔ معلوم ہوا کہ یہ وقت مناسب نہیں تھا، کوئی کھانا کھا رہا تھا، کوئی قیلولہ کر رہا تھا ہم لوگ سوڈان کی پارٹی کے صدر اسماعیل بک ازہری سے ملے، ہم ان کے متعلق سنتے اور پڑھتے تھے الحاج اسحاق اور الحاج اسماعیل دہلوی مکی سے لوکاندہ البرلمان میں ملے، لوکاندہ بغداد میں بعض ترک طلبہ سے ملاقات

کی، بھائی عبدالغنی محجوب آئے اور کچھ دیر ہمارے پاس بیٹھے۔

پنجشنبہ ۱۱/۸/۱۳۷۰ھ مطابق ۱۷/۵/۱۹۵۱ء

سفر سوڈان کا نظم

اسی طرح ہم لوگ سوڈانی وفد سے بھی ملے، معلوم ہوا کہ ہاشم صاحب جن کو ہم نے کل اپنی بعض مطبوعات دی تھیں کہ وہ انھیں جناب سیّد علی مرغنی باشا کو پیش کردیں انھوں نے ان کتابوں کو ابو آمنہ کے ہاتھ جنھوں نے کل جہاز سے سفر کیا ہے بھیج دیا، ہم لوگوں نے طے کرلیا تھا کہ سوڈان کا سفر کیا جائے اس سلسلہ میں جنرل صالح حرب باشا سے مشورہ لیا تو انھوں نے بھی اس کی تائید کی اور سوڈان کی دینی روح اور داعیوں و دیندار لوگوں سے سوڈانیوں کی گہری دلچسپی کی تعریف کی، آں محترم نے سوڈانی سفیر کے سکریٹری استاذ محمد حسن سے ٹیلیفون پر گفتگو کی اور ان سے کہا کہ ہمارے سفر میں پورا تعاون کریں اور ضروری کاروائیوں کی تکمیل میں مدد دیں۔

شیخ حامد فقی کی تنقید اور میرا جواب اور شیخ کا اطمئنان

آج میں انصار السنۃ کے صدر شیخ محمد حامد فقی سے ملا اور ان کو (الدعوة الاسلامية وتطوراتها فی الهند کا ایک نسخہ پیش کیا، اس رسالہ میں صوفیہ اور ہندوستان کی اسلامی دعوت میں ان کے کردار کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے وہ ان کو پسند نہیں آیا، انھوں نے اس پر سخت تنقید کی اور اسے شرک و بت پرستی کی طرف مائل بتایا اور کہا کہ میں آپ کو (رسالة العبودية) کا ایک نسخہ پیش کروں گا تاکہ آپ صوفیہ کے بارے میں میرے خیالات سے واقف ہوجائیں، صوفیہ کے بارے میں میری رائے شیخ ابن تیمیہ سے الگ ہے اس لئے کہ وہ جنید جیسے لوگوں کو مستثنیٰ کرتے ہیں اور میں کسی کو مستثنیٰ نہیں کرتا، یہ بھی کہا کہ میں آپ کی تصنیفات اور طرز فکر کو پسند نہیں کرتا اسی لئے آپ کی قیام گاہ پر آپ سے ملنے اور ملاقات کرنے کے لئے میری طبیعت آمادہ نہیں ہوئی، میں آپ کی کتابوں میں اشتراکیت کی بو محسوس کرتا ہوں کیونکہ

آپ ہمیشہ اپنی کتابوں میں مادہ اور مادیت کا انکار کرتے ہیں اور فقر وزہد پر بہت زیادہ توجہ دیتے ہیں اور یہ اشتراکی رجحان ہے، میں سمجھتا ہوں کہ دولت کو بڑی اہمیت حاصل ہے، اسلام نے اس کا انکار نہیں کیا اور نہ اس کی مخالفت کی دعوت دی، مال حاصل کرنے اور اس کو بڑھانے میں کوئی حرج نہیں اور نہ خوشحال زندگی گزارنے میں کوئی عیب ہے، اموی دور حکومت ایسا نہیں کہ لوگ اس پر تنقید کریں، مادیت کوئی اہم مسئلہ پیدا نہیں کرتی نہ وہ اتنی بڑی چیز ہے کی داعی اس کی فکر کرے اور اس کی نفی وانکار میں لگ جائے دعوت کا موضوع تو شخصیت کی تربیت کرنا، اس کو ابھارنا، اور انسانی صلاحیتیں بروئے کار لانا ہے، اللہ تعالیٰ نے دنیا کو جو خزانے اور پیداوار کے ذرائع عطا کئے ہیں ان کو صحیح طور پر استعمال کرنا ہے، قرآن اسی سے بحث کرتا ہے اور اسی کی تعلیم دیتا اور اس کے خلاف کرنے کو ظلم سے تعبیر کرتا ہے، رہیں اس کے علاوہ چیزوں تو وہ جزئی مسائل ہیں، حتی کہ زنا کی قرآن نے چند ہی جگہ برائی بیان کی ہے، اس لئے کہ وہ درحقیقت قوت شہوانیہ کے بے جا استعمال کے نتیجہ میں وجود میں آتا ہے، اصل کام ان صلاحیتوں کا صحیح استعمال ہے، فکر واہمیت کی بات یہ ہے کہ انسان اپنی شخصیت کی تربیت کرے اور اس کی قوت کو بڑھائے اور اپنے فکر میں اتنا پختہ ہو کہ وہ رسول کی شخصیت کو صرف وحی کے اعتبار سے اپنے سے ممتاز سمجھے۔

میں نے شیخ محترم سے کہا کہ مادیت پر میرے مضامین اور تنقیدات اس سبب سے ہیں کہ وہ اپنی حدود سے بہت آگے بڑھ گئی ہے اور لوگ اس میں بہت زیادہ ڈوب گئے ہیں، میری تنقیدات ومضامین انھیں مادیت پروردہ رجحانات کے ردّعمل کے طور پر ہیں، میں یہ سمجھتا ہوں کہ توحید ہی وہ اصل بنیاد ہے جس پر دعوت کی بنا اور قیام کا ہونا ضروری ہے، میں نے اس موضوع پر اپنے خیالات کی ترجمانی کرنے کے لئے اپنا رسالہ (من الجاہلیۃ الی الاسلام) جناب کی خدمت میں پیش کیا ہے، جس کو جماعت انصار السنۃ کے ایک بھائی نے چھپوایا ہے، شیخ نے کہا یہ بھی مبہم اور غیر واضح ہے، میں نے بہت زور دے کر شیخ کو بتایا کہ میں ہر انتہا پسند مذہب اور غیر اسلامی رجحان سے بری وبے تعلق ہوں، میں نے اشتراکیت اور کمیونزم کو پڑھا اور سمجھا ہے، میں ان دونوں

نظریات کا مخالف ہوں اور ان دونوں ہی کو صحیح اسلام کا مخالف سمجھتا ہوں، شیخ نے کہا کہ مجھے معلوم ہے کہ آپ اچھے آدمی ہیں، آپ کی نیت درست اور خالص ہے، میں مصر میں آپ کی نقل وحرکت کی خبر رکھتا تھا، میں اسی نتیجہ پر پہونچا کہ آپ اچھا ہی ارادہ رکھتے ہیں۔

جمعہ ۱۲/۸/۱۳۷۰ھ مطابق ۱۸/۵/۱۹۵۱ء

سوڈانی سفارت خانہ میں

ہم لوگ سوڈانی کونسلیٹ میں گئے اور سفر سوڈان کے بارے میں ضروری کاروائیوں سے واقفیت حاصل کی، ان کا مطالبہ یہ بھی تھا کہ ہندوستانی سفارتخانہ ہماری ذمہ داری لے اور ہم مصر واپس آنے کی سفارتخانہ سے واضح الفاظ میں ایک تحریر پیش کریں،

شیخ احمد الشرباصی کا خطبہ جمعہ

وہاں سے نکل کر جمعیۃ علماء ازہر سے متصل واقع مسجد ''المنبرہ'' میں ہم لوگوں نے شیخ احمد الشرباصی کے پیچھے جمعہ پڑھا اور ان کا بلیغ خطبہ سنا، جس کا موضوع تھا (الاسلام اصلاح لاثورۃ) اسلام اصلاحی پروگرام ہے بغاوت وانقلاب نہیں۔ انھوں نے اس خطبہ میں فرانسیسی انقلاب کا بھی جائزہ لیا پھر اسلام کی فوقیت دکھاتے ہوئے س میں اور اسلام کے نظام حق وانصاف اور اخوت ومساوات میں جو بعد المشرقین ہے اس کو ظاہر کیا اور اسلام کے اصلاحی طریقۂ کار کی وضاحت کی، آج مختلف اوقات میں کچھ اخوانی احباب سے ملے ان میں عبدالغنی محجوب، یوسف القرضاوی، احمد الدمرداشی، عبداللہ العقیل، اور فارقی صاحب، علی عدلی المرشدی، محمد عبدالوہاب البناء قابل ذکر ہیں۔

شنبہ ۱۳/۸/۱۳۷۰ھ مطابق ۱۹/۵/۱۹۵۱ء

مولانا ابوالکلام آزاد سے ملاقات

آج کا دن ویزا کے حصول اور واپسی کی تاریخ کی وضاحت کے سلسلہ میں مختلف

دفتروں اور سفارتخانوں میں گزرا، عشاء بعد استاذ فاروقی اور یہاں رہنے والے ہندوستانی باشندوں کے ساتھ ہم لوگ فاروق ہوائی اڈے گئے اور ہندوستان کے وزیر تعلیم جناب مولانا ابوالکلام آزاد کا استقبال کیا جو لندن جاتے ہوئے یہاں سے گزر رہے تھے، نصف شب گزر چکی تھی مولانا بہت تھکے ہوئے تھے، ان پر بڑھاپے اور تھکن کا اثر ظاہر ہو رہا تھا، باتیں کرتے ہوئے ہمارے ساتھ چائے پر بیٹھے، اخباری نمائندوں نے ان کو گھیر لیا، وہ ہندوستان کی سیاست وہاں کی پارٹیوں اور سفر لندن کی غرض وغایت کے متعلق سوالات کرنے لگے، مولانا ان کو کبھی انگریزی میں جواب دیتے کبھی عربی میں، مولانا اپنی حاضر جوابی اور محتاط گفتگو میں مشہور ہیں، چنانچہ رپورٹر راز معلوم کرنے میں کسی طرح کامیاب نہ ہوئے، مولانا کے سارے جوابات مختصر اور ٹھوس تھے، کسی کسی وقت آیات قرآنی سے جواب دیتے جس سے صحافی حیرت زدہ رہ جاتے، ان کو عرصہ سے عربی میں گفتگو کا موقع نہ ملا تھا اس کے باوجود وہ قرآن کی زبان میں گفتگو کر رہے تھے، ان کی ذہانت اور حاضر جوابی کا لوہا ان کے مخالفین مانتے ہیں۔

اپنی بے مثال یادداشت کے باوجود جب مجھے محسوس ہوا کہ مجھے پہچانا نہیں تو میں نے تعارف کرانا چاہا چنانچہ استاذ ابوالنصر بڑھے اور میرا تعارف کرایا تب مولانا میری طرف متوجہ ہو کر باتیں کرنے لگے اور کچھ ایسی چیزوں کا ذکر کیا جن سے معلوم ہوا کہ انھوں نے مجھے پہچان لیا فرمایا مجھے معلوم تو ہوا تھا کہ آپ بلاد عربیہ کے سفر پر ہیں، آپ نے کن کن ملکوں کو دیکھا؟ اسی طرح کی اور باتیں کیں میرے والد مرحوم (مولانا سید عبدالحئی سابق ناظم ندوۃ العلماء) کا ذکر کیا، برادر معظم ڈاکٹر حکیم سیّد عبدالعلی کو یاد کیا، میری کتاب سیرت سید احمد شہیدؒ کے بارے میں پوچھا اور اس موضوع پر بعض قلمی کتابوں کا ذکر کیا جو ان کے علم میں تھیں، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ زندگی کے طویل سفر نے اس قسم کے علمی موضوعات سے غافل اور بے خبر نہیں کیا۔

نئی کتابوں کے بارے میں مولانا کی رائے

استاذ ابوالنصر نے ان سے کئی کتابوں کے بارے میں پوچھا جو اسلامی اقتصادیات

اوراس کے سیاسی نظریات کے موضوع پر شائع ہوئی ہیں، مولانا نے فرمایا کہ ان کتابوں میں یہ عیب ہے کہ وہ اسلام کو نئے افکار اور نئے فلسفہ کے ساتھ چلانا چاہتی ہیں اور انھیں کے مطابق اسلام کی تاویل کرتی ہیں، وہ اسلام کو خارجی اثرات ورجحانات سے الگ ہوکر سمجھنے کی کوشش نہیں کرتیں، فرمایا ان کتابوں میں سب سے زیادہ حیرت انگیز کتاب طنطاوی کی تفسیر الجواہر ہے، میں نے جب اس کتاب کو پڑھا تو خیال ہوا کہ وہ علوم طبعیہ پر نصاب کی ایک درسی کتاب ہے، میں نے عرض کیا کہ آدمی اپنے گردوپیش کی چیزوں، زمانہ کے اثرات اور چھائے ہوئے افکارونظریات سے کیسے بچ سکتا ہے، کیا یہ ممکن ہے؟ فرمایا ہاں بڑی حد تک ممکن ہے، مگر دشوار ضرور ہے، یہ بڑی علمی اور پرمغز گفتگو تھی، ان کی ہندوستان کی مجلسوں میں بھی میرا ان سے اسی طرح کا علمی تعلق تھا، جب مولانا کو اطلاع دی گئی کہ جہاز کے پرواز کا وقت قریب آچکا ہے تو ہشاش بشاش اٹھے اور ہم لوگوں کو رخصت کیا، عبدالحمید الکاتب کے بقول جو اس نے مروان بن محمد کے بارے میں کہا تھا، وہ ہمارے ساتھ تھے، پھر چھوڑ کر اڑ گئے۔

یکشنبہ ۱۴/۸/۱۳۷۰ھ مطابق ۲۰/۵/۱۹۵۱ء

جدہ کی ممتاز شخصیت شیخ محمد نصیف سے ملاقات

آج ہم شیخ محمد نصیف سے ملے وہ جدّہ، بلکہ پورے حجاز کی ممتاز ترین شخصیتوں میں ہیں، علم ودین کے اعتبار سے بھی عزّت ووجاہت، عقل ودانش اور خوش اخلاقی کے اعتبار سے بھی، پاکستانی سفیر سے بھی ملاقات کی اور انھیں ''شاعر الاسلام'' کا ایک نسخہ ہدیہ کیا، الحاج حلمی منیاوی کے پریس میں اپنے رسالہ '' أريد أن اتحدث إلى الإخوان '' کے پروف کی تصحیح میں مشغول رہا۔

دوشنبہ ۱۵/۸/۱۳۷۰ھ مطابق ۲۱/۵/۱۹۵۱ء

وزارتِ داخلہ میں عجیب تجربہ

میں وزارت داخلہ کے پاسپورٹ آفس گیا، اگر کاروائی دفتری معمول کے مطابق

ہواور تمام مراحل کو اپنے طبعی نظام کے مطابق طے کرے تو کبھی کبھی ایک ہفتہ بلکہ اس سے بھی زائد وقت لگ جاتا ہے، لیکن منطقہ افسر اپنا کام چھوڑ کر خود سے دوسرے دفتر میں گیا اور کاروائی مکمل کی پھر معاملہ ان تمام لوگوں کے پاس لے گیا جن سے اس کا تعلق تھا اور جتنی جلد ممکن ہوسکتا تھا کاغذات کی کاروائی مکمل کردی، جب ہم نے بعض رسائل ان کو ہدیہ کرنا چاہا تو انھوں نے انکار کردیا اور کہا کہ میں نے قسم کھائی ہے کہ کام کرنے والوں سے کوئی چیز نہیں لوں گا، ہم نے کہا یہ ہدیہ ہے کسی خدمت کا صلہ اور کام کا بدلہ نہیں ہے یہ تو محض ایک علمی ہدیہ ہے، انھوں نے کہا کہ میرے پاس اپنا مخصوص ذاتی کتب خانہ ہے اور میں کتابوں کا شوقین ہوں لیکن اس وقت میں اس ہدیہ کو قبول کرنے سے معذور ہوں، سرکاری دفاتر کے مختلف شعبوں اور ناموں کی فہرست میں یہ اپنی نوعیت کا پہلا معاملہ تھا، اس میں شبہ نہیں کہ ہم کو اپنے ملک میں دفاتر کے کارکنوں اور ملازمین میں یہ سرگرمی، توجہ اور مستعدی نہیں دکھائی دیتی، جس کا ہمیں تجربہ ہوا، اس احتیاط سے ہمیں حیرت ہوئی، اگر مصر کا پورا معاشرہ اسی طرح ہوتا اور ہر ایک کے ساتھ ایسا معاملہ ہوتا تو آج اس کا مقام دنیا میں کہیں زیادہ اونچا ہوتا اور حسن انتظام میں وہ ہر جگہ ضرب المثل ہوتا۔

علامہ زاہد کوثری کا ہدیہ کتب

آج ہم لوگوں نے نامور عالم و محقق علامہ محمد زاہد کوثری سے ملاقات کی، ان کے ساتھ بیٹھے، انھوں نے ہم کو اپنی بعض وہ تصنیفات ہدیہ کیں جو انھوں نے پہلی ملاقات میں ہدیہ نہیں کی تھیں۔

چہار شنبہ تا پنجشنبہ ۱۶۔۱۷/۸/۱۳۷۰ھ مطابق ۲۲۔۲۳/۵/۱۹۵۱ء

سفارت خانوں کی آمد و رفت

ان تین دنوں کا بڑا حصہ سفارتخانوں کی آمد و رفت میں گزرا، منگل کے دن حلوان میں سیّد قطب صاحب سے ملاقات کے علاوہ اور کوئی قابل ذکر بات پیش نہیں آئی، سید

قطب صاحب نے بتایا کہ آئندہ جمعہ کو'' الندوۃ العلمیۃ'' میں جو ہر جمعہ کو انھیں کے گھر پر ہوتی ہے،'' ماذا خسر العالم'' پر بحث و مذاکرہ ہے مجھے بھی اس جلسہ میں آنے کی دعوت دی، جدّہ سے ہمارے محترم دوست ڈاکٹر غلام مصطفیٰ تشریف لائے، ان کی آمد سے ہمیں بہت خوشی ہوئی، مصر جدیدہ میں واقع ایک ہوٹل میں جہاں وہ ٹھہرے تھے، ان سے ملاقات کی، ہم لوگ ہر روز ایک دو مرتبہ ملتے تھے۔

جمعہ ۱۹/۸/۱۳۷۰ھ مطابق ۲۵/۵/۱۹۵۱ء

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ کے ساتھ ان کی دلجوئی کی غرض سے ہم نے دوبارہ قناطر خیریہ کی سیر کی اور مولانا لقمان ندوی (۱) کی میزبانی میں کھانا کھایا پھر حلوان چلے گئے، وہاں سیّد قطب کی قیام گاہ پر اپنی کتاب'' ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین'' کے مباحثہ میں شریک ہوئے، حاضرین میں سے اکثر لوگ جامعہ فؤاد کے فارغ تھے، اس کتاب کے ساتھ ان کی توجہ واعتناء سے مجھے فطری اور طبعی طور پر خوشی ہوئی اور میں نے عزّت محسوس کی، جب ان لوگوں کو کتاب کے مصنف کی موجودگی کا علم ہوا تو اکثر سوالات مصنّف ہی سے کئے اور کتاب میں مذکور بعض چیزوں سے متعلق تفسیر و وضاحت چاہی، میں نے ان کو جواب دیا، پھر ہم لوگوں نے صحیح اسلامی دعوت اور نئی نشأۃ اسلامی کے طریقہ کار کے بارے میں بحث و گفتگو کی۔

اسلامی دعوت کے طریقہ کار کے بارے میں استاذ سیّد قطب کی رائے

اس موضوع پر ہر ایک نے اپنی رائے پیش کی، میں نے بھی اپنی رائے دی، سید قطب صاحب نے وضاحت و تفصیل سے گفتگو کی، ان کی رائے کا خلاصہ یہ تھا کہ پہلی منزل یہ ہے کہ انسان پہلے اپنی تربیت کرے اور خود کو اسلامی دعوت اور اس کے مطالبات کے پورا کرنے کے لئے تیار کرے اس کے بعد وہ دوسروں کو دعوت دے اور ان کی تربیت کرے

---

(۱) ازہر میں پڑھنے والے تین ندوی لقمان مشہور ہوئے، دوسرے مولانا لقمان خاں ندوی بھوپالی اور مولانا سید لقمان اعظمی ندوی نے بھی بعد میں ازہر میں تعلیم حاصل کی (مترجم)

تا کہ ایک صحیح اسلامی دعوت وجود میں آئے ان کی رائے میں صالح افراد کی جماعت کا وجود میں آنا ضروری ہے، جیسا کہ پہلے زمانہ میں تھا اور یہ جماعت اولاً چند افراد سے شروع ہو، پھر ان افراد سے صالح مجموعہ تیار ہو، ان کا اندازہ ہے کہ اس کام میں ۲۵ سال تک لگ سکتے ہیں، انھوں نے کہا کہ لوگ اس کو بہت طویل مدّت خیال کریں گے اور میں اس کو کم سمجھتا ہوں س کے بعد اس موضوع پر گفتگو ہونے لگی کہ وہ پہلا شخص جو اس کام کی نگرانی کرے وہ کون ہو، بعض اہل مجلس نے سیّد قطب کی طرف اشارہ کیا ان کی تعریف کی اور ان سے کہا کہ جو کتابیں آپ نے لکھی ہیں وہ خلوص دل، پختہ عقیدہ اور اچھے اخلاق کی آئینہ دار ہیں ،اس پر سیّد قطب بول اٹھے اور بہت کھل کر نہایت بے تکلفی کے ساتھ فرمایا، میں اپنے کو اس تعریف وامید کا اہل نہیں سمجھتا، کتابوں کا شائع ہونا اس کا ثبوت نہیں کہ مصنّف نے اسلامی تربیت واصلاح نفس کی پہلی منزل طے کرلی ہے، میں اپنے ماحول میں شر وفساد کی ہونے والی جنگ اور راحت وآسائش اور بے فکری سے واقف ہوں اور ایمان وجہاد، جس ایثار وقربانی، زہد وروحانیت کے طالب ہیں اس کے فرق کو اچھی طرح جانتا ہوں۔

میں سمجھتا ہوں کہ آخری منزل ابھی دور ہے، اصل معیار وہ ہے جو قرآن نے مقرر کیا ہے (قُلْ إِنْ كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ)الآیہ

اگر میں اپنے اس مکان اور جھونپڑے، ملازمت وبے کاری، فقر ومالداری کے اسباب کو برابر نہیں سمجھتا تو میں حقیقت ایمان اور اسلامی تربیت سے دور ہوں، میں خود کو اور غیروں کو دھوکا دینا نہیں چاہتا، مجھے یہ اعتراف حقیقت پسند آیا اور میرے دل میں ان کی وقعت پہلے سے زیادہ ہوگئی۔

سیّد قطب اپنی زندگی کے اتار چڑھاؤ بیان کرتے ہیں

سیّد قطب نے اپنی زندگی کی مختلف منزلوں کو بیان کیا اور بتایا کہ وہ کس طرح اسلامی عقیدہ اور اسلام تک پہنچے، انھوں نے بتایا کہ دیہات میں کس طرح اسلامی تہذیب

اور اپنے ماحول کے مطابق ان کی پرورش ہوئی، پھر جب قاہرہ پہونچے تو پہلے ماحول سے بالکل کٹ گئے اور ان کی کمزور دینی تربیت اور اسلامی عقیدہ دھوئیں کی طرح اڑ گیا، اور وہ دینی حقائق کے بارے میں حد درجہ شک وشبہ کے دور سے گزرے، اس کے بعد جب انھوں نے ادبی جذبات کی تحریک پر قرآن کا مطالعہ کرنا شروع کیا تو قرآن نے کس طرح ان پر اثر ڈالا اور دھیرے دھیرے ایمان کی طرف کھینچ لایا۔ ع

گاہ بحیلہ می بردگاہ بزور می کشد
عشق کی ابتداء عجب عشق کی انتہا عجب

ان پر سیرت کی کتابیں کس طرح اثر انداز ہوئیں، انھوں نے بتایا کہ قرآن وکتب سیر کے مطالعہ کے سلسلہ میں ان کے دوستوں کی نصیحتوں نے کیسے اثر ڈالا، میں اس قیمتی گفتگو سے مستفید ہوا، اس کے بعد ہم لوگوں نے اجازت چاہی، میں نے اپنی کتاب (ماذا خسر العالم) پر ان سے مقدمہ لکھنے کی درخواست کی، یہ خیال ایک عرصہ سے میرے ذہن میں گردش کر رہا تھا، آج اس نے عملی صورت اختیار کر لی اور اسے ٹال نہ سکا، موصوف نے خوشی خوشی میری درخواست قبول کر لی۔

شنبہ ۲۰/۸/۱۳۷۰ھ مطابق ۲۶/۵/۱۹۵۱ء

سید عبدالرزاق حمزہ سے ملاقات

آج ڈاکٹر غلام مصطفیٰ صاحب کے پاس دیر تک رہے وہ کل ہوائی جہاز سے جدّہ روانہ ہو جائیں گے، برلمان ہوٹل میں شیخ عبدالرزاق حمزہ (۱) سے ملاقات ہوگئی، ہم استاذ عبد الحکیم عابدین سے ملنے کے لئے ان کے گھر الدرب الاحمر گئے، پھر شیخ بہی الخولی سے ملنے ان کے مکان قلعہ گئے، دونوں میں سے کسی سے ملاقات نہ ہوئی اور ہم اپنی قیام گاہ واپس آ گئے۔

---

(۱) امام حرم مکی کا حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ سے خاص تعلق ہو گیا تھا کسی وجہ سے مصر آئے ہوں گے (مترجم))

یکشنبہ ۲۱/۸/۱۳۷۰ھ مطابق ۲۷/۵/۱۹۵۱ء

افغانی سفارتخانہ کے جشن آزادی میں شرکت

آج ہم لوگ ازہر کے کتب خانہ گئے اور کتب خانہ کے ناظم سے سہارنپور سے بھیجی ہوئی کتابوں، اوجز المسالک، بذل المجہود، اور الکوکب الدری کے نسخوں کی قیمت لی (۱)، مکتبہ یحیویہ کے ناظم نے ہدایت کی تھی کہ ان کتابوں کی قیمت ہم کو دے دی جائے، ازہر کے گیٹ پر حرم مکی کے بڑے استاذ شیخ محمد العربی المغربی حجاز میں ویزیٹنگ پروفیسر جناب محمد کحیل مل گئے، میں نے ان دونوں حضرات کو اپنی نئی کتابوں کے کچھ نسخے پیش کئے، کحیل صاحب نے تاکید کی کہ ان کو میری ساری کتابیں اور رسالے ہدیہ کئے جائیں، اور ہم ان کے گھر پر ان سے ملیں۔

بھائی خالد احمد الجسار کویتی آئے اور دیر تک ہمارے پاس بیٹھے اور افسوس ظاہر کرتے رہے کہ انھیں اس کا علم نہ ہوسکا کہ ہم لوگوں کا قیام ان کے گھر کے پہلو ہی میں ہے اور وہ قرب کے باوجود ہم سے دور رہے، مجھے وہ سلیم الفہم اور مثقف نوجوان نظر آئے، ان سے ہمیں کویت کے بہت سے حالات معلوم ہوئے، انھوں نے ہم کو اطلاع دی کی فرید عبد الخالق صاحب عصر بعد ہمارے پاس آئیں گے، عصر بعد استاذ فرید عبد الخالق اور عبد الحفیظ صفی آئے ہم لوگ تھوڑی دیر بیٹھے پھر افغانی سفارتخانہ کے سالانہ جشن آزادی میں شرکت کے لئے اٹھے، جناب سفیر صاحب کی طرف سے جلسہ میں شرکت کا دعوت نامہ مل چکا تھا، ہم لوگ سفارتخانہ میں داخل ہوگئے تو دیکھا کہ مٹھائیوں اور بسکٹوں سے بھری ہوئی میزوں کی ایک طویل قطار لگی ہوئی ہے، ہم لوگوں نے چائے پی، پھر محترم سفیر صاحب نے یوم آزادی کی مناسبت سے ایک تقریر کی جوان کے دینی جذبات اور اسلامی فکر کی غمازی کررہی تھی انھون نے اپنی تقریر (اللہ اکبر وللہ الحمد) کے نعرہ کے ساتھ ختم کی۔

اس جلسہ کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں عورتیں بالکل شریک نہ تھیں معلوم ہوا کہ

---

(۱) حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا کاندھلوی کی کتابیں جن کی طبع جدید اشاعت اور اہل علم وفضل کو پہونچانے کی انہیں بڑی فکر تھی (مترجم)

ایک صاحبہ نے جلسہ میں داخل ہونا چاہا تو گیٹ کے چوکیدار نے ان کو روک دیا۔

مغرب کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد شیخ الازہر (شیخ عبد المجید سلیم) سے ملاقات ہوگئی، میں نے ان سے اپنا تعارف کرایا تو انھوں نے کہا کہ میں آپ کی کتاب (ماذا خسر العالم) نصف پڑھ چکا ہوں، آپ نے کتاب میں بڑی دیدہ ریزی سے کام لیا ہے، میرے حق میں دعا فرمائی، میں نے ان سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی، انھوں نے منگل کے دن گیارہ بجے کا وقت مقرر کیا، افغانی سفارتخانہ سے ہم لوگ استاذ صالح عشماوی، سعد الدین الولیلی اور شرق اردن میں اخوان المسلمین کے صدر الحاج عبد اللطیف ابوقورہ کی معیت میں انڈونیشی سفارتخانہ گئے، انڈونیشی حکومت کے سابق صدر ڈاکٹر شہریار کی شادی کی تقریب تھی ہم نے ان سے مصافحہ کیا اور انڈونیشیا کے سفیر برائے مصر کو اپنی کتابوں کے کچھ نسخے دیئے وہاں ازہری عالم محمود حسن مل گئے، انھیں مصر میں ہمارے موجود ہونے پر تعجب ہوا، وہ سمجھ رہے تھے کہ ہم لوگ جا چکے ہیں، ہمارا ہاتھ پکڑا اور اپنے گھر عباسیہ لے گئے جہاں چائے پی اور کچھ شیرینی سے تواضع کی، انھوں نے بڑی محبت وعزت افزائی کا مظاہرہ کیا۔

دوشنبہ ۲۲/۸/۱۳۷۰ھ مطابق ۲۸/۵/۱۹۵۱ء

ایک کویتی دوست کے ساتھ

آج دوپہر کا کھانا بھائی احمد الجسار کویتی کے یہاں کھایا، ہم نے کویتی انداز کا بہترین پکا ہوا کھانا کھایا، کویت کا اصل کھانا چاول ہے، ہم نے پیاز وبیگن کے ساتھ پکا ہوا گوشت اور روٹی کھائی پھر چاول کھایا اس کے بعد تربوز سے شوق کیا، ہندوستانی چاول کے بعد تربوز کھانے سے بہت بچتے ہیں، اللہ کے بھروسہ پر ہم نے کھایا اور الحمد للہ کوئی تکلیف نہیں ہوئی، شام کو شبرا میں شارع عبد العال نائل پر واقع جناب احمد کحیل کے گھر کھانا کھایا۔

سہ شنبہ ۲۳/۸/۱۳۷۰ھ مطابق ۲۹/۵/۱۹۵۱ء

شیخ الازہر کے ساتھ گفتگو

آج ہم لوگ شیخ الازہر سے ملنے گئے وہ بڑی گرمجوشی کے ساتھ ہم لوگوں سے ملے، اور اپنے پہلو میں بیٹھے ہوئے استاذ سے میرا تعارف کرایا اور میری کتاب (ماذا خسر العالم) کا ذکر کیا، فرمایا کہ میں نے اس کو اپنی بیماری کے زمانہ میں پڑھا ہے، یہ استاذ جن سے میرا تعارف ہوا، شعبہ بحوث اسلامیہ کے صدر شیخ محمود شلتوت نکلے جن سے مصر آتے ہی میں نے ملنے کی خواہش کی تھی لیکن وہ ان دنوں بہت تھکے ہوئے اور نڈھال تھے، لہٰذا ملاقات نہ کر سکے، آج شیخ کے دفتر ہی میں ملاقات ہوئی، جب انھوں نے میرا نام سنا اور مجھے پہچانا تو خیر مقدم کیا اور اس حسن اتفاق پر اظہار مسرت کیا وہ میرا رسالہ ''الدعوۃ الاسلامیۃ فی الہند'' پڑھ چکے تھے، میں نے شیخ الازہر سے اسلامی ممالک سے آنے والے طلبہ کے بارے میں بات کی اور وہ جس تربیت اور توجہ ونگرانی کے ضرورت مند ہیں اس کا ذکر کیا، میں نے ان وفود کی اہمیت ظاہر کرتے ہوئے ان سے عرض کیا کہ وہ ایک بڑا سرمایہ ہیں، اگر ان کو صحیح رُخ پر ڈال دیا جائے تو ان کے ذریعہ سے بلاد اسلامیہ میں بڑا کام ہوسکتا ہے، علاوہ ازیں اور جو کچھ بروقت سمجھ میں آیا میں نے شیخ ازہر سے عرض کیا، انھوں نے میری باتوں کو بڑی غور اور توجہ سے سنا اور فرمایا کہ وہ اس مسئلہ سے غافل نہیں ہیں، اس بارے میں اپنی بعض کاروائیوں اور خیالات کا اظہار کیا اور مجھ سے فرمایا کہ ان وفود کے بارے میں ایک یادداشت لکھدوں جس میں اپنے خیالات وملاحظات کو ظاہر کردوں اور اسے شیخ محمود شلتوت کے حوالہ کردوں، میں نے ان سے اس کا وعدہ کرلیا کہ پرسوں انشاء اللہ اس کو پیش کردوں گا۔

اسی طرح میں نے اس موضوع پر گفتگو کی کہ وہ علماء ازہر کا ایک وفد ہندوستان بھیجیں جو وہاں کے دینی حالات کا مطالعہ کرے، مسلمانون سے ملے، اصلاحی تحریکات اور اسلامی دعوتوں سے واقفیت حاصل کرے، آں محترم نے اس تجویز کو بھی پیش کرنے کی رائے دی، آج ہم لوگ

رسالہ الدعوۃ کے دفتر گئے اور استاذ صالح عشماوی اور استاذ سعد الدین الولیلی سے ملے۔

چہار شنبہ ۲۴/۸/۱۳۷۰ھ مطابق ۳۰/۵/۱۹۵۱ء

سعودی سفارت خانہ میں

صبح کو کحیل صاحب آئے تھوڑی دیر بیٹھے پھر ہم لوگ سعودی سفارتخانہ جیزہ گئے کہ ویزا حاصل کریں، یہ مرحلہ بڑی آسانی سے طے ہوگیا، دوپہر کا کھانا مولوی عبداللہ کابلی کے یہاں کھایا اور وہیں آرام کیا، رات بغداد ہوٹل گئے، وہاں بعض ترک طلبہ آئے اور ان سے باتیں کیں۔

پنجشنبہ ۲۵/۸/۱۳۷۰ھ مطابق ۳۱/۵/۱۹۵۱ء

شیخ محمود شلتوت کے ساتھ

ہم لوگ شیخ محمود شلتوت کے دفتر گئے اور ان کو یادداشت پیش کی، اس یادداشت کے پڑھنے کے دوران وہ بعض تعبیرات پر رُکے مثلاً میری اس عبارت (ممالک اسلامیہ نے اپنے جگر پاروں کو ازہر میں ڈال دیا ہے) پر رُکے اور فرمایا کہ قبل اس کے کہ میں اس یادداشت کو پڑھوں، چاہتا ہوں کہ آپ کے طرز تعلیم اور حصول تعلیم کی جن منزلوں کو آپ نے طے کیا ہے ان کو سنوں، میں نے ابتدائے تعلیم سے لے کر تدریس میں مشغول ہونے، پھر ملازمت سے الگ ہوکر دعوت کے کام میں لگنے تک کے حالات ان سے بیان کردیئے، انھوں نے میرے نظام تعلیم سے اتفاق کیا، میرے پڑھنے کا طریقہ یہ رہا کہ ایک علم کو اچھی طرح پڑھتا اس دوران کسی دوسرے درسی مضمون سے اشتغال نہ ہوتا، انھوں نے کہا تعلیم کا یہی فطری اور معقول طریقہ ہے اور میں تفسیر سے پہلے ادب عربی اور حدیث سے پہلے تفسیر اور فقہ سے پہلے حدیث کو پڑھنا بہتر سمجھتا ہوں، انھوں نے علم تفسیر کے بارے میں اپنی رائے بیان کی اور میری کتاب مضامین قرآن کا عربی میں ترجمہ کرنے کی تجویز پیش کی، انھوں نے دار العلوم ندوۃ العلماء میں تفسیر کے طرز تعلیم کو پسند کیا جہاں پہلے صرف متن قرآن پڑھایا جاتا ہے اور قرآن کے عام موضوع پر تقریر اور متقدمین کی کتب تفسیر پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔

اس کے بعد انھوں نے یادداشت کو پڑھا اور اس کو ٹائپ کرنے کو دے دیا اور مجھ سے فرمایا کہ ازہر آنے والے وفود کے فرائض وذمہ داری سے متعلق ایک یادداشت ازہر کے دارالاقاموں میں میں نے جو کچھ دیکھا اور اس میں جس اصلاح وتنظیم کی ضرورت ہے اس کے متعلق بھی ایک یادداشت مرتب کروں۔

جمعہ ۲۶/۸/۱۳۷۰ھ مطابق ۱/۶/۱۹۵۱ء

سیدنا امام شافعیؒ کی مزار پر

جمعہ ہم لوگوں نے ازہر میں پڑھا اور عصر بعد امام شافعی کی مزار کی زیارت کے لئے گئے وہاں سے استاذ عبدالحکیم عابدین کے گھر گئے، پہلے دن کی طرح وہ آج بھی نہ ملے ہم برلمان ہوٹل میں حاجی اسماعیل صاحب دہلوی سے ملے۔

شنبہ ۲۷/۸/۱۳۷۰ھ مطابق ۲/۶/۱۹۵۱ء

استاذ منصور فہمی باشا

استاذ منصور فہمی باشا کو میں نے ''شاعر الاسلام'' کا ایک نسخہ بھیجا تھا، ان کا کارڈ ملا جس میں انھوں نے اس ہدیہ کا شکریہ ادا کیا، کتاب کی پسندیدگی کا اظہار فرمایا اور دوسری ملاقات کی خواہش ظاہر کی تھی ہم لوگ عصر بعد ان کی کوٹھی پر گئے اور وہاں ایک پرلطف مجلس رہی، میں نے مصری میوزیم دیکھنے کی خواہش ظاہر کی، انھوں نے ہم کو صبح کو '' المجمع اللغوی '' بلایا تاکہ کسی کو ساتھ کردیں اور میوزیم کے انچارج کو ہمارے متعلق ہدایات دے دیں، فرمایا گرمی کی چھٹی میں ان عنوانات پر لکھنے کی کوشش کریں گے جن کی آپ نے فرمائش کی ہے، وہ اپنی موٹر پر ہم کو ''العتبۃ الخضراء'' چھوڑنے آئے، العتبۃ سے ہم لوگ اپنے پرانے دوست اور مصر کے پہلے رہبر شیخ احمد عثمان صاحب کے یہاں گئے وہ اپنے گھر شبرا میں ہم کو نہ ملے، معلوم ہوا کہ وہ نئی مسجد میں ہیں جس کی تعمیر کی نگرانی خود فرمارہے ہیں، وہ راستہ میں مل گئے اور مسجد کی چھت کی نیچے بیٹھے باتیں کرتے رہے، ہم نے وہیں عشاء کی نماز پڑھی، اس نئی مسجد کی نگرانی

میں مشغولیت اور دیگر کاموں کے سبب عرصہ سے ہم سے منقطع رہنے پر بڑی معذرت کی۔ ہم نے ان کو معذور سمجھا، اور ان سے رخصت ہوئے۔

یکشنبہ ۲۸/۸/۱۳۷۰ھ مطابق ۳/۶/۱۹۵۱ء

ڈاکٹر یوسف موسیٰ کی تجویز

ہم لوگ فؤاد اول اکیڈمی گئے جہاں ڈاکٹر منصور فہمی ہمارے منتظر تھے وہاں ہم لوگ تھوڑی دیر بیٹھے پھر محترم باشا نے اکیڈمی کے ایک کارکن کو جو ترجمہ کا کام کرتے ہیں ہمارے ساتھ کر دیا، راستہ میں اچانک ڈاکٹر یوسف موسیٰ آ ملے، وہ بہت تیز تیز ہمارے پیچھے آ رہے تھے، اس اچانک ملاقات سے ہم لوگ خوش ہوئے، انھوں نے کہا کہ میں اکیڈمی میں تھا، جب میں نے سنا کہ آپ لوگ نکل گئے تو آپ لوگوں سے ملنے کے لئے آپ کے پیچھے دوڑا، میری کتاب ''شاعر الاسلام'' کے بارے میں اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا اور کہا کہ اس میں میں نے حیرت انگیز افکار و مضامین پائے، آپ کا فرض ہے کہ اقبال پر ایک مستقل کتاب لکھیں اور یہ آپ کے ذمہ ہے، مجھ کو اس کی بڑی تاکید کی اور بہت اصرار فرمایا میں نے وعدہ کر لیا، اس کی بھی تاکید کی کہ ان کو اپنی واپسی کی اطلاع کریں اور ایک دن افطار کریں اور یہ بھی فرمایا کہ میں اپنی کتاب ''ماذا خسر العالم'' کا تصحیح شدہ ایک نسخہ ان کو دوں، اس لئے کہ انھوں نے ڈاکٹر احمد امین صاحب سے کتاب کے شائع کرنے کی اجازت مانگی تو انھوں نے اجازت دے دی ہے اور جلد ہی وہ اس پر مقدمہ لکھیں گے۔

مصری آثار قدیمہ کے میوزیم کی سیر

ہم لوگ آثار قدیمہ کے میوزیم میں داخل ہوئے، استاذ آفندی بھی ساتھ تھے، وہ مصر کی قدیم تاریخ کے ماہر ہیں، وہ ہر یادگار کے پاس فراعنہ کی یادگاروں، ان کی تہذیب اور اطوار و عادات پر ایک لیکچر دیتے، لیکن وقت تنگ تھا لہٰذا ہم نے جلدی جلدی جو کچھ ہو سکا دیکھا، اور واپس آ گئے کہ سفر سوڈان کی تیاری کریں۔

سُوڈان میں

یکشنبہ ۲۸/۸/۱۳۷۰ھ مطابق ۳/۶/۱۹۵۱ء

قاہرہ سے شلال کو روانگی اور مولانا عبید اللہ بلیاوی کی رفاقت میں

اب ہمارے سفر سوڈان کا آغاز ہوتا ہے۔ مغرب سے پہلے ہم اسٹیشن پہنچ گئے، اس سفر میں میرے رفیق مولانا عبید اللہ صاحب بلیاوی تھے جو ایک بار سوڈان جا چکے تھے، عزیزان مولوی معین اللہ ندوی اور مولوی عبد الرشید ندوی (۱) چونکہ زیارت کے پاسپورٹ پر مصر آئے تھے اس لئے ان کے سفر میں قانونی پیچیدگیاں تھیں اور ان کو قاہرہ سے حجاز واپس جانا تھا، وہاں ہمیں سوڈانی طلبہ کا ایک جم غفیر ملا، مسافروں سے زیادہ رخصت کرنے والوں کی تعداد تھی ان میں سے بہت سے مجھ کو پہچانتے تھے، کچھ لوگ ہماری بعض تقریروں میں آئے تھے، کچھ نے ہماری قیام گاہ پر ہم سے ملاقات کی، ان سوڈانی طلبہ نے اپنے سفر کرنے والے ساتھیوں کو ہدایت کی وہ ہمارا خیال رکھیں انھوں نے ہمیں اپنے ملک کی طرف بڑی گرمجوشی سے رخصت کیا، بعض لوگوں کو افسوس تھا کہ ہمارے سفر کا علم ان کو بالکل اخیر میں ہوا، ورنہ وہ ہمارے ساتھ اپنے وطن عزیز کا سفر کرتے اور ہمارے معاون ثابت ہوتے، بعض طلبہ نے امتحان قریب ہونے کی وجہ سے معذرت کی اور بعض

---

(۱) حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے رفقاء میں مولانا معین اللہ ندوی اندوری اور مولانا عبد الرشید اعظمی مصر تک ساتھ رہے تھے اور مولانا عبید اللہ بلیاوی جو بعد میں تبلیغی جماعت کے ممتاز رہنماؤں میں شمار کئے گئے سفر سوڈان میں بھی ساتھ رہے، مولانا عبید اللہ بلیاوی اور مولانا معین اللہ ندوی اندوری کا حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی حیات ہی میں انتقال ہو گیا تھا، مولانا عبد الرشید اعظمی ندوی بعد تک بقید حیات رہے اور ماہنامہ بانگ حرا لکھنو کے مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابو الحسن ندویؒ نمبر کے لئے سفر مصر کے متعلق کچھ مشاہدات اور تاثرات تحریر کرائے تھے اس سے بھی اس سفر پر اچھی روشنی پڑتی ہے، افسوس کہ انہوں نے بھی ۸/اگست ۲۰۰۴ء کو لکھنو میں وفات پائی رحمہم اللہ جمیعا (ناشر)

ان اشخاص اور جگہوں کے نام نوٹ کر دیئے، جہاں جانا اور جن سے وہ ہمارا ملنا مناسب ومفید سمجھتے تھے، سکنڈ کلاس میں اچھی جگہ مل گئی، ہم دونوں کو عزیز ساتھیوں مولوی معین اللہ اور مولوی عبدالرشید نے رخصت کیا، ان دونون کی جدائی سے طبیعت پر اثر پڑا مگر اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا، اس لئے کہ وہ مصر حج کے پاسپورٹ پر آئے تھے، اس کے ذریعہ کسی اور ملک کے سفر کی قانوناً گنجائش نہ تھی، دو گھنٹے کے بعد بہت سے مسافر اتر گئے تو ہمیں اپنی سیٹوں پر پاؤں پھیلانے، لیٹنے اور سونے کا موقع ملا نصف رات کو سوتے میں ہم لوگ امام سیوطی کے شہر اسیوط سے گزرے۔

دوشنبہ ۲۹/۸/۱۳۷۰ھ مطابق ۴/۶/۱۹۵۱ء

فراعنہ کے پایۂ تخت میں

نماز فجر سے ہم فارغ ہوئے تھے کہ فراعنہ کے پایۂ تخت صعید کا علاقہ شروع ہوا اور ہم بیٹھے بیٹھے اس کی سیر کرتے رہے، عجب اتفاق بلکہ قرآن کا معجزہ کہئے کہ میں اس وقت قرآن کریم کے پچیسویں پارہ کی وہ سورتیں پڑھ رہا تھا جو فرعون کے ذکر سے بھری ہوئی ہیں، اتفاق دیکھئے کہ جس وقت ٹرین اقصر پہنچی جو فراعنہ کا پرانا پایۂ تخت ہے اس وقت میں قرآن کی یہ آیت پڑھ رہا تھا "وَنَادَى فِرْعَوْنُ فِي قَوْمِهِ يَا قَوْمِ لَيْسَ لِي مُلْكُ مصر وهذه الانهار تجرى من تحتى افلا تبصرون" (الزخرف آیت ۵۱) اور فرعون نے اپنی قوم میں بہ آواز بلند یہ بات کہی کہ اے میری قوم! کیا مصر کی سلطنت میری نہیں ہے اور نہریں میری پائیں میں بہہ رہی ہیں کیا تم دیکھتے نہیں ہو۔

اس شاداب اور پرفضا خطہ سے گزرتے ہوئے میں نے خداوند تعالیٰ کا یہ فرمان پڑھا "كم تركوا من جنات وعيون وزروع ومقام كريم ونعمة كانوا فيها فاكهين كذلك واورثنها قوما آخرين فما بكت عليهم السماء والارض وما كانو منظرين" (الدخان آیت ۲۵ تا ۲۹) وہ لوگ کتنے ہی باغ اور چشمے اور کھیتیاں اور عمدہ مکانات اور آرام کے سامان جن میں وہ خوش ہوا کرتے تھے چھوڑ گئے، اسی طرح ہوا اور ہم نے

ایک دوسری قوم کو ان کا مالک بنادیا سونہ تو ان پر زمین وآسمان کو رونا آیا اور نہ ان کو مہلت ملی۔

اللہ تعالیٰ نے سچ فرمایا "وتلك الايام نداولها بين الناس" (آل عمران آیت ۱۴۰) اور ہم ان ایام کو لوگوں کے درمیان ادلتے بدلتے رہا کرتے ہیں۔

ریلوے کا قابل تقلید نظام

اس ٹرین میں یہ اچھا نظم ہے کہ پورے سفر میں برف کا پانی ملتا رہا جس کو مسافر اپنے قریب کے نل سے لے لیتے تھے، ٹرین میں نوکر بھی تھے جو مسافروں کو سوار ہونے اور سیٹ حاصل کرنے میں مدد دیتے تھے، ان کی ضروریات وسامان کو ٹھیک سے رکھواتے تھے، یہ باتیں ہمارے یہاں بھی شعبۂ ریلوے کے اختیار کرنے کی ہیں۔

دن چڑھے ہم لوگ سوڈانی طلباء کے پاس سے گزرے جو اپنی جگہ پر بیٹھے ہمارے بعض رسالوں کا مطالعہ کررہے تھے، میں نے تھوڑی دیر ان سے باتیں کیں، وہ جامعہ کے کالجوں کے طلبہ تھے، گرمیوں کی چھٹی میں اپنے وطن واپس جارہے تھے۔

ان سطور کو تحریر کرتے وقت میں دیکھ رہا تھا کہ وادی دو پہاڑوں کے درمیان تنگ ہوتی جارہی ہے، انھیں دونوں پہاڑوں کے درمیان دریائے نیل بہتا ہے کبھی یہ وادی وسیع ہوجاتی تھی کبھی تنگ، نیل کا فاصلہ کبھی قریب ہوجاتا کبھی دور۔

ہم لوگ اسوان سے گزرے اور ہمیں اسوان بندھ یاد آیا، لیکن وقت نے اس کی سیر کی اجازت نہ دی، شلّال پہونچ کر ٹرین کا سفر ختم ہوگیا۔

جہاز میں

ہم لوگ ٹرین سے اترے اور دوسری نوعیت کا سفر شروع ہوا یہ جہاز کا سفر تھا، لیکن یہ جہاز سمندر میں نہیں بلکہ دریائے نیل میں چلتا ہے اس لئے چکّر ومتلی کا ڈر نہ تھا، کسٹم اور پاسپورٹ وغیرہ کے دکھانے کے مراحل سے فارغ ہوکر جہاز میں اپنی سیٹ حاصل کرلی، خدا کے فضل سے ازہر کے دو طالب علموں کی رزرو سیٹیں ہم کو مل گئیں جو نہیں آسکے تھے،

بعض طلباء نے ہم کو اس کی اطلاع کردی تھی اور دونوں طالب علموں کا نام نوٹ کرادیا تھا، اس کی وجہ سے سکنڈ کلاس میں سفر کرنے کی سہولت حاصل ہوگئی۔

گرمی بہت سخت تھی اور جہاز میں ہمارا کیبن سورج کے رخ پر تھا دیر تک دھوپ میں کھڑے رہنے کی وجہ سے جہاز خوب گرم ہوگیا تھا (جیسے ہم باورچی خانہ کی تپش میں ہوں) آج شعبان کی ۲۹ رتاریخ تھی، رمضان کا چاند ہوجانے کی امید تھی مگر چاند نہیں ہوا، ہم لوگوں نے سکنڈ کلاس کے مسافروں کو اپنے کمپارٹمنٹ میں جمع کیا جس مین اکثر جامعۃ الفؤاد کے طلبہ تھے تھوڑے سے ازہر کے طلبہ بھی تھے، ہم نے ان سے دینی موضوع پر گفتگو کی اور ایک دوسرے سے تعارف حاصل کیا۔

سہ شنبہ ۳۰/۸/۱۳۷۰ھ مطابق ۵/۶/۱۹۵۱ء

استقبال رمضان

جنتری پر اعتماد کر کے بہت سے لوگوں نے روزہ رکھ لیا، ہم لوگوں نے چونکہ چاند نہیں دیکھا تھا اس لئے روزہ نہیں رکھا، شعبان کے تیس دن پورے کر لئے پورے دن ڈائری کی چھوٹی ہوئی چیزوں کو مکمل کرنے میں مشغول رہا، یہ ۶ ررجب سے ۸ رشعبان تک کا وقفہ تھا، اس کے لکھنے میں اللہ نے مدد فرمائی، عصر بعد میں اس سے فارغ ہوا اور پھر تراویح میں جتنا قرآن پڑھنا تھا اکی تیاری کی، تیس کو ہم لوگوں نے چاند دیکھا اور ماہ مبارک کا استقبال وخیر مقدم کیا، چاند بہت باریک تھا ہم نے دعا پڑھی (اَللّٰھُمَّ اَھِلَّهٗ عَلَیْنَا بِالْاَمْنِ وَالْاِیْمَانِ وَالسَّلَامَةِ وَالْاِسْلَامِ وَالتَّوْفِیْقِ لِمَا تُحِبُّ وَتَرْضٰی) اے اللہ! تو اس کو ہم پر امن وایمان وسلامتی اور اسلام اور اپنی پسند ورضا کی توفیق کے مطابق طلوع فرما۔

ہم جس کمپارٹمنٹ میں تھے اس کے سامنے کئی منزلہ اور ایک بڑے ہوٹل والا جہاز چل رہا تھا، اس کے سامنے ایک چھوٹا سا جہاز چل رہا تھا، اس لئے کہ پانی نیل میں کم تھا ،۱۲ ربجے رات کو ہم لوگ حلفہ کے بجائے فرس پہنچے، رات جہاز میں گزاری۔

چہارشنبہ یکم رمضان سنہ ۱۳۷۰ھ مطابق ۶/۶/۱۹۵۱ء

پہلا روزہ وافطار

بہ فضل خدا ہم لوگ روزہ سے تھے، چیکنگ کسٹم اور پاسپورٹ وغیرہ کی منزلیں طے ہوئیں اور ٹرین کے سکنڈ کلاس میں اپنی رزرویشن حاصل کی اور محترم سید علی میرغنی باشا کو اپنی آمد کا تار دے دیا، ٹرین صحرا کو طے کرتی ہوئی چلی، ہوائیں صحرا کی ریت اڑا اڑا کر ہمارے چہروں کو گرد آلود کر رہی تھیں، کچھ سوڈانیوں کے ڈبے میں ہم لوگوں نے افطار کیا ان لوگوں نے بڑے اصرار سے افطار کی دعوت دی تھی، کھانے کی صفائی اور اس کے مشکوک ہونے کے بارے میں اطمینان حاصل کر لینے کے بعد ٹرین کے ڈائننگ کار میں ہم لوگوں نے کھانا کھایا۔

اس تحقیق واحتیاط کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ فرسٹ اور سکنڈ کلاس کے مسافروں میں اکثر انگریز تھے اور اس وقت ہم لوگ انگریزی حکومت کے حدود میں سفر کر رہے تھے۔

پنجشنبہ ۲/۹/۱۳۷۰ھ مطابق ۷/۶/۱۹۵۱ء

الخرطوم البحری میں

ہم لوگ الخرطوم البحری میں عصر کے وقت ساڑھے چار بجے ٹرین سے اترے، شدید گرمی تھی، کرایہ پر ایک موٹر لی اور سیّد میرغنی کی قیام گاہ کے لئے روانہ ہوئے جہاں جہاں ٹھہرے غسل کیا اور عصر کی نماز پڑھی، یہ نہ معلوم تھا کہ ہم کہاں ٹھہریں گے اور ہمارا ٹھکانہ کہاں ہوگا، پھر معلوم ہوا کہ سیّد میرغنی کو ہمارے آنے کی اطلاع ہو چکی ہے، خدّام ہمارے بارے میں ان کی ہدایات کے منتظر ہیں، تھوڑی دیر بعد سیّد میرغنی کے ایک خادم نے ہم کو اپنے ساتھ موٹر پر سوار ہونے اور جہاں ہمارے ٹھہرنے کی ہدایت ملی تھی وہاں چلنے کا اشارہ کیا ہم لوگ موٹر پر سوار ہو گئے اور الخرطوم البحری کے ایک تاجر کے گھر کے پاس اتر گئے جن کا نام شیخ طیّب ابراہیم عبدالمقصود تھا، وہ سیّد میرغنی کے خلفاء اور عزیزوں میں تھے، ہمارے رہبر نے بتایا کہ

یہی آپ کے میزبان ہیں، ان کو سیّد میر غنی کی ہدایات پہنچ چکی ہیں، ہم نے ان سے سیّد میر غنی سے ملنے کا وقت پوچھا تو جواب ملا کہ ابھی آپ کو معلوم ہو جائے گا، ہم لوگ ایک وسیع مکان میں اور بہت شریف لوگوں کے پاس ٹھہرے ہم لوگ بہت تھکے ہوئے تھے لہٰذا افطار کے بعد آرام کیا اور جب نماز تراویح کے لئے اٹھنے کا ارادہ کیا تو کھانا آ گیا۔

ہمارے ملک میں افطار کے فوراً بعد کھانے کا رواج ہے بس صرف مغرب کی نماز کا فصل ہوتا ہے، اب ہم بڑی کشمکش میں پڑے اس لئے کہ ہم نے کوئی کسر نہیں رکھی تھی افطار کے ساتھ ہی کھانے کی ضرورت پوری کر لی تھی، تاہم میزبان کے خیال سے ہم لوگوں نے کچھ کھا لیا۔

جمعہ ۳/۹/۱۳۷۰ھ مطابق ۸/۶/۱۹۵۱ء

تقریر سے معذرت

نیند پوری کرنے کے لئے ہم لوگ فجر بعد سو گئے اور جب دھوپ نکلی تو اٹھے اور جمعہ کی تیاری کی اور بازار کی مسجد میں جمعہ پڑھا، امام صاحب نے مجھ سے تقریر کرنے کو کہا میں نے معذرت کر دی، جمعہ کا خطبہ، روزوں اور رمضان میں نوافل، شب کے فضائل سے متعلق تھا، ہم نے پورا دن اپنی قیام گاہ پر گزار دیا، سیّد میر غنی کی اجازت اور ان سے ملاقات کے وقت کا انتظار کرتے رہے، یہ انتظار ہمیں کھل گیا رات کو اطلاع ملی کہ سیّد صاحب کل دس بجے ہم سے ملیں گے، اس خبر سے ہم لوگ خوش ہو گئے، اور انتظار کی کلفت دور ہو گئی، افطار سے قبل میزبان اور ان کے سب بھائی صاحبان اکٹھا ہوئے، ہمارے میزبان شیخ طیّب ان کے دونوں بھائی، اور صاحب مکان کے لڑکے بھائی خوجلی کی باتیں بڑی نشاط انگیز و دلچسپ تھیں، غیر ملکی حکومتوں اور ان کے کارپردازوں سے ان کو شدید نفرت ہے، جناب طیّب صاحب ایک باوقار و معتدل بزرگ ہیں، عبدالرحیم صاحب مؤدب اور بڑے شرمیلے ہیں، ہمارے میزبان شیخ طیّب کی واقفیت اور علم عام تاجروں کی سطح سے بلند ہے۔

شنبہ ۴/۹/۱۳۷۰ھ مطابق ۹/۶/۱۹۵۱ء

سیّد میر غنی باشا

سو کر اٹھے تو دھوپ خوب پھیل گئی تھی، سیّد صاحب سے ملاقات کی تیاری کی اور اپنے معزز میزبان شیخ طیّب ابراہیم کے ساتھ ان کے یہاں کے لئے روانہ ہوئے۔ ذہن وخیالات میں یہ بات گردش کرنے لگی کہ ابھی اس شخصیت سے ملیں گے جس کے بارے میں بارہا بہت کچھ سنا ہے

سیّد صاحب کو سوڈان میں ہمہ گیر مقبولیت اور اثر ورسوخ کی نعمت حاصل ہے اور وہ اپنے متبعین کے دلوں کی گہرائیوں میں اتر چکے ہیں جو ہزاروں کی تعداد میں ہیں، انھوں نے اپنے روحانی اثرات، طاقتور شخصیت اور زبردست عقل وفراست کی وجہ سے انگریزوں کے مقابلہ میں اپنی روحانی قیادت اور سیاسی مقام کا سکہ قائم کردیا، وہ سوڈان میں تحریک (وحدۃ وادی النیل) کے سب سے بڑے قائد اور لیڈر ہیں، میری اطلاع کے مطابق وہ بڑے باخبر، دینی سیاسی تحریکوں سے اچھی طرح واقف، کتب بینی کے شیدا، علم ومطالعہ کے شائق، بیدار مغز اور چاق وچوبند آدمی ہیں، انھوں نے ہزاروں سوڈانیوں کو ایک ایسے نظام میں مربوط اور مشغول کردیا جو ورزش وذکر، صفائی وچستی کا جامع ہے، تخریب پسند تحریکوں اور اخلاق خراب کرنے والے کاموں کا مقابلہ ان کے مدنظر تھا، غرض ان نوجوانوں کی اخلاقی تربیت اور سوڈان میں دینی دعوت کے پھیلنے میں سب سے زیادہ دخل اور اس کا سہرا انھیں کے سر ہے، یہ تمام خوبیاں میں نے ان سب لوگوں کو بیان کرتے سنا جو مصر وسوڈان میں ان سے ملے ہیں اور ملاقات کی ہے لیکن جس بات نے مجھے ان کی شخصیت سے سب سے زیادہ متأثر کیا اور دل میں ان کے احترام کا جذبہ پیدا کیا وہ یہ ہے کہ سیّد میر غنی باہری طاقتوں کے جال میں نہیں پھنسے، غیر ملکی ان کو خرید نہیں سکے اور نہ ان کو اپنے دام فریب میں ہی لا سکے، انھوں نے ان سے دھوکہ نہیں کھایا حالانکہ بہت سے مشائخ علماء لیڈر اور بڑے بڑے لوگ ان کے ہتھکنڈوں میں آچکے ہیں۔

سیّد میر غنی پاشا کے ساتھ

ہم لوگ سیّد میر غنی کی ملاقات کے لئے آئے اور ایک خوبصورت سجے ہوئے بہت بڑے کمرے میں بیٹھ گئے جس میں بجلی کے پنکھوں کے نیچے ایسی خوبصورت کرسیاں لگی ہوئی تھیں جن پر مور کے پر پشتے لگے ہوئے تھے، ہال سادگی اور لطافتِ ذوق کا مظہر تھا، تھوڑی دیر بعد سید صاحب تشریف لائے، ہم لوگوں نے سوڈانی شکل وصورت اور کمزور جسم کے ایک ستر سالہ پیر مرد سے ملاقات کی، ان کی صورت سے فکر واستغراق، انتھک مطالعہ، مدتوں سے شب بیداری کے آثار نمایاں تھے، آنکھیں بے مثال ذہانت کا پتہ دے رہی تھیں، ان کی چوڑی پیشانی، بلند ہمتی وخودداری کی آئینہ دار تھی، وہ ہم سے خوشی وبشاشت قلب کے ساتھ ملے ہم لوگ بیٹھ کر باتیں کرنے لگے، گفتگو ہندوستان، اس کی تاریخ، یہاں کے مذاہب، فسادات اور اس کے اثرات، مسلمانوں کے مستقبل اور ان کے دینی علمی اور اقتصادی واجتماعی معاملات کے بارے میں ہوتی رہی، مسجدوں اور آثار قدیمہ اور اچھوت طبقہ اور کمیونزم کا ذکر رہا، وہ میرے جوابات پر تبصرہ کرتے اور اپنی رائے کا اظہار کرتے جاتے تھے، یہ بات ان کی وسعت معلومات اور متنوع مطالعہ کا ثبوت دے رہی تھی اور یہ ظاہر کرتی تھی کہ وہ مختلف سیاسی نظاموں سے واقف ہیں، یورپ میں جو کچھ ہو رہا ہے اس سے وہ بے خبر نہیں، تازہ ترین خبریں معلوم کرتے رہتے ہیں اور ان کے اندر ہر ملک کے تازہ ترین حالات معلوم کرنے اور واقف ہونے کا جذبہ ہے، اسی طرح ہمیں ان کی گفتگو سے یہ بھی اندازہ ہوا کہ وہ متوازن فکر اور اچھی نظر رکھنے والے ایک دوراندیش آدمی ہیں وسعت معلومات اور فکری بیداری میں ان کو مولانا آزاد سے مشابہ پایا۔

ہم محترم سیّد میر غنی باشا کے پاس سے لوٹے، یہ ہماری پہلی ملاقات تھی، یہ مجلس ہندوستان سے متعلق سوالات اور یہاں کے حالات سے مخصوص رہی، لیکن اس مجلس اور گفتگو سے ہماری سیری نہیں ہوئی، عشاء تک اپنی قیام گاہ پر رہے، عشاء کی نماز وتراویح خرطوم کی جامع مسجد میں پڑھی، کچھ وقت اپنے میزبان شیخ طیّب کی دوکان پر گذارا۔

یکشنبہ ۵/۹/۱۳۷۰ھ مطابق ۱۰/۶/۱۹۵۱ء

سیّد میر غنی کی مقبولیت

میں نے پاشا سید میر غنی کو ایک خط لکھا، اس میں دوسری ملاقات کی گذارش کی اور لکھا کہ میں نے آں محترم کو ان کے ایک مصری معتقد کے ہاتھ اپنے رسائل کا ایک مجموعہ بھیجا تھا اور امید ظاہر کی تھی کہ ان کے مطالعہ کا وقت نکل آئے گا، آج شدید گرمی کے سبب تھکا تھکا رہا، سوڈان کے اس چند روزہ قیام میں میں نے یہ بات محسوس کی کہ یہاں کے باشندوں میں ان کو حیرت انگیز مقبولیت واعتماد حاصل ہے جس نے بھی یہ سنا کہ ہم لوگ ان کی میزبانی میں مقیم ہیں، اطمینان وپسندیدگی کا اظہار کیا، اب تک ہمیں ایسا ایک شخص بھی نہ ملا تھا جو ان کی غیبت وبرائی کرتا ہو یا ان پر تنقید کرتا ہو، ان کے اخلاص وبے لوثی، خاندانی شرافت اور وسعتِ معلومات کی ہر شخص تعریف کرتا ہے۔

انگریزوں سے ناراضگی

میں نے محسوس کیا کہ یہاں کے لوگوں میں انگریزوں کے خلاف عام ناراضگی پائی جاتی ہے، پولیس اسٹرائک، مجلسوں کا موضوع گفتگو بنی ہوئی تھی، اٹھتے اٹھتے لوگوں کی زبانوں سے اسی کا ذکر رہتا ہے، کم ہی کوئی مجلس اس ذکر سے خالی جاتی ہوگی، اسی ذکر وگفتگو کے ساتھ ہم نے افطار کیا اور رات میں بھی یہی گفتگو رہی۔

دوشنبہ ۶/۹/۱۳۷۰ھ مطابق ۱۱/۶/۱۹۵۱ء

سوڈان کے تین پایہ تخت

آج بھی میں بے کار ہی رہا، گھر سے باہر نہیں نکلا، بے کاری مجھے گراں گزری ہم

سیّد صاحب کی دوسری ملاقات کے منتظر رہے، افطار ومغرب کی نماز سے فراغت کے بعد میزبان کے بھائی عبدالرحیم صاحب اپنی موٹر پر ہم لوگوں کو لے کر نکلے اور تینوں دارالسلطنتی شہروں (۱) کی سیر کرائی، اخیر میں وہ ہم کو ام درمان لے گئے جو ان میں سب سے بڑا اور عوامی طرز کا شہر ہے، یہاں ہم لوگ جامع مسجد کے امام محمد شیخ عوض عمر سے ملے، ان کے بھائی تاج عمر ہمارے سفر کے رفیق تھے، ہم لوگوں نے تھوڑی دیر باتیں کیں، شیخ نے افطار پر مدعو کیا ہم نے اس دعوت کو جمعرات تک مؤخر کر دیا۔

مصر کی کشش

میں نے محسوس کیا کہ سوڈانی قوم کو مصر اور اس سے تعلق رکھنے والی چیزوں سے بڑا تعلق ہے، وہ مصر کی پر جوش وکھلی ہوئی حمایت کرتی ہے، انگریز اس قوم کو اس جذبے سے موڑنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔

سہ شنبہ ۷/۹/۱۳۷۰ھ مطابق ۱۲/۶/۱۹۵۱ء

استاذ اسماعیل ازہری سے باتیں

ہمارے میزبان اور ان کے چھوٹے بھائی عبدالرحیم نے حزب الاشقاء (۲) کے صدر استاذ اسماعیل ازہری (۳) سے ظہر سے قبل اشقاء کے دفتر میں ہماری ملاقات طے کر لی لہٰذا ہم لوگ الخرطوم العمومی کی طرف نکلے اور اشقاء کے دفتر میں ان سے ملاقات کی اور براعظم افریقہ میں اسلامی دعوت کے امکانات اور مواقع اور اس کام میں لگے ہوئے حضرات کے بارے میں دیر تک گفتگو کرتے رہے۔

---

(۱) سوڈان کا دارالسلطنت درمیان سے دریائے نیل سے دو شاخ ہو کر گذرنے کی وجہ سے تین شہروں میں بٹ گیا ہے جو خرطوم بحری وعمومی اور ام درمان کے نام سے موسوم ہیں۔ (۲) وحدت مصر وسوڈان کی علمبردار جماعت۔
(۳) بعد میں کچھ مدت تک سوڈان کے وزیر اعظم رہے پھر ایک مدت تک جمہوریہ سوڈان کے صدر رہے، ان کے والد ماجد جامعہ ازہر کے فاضل تھے اور یہ نسبت ان کو وراثت میں ملی

سرکاری علماء کے بارے میں ان کی رائے

استاذ اسماعیل بے نے سرکاری ملازمت کرنے والے علماء پر تنقید کی اور فرمایا کہ انھوں نے کالجوں کے دینی شعبہ میں محض داخلہ لے کر دین سیکھا ہے وہ دینی ماحول کے لوگ نہیں ہیں اور نہ دینی تربیت حاصل کی ہے اور حکومت کے منصب افتاء اور عہدہ قضا کی ذمہ داری سنبھال لی، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ نہ وہ دین سے تعلق رکھتے ہیں اور نہ دینی امور کو سلجھاتے اور اس کی فکر کرتے ہیں، سوائے ان امور کے جو ان کی ملازمت و پیشے کے دائرے میں آتے ہیں انھیں دین کی فکر ہے نہ اہتمام، اس کے برخلاف مشائخ طریقت جو خالص دینی علمی گھرانوں میں پیدا ہوئے اور اچھے و دیندار ماحول میں پرورش پائی، ان میں آپ کو مخلص داعی اور خالص مربّی و مبلغ ملیں گے۔

کہنے لگے میں گارڈن کالج میں تھا وہاں طلبہ کی تقسیم ذوق و مناسبت سے نہیں ہوتی تھی کہ جس کو جس مضمون سے مناسبت ہو وہ اس میں داخل کیا جائے بلکہ بے سوچے سمجھے محض خود رائی سے ہوتی تھی، چنانچہ میرا انتخاب ریاضی اور علوم جدیدہ کے طالب علم کی حیثیت سے ہوا، میرے اور بہت سے ساتھی دینی علوم میں لے لئے گئے، انھیں میں سے کوئی قاضی مفتی اور کوئی عالم ہوا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ لوگ دینی مزاج اور علمی ورثہ سے خالی ہیں، یہی وجہ ہے کہ وہ ملازمت میں لگے ہوئے ہیں، نہ دین کا اہتمام ہے نہ قوم کی فکر۔

سید میر غنی کے بارے میں ان کی رائے

استاذ اسماعیل ازہری نے شیخ سیّد میر غنی کی تعریف کی ان کی دعوتی سرگرمی اور حکمت و اخلاص کی مدح سرائی کی اور فرمایا کہ بلاشبہ وہ خداداد صلاحیت کے مالک ہیں، نوجوانوں کو اخلاق رذیلہ سے بچانے، مغرب کے دھارے کے ساتھ بہنے سے روکنے میں سب سے زیادہ دخل انھیں کی شخصیت کو ہے، خدا ہی نے ان کو یہ توفیق بخشی کہ انھوں نے کبر

سنی میں تحریک ودعوت کی طرف توجہ کی ، جو اس بات کا ثبوت ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے ہاتھوں اس قوم کے لئے بہتری کا فیصلہ کرنا چاہتا ہے۔

افریقہ میں اسلامی دعوت کی ضرورت

میں نے ان سے افریقی ممالک میں ٹھوس اسلامی دعوت وتحریک کی ضرورت کے بارے میں گفتگو کی (۱)، جو ابھی تک اپنی جہالت اور پسماندگی میں گرفتار ہیں، اس میں شبہ نہیں کہ یہ دعوت عنداللہ بہت بڑی عبادت اور مسلمانوں کی قوت وطاقت اور صحیح نشوونما کے قوی تر اسباب میں سے ہوگی اور ان مقاصد کے حصول کا سب سے بڑا ذریعہ ہوگی جن کو ان جیسے حضرات اپنا مقصد ومراد بناتے ہیں، میں نے امید ظاہر کی کہ وہ اس طرف پوری توجہ کریں گے، انھوں نے مصر وسوڈان کی وحدت کی کوششوں میں انہماک کا عذر بیان کیا اور فرمایا کہ ان کا منصب عالم دین کا منصب نہیں ہے، اس کے لئے علماء دین ہی زیادہ موزوں اور مناسب ہیں، یوں وہ اس کا خیال رکھتے ہیں، اسے کمتر نہیں سمجھتے، انھوں نے اس مقصد کی خاطر جمعیۃ تبلیغ اسلام کے قیام کا ذکر کیا اور مجھ سے اس کے سکریٹری شیخ شوقی اسد سے ملنے کو کہا، میں نے اس کے لئے اپنی آمادگی ظاہر کی، میں نے ان سے انجمن طلباء قدیم انجمن سوڈان اور انجمن مصر کے دیکھنے کی خواہش ظاہر کی، انھوں نے کہا کہ وہ اس سلسلہ میں ضرور مدد کریں گے ، ہم لوگ ان کے پاس سے شکر گزار اور ان کے علم وفہم اور ان کی اچھی باتوں سے متأثر ہوکر واپس آئے ، یہاں سے ہم لوگوں نے شرعی عدالت کا قصد کیا اور قائم مقام چیف، جسٹس شیخ حسن المدثر اور سوڈان کے مفتی اعظم شیخ ابوالقاسم سے ملے اور ان دونوں حضرات سے جنوبی سوڈان اور ان علاقوں میں دعوت وتبلیغ دین کے موضوع پر گفتگو کی جو ابھی تک کفر وجہالت پر قائم ہیں، قاضی القضاۃ نے مجھے بتایا کہ آخر میں انگریزی حکومت نے کیوبا میں اسلامی تبلیغ کی

---

(۱) برادر معظم مولوی حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب اپنے خطوط میں مجھے بار بار اس کی تاکید کرتے تھے کہ میں اپنے اس سفر میں زیادہ سے زیادہ اس مقصد کے حصول کی کوشش کروں اور جو لوگ اس سلسلہ میں کچھ کر سکتے ہیں ان کو توجہ دلاؤں (ملاحظہ ہو حیات عبدالحی تذکرہ ڈاکٹر عبدالعلی صاحب مرحوم)

اجازت دے دی ہے پہلے ممنوع تھی، ہم نے اس کو فال نیک سمجھا اور ان پر زور دیا کہ وہ اس مسئلہ کی طرف خصوصی توجہ دیں، عجب اتفاق کہ عدالت میں ہماری موجودگی ہی کے وقت اقبال علی شاہ آ گئے جو چند دنوں سے سوڈان میں مقیم ہیں، وہ انجمن اتحاد اسلامی کی شاخ قائم کرنے آئے ہیں جس کا مرکز پیرس میں ہے یہ غیر واضح سا وفاق ہے جس کے اغراض ومقاصد ابھی تک کھل کر سامنے نہیں آئے، اس کے بارے میں بہت سے لوگوں کو شکوک وشبہات ہیں، اس کا مرکز پیرس میں ہے، اس پیرسی اتحاد کی تجویز نو آبادیات کے ان لوگوں کی طرف سے ہے جو اتحاد کے سب سے بڑے دشمن ہیں اور یہی اس کے کرتا دھرتا ہیں اقبال علی شاہ سوڈان کی ہر محفل ومجلس کا موضوع گفتگو بنے ہوئے تھے، وحدت وادی نیل کے ممبران اور سیّد میر غنی باشا کے ماننے والے حضرات ان کو بڑے شک وشبہ کی نظر سے دیکھتے تھے اور ان کے مقصد سفر اور سوڈان کی آزادی کے لیڈر سیّد عبدالرحمٰن مہدی کے یہاں ان کے ٹھہرنے کے متعلق چہ مگوئیاں ہو رہی تھیں، حکومت کے ذمہ داروں سے ان کے بار بار ملنے اور گورنمنٹ ہاؤس میں اس اتحاد کی شاخ قائم کرنے کے متعلق ہم سے بہت سے سوالات کئے گئے، ان صاحب کے بارے میں میں نے اپنی بعض معلومات بیان کیں، منجانب اللہ یہ مقدر تھا کہ عدالت میں ان سے ہماری ملاقات ہو جائے، میرے ساتھ شیخ طیّب اور ان کے بھائی عبدالرحیم تھے، جب اقبال علی شاہ پولیس انسپکٹر ڈائرکٹر محمد طیّب ہاشم اور جسٹس حسن مدثر سے باتیں کر چکے تو ہماری طرف متوجہ ہوئے، اور تھوڑی دیر ہم نے اردو میں بات کی، ان کے چلے جانے کے بعد ہم نے حاضرین کے سامنے ان کی گفتگو کا ترجمہ کر دیا۔

میں نے ان سے یہ توقع ظاہر کی کہ وہ اس کبر سنی میں صرف خدمت اسلام میں لگ جائیں، ہر طرف سے کٹ کر اور یکسو ہو کر صرف ان کاموں میں مصروف ہو جائیں جو خدا کی خوشنودی ورضا کا سبب ہیں، اور اپنی ساری کوشش اسی پر صرف کر دیں۔

عشاء کی نماز وتراویح ہم نے خرطوم کی جامع مسجد میں پڑھی اور رمضان المبارک سے متعلق مختصر تقریر کی۔

چہارشنبہ ۸/۹/۱۳۷۰ھ مطابق ۱۳/۶/۱۹۵۱ء

شیخ شوقی اسد سے ملاقات

آج گیارہ بجے دن میں شیخ عبدالرحیم اور شیخ طیّب کے ساتھ ہم لوگ ''جمعیۃ التبشیر الاسلامی'' کے سکریٹری شیخ شوقی اسد سے ملنے گئے اور خرطوم میں واقع مصری ماہر اقتصادیات کے دفتر میں بڑے انتظار کے بعد ان سے ملے اور دعوت کے موضوع پر گفتگو کی، انھوں نے اس سلسلہ میں جو کام ہوا ہے اس کا ذکر کیا اور اس بڑے اور اہم کام کے لئے اپنی آمادگی اور عزم کا اظہار کیا، میں نے ان کو اس بات کی طرف توجہ دلائی کہ حسبۃ اللہ کام کرنے والوں اور مخلص داعیوں اور کارکنوں کا وجود آمدنی کی زیادہ فکر کرنے اور چندہ جمع کر کے جمعیۃ کے لئے اچھا بجٹ اکٹھا کرنے سے زیادہ مقدم وضروری ہے، میں نے ان کے سامنے کچھ علماء اور جمعیۃ کے اراکین کو ہندوستان بھیجنے کی تجویز رکھی جو یہاں آکر دعوت کے طور وطریق کا مطالعہ کریں اور مخلص داعیوں سے ملیں، میں نے خود ان کو بھی ہندو پاک کے سفر کی دعوت دی انھوں نے اس مشورہ کا خیر مقدم کیا اور جمعیۃ کے صدر واراکین کو جمع کرنے کا وعدہ فرمایا تاکہ میں ان سے تعارف حاصل کروں اور بات کرنے کا موقع ملے، جامع الخرطوم البحری میں ہم لوگوں نے عشاء کی نماز اور تراویح پڑھی اور رمضان سے متعلق ایک مختصر تقریر کی، میں نے حاضرین سے کہا کہ رمضان مسلمانوں کے لئے نہر طالوت کی طرح ہے، اس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ ان کو جانچتا اور پرکھتا ہے۔

پنجشنبہ ۹/۹/۱۳۷۰ھ مطابق ۱۴/۶/۱۹۵۱ء

شیخ محترم سیّد میرغنی سے جماعت تبلیغ کا تعارف اور بانی کا تعارف

سیّد میرغنی کا فرستادہ آیا اور یہ اطلاع کی کہ ساڑھے دس بجے ملاقات کا وقت طے ہوا ہے اس خبر سے ہمارے دل خوش ہو گئے اس ملاقات کے انتظار میں ہمارا پیمانۂ صبر لبریز ہو چکا تھا،

بہر حال ہم لوگ ان کے گھر کی طرف روانہ ہوئے، آج کی ملاقات بڑی سودمند و تشفی بخش تھی، دو گھنٹے تک نشست رہی، اس طویل مجلس میں انھوں نے افریقہ میں دعوتِ اسلام کے موضوع پر گفتگو کی اور اپنی قیمتی معلومات سے ہمیں مستفید کیا اور ان رکاوٹوں کے بارے میں گفتگو کی جو استعماری حکومتیں اس دعوت کی راہ میں پیدا کر رہی ہیں اور دعوت کا کام کرنے والوں کو ان کے مقصد و مراد میں جو مشکلات و پریشانیاں پیش آ رہی ہیں ان کو بیان کیا، انھوں نے مختلف علاقوں میں جو مختلف نوعیت کی صورتحال ہے نیز وہاں کی آبادی میں مسلمانوں کے تناسب، ان کے مزاج اور طور و طریق میں جو فرق ہے ان پر روشنی ڈالی، اندازہ ہوا کہ بڑے باخبر و صاحب نظر ہیں، انھوں نے کہا کہ سوڈانی نوجوانوں کے لئے یہ نظام اسی غرض سے چلایا گیا ہے کہ دعوت کا کام پھیلایا جائے اور دین و اخلاق کے مخالف، فساد و بگاڑ سے جوانوں کو محفوظ رکھا جائے۔

اخلاق کی اصلاح اور جوانوں کو منظّم اور دین کی طرف متوجہ کرنے میں اس نظام کا بڑا دخل ہے اور غیر مسلموں میں ان تنظیموں کی طرف کشش اور ان کے اثرات سے اسلام قبول کرنے کا ایک بڑا ذریعہ ہے، سیّد میر غنی کی تائید شیخ عمر اسحٰق اور ان کے ساتھیوں نے بھی کی اور اس سلسلے کی اپنی معلومات اور تجربات کو بیان کیا اور کہا کہ سوڈان کو اخلاقی گراوٹ، آزادی اور بے پردگی سے بچانے کا سہرا تنہا انھیں کے سر ہے۔

میں نے سیّد میر غنی سے ہندوستان کی موجودہ دعوتی سرگرمی (جماعت تبلیغ) اور اس کے کارکنوں کے حالات اور ملک کے طول و عرض میں ان کی نقل و حرکت جماعتوں کے انتظام اور ان کے سفروں، نظام تعلیم اور ذکر و اجتماعات کے طرز کو بیان کیا۔

حرکت و عمل جوانوں کا ایک فطری خاصّہ ہے اس سے فائدہ اٹھانا اور ان کو مفید کام میں لگانا ضروری ہے

میری اس گفتگو سے وہ بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ اس میں شک نہیں کہ تنہا حرکت و عمل ہی کے ذریعہ نوجوانوں کی حفاظت اور تربیت ممکن ہے، بلاشبہ حرکت و عمل نوجوانوں کا ایک فطری خاصہ ہے اس کو موڑا جا سکتا ہے روکا نہیں جا سکتا، لیکن ہاں اس کو کام

میں لگایا جاسکتا ہے اور اچھے اور مفید نتائج حاصل کئے جاسکتے ہیں۔

یہی وہ رابطہ ہے جو ہمارے سوڈانی نظام دعوت اور ہندوستان میں آپ کی تحریک میں یکسانیت پیدا کرتا ہے، ان کے ارشاد پر میں نے ان کو مشورہ دیا کہ وہ ایک سوڈانی وفد ہندوستان بھیجیں تاکہ وہ دینی حالات اور اصلاحی طریقۂ کار کا مطالعہ کرے، اس کے ذریعہ دعوت کا کام کرنے والے دونوں قوموں میں بہتر کڑی ثابت ہوں اور عمومی طور پر اسلامی دعوت کی ترقی میں نشان راہ کا کام کریں، سیّد صاحب نے اس تجویز کو پسند فرمایا اور اس کا خیر مقدم کیا اور فرمایا کہ اس وفد کے بھیجنے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہم اس پر باقاعدہ سوچیں گے اور غور کریں گے، اسی طرح میں نے ان کو زمانۂ حج میں سوڈانی وفد حجاز بھیجنے کا مشورہ دیا جو ہندوپاک کے مبلغین اور داعیوں سے ملے، انھوں نے اس مشورہ کا بھی خیر مقدم کیا۔

انھوں نے شیخ عمر اسحٰق سے فرمایا کہ ہم لوگوں کو جمعہ کے دن شباب میر غنی کے جلسہ میں بلائیں تاکہ میں اس کے نظام کو دیکھوں، آج کی گفتگو میں بھی ہندوستان اور وہاں کے سیاسی نظام پر بات ہوئی، مسلمانوں کو اپنی زبان وکلچر اور دینی تعلیم پر باقی رہنے میں جن مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے ان کا ذکر رہا، مسلم غیر مسلم سب کے لئے یکساں قانون جو مشکلات و پیچیدگیاں پیدا کرے گا، ان سب باتوں کا ذکر آیا اور ہم لوگوں نے اس کا حل تلاش کرنے کے سلسلے میں گفتگو کی۔

سیّد میر غنی کے بعض خیالات

سیّد میر غنی نے تمام اسلامی ملکوں کے اندر جدید تعلیم کے بارے میں جو مشکلات ہیں ان کے متعلق گفتگو کی۔

تعلیم کو اس کے مزاج وعیوب سے الگ نہیں کیا جاسکتا

انھوں نے کہا کہ جدید تعلیم کو اس کے مزاج وعیوب سے الگ نہیں کیا جاسکتا کسی بھی ملک میں جب اس کو نافذ کیا جائے گا تو وہ اپنا میٹھا کڑوا دونوں ہی مزا دے گی، فرمایا

اسلامی ممالک میں مغربی تہذیب کا بہت اثر ہے۔

اسلامی ممالک ترکی کے نقش قدم پر

اس وقت تمام اسلامی ممالک ترکی کے اس نقش قدم پر چل رہے ہیں جس کو کمال اتاترک نے جنم دیا ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ ترکی میں کمال اتاترک جیسا سخت آدمی تھا، جس نے مغربی تہذیب اور اپنے خیالات کو سختی کے ساتھ زبردستی وتیزی سے نافذ کیا، دوسرے ممالک دھیرے دھیرے ۵۰ سال تک ترکی کے مقام تک پہونچیں گے، انھوں نے مغربی زبانوں کے پڑھنے کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کیا اور فرمایا کہ اس سے بے نیاز رہنا درست نہیں۔

ترجمہ کے ذریعہ علوم کو پڑھانا ناکام کوشش ہے

فرمایا: مصر نے کوشش کی کہ ڈاکٹری عربی زبان اور مغربی کتابوں کے ترجمہ سے پڑھے مگر کچھ عرصہ بعد یہ اندازہ ہوا کہ دوسری زبان کا علم وتجربے کی ترقی کا ساتھ دینا ممکن نہیں، ترجمہ پیچھے رہ جاتا ہے، علم وایجادات آگے بڑھتے جاتے ہیں اور ترجمہ کا کام سست رفتاری وکوتاہی کا شکار رہتا ہے، آخر کار انھوں نے یورپین زبانوں میں ڈاکٹری پڑھنا شروع کیا ان کے ان ٹھوس خیالات اور دقیق النظری میں میں نے دوبارہ ان کی وسعت معلومات وروشن دماغی کی جھلک دیکھی اور ہمیں اندازہ ہوا کہ وہ مصر اور مصر سے باہر کی علمی ادبی تحریکوں سے اچھی طرح واقف ہیں اور ہر قسم کے اخبارات ورسائل کا مطالعہ کرتے ہیں خواہ وہ اچھے ہوں یا برے اور ان کے رطب ویابس صحیح وغلط مقاصد میں فرق وامتیاز کرتے ہیں۔

مصر پر ادبی رنگ غالب ہے

ان کے خیال میں مصر پر ادبی رنگ اور خالص ادبی رجحان غالب ہے۔ جدید علمی کدوکاوش ادبی سرگرمی کے مقابلہ میں کمزور ہے، قوم بھی اس کی طرف سے بے توجہی اور لاابالی پن برتتی ہے یہی وجہ ہے کہ (المقتطف) جو تنہا علمی رسالہ ہے، اس کی اشاعت زیادہ بڑھ نہیں سکی۔

مصری رسائل کا گھٹیا معیار

اس ذہنیت کی وجہ سے ماہنامہ " الھلال " اس پر مجبور ہوا کہ علمی معیار سے اتر کر گھٹیا وکم معیاری مضامین شائع کرے جو اس وقت اس کا معیار ہے۔

دوستانہ گفتگو

اس ملاقات میں سیّد میر غنی خوب کھل کر ملے، چہرے سے خوشی ظاہر ہوتی تھی میں نے موقع کو غنیمت جانا لہٰذا آزادی و بے تکلفی سے گفتگو کی اور جو کتابیں ان کو بھیجی تھیں ان کا ذکر کر کے عرض کیا کہ ان پر ایک نظر ڈال لیں، انھوں نے اس کا وعدہ کیا میں نے ان کے پاس اپنے کچھ پرانے رسائل دیکھے جن کو مولانا عبید اللہ صاحب (بلیاوی) نے انھیں ہدیہ کئے تھے، اور سیّد میر غنی نے وہ شیخ عمر اسحٰق کو مطالعہ کے لئے دیئے تھے۔

سوڈانی طرز کی مہمانی

مسجد کے امام شیخ محمد عوض عمر کے یہاں ہم لوگوں نے افطار کیا یہ دعوت سوڈانی قِسم کے کھانے کی اچھی و سچی تصویر پیش کر رہی تھی، مہمان اپنی وضع وقطع اور مُلکی لباس میں تھے، ہر چیز سوڈانی اور خالص اپنے طبعی طور وطریق پر تھی، ہم لوگ قسمہا قسم کی افطاری سے سجے ہوئے ایک لمبے دسترخوان پر بیٹھے جس میں مفرح وٹھنڈے مشروبات اور سوڈانی ماکولات کا حصّہ غالب تھا۔ عشاء بعد کھانا ہوا۔

دعوت میں میری تقریر

رات کے کھانے کے بعد میں نے تقریر کی اور یہ کہا کہ سوڈان اور افریقہ دنیا اور اسلام کی تاریخ میں ایک اہم رول ادا کر سکتے ہیں اور یہ اس وقت ممکن ہے جب کہ سوڈانی بھائی اپنی قدر و قیمت کو پہچانیں اور اس کو اچھی طرح استعمال کریں، میں نے ان کو اسلامی دعوت کی

تحریک چلانے کی طرف متوجہ کیا، حاضرین میں بڑی تعداد تعلیمی اداروں اور مدارس ثانویہ کے اساتذہ کی تھی۔

جامعہ کے فارغین کے سامنے میری تقریر

یہاں سے ہم لوگ جامع.....ام درمان گئے جہاں عشاء وتراویح کی نماز پڑھی اس کے بعد تعلیمی اداروں کے فارغین کے مرکز گئے جہاں آج رات اجتماع طے ہو چکا تھا، جلسہ میں دارالسلطنت کے تینوں شہروں کے علماء نوجوانوں اور مدارس کے اساتذہ کی بہت بڑی تعداد حاضر ہوئی، میں نے افریقہ کی دینی اہمیت کے موضوع پر تقریر کی، میں نے کہا کہ ایک زمانہ میں ایشاء دنیا کا قائد تھا، اس نے قوموں کی قیادت ورہنمائی کی ذمہ داری کامیابی کے ساتھ پوری کی، یہ دنیا کی خوش بختی کا دور تھا، اس لئے کہ اس کی قیادت انبیاء کرام کی تعلیم اور دینی اصولوں پر مبنی تھی، اس کے بعد عالمی قیادت (کچھ ناگزیر اسباب کی بناء پر جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے) مادیت پرست وتوسیع پسند یورپ کی طرف منتقل ہوگئی۔

اس قیادت سے دنیا اور انسانیت کو وہ برے دن دیکھنے پڑے کہ جس کو سبھی جانتے ہیں، اے افریقی مسلمانوں اب افریقہ کی قیادت کی باری ہے، اللہ تعالیٰ ہر ملک وقوم کو قیادت کا موقع دیتا ہے "ھو الذی جعلکم خلٰٓئف" "وہی ہے جس نے تم کو خلیفہ بنایا"۔ پھر میں نے بتایا کہ افریقی کس طرح اس موقع سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور قیادت کا اپنا یہ حصّہ کس طرح حاصل کر سکتے ہیں، اور دنیا کو دینی رُخ پر ڈالنے اور اسلام کی خدمت کا کام کس طرح انجام دے سکتے ہیں، میں نے دل کھول کر تقریر کی جو میرے خیال میں ایک گھنٹہ تک جاری رہی، تقریر کے بعد معزز وسربرآوردہ لوگوں سے میرا تعارف ہوا، پھر ہم نے اُم درمان میں فارغین کے جلسہ کا قصد کیا پہنچنے میں ہماری تاخیر کے سبب ایک تعداد چلی گئی، جو لوگ موجود تھے ان سے تعارف حاصل کیا اور اپنی قیام گاہ واپس آ گئے۔

جمعہ ۱۰/۹/۱۳۷۰ھ مطابق ۱۵/۶/۱۹۵۱ء

شبان میرغنی کے جلسہ میں

سیّد میرغنی کا فرستادہ آیا اور جو کتابیں میں نے مصر سے سیّد میرغنی صاحب کو سوڈان بھیجی تھیں ان کی فہرست مانگی، میں نے ان کتابوں کے نام لکھ دیئے، معلوم ہوتا ہے کتابیں ان کو نہیں پہنچیں جمعہ ہم نے جامع الخرطوم البحری میں پڑھا اور نماز بعد میں دینی موضوع پر تقریر کی اور عصر تک مسجد ہی میں رہے، عصر کی نماز کے بعد ہم لوگ مزدوروں کے لیڈر اور سوڈان کی جمعیۃ الشبان المسلمین کے صدر الحاج سلیمان موسیٰ سے ملے، گرامی قدر محمد صالح حرب (باشا) نے ان کے نام ہم کو ایک تعارفی خط دیا تھا۔ ان سے ملنے میں تاخیر ہوئی، انھوں نے بڑے شریفانہ انداز میں ہمارا استقبال و خیر مقدم کیا اور دیر سے تعارف و ملاقات پر اظہار افسوس کیا۔

دوسرے دن ہم کو افطار پر بلایا ہم نے شکریہ کے ساتھ ان کی دعوت قبول کر لی، عشاء بعد ہم لوگ شباب میرغنی کے جلسہ میں ام درمان حاضر ہوئے، سیّد میرغنی کے بزرگوں اور اس طریقہ کے بعض مشائخ کے نعتیہ اشعار سنے، نوجوانوں کے نشاط و سرگرمی، ان کے کپڑوں کی صفائی اور لباس کی صفائی و خوب صورتی سے جی بہت خوش ہوا۔

جلسہ میں میری تقریر

شیخ عمر اسحٰق نے مجھ سے تقریر کرنے کو کہا میں نے تقریر کی جو مسلم نوجوانوں اور ان کی تربیت سے متعلق تھی، اس تقریر میں میں نے دارالارقم اور اس کے ان نوجوانوں کا ذکر کیا جنھوں نے تاریخ کا رُخ بدل دیا، میں نے ان لوگوں کو ان کے کردار کو اپنانے اور شریعت کو مضبوطی کے ساتھ پکڑ لینے کی تلقین کی اور سنّت کی اتباع پر ابھارا معلوم ہوا کہ اس تقریر کا اثر ان پر اچھا پڑا۔

ترانہ جو ہم لوگوں کو پسند نہ آیا

جلسہ گاہ سے نکلتے وقت ہم کو جوانوں کا ایک حلقہ نظر آیا جو ترنم کے ساتھ بار بار یہ

کہتا تھا شیئًا للّٰہ یا حسن أنت سلطان الزمن (اے حسن خدا کے واسطے کچھ دو۔ تم زمانے کے بادشاہ ہو) ہم لوگوں نے اس ترانے کی ناپسندیدگی کا اظہار کیا جس کا ہمارے نزدیک کوئی جواز نہیں اور جو قطعًا توحید کے خلاف ہے، کسی وفات پائے ہوئے بزرگ سے فریاد کرنا اور یہ عقیدہ رکھنا کہ وہ شاہ زمان ہیں کس طرح جائز ہوسکتا ہے، یہ پتہ نہیں کہ سیّد میر غنی کو اس کا علم ہے وہ اسے پسند کرتے ہیں یا ان کو علم ہی نہیں، بہر کیف میرا یہ اعتقاد ہے کہ عقیدۂ توحید اور عبادت کا خالص اللہ کے لئے ہونا ایسی چیز ہے جس کی طرف سب سے پہلے داعی اور مصلح کو فکر وتوجہ کرنی ضروری ہے، اس کی طرف سے تغافل کی کسی صورت میں گنجائش نہیں، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے (ماکان لبشر أن یوتیه اللّٰه الکتاب والحکم والنبوة ثم یقول للناس کونوا عبادًا لی من دون اللّٰه ولکن کونوا ربانیین بما کنتم تعلمون الکتاب وبماکنتم تدرسون ولا یامرکم أن تتخذوا الملٰئکة والنبیین اربابًا أیامرکم بالکفر بعد اذ انتم مسلمون) کسی بشر سے یہ بات نہیں ہوسکتی کہ اللہ اس کو کتاب اور فہم اور نبوت عطا فرمائے پھر وہ لوگوں سے کہنے لگے کہ میرے بندے بن جاؤ خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر، لیکن کہے گا تم لوگ اللہ والے بن جاؤ بوجہ اس کے کہ تم کتاب سکھاتے ہو اور بوجہ اس کے کہ تم پڑھتے ہو اور نہ یہ بات بتلائے گا کہ تم فرشتوں کو اور نبیوں کو رب قرار دے لو کیا وہ تم کو کفر کی بات سکھائے گا، بعد اس کے کہ تم مسلمان ہو۔

شنبہ ۱۱/۹/۱۳۷۰ھ مطابق ۱۶/۶/۱۹۵۱ء

سیّد میر غنی کا شوق مطالعہ اور حالات باخبری

محترم سیّد میر غنی کا فرستادہ آیا اس کے ہاتھ میں "ماذا خسر العالم" کا ایک نسخہ تھا جس کو میں نے مصر سے بھیجا تھا، قاصد نے کہا کہ سیّد میر غنی کو صرف یہ کتاب ملی ہے، انھوں نے یہ کتاب اس شخص سے منگوائی جس کے ہاتھ آپ نے بھیجی تھی وہ شخص دوسرے

شہر میں رہتا ہے، کیا آپ کے پاس ان رسالوں کے نسخے ہیں جن کا آپ نے فہرست میں ذکر کیا ہے، اس وقت جو رسالے میرے پاس موجود تھے میں نے بھیج دیئے، کتابوں سے سیّد میرغنی کی دلچسپی اور ان کے مطالعہ کا شغف اور حالات کی جستجو اور باخبر رہنے سے میں متأثر ہوا، ظہر بعد علی طالب اللہ آئے، ان کا اخوان المسلمین سے تعلق ہے، ان کے ساتھ ان کے ایک دوست بھی تھے، تھوڑی دیر بیٹھے باتیں کیں، ایک دوسرے سے تعارف ہوا میں نے ان کو " أريد أن أتحدث إلى الاخوان " کے دو نسخے ہدیہ کئے۔

سلیمان موسیٰ کی دعوت

ہم لوگ الحاج سلیمان موسیٰ کے یہاں افطار کو گئے وہاں ہم کو معزز مہمانوں کی ایک منتخب جماعت ملی جن میں اکثر جمعیۃ الشبان المسلمین کے ارکان تھے، افطار پر تکلف تھا اور میزبان نے بڑا اہتمام کیا تھا۔

افطار اور نماز کے بعد میزبان کی فرمائش پر میں نے تقریر کی، اور جمعیة الشبان المسلمین کی تعریف کی اور ان کی اس مہمان نوازی اور اچھے جذبہ کا شکریہ ادا کیا۔

سیدّ میرغنی صاحب سے رخصتی مُلاقات

یہاں سے ہم لوگ سیّد میرغنی باشا کے گھر گئے انھوں نے آخری گفتگو کرنے کے لئے بلایا تھا، وہاں پہونچ کر معلوم ہوا کہ شنبہ کو نوجوانوں میں نے جو میں تقریر کی تھی، اس کا سیّد میرغنی کے لوگوں کو علم ہو گیا، انھوں نے اس پر میرا شکریہ ادا کیا، سیّد میرغنی کے نائب وخلیفہ نے تقریر کی تعریف کی، شیخ عمر اسحٰق بھی موجود تھے، آج رات کی گفتگو حجاز کے دینی حالات، مرکز اسلام میں بے راہ روی اور دین کی ناقدری اور دینی کمزوری، حد سے بڑھے ہوئے عیش وتنعم، لہو ولعب، گھروں میں فحش ادب اور برے برے افسانوں کے پھیلنے اور جوانوں کے ذہن ودماغ اور تعلیمی رجحان وغیرہ پر چھانے سے متعلق رہی جو مسلمانوں کے ذہنوں میں اضطراب وبے چینی پیدا کرتے ہیں، اس کے بعد ہم لوگ سوڈان کی انجمن عمومی خرطوم گئے جہاں سوڈانی نوجوانوں کی

بڑی تعداد کا اپنا منتظر پایا ان نوجوانوں نے مجھ سے سوالات کی بوچھار کی، یہ مجلس جلسہ اور ملاقات سے زیادہ، پریس کانفرنس سے مشابہ تھی، پھر ہم نے ان سے اجازت لی اور قیام گاہ واپس آ گئے۔

یک شنبہ ۱۲/۹/۱۳۷۰ھ مطابق ۱۷/۶/۱۹۵۱ء

سوڈان کی قدرتی، جغرافیائی، سیاسی اور دینی حالت

سوڈان چھوڑنے سے قبل اچھا ہوگا کہ ہم ایک سرسری نظر سوڈان اور اس کے جغرافیہ پر ڈال لیں، آدمی جس ملک کی سیر کرے اس میں کچھ وقت گزارے اس ملک کا یہ حق ہے۔

سوڈان کا رقبہ ۲۶ لاکھ ستائس ہزار مربع کلومیٹر ہے، اس کی لمبائی شمال کی سمت وادی حلفاء سے لے کر جنوب کی سمت جوبا تک ۱۲۰۰ سو کلومیٹر ہے اور اس کی زیادہ سے زیادہ چوڑائی مشرق سے مغرب میں بحر احمر اور دارفور کے اضلاع افریقہ کے خط استوائی علاقہ کے درمیان ۱۵۰۰ کلومیٹر ہے، رقبہ کے اعتبار سے یہ افریقہ کا سب سے بڑا حصّہ ہے ۱۹۴۷ء کی مردم شماری کے مطابق اس کی آبادی ستر لاکھ تھی۔

سوڈان قدرتی اعتبار سے تین حصّوں میں منقسم ہے

(۱) صحراوی علاقہ جو ۵۱۷ کلومیٹر کی چوڑائی میں مصری حدود کے درمیان پھیلا ہوا ہے، یہ خشک وریگستانی موسم کا علاقہ ہے اس صحرا کا نام صحرائے نوبہ ہے۔

(۲) ہموار میدانی علاقہ یہ ۵ ڈگری چوڑائی میں ۵۱۲، اور ۱۷ کلومیٹر کے دونوں دائروں کے درمیان خط استوا کے شمال میں واقع ہے، الجزیرہ میں روئی کی پیداوار کا منصوبہ بنانے کے بعد زرعی اعتبار سے سوڈان کا یہ سب سے اہم جز ہو گیا ہے، الجزیرہ نیل ازرق اور نیل ابیض کے درمیان اسی ملک میں واقع ہے، یہاں کی آبادی عرب وسوڈانی قوم سے ملی جلی ہے، یہی لوگ سوڈانیوں میں زیادہ چست ومتحرک ہیں۔

(۳) استوائی منطقہ جو ۵۱۲ کلومیٹر کی چوڑائی میں جنوب کے آخری حصہ تک

پھیلا ہوا ہے، یہاں کے اکثر حصوں مین زوروں کی بارش ہوتی ہے، گرمی بہت پڑتی ہے یہ حصّہ قدرتی اشیاء کے اعتبار سے بہت مالا مال ہے، آبادی کا اکثر حصہ سوڈانی نسل ہے ان میں بت پرست حبشی بھی ہیں۔

سوڈان کے اکثر باشندے عرب اور سوڈانی ہیں وہ باہم گھل مل گئے ہیں۔ خصوصًا شمالی علاقوں میں، ان میں اکثر مذہب اسلام اختیار کر چکے ہیں، اسلامی فتوحات سے قبل عرب باب المندب کے راستہ سے سوڈان آئے اور ان سے پوری طور پر گھل مِل گئے، ان سے شادیاں کیں، وہاں کچھ قبائل برابر خالص عربوں کے چلے آرہے ہیں۔ جنھوں نے عربوں کی بہت سی عادات ان کے اخلاق اور زبان کو بڑی حد تک محفوظ رکھا ہے، سیّاح ان قبائل سے مل کر عربی رنگ ومزاج محسوس کرتے ہیں۔

نظام حکومت

سوڈان قانونًا بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ اصطلاحی طور پر ثنوی یعنی مِصری انگریزی اقتدار کے ماتحت ہے لیکن درحقیقت خالص انگریزی اقتدار کے کے تحت ہے، دوسری جنگ عظیم کے بعد مصر نے وادی نیل سے انگریزی فوج ہٹانے کا مطالبہ کرنا شروع کیا تو برطانیہ نے اس کے درمیان سوڈان کا مسئلہ کھڑا کر دیا اور مصر وسوڈان میں ایک زوردار تحریک چلی جو یہ کہتی ہے کہ سوڈان مصر کا ایک جز ہے جیسا کہ جغرافیائی طور پر واقع ہے، حکومت برطانیہ نے اس کی مخالفت کی پھر آخر میں مصر نے ۱۹۳۶ء کے معاہدہ کو توڑ دیا اور سوڈان کے دونوں معاہدوں کو ختم کر کے وادی نیل کی وحدت کا اعلان کر دیا، اور شاہ مصر کو وادی کا بادشاہ قرار دیا۔

سوڈان کے ضلعے

سوڈان میں پندرہ ضلعے ہیں، ان میں سے زیادہ اہم (۱) دارفور (۲) الجزیرہ (۳) کسلا (۴) الخرطوم (۵) کردفان (۶) المدیریۃ الشمالیۃ (۷) خط الاستواء (۸) بالائی النیل،

اہم شہر

الخرطوم جس کی آبادی ۵۰ ہزار ہے، یہ شہر زمین کی ایسی پٹی پر واقع ہے جو طول وعرض میں ہاتھی کی سونڈ سے مشابہ ہے، نیل ازرق ونیل ابیض کے سنگم پر واقع ہے۔ یہی سوڈان کا پایۂ تخت اور اس کا سب سے بڑا شہر اور عظیم تجارتی منڈی ہے، پرانے زمانے میں (ام درمان) جو اسی کے مقابل نیل ابیض کے بائیں کنارے پر واقع ہے وہ اس کا پایۂ تخت تھا اور ابھی تک بہت بڑا عوامی شہر ہے جس کی آبادی ایک لاکھ سے زائد ہے۔

خرطوم نیا شہر ہے، اس میں اچھی سڑکیں ہیں، اس میں اسکول، گارڈن اور ایک کالج ہے جو ۱۹۰۲ء میں ابتدائی وثانوی تعلیم سے شروع ہوا اور ۱۹۴۰ء میں یونیورسٹی کے معیار کی تعلیم ہونے لگی۔

عطبرہ

یہ ملک میں سوڈان ریلوے کا سب سے بڑا سنٹر ہے اور اس خط لائن پر واقع ہے جو قاہرہ کو کاب سے ملاتی اور پورے افریقی براعظم سے گذرتی ہے۔

الابیض

یہ مغربی سوڈان کا علاقہ میں کردفان کا مرکز ہے اور اپنی تجارتی وحکومتی سرگرمیوں میں مشہور ہے، سوڈان ریلوے لائن کے آخری مغربی حصّہ پر واقع ہے۔

سوڈان، سواکن، بربر، شندی وغیرہ بھی اہم شہروں میں سے ہیں۔

سوڈان کی اقتصادی زندگی

سوڈان کا بڑا دارومدار کھیتی اور جانوروں کے پالنے وچرانے اور گوند جمع کرنے پر ہے اس کی موجودہ اہم زراعت روئی اور (الصمغ العربی) عربی گوند کے درخت ہیں، سوڈان کی سب سے بڑی غذا مکئی اور دوسرے غلّہ جات ہیں۔

صنعت وتجارت

سوڈان صنعت میں کچھ زیادہ ترقی یافتہ نہیں ہے، ہاں تجارت میں روئی کی کاشت کی وجہ سے ترقی کی ہے جو تقریباً حکومت برطانیہ لے لیتی ہے۔

اخلاقی حالت

سودانی بھولے پن اور فطری مزاج کے مالک ہیں مگر انگریزی سامراج کی مصیبت میں پڑ کے جو قدرۃً اپنے ساتھ وہ اخلاقی امراض لایا ہے، جس کی مغربی تہذیب حامل ہے اور جو سامراجی حکومتوں کی خاصیت ہے.....ان میں بھی شراب نوشی، بہت سی چیزوں میں انگریزوں کی تقلید اور ان کی عادت اختیار کرنے کا مرض پھیلا اور مشرقی مزاج اور مغربی عادات واطوار کا ملا جلا ایک مضطرب عنصر پروان چڑھا جیسا کہ انگریزی دور کی ابتداء میں ہندوستان میں ہوا تھا، ایسے ہی مصر وغیرہ میں، یہ عجیب عنصر ہے اس سے ملک وقوم کو فائدہ نہیں پہونچتا، یہ طبقہ اکثر تینوں راجدھانیوں اور بڑے شہروں میں پایا جاتا ہے۔

دینی حالت

سوڈانی دین کے بارے میں سخت اور اس کے پابند ہیں، ان کا دینی جذبہ قوی، اور وہ الحاد وآزادی سے بہت دور ہیں، مذہب سے گلوخلاصی کا ان میں کوئی جذبہ نہیں، وہ اپنی اسی حالت پر قائم تھے کہ انگریزی سامراج کی مصیبت میں پڑ گئے، چنانچہ ان کی دینی حالت میں انتشار پیدا ہوا اور جدید تعلیم دوسروں کی طرح ان پر بھی اثر انداز ہوئی، یہ بات ضرور ہے کہ وہ اپنے ملک کے دینی مزاج اور ان میں دینی دعوت کے اچھی طرح اشاعت کے سبب دینی رجحان ان پر غالب رہا، ہاں یہ بات ضرور ہوئی کہ اس دینداری میں تصوّف کے سلسلوں کے اشخاص اور بزرگوں کے ساتھ احترام وتعظیم کا معاملہ کرنے، ان کی بات کے آگے جھکنے اور ان کی تعظیم وتکریم میں اتنا مبالغہ سے کام لیا کہ شرعی حدود سے نکل کر اس جگہ پہنچ جاتے ہیں جو عبادت وشرک کہی جاسکتی ہے

سوڈانیوں میں سب سے زیادہ مقبول اور پھیلنے والا طریقہ میر غنی کا طریقہ طریقۂ ختمیہ ہے، جس کی مسند پر اس وقت سیّد میر غنی متمکن ہیں..... بہت سی مسجدوں میں سیّد میر غنی علی کی تصویریں آویزاں پائیں گے تو پھر گھروں کا کیا ذکر، سوڈان اور حبشہ کی اکثر مسجدوں میں جو شخص اس طریقہ سے تعلق نہ رکھتا ہو اور سیّد میر غنی کے متبعین میں سے نہ ہو، وہ خطبہ نہیں دے سکتا۔

سوڈان کو الوداع

ہم لوگوں نے اسٹیشن کا رخ کیا معلوم ہوا کہ الحاج سلیمان موسیٰ ہمارے معزز مہمان اور اپنے دونوں بھائیوں کے ساتھ ناشتہ، رات کا کھانا اور بھی ہمیں سفر میں جن چیزوں کی ضرورت ہوگی سب لئے ہوئے ہم سے پہلے اسٹیشن پہنچ کر وعدے کے مطابق ہمارے لئے ٹرین میں دو سیٹیں رزرو کرا چکے ہیں حالانکہ وقت اتنا تنگ تھا کہ اس میں رزرویشن بہت دشوار تھا، اور جب سوڈان ریلوے کے ٹکٹ گھر کے ہیڈ کلرک یوسف قناوی نے میرے نام کو پہچانا تو انھیں بڑا تعجب ہوا، وہ مجھ سے ملے، مگر میں نے ان کو نہیں پہچانا، میرے نہ پہچاننے پر انھوں نے شکوہ کیا اور کہا کہ میں مکّہ مکرّمہ میں ترکوں کے اجتماع میں آپ سے ملا ہوں، آپ نے رسائل وتقریروں کا ایک مجموعہ بھی دیا تھا اور مجھ سے یہ وعدہ بھی فرمایا تھا کہ جب سوڈان آئیں گے تو ہم سے ملیں گے، کیا آپ وعدہ بھول گئے، میں نے ان سے معذرت کی اور ان کا شکریہ ادا کیا، انھوں نے مجھے اپنا وزیٹنگ کارڈ دیا تو فوراً ہی پہچان گیا، انھوں نے ہمارے مسئلہ میں بڑی دلچسپی لی اور ہمارے لئے مناسب سیٹ رزرو کی۔

ہم جن دوستوں کی مہمانی میں تھے، انھوں نے ہم کو رخصت کیا وہ ہماری جدائی سے بڑے متأثر تھے، ہمارا بھی یہی حال تھا، سبحان اللہ اسلامی رشتہ کتنا قوی اور گہرا ہے۔

دوبارہ مصر میں

دوشنبہ ۱۳/۹/۱۳۷۰ھ مطابق ۱۸/۶/۱۹۵۱ء

جہاز کی مصیبت

ظہر کے وقت ہم لوگ جہاز میں سوار ہوئے، جہاز چلا اور چند گھنٹوں کے بعد جہاز کا وہ حصّہ جس میں ہم تھے، نیل میں پانی کی کمی کے سبب ریت میں پھنس گیا جہاز کے کپتان اور ملاّحوں نے نکالنے کی بہت کوشش کی لیکن ناکام رہے، ہم نے پوری رات نیل میں کھڑے کھڑے الجھن اور اکتاہٹ میں گزاری لیکن کیا کر سکتے تھے۔

نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن

امدادی جہاز آیا اور ہمارے جہاز کو نکال کر اس بڑے جہاز سے جوڑ دیا جو اسے شلاّل لے جائے گا، خدا کے فضل سے ہمارا سفر شروع ہو گیا۔

ظہر بعد جہاز اپنے ملحق جہازوں کے ساتھ نیل کے ایک تنگنائے میں پھنس گیا یہ پہلے سے زیادہ مشکل اور تکلیف دہ تھا، باقی رات و دن ہم اپنی ہی جگہ پڑے رہے، اکتاہٹ و پریشانی انتہا کو پہنچ گئی تھی، ملاّحوں اور جہاز کے ذمہ داروں نے جہاز کو اس مصیبت سے نکالنے کے لئے اپنی تمام کوششیں صرف کر دیں مگر کامیاب نہ ہوئے اور ہمّت ہار گئے، ہم نے اپنا معاملہ خدا کے حوالے کر دیا اور صبح کا انتظار کرنے لگے۔

مسلم اور غیر مسلم کا فرق

ہم نے مسلمانوں اور غیر مسلموں میں بڑا فرق محسوس کیا، اکثر مسافر انگریز اور غیر

مسلم تھے، ہم نے ان میں سے کسی کو اللہ کی طرف متوجّہ اور دعا کرتے نہیں دیکھا، وہ لہو ولعب، چلنے پھرنے، کھانے پینے اور ناچ گانے میں مصروف تھے، رہے مسلمان تو ان میں سے کچھ لوگوں کو میں نے دیکھا کہ دعا کر رہے ہیں اور اللہ سے پناہ کے طالب ہیں جیسا کہ پہلے ہم نے سنا تھا کہ دوسرے مذاہب روحانی طور پر دیوالیہ ہو چکے ہیں، ان کے پیروؤں کا تعلق خدا سے ختم ہو چکا ہے یا بہت کمزور ہو چکا ہے، اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔

چہارشنبہ ۱۵/۹/۱۳۷۰ھ مطابق ۲۰/۶/۱۹۵۱ء

ظہر بعد تک ہم اپنی اس مصیبت میں پھنسے رہے، پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا اور دم گھٹنے لگا اور لوگ انتشار و اضطراب میں تھے کہ اچانک امدادی جہاز آ گیا اور چند کوششوں کے بعد ہمارے جہاز کو مع ملحقات کے نکال لیا، جہاز کے عیسائی مسافروں نے زوردار تالیوں سے اس کا استقبال کیا، بعض مسلمان مسافروں نے اللہ سے نذر مانی تھی کہ جب وہ اس مصیبت سے نکل جائیں گے تو دو رکعت نماز پڑھیں گے، چنانچہ انھوں نے اپنی نذریں پوری کیں، یہ قصّہ دن میں تین بجے پیش آیا، اللہ ہی کے لئے ساری تعریف ہے جس کی بزرگی اور بڑائی سے بھلے کام انجام پاتے ہیں، جہاز بڑی تیزی کے ساتھ چلا، لوگ کہتے تھے کہ خدا کے فضل سے صبح پہنچ جائے گا۔

پنجشنبہ ۱۶/۹/۱۳۷۰ھ مطابق ۲۱/۶/۱۹۵۱ء

شلال سے قاہرہ

جہاز چاشت کے وقت شلّال پہنچ گیا، شلّال کو دیکھ کر لوگ اس طرح خوش ہوئے جیسے اطراف شہر اور اپنے گاؤں کے قریبی حصّوں کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں، اور ہم لوگ خوش خوش ٹرین پر سوار ہو گئے، ٹرین میں رات اندھیرے میں گزاری، باوجودیکہ ہم سکنڈ کلاس میں تھے ہم نے ٹرین کے ذمہ داروں سے بار بار شکایت کی، مگر کسی نے ہماری مدد نہ کی، نہ ٹرین میں حسن انتظام اور نہ اسباب راحت کی موجودگی، نیز پانی اور روشنی کی زیادتی کے اعتبار سے اس

گاڑی کی طرح تھی جس پر ہم قاہرہ سے آئے تھے ہم نے ڈائننگ کار میں رات کا کھانا کھایا۔

جمعہ ۱۷/۹/۱۳۷۰ھ مطابق ۲۲/۶/۱۹۵۱ء

مصر کی طرف لوٹنے کی خوشی

ہم نے اشتیاق بھرے دلوں اور شوق کی نگاہوں سے مصر کا اس طرح استقبال کیا جیسے ہم اپنے محبوب وطن کا استقبال کر رہے ہوں، اس کی وجہ یہ تھی کہ یہاں ہمارے احباب موجود تھے ہم یہاں رہ چکے تھے، ایک سبب یہ بھی تھا کہ سفر کی منزلوں میں سے ایک ایسی منزل ختم ہوئی تھی جو شاید سب سے زیادہ مشکل و دشوار تھی، اسٹیشن سے ہم لوگ ازہر کی طرف روانہ ہوئے جہاں اپنے دوست شیخ عبداللہ کابلی کی قیام گاہ، افغانی دارالاقامہ میں ٹھہرے لیکن وہ سفر پر جانے والے تھے تاہم وہیں قیام رہا، ہم نے سفر کا گرد و غبار جھاڑا، یہاں معلوم ہوا کہ عزیزان مولوی معین اللہ صاحب اور مولوی عبدالرشید صاحب چند دنوں پہلے حجاز جا چکے ہیں۔

عجیب احساس

اشتیاق تازہ ہو گیا، اب اس شہر میں جس میں ہم نے کئی مہینے گزارے تھے، تنہائی واجنبیت محسوس ہوئی، بقول شاعر

كأن لم يكن بين الحجون إلى الصفا
أنيس و لم يسمر بمكة سامر

(جیسے حجون اور صفا کے درمیان (شہر مکہ کے دونوں رُخ کے آخری محلّہ) کوئی دوست وہمراز ہی نہیں رہا نہ مکّہ میں رات کی کوئی محفل جمی) ازہر کی طرف نگاہ پھیرتا ہوں تو وہ نمازیوں سے بھرا نظر آتا ہے مگر کوئی شناسا نہیں دکھائی دیتا بس ایک محمد امین ترکی سے ملاقات ہوئی وہ بڑی گرم جوشی سے ملے اور بہت خوش ہوئے، ازہر سے ہم نے برادرم احمد عبدالنبی اور شیخ ریاض الدین فاروقی سے ملنے کے لئے عبدالنبی صاحب کے گھر کا رُخ کیا، وہ دونوں حضرات اتفاقاً

ہم کوسکہ جدید میں مل گئے، ان دونوں کے ساتھ الحاج عبدالنبی کے گھر گئے اور ایک گھنٹہ بیٹھے، احمد عبدالنبی صاحب نے آج ہم کو افطار پر بلایا ہم نے ان سے اس کا وعدہ کرلیا، یہاں سے ہم لوگ بھائی یٰسین الشریف سے ملنے کے لئے شامیوں کے دارالاقامہ گئے، پہنچے تو معلوم ہوا کہ وہ اپنے گاؤں چلے گئے ہیں، تھوڑی دیر سوریہ کے احباب میں بیٹھے پھر اپنی قیام گاہ واپس آگئے، تھوڑا سا آرام کیا پھر عتبہ گئے جہاں برلمان ہوٹل میں الحاج اسحٰق دہلوی سے ملے، معلوم ہوا کہ الحاج اسماعیل دہلوی مکہ معظّمہ جاچکے ہیں اس کے بعد الحاج عبدالنبی کے پاس لوٹے اور ان ہی کے یہاں ہندوستانی طرز کی افطاری کی اور ہندوستانی کھانا کھایا، یہاں سے فارغ ہوکر ہم اپنے محترم دوست شیخ احمد الشرباصی کے گھر عطفه السادات الحلمية الجديدة گئے، ہمیں اندیشہ تھا کہ وہ بھی نہ ملیں گے، لیکن وہ مل گئے، تھوڑی دیر ان کے پاس بیٹھے، پھر ان کے ساتھ نکلے۔

شبان المسلمین کے مرکز عام میں

شارع ازہر سے نکلتے ہوئے ہم لوگ برادر عزیز اور صدیق وفی عبداللہ العقیل سے ملے اور ان کے ساتھ جمعیۃ الشبان المسلمین کے مرکز عام گئے، وہاں اچانک ہم کو غزوۂ بدر کی یادگار میں ہونے والے ایک ڈرامہ سے سابقہ پڑا، یہاں ہم لوگ محمد صالح حرب باشا، مفتی امین الحسینی، شیخ محمد صبری عابدین اور شیخ سیّد مبشر الطرازی سے ملے ان کو ہمارے مصر میں موجود ہونے پر تعجب ہوا، ہم نے ان کو اپنے سفر سوڈان کی واپسی کی اطلاع دی تو انھوں نے بعافیت واپسی کی مبارکباد دی، ڈرامہ میں شرکت کئے بغیر ہم لوگ جمعیۃ سے واپس آگئے۔

شنبہ ۱۸/۹/۱۳۷۰ھ مطابق ۲۳/۶/۱۹۵۱ء

ہم لوگ الحاج جلال حسین کے دفتر گئے اور ہماری عدم موجودگی میں جو خطوط جمع تھے ان کا حاصل کیا، مجھے اس ڈاک کا شدید اشتیاق تھا، گھر والوں اور ہندوستانی احباب کے حالات عرصہ سے نہ معلوم ہوسکے تھے، اس ڈاک میں مخدومہ معظّمہ والدہ صاحبہ کا خط ملا (اللہ ان کی عمر دراز کرے)(۱) گھر والوں، بہنوں اور میرے بڑے بھائی ڈاکٹر سیّد عبدالعلی

(۱) وفات ۱۳۸۸ھ۔۱۹۶۸ء

صاحب کے خطوط بھی تھے میں نے نذر مانی تھی کہ جب ان لوگوں کے صحت وعافیت کی خوشخبری کا خط ملے گا تو چار رکعت نماز پڑھوں گا، میں نے اپنی نذر پوری کی، تمام تعریفیں اس ذات کے لئے زیبا ہیں جس کی بزرگی وبڑائی سے اچھے کام پورے ہوتے ہیں ہم لوگ فارن آفس گئے جہاں قاہرہ میں اپنی آمد کا اندراج کرایا، پھر سوریہ کے قنصل خانہ گئے اور ویزا میں توسیع کی درخواست کی اور اپنی قیام گاہ واپس آگئے اور آرام کیا۔

ازہر کے دفتر میں

اس کے بعد ہم لوگ ازہر کے دفتر گئے جہاں شیخ احمد الشرباصی اور ڈاکٹر محمد یوسف موسیٰ سے ملے اور ان سے ان کی دعوت کے قبول کرنے کا امکان نہ ہونے کی معذرت کی اور ان کو ماذا خسر العالم کا تصحیح شدہ نسخہ دیا پھر شیخ محمود شلتوت کے دفتر گئے اور ان سے ملے ہم نے ان سے ان یادداشتوں کا ذکر کیا جو میں نے انھیں پیش کی تھیں، انھوں نے افطار اور رات میں کھانے کی دعوت دی لیکن ہم نے معذرت کردی۔

بلاد اسلامیہ کے طلبہ افطار کی دعوت پر

برادر محترم شیخ لقمان ندوی کی افطار کی دعوت میں ہم لوگ ہندوستانی دار الاقامہ گئے وہاں بلاد اسلامیہ کے طلباء کی ایک بڑی تعداد نظر آئی ہمیں معلوم ہوا کہ وہ وزارت شئون اجتماعیۃ کے مہمان کی حیثیت سے روز یہاں افطار کرتے ہیں، بڑا خوب منظر اور اسلامی اتحاد واخوت کا ایک اچھا مظہر تھا مختلف ملکوں اور مختلف رنگ ونسل کے طلبہ پہلو بہ پہلو بیٹھے ہوئے تھے لیکن ہمیں نظر آیا کہ خشوع وسکینت کی فضا نہیں ہے حاضرین روزے کی عظمت رمضان کے احترام، افطار کی گھڑیوں کے قریب ہونے کے فضائل کو نہیں محسوس کررہے تھے، نہ ذکر میں مشغول تھے، نہ سکون ووقار کے ساتھ تھے، بلکہ اس کے برعکس وہاں شور وشغب تھا، اس بات سے اگر کسی چیز کا پتہ چلتا ہے تو وہ ہے طلبہ کے دلوں میں دین کے احترام اور مذہبی جذبہ کی کمی،

شیخ بہی الخولی کی عنایات

عشاء بعد برادرم عبداللہ العقیل اور احمد العسال آئے تا کہ ہمارے ساتھ شیخ بہی الخولی کے نئے مکان مطریّہ جائیں، ہم لوگ بس پر سوار ہوئے، پھر ٹرین پر بیٹھے، اسٹیشن پر اترے اور بہی الخولی صاحب کے مکان پہنچ گئے، انھوں نے عبداللہ العقیل کو ہدایت کی تھی کہ جب میں سوڈان سے واپس آؤں تو وہ انھیں میری واپسی کی اطلاع کریں تا کہ وہ خود تشریف لا کر ملاقات کریں، انھیں اس کا افسوس تھا کہ جب بھی ہم ان کے مکان پر گئے وہ موجود نہ تھے، ان کی اس ہدایت کے باوجود میرے دل میں ان کی جو قدر و منزلت ہے اس کی بناء پر میں نے یہ مناسب سمجھا کہ میں خود جا کر اُن سے ملوں، انھیں جب معلوم ہوا کہ ہم دروازے پر کھڑے ہیں تو اپنی گونجتی ہوئی آواز اور شوق و بشاشت کے ساتھ خوش آمدید کہتے ہوئے نکلے اور بڑی گرمجوشی کے ساتھ معانقہ کیا اور اپنے دونوں، ساتھیوں، جناب امین الدویدار، اور دوسرے مطریّہ کے نائب اسٹیشن ماسٹر سے ہمارا تعارف کرایا، پھر ہم باتوں میں لگ گئے، اور میں نے محسوس کیا کہ قاہرہ پہنچ کر جان پہچان والوں اور دوستوں میں پہلی سی عنایات نہ پا کر دل میں جو تکلیف محسوس کر رہا تھا وہ دھیرے دھیرے دور ہو رہی ہے اور شیخ بہی الخولی کی حرارت قلبی اور محبت کے اثر سے میرے دل میں قوت و حرارت پیدا ہو رہی ہے اور میں نشاط و تازگی محسوس کرنے لگا، مصر پہونچ کر دل میں جو مسافرت کی تنہائی کا احساس پیدا ہوا تھا وہ دور ہو گیا، دویدار صاحب کو جب معلوم ہوا کہ " قصص النبیین للاطفال " کے سلسلہ کا مصنّف میں ہوں جس کو وہ پڑھ چکے تھے، انھوں نے ان قصّوں کے اسلوب اور طرز پر اظہار پسندیدگی فرمایا اور اس ملاقات سے بہت خوش ہوئے، قصص النبیین کی تعریف اور اس کی خوبی کا اعتراف میری بڑی ہمت افزائی تھی اس لئے کہ ان کو اس موضوع پر خصوصی مہارت حاصِل ہے، انھوں نے بھی بچّوں کے لئے قصّے لکھے ہیں اور وہ عوامی تعلیم و تربیت کے شعبہ میں کام کرتے ہیں، انھوں نے خواہش ظاہر کی کہ ہم ان کے گھر چلیں اور کچھ دیر ان کے پاس بیٹھیں، ہم سب لوگ ٹہلتے ہوئے نکلے، بہی الخولی اپنے دلچسپ

لطائف اور چٹکلوں سے ہم کو محظوظ کرتے رہے، یہاں تک کہ ہم ایک وسیع اور سلیقہ کے گھر میں داخل ہو گئے، تھوڑی دیر بیٹھے مٹھائی اور ٹھنڈے مشروبات سے لطف اندوز ہوئے، امین صاحب نے اپنے قصّوں کا ایک مجموعہ ہمیں ہدیہ کیا اور سب حضرات ہمیں رخصت کرنے کے لئے مطریّہ کے اسٹیشن چلے امین صاحب نے بڑھ کر سکنڈ کلاس کا ٹکٹ لیا اور آدھی رات کو ہم واپس ہوئے۔

یکشنبہ ۱۹/۹/۱۳۷۰ھ مطابق ۲۴/۶/۱۹۵۱ء

ہندوستانی سفیر سے ملاقات کی ناکام کوشش

ہم احمد عبدالنبی کے گھر پر ان سے اور فاروقی صاحب سے ملے، وہیں ابوالنصر حسینی سے بھی ملاقات ہوگئی، فاروقی صاحب نے اگلے دن ہندوستانی سفیر سے ملاقات کا وقت طے کرلیا، وہاں سے ہم لوگ مصری ہوائی اڈے میدان ابراہیم باشا گئے اور دوشنبہ کی صبح کو دمشق کے لئے پرواز کرنے والے جہاز میں دو سیٹیں رزرو کرائیں، راستہ میں ہم ''العتبۃ'' میں واقع مکتبہ محفوظ سے گذرے معلوم ہوا کہ ''إلی الإسلام من جدید'' کی طباعت ابھی تک مکمل نہیں ہوئی، محفوظ صاحب نے وعدہ کیا کہ وہ فضائی ڈاک سے کتاب کے پچاس نسخے دمشق بھیج دیں گے، یہاں سے ہم مکتبہ وہبہ حسن وہبہ شارع ابراہیم گئے، اور وہاں سے ''شاعر الاسلام محمد اقبال'' کے بیس نسخے خریدے، تاکہ شام وترک کے دوستوں کو ہدیہ پیش کرسکیں، اس کے بعد ''دارالکتاب العربی'' گئے اور الحاج حلمی منیاوی صاحب سے ملاقات کی اور ان سے رخصت ہوئے، پھر الحاج احمد عبدالنبی اور جناب فاروقی صاحب سے ملنے اور رخصت ہونے، نیز فاروقی صاحب سے معذرت کرنے گئے کہ اب سفیر صاحب سے ہم ملاقات نہ کرسکیں گے، مگر وہ ملے نہیں ہم معذرت کا ایک پرچہ لکھ کر واپس آگئے۔

اخوانی محبین کے ساتھ

بھائی یٰسین الشریف آئے اور ان کے ساتھ ہم لوگ بھائی عبداللہ العقیل کے گھر گئے جہاں اخوانی نوجوانوں کے ساتھ افطار وکھانا ہوا، اور اس کے بعد ہم لوگ شارع صبری کی طرف

مرکز عمومی کے لئے روانہ ہوگئے، شیخ سید سابق کے پیچھے تراویح کی نماز پڑھی اور شیخ سابق واحباب کے مطالبہ پر میں نے تقریر کی اور استاذ عبدالعزیز کامل سے ملے، ان سے ملے عرصہ ہو چکا تھا، ملاقات کا اشتیاق تھا، ہم لوگ ایک گھنٹے تک بیٹھے باتیں کرتے رہے، استاذ صالح عشماوی اور ان کے بھائی ڈاکٹر خلیل عشماوی سے ملے، بھائی عبدالنافع سباعی (۱) نے اپنے دمشقی احباب کے نام تعارف ومشورہ کے خطوط دیئے، سیّد محمد بک غزنوی کی موٹر پر ہم لوگ سیّد سابق کے ساتھ واپس ہوئے، اس کا افسوس رہا کہ باقی احباب سے ملاقات نہ ہوسکی اس لئے کہ ان میں سے اکثر بدر کبریٰ اور غزوہ خندق کے جلسوں میں شرکت کے لئے شہروں کو چلے گئے تھے، مثلاً استاذ عبدالحکیم عابدین (۲)، استاذ سعید رمضان، استاذ فرید عبدالخالق، استاذ محمد الغزالی، تو رمضان سے پہلے ہی سفر کر چکے تھے، مجھے اس کا افسوس ہو رہا تھا کہ ہمارا سفر دمشق جیسا کہ طے ہو چکا ہے ہوائی جہاز سے ہوگا اور اسکندریہ نہ دیکھ سکوں گا، اس سے قبل ہم نے بیروت کا سفر اسکندریہ کے راستے سے بذریعہ جہاز طے کیا تھا، مگر اس کے بعد ہم نے رمضان میں آرام اور وقت بچانے کے خیال سے ہوائی سفر کو ترجیح دی۔

اسکندریہ

اسکندریہ جانا مختلف وجوہ کی بنا پر اہم ہے بعض بڑے اخوانی بھائیوں نے ہم کو اسکندریہ آنے کی دعوت دی تھی اور ہم نے جناب عبدالحکیم عابدین کے ساتھ اسکندریہ جانا طے کر لیا تھا لیکن سفر ٹلتا رہا حتیٰ کہ اس کا وقت نکل گیا ہوسکتا ہے کہ مصر کے دوسرے پایۂ تخت کی سیر دوسرے سفر میں مقدّر ہو۔

---

(۱) پرجوش شامی نوجوان تھے جو مصر میں اس زمانہ میں مقیم اور تحریک اخوان المسلمین سے متعلق تھے، انہوں نے ایک دار الاشاعت کی داغ بیل ڈالی تھی جو مفید لٹریچر شائع کرنے والا تھا، عرب ویہود کی جنگ میں انہوں نے جام شہادت نوش کیا۔

(۲) وہ شیخ حسن البناء مرحوم کے بہنوئی تھے، جمال عبدالناصر کے عہد میں ان کو مصر چھوڑنا پڑا، بیروت میں رہ کر انہوں نے وکالت شروع کی، ان کے پاس تمام عرب ممالک میں وکالت کا لائسنس تھا، ان کا مکان راقم سطور کی بیروت میں مستقل فرودگاہ تھی ۷۶ء میں قاہرہ واپس آکر ان کا انتقال ہوا رحمہ اللہ

مصر کو الوداع

تقریباً نصف سال رہنے کے بعد اب ہم مصر چھوڑ رہے ہیں جو ہمیں بہت عزیز ہے ، یہاں قیام بڑا پر لطف رہا، لہٰذا جدائی بہت شاق ہوئی ہم جب مصر آئے تو مہینہ دو مہینہ سے زیادہ ٹھہرنے کا اندازہ نہ تھا مگر ہوا یہ کہ ہم مدّت قیام کو بڑھاتے اور سفر میں تساہل اور لیت و لعل کرتے رہے، یہاں تک کہ قیام پانچ ماہ سے بڑھ گیا اگر مصر آنے کے وقت ہم سے کہا جاتا کہ ہم کو مصر میں تقریباً چھ ماہ رہنا ہے تو ہمیں یہ گوارہ نہ ہوتا اور ہم بڑے شد و مد سے انکار کرتے ، ہمارے سامنے شرق اوسط کا طویل سفر تھا، اگر ہم صحیح طرح حساب لگاتے تو مصر کے لئے صرف چند ہفتے نکل سکتے تھے مگر ہم اپنے ارادے میں مغلوب ہو گئے اور مصر کے بارے میں زیادہ قانون نہیں برتا بس چلنے دیا یہاں کے قیام کو میں نے فیتے سے نہیں ناپا، محبوب کا یہی معاملہ ہے وہ اپنے حصہ سے زیادہ لے لیتا ہے دنیا کی ہر چیز ریاضی کے اصولوں کی تابع نہیں، یہ اچھا ہی ہے کہ ایسا نہیں ہے اگر زندگی پر ریاضی کی دسترس ہوتی تو زندگی انسان پر تنگ ہو جاتی ، وہ اس سے بددل ہو جاتے اور زندگی بے جان مشین بن کر رہ جاتی ، اس میں نہ کوئی جدت ہوتی نہ ندرت نہ دلچسپی اور تسکین قلب کا سامان لیکن ایسا بہت ہوتا ہے کہ جذبۂ دل عقل و خرد کے تقاضوں سے باغی اور جذبات و خواہشات ، ضابطہ و قانون اور مقررہ نظام سے منحرف ہو جاتے ہیں اور یہ دونوں چیزیں مل کر دنیا میں زندگی و نشاط پیدا کرتی ہیں۔

مصر اپنے قدرتی حسن ، جمال اور ترقی یافتہ شہرت و تمدن کے باوجود ہمیں اس سفر کے بندھے ہوئے نظام سے ہٹا نہیں سکتا تھا، نہ ہمارے دلوں میں کشش پیدا کر کے اپنے حق سے زیادہ ہم سے وصول کر سکتا تھا اس لئے کہ ہم ایسے ملک میں پلے بڑھے جس میں ہمیشہ سے دلفریب قدرتی مناظر ، سحر انگیز جمال بہت زیادہ شادابی اور ترقی یافتہ تمدن ہے جس چیز نے ہم کو ہمارے بنے بنائے نظام سے بہلا لیا اور ہم طویل قیام سے نہ بچ سکے وہ ایسے مخلص احباب کی موجودگی تھی جن کے دل ہمارے دل سے اور روحیں ہماری روح سے

مل گئی تھیں گویا کہ ان کی ملاقات اور ملنے کا وقت مقرر تھا، ایسے احباب کی موجودگی جنھوں نے اپنے لطف ومحبت سے ہمارے دل میں گھر کرلیا اور سفر کی پریشانی اور پردیس کی وحشت کو بھلا دیا بلکہ پردیس کے احساس تک کو ختم کردیا، ایسے دلوں کا وجود تھا جو پھولوں کی طرح کھلے ہوئے آنکھوں کی طرح امنڈے ہوئے اور آگ کی چنگاری کی طرح ایمان سے بھڑک رہے تھے، انھوں نے ہم سے محبت کی، وہ ہمارے اور ہم ان کے دلدادہ ہوگئے، ایسے جوانوں کی موجودگی تھی جو اپنے رب پر ایمان لے آئے اور اللہ نے ان کی ہدایت میں اضافہ کیا، بس فرق یہ تھا کہ وہ غار سے نکلے اور شر کو چیلنج کیا، باطل کے مقابلہ میں آئے اور اس سے لڑے، مصر میں مضبوط دینی تحریک کا وجود قومی علمی سرگرمی اور تیزی کے ساتھ نشر واشاعت کا کام جو مصر کو عالم عربی کا مرکز بنائے اس کے لئے امامت وپیشوائی علمی، عقلی رہنمائی کی اہلیت کا ثبوت دے، انھیں چیزوں کے وجود نے سرزمین مصر میں ہم کو عرصہ تک رہنے پر مجبور کردیا اور ہم نے جو نظام بنایا تھا اس کو ترک کرنے کو ہمارے لئے آسان وبہتر بنادیا، اسی چیز نے ہمارے سفر میں مصر کے حصّہ کو بڑھایا۔

سفر کے بعد کتنے ہی لوگوں نے پوچھا کہ آپ کو مصر میں کیا پسند آیا اور کیا پسند نہیں آیا۔ بلاشبہ سوال بڑا نازک تھا لیکن اہم اور مفید تھا، لہذا اس مشکل کا سامنا ضروری اور جواب دینا امر لابدی تھا، بہرکیف مصر میں جو بات ہمیں پسند آئی وہ وہاں کا نشاط اور زندگی، علمی ادبی ماحول، نشر واشاعت کی سہولت اور فراوانی اور اس کی سرعت تھی، عربی زبان کی طرف اس کی توجہ اس کا اپنانا اور اس بارے میں غیور ہونا، اس کے لئے کدوکاوش کرنا، عربی اور اسلامی مسائل میں وسیع النظر ہونا اور اس پر توجہ دینا دوسرے عرب ممالک کے مقابلہ میں یہاں ذہانت وبیداری کا پایا جانا ہے۔

اہل مصر کا حسن اخلاق، کشادہ دلی، صاف دلی، مسلمان مہمان کے ساتھ حسن سلوک، اس کا اعزاز، اس کی ہمّت افزائی، اس کی صلاحیتوں کا اعتراف، ایمان وروحانیت کی قوت، بشاشت، تنگدلی کے عیب کا نہ پایا جانا، جلد مانوس ہونے اور اور دوستی کرنے کی

صلاحیت، علم سے شغف اور اس کے لئے جدوجہد، مطالعہ کی طرف توجہ اور کتابوں کے جمع کرنے کا شوق، یہ ایسی خصوصیات تھیں جو مجھے بہت پسند آئیں۔

مصر کی جو بات مجھے پسند نہیں آئی اور ناگوار ہوئی اور میں اس کو تنقید کی نظر سے دیکھتا ہوں اسے اپنے اس دل سے جس نے مصر و مصریوں سے محبت کی، معذرت کے ساتھ بے تکلف عرض کرتا ہوں، وہ ہے معاشرہ میں گھٹیا تفریح و دلچسپی کا سامان اور بڑی تعداد میں ایسے بااثر طبقہ کا وجود جو فحش ادب کی تجارت کرتا ہے، عزّت و اخلاق کا سودا کر کے زندگی گزارتا ہے اور اسلامی مصر میں پوری عزّت و آزادی کا مالک ہے۔

اسی طرح بہت سی انجمنوں اور تحریکات کی بھرمار بھی پسند نہ آئی جو مصر کے چپہ چپہ پر قائم ہیں، جن میں بہت سی ایسی ہیں جن کا کوئی خاص پیغام و امتیازی دعوت نہیں ان میں سے بعض انجمنوں اور اس کے چلانے والوں کے ذاتی جرح و تعدیل جزئی اختلافات ایک دوسرے سے لڑنے اور اس کی وجہ سے دینی اخلاقی حدود سے تجاوز کر جانے کو بھی میں نے ناپسند کیا۔

میں نے مصر میں ایک ایسا پڑھا لکھا طبقہ پایا جس کے ہاتھوں میں ملک کی باگ ڈور ہے اور وہ تعلیم و صحافت اور ادب کے میدان میں چھایا ہوا ہے، اس طبقہ کا ضمیر فاسد ہو چکا ہے، اس کی ذہنیت مسخ ہو چکی ہے، اسلام اس کے حلق نیچے نہیں اترتا اور وہ یہ نہیں مانتا کہ اسلام کا کوئی مستقبل ہے، نہ اس کا اسلام سے مخلصانہ تعلق ہے، یہ وہی طبقہ ہے جس کو ہم نے ہندوپاک، ترکی و ایران، شام و عراق میں بھی پایا، یہ دراصل سابقہ تربیت اور اس تعلیم کی پیداوار ہے جس کو مغربی سامراجیوں نے بہت خوبی سے وضع کیا تھا اور بڑی ہوشیاری کے ساتھ اس کو اسلامی روح اور دینی تربیت سے خالی بنایا تھا، یہ طبقے اپنے عقیدہ اور عقلیت میں ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں اس لئے کہ ان سب کی تعلیم و تربیت کا سرچشمہ ایک ہی ہے، میں نے مصریوں کے معیار زندگی اور سامان معیشت اور امیری غریبی میں بہت زیادہ فرق کو ناپسند کیا، فرق ہونے میں تو کوئی حرج نہیں لیکن فقراء کی ایک بہت بڑی ایسی تعداد کا

ہونا جو نان شبینہ کے محتاج ہیں جن کے پاس جسم ڈھکنے کا کپڑا تک نہیں اور دوسری طرف ایسے ایسے لوگ ہیں جو مال کی فراوانی اور کھانے پینے میں تخمہ کا شکار ہیں اور انھیں ان غرباء کی زندگی پر ترس نہیں آتا، ان کی حد سے بڑھی ہوئی غربت اور جان لیوا بھوک پر تسلی کا ایک لفظ بھی کہنا مشکل ہے، وہ بچا کھچا بھی ان پر خرچ کرنے کے روادار نہیں، یہ ایسا فرق وامتیاز ہے جس کو نہ کوئی دین مانتا ہے اور نہ کوئی انصاف اسے قبول کرسکتا ہے، یہ زندگی کا ایسا ناقابل قبول ڈھانچہ ہے جو کسی بقاء ودوام کی صلاحیت نہیں رکھتا، یہ سبھی یا کچھ چیزیں بلاشبہ سابق پسماندہ دور، اور یورپین سامراجیوں کی دین ہیں۔

صحیح دینی اصلاحی تحریکیں اور اسلامی بیداری ہی سے امید کی جاسکتی ہے کہ ان کمزور پہلوؤں اور اجتماعی بیماریوں کا مداوا کریں، اس میں شک نہیں کہ مصر دینی، اصلاحی تحریکوں سے بھرا ہوا ہے اور عرب واسلام کے لئے نیا دور لانے کی تیاری میں ہے۔

خدا مصر کو اور اہل مصر کو سلامت رکھے، مصر اور مصریوں کو اس مسافر وسیّاح کا سلام، جس کو اس اسلامی ملک میں وہ محبت ونوازش، ضیافت واکرام اور وہ سب کچھ نصیب ہوا جس کی ایک مسلمان امید کرتا ہے۔

ملک شام میں

دوشنبہ ۲۰/۹/۱۳۷۰ھ مطابق ۲۵/۶/۱۹۵۱ء

ایک براعظم سے دوسرے براعظم تک

فجر کے بعد ہم لوگ مصر "ایرلائن" کے دفتر کے لئے میدان ابراہیم باشا کو روانہ ہوئے میرے ساتھ سیّد یٰسین الشریف تھے، قانونی کاروائیاں طے ہوئیں، عبداللہ العقیل اور محمد دمرداشی اور احمد عسال رخصت کرنے کے لئے آئے میں نے ان کی ہمّت واخلاص کی داد دی کہ وہ سونے کے وقت میں رخصت کرنے آئے، ہوائی اڈہ کے لئے ایرلائن کی بس پر سوار ہوا، صبح ۷ر بجے ہم کو لے کر جہاز نے دمشق کی طرف پرواز کی، میرے رفیق سفر مولانا عبیداللہ صاحب بلیاوی تھے، دو گھنٹے کے اندر ہم ہوا کے دوش پر برّ اعظم افریقہ سے برّ اعظم ایشیا پہنچ گئے اور سوریہ کے حدود میں داخل ہوگئے اور پندرہ منٹ کے اندر اندر ہم دمشق کے مزّہ ہوائی اڈے پر تھے، اس طرح یہ طویل سفر تھکن اور طوالت کا احساس کئے بغیر ختم ہوگیا، پاک ہے خدا کی ذات جس نے انسان کو وہ سکھلایا جو وہ جانتا نہیں تھا۔

دمشق میں

میں نے بھائی عبدالنافع سے صاف ستھرے اوسط درجے کے ہوٹلوں کے بارے میں پوچھا تھا، انھوں نے ہم کو مرجہ کے ہوٹل قصر الاندلس میں ٹھہرنے کا مشورہ دیا یہ مناسب انتخاب تھا ہم ایک گھنٹہ سے زیادہ ایرلائن کی بس کا انتظار کرتے رہے جو ہم کو شہر میں واقع ایر کمپنی کے آفس

منتقل کرے گی، ''بس'' اتنالیٹ ہوئی کہ افریقہ سے ایشیا پہونچنے میں جو وقت لگا تھا اس سے کچھ ہی کم وقت دمشق سے دمشق پہونچنے میں لگ گیا، بہر کیف ہم لوگ ہوٹل قصر الاندلس پہونچے اور ایک کمرہ لے لیا، تھوڑی دیر آرام کر کے ظہر کی نماز پڑھی۔

دمشق کا موسم بڑا خوشگوار تھا جو ہمارے ملک کی معتدل آب وہوا سے مشابہ تھا نہ ہم گرمی محسوس کر رہے تھے نہ دھوپ کی تیزی، شہر شائستہ و پرسکون تھا، قاہرہ کے شور وشغب کے مقابلہ میں ہم بڑا آرام وسکون محسوس کر رہے تھے۔

جامع شیخ محی الدین میں

ہم نے چاہا کہ سب سے پہلے شیخ احمد کفتارو(۱) سے ملیں لہٰذا ہوٹل والوں سے حی الاکراد کا راستہ پوچھا، ان لوگوں نے بتایا کہ آپ شیخ محی الدین ٹرام میں سوار ہوں، شیخ کی زیارت کریں اور وہاں شیخ احمد کفتارو کو پوچھ لیں، ان کی اس بات سے اس کے سوا میرے ذہن میں کچھ نہ آیا کہ شیخ یہاں کے مشہور لوگوں میں ہیں، تھوڑی دیر بعد اچانک ہمارا ذہن شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کی طرف منتقل ہوا اور مجھے یاد پڑا کہ وہ دمشق میں مدفون ہیں حیرت ہوئی کہ میرا ذہن اس وقت کہاں چلا گیا تھا شیخ کے نام سے جو محلّہ منسوب ہے میں اس میں اترا اور ان کی مسجد کی طرف چلا، مسجد بڑی خوبصورت اور نمازیوں سے آباد نظر آئی، لوگوں کو نماز کے انتظار میں، ذکر میں مشغول پایا، کچھ لوگ تلاوت کر رہے تھے، یہ عصر کی اذان سے پہلے کا وقت تھا، میں نے دین کی حفاظت و پابندی اور اس ملک میں دین کے رہے سہے سرمایہ کی حفاظت میں سوریہ کو ممتاز پایا، یہ مسجد بھی دوسری بہت سی مساجد کی طرح مزار پر بنی ہے اور اس میں کچھ نیک لوگ مدفون ہیں، میں نے دیوار پر ایک تختی دیکھی جس میں (یا شیخ محی الدین) لکھا ہوا تھا، یہ بات اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی کھلی ہوئی مخالفت تھی کہ ''وأن المساجد للّٰہ فلا تدعوا مع اللّٰہ احدًا'' مسجدیں اللہ کے لئے ہیں خدا کے ساتھ کسی اور کو نہ پکارو۔

عصر کی نماز کے بعد ہم نے شیخ محی الدین ابن عربیؒ کے مزار کی زیارت کی جو عام

طور پر (شیخ اکبر کے نام سے معروف ہیں) دیوار پر یہ شعر لکھا ہوا تھا۔

افلت شموس الاولین و شمسنا

ابدا علی افق العلا لا تغرب

(پہلے لوگوں کا سورج غروب ہوگیا۔ ہمارا سورج افق کی بلندی پر ہمیشہ دمکتا رہے گا، غروب نہ ہوگا) یہ بات بھی حیرت ناک طور پر ناپسندیدہ تھی۔

جامع اموی میں

ہم لوگوں نے شیخ احمد کفتارو کے گھر پر آواز دی اور ان کو پوچھا، بتایا گیا کہ وہ جامع اموی میں ہیں، وہاں ان کا درس ہے اس حسن اتفاق سے میں خوش ہوا، خدا کو یہی منظور تھا کہ اس عظیم الشان اسلامی یادگار کی زیارت میں تاخیر نہ ہو جس کے بارے میں ہم اس وقت سے پڑھتے رہے جب سے تاریخ کا مطالعہ شروع کیا، چنانچہ ہم بازار احمدیہ(۱) کی طرف روانہ ہوئے اور مسقّف بازاروں سے گزرتے ہوئے اس عظیم الشان مسجد تک پہنچ گئے ہماری نگاہیں جلد ہی اس شاندار عمارت پر پڑیں، ہم اس کے صدر دروازے سے داخل ہوئے اور اس کے وسیع صحن سے گزر کر مسجد کے اندر پہنچ گئے، یہاں ہمیں آدمیوں کی بہت بڑی تعداد نظر آئی، کوئی نماز پڑھ رہا تھا، کوئی تسبیح میں مشغول تھا، کوئی درس وتدریس میں، کچھ لوگ باتوں میں لگے تھے، ہماری نگاہوں میں عہد اوّل کے بڑے شہروں کا نقشہ پھر گیا، تدبیر الٰہی تھی کہ ہم مسجد میں گزر رہے تھے اور بے سان وگمان محمد توفیق الکنجی سے ملاقات ہوگئی جنھوں نے ازہر میں رواقِ ہنود کے پہلے جلسہ میں میرا خیر مقدم کیا تھا اور شکریہ کے کلمات کہے تھے، انھوں نے بڑے جوش ومسرت سے خوش آمدید کہا، رات میں ہوٹل آنے کا وعدہ کیا۔

شیخ احمد کفتارو کے درس میں

ہم لوگ سیکڑوں لوگوں پر مشتمل ایک بہت بڑے حلقہ کی طرف چلے، جہاں لاؤڈ اسپیکر

شیخ احمد کفتارو کی آواز کو دور تک پہونچا رہا تھا، ہم لوگ بیٹھ کر غور سے سننے لگے کچھ دیر میں شیخ کی نظر ہم پر پڑی، انھوں نے دور سے دیکھ کر ہمیں پہچان لیا اور ہم کو اپنے قریب بلا لیا، ان کے اس سرعت ادراک سے ہم کو تعجب ہوا، اس لئے کہ حج کے بعد پھر ہماری ان کی ملاقات نہیں ہوئی تھی اور نہ ان کو ہمارے دمشق روانہ ہونے کا علم تھا، تقریباً دو گھنٹہ تک درس جاری رہا، سورہ بروج کا درس تھا مگر وہ ایک ایسا عام دینی درس تھا جو زندگی کے تمام گوشوں پر حاوی تھا، شیخ کا آیات کو زندگی سے تطبیق دینے اور علمی معانی اور کلیات پر اقتصار کئے بغیر واقعات، اور موجودہ حالات پر منطبق کرنے اور عام فہم معیار پر ان کے اتر آنے اور حاضرین کی مقامی عام زبان میں بات کرنے کا انداز بڑا بھلا معلوم ہوا، انھوں نے ملکوں میں غیر دینی تعلیم اور نوجوانوں کے دین سے مطلق بیگانگی میں تربیت پانے اور اس سے غفلت برتنے پر تنقید کی، المیہ فلسطین اور مسلمانوں کے اندیشہ وخوف کی اس ذہنیت کو پیش کیا کہ وہ برابر خاموشی و بزدلی میں مبتلا رہے ہیں۔ انھوں نے کہا:

''خدا نہ کرے کہ دمشق وسوریہ پر یہودی غالب آجائیں اور اس منبر پر ان کا کوئی ''حاخام'' آکے بیٹھے، اس بات سے خوشی ہوئی کہ درس میں نوجوانوں اور مدارس کے طلبہ کا تناسب اچھا خاصا تھا، درس ختم ہونے کے بعد مصافحہ وملاقات ہوئی، شیخ نے فرمایا کہ آپ قاہرہ میں بہت دن رکے، میں نے کہا کیا آپ کو میرے مصر میں ہونے کا علم تھا؟ فرمایا ہاں ہمیں معلوم تھا، شیخ چلے تو دائیں بائیں ہم لوگ اور دونوں طرف سے رخصت کرنے والوں کا ہجوم تھا، یہ ایسا منظر تھا جو عہد ماضی کے علماء کی عزت وتکریم اور فریفتگی کی یاد تازہ کر رہا تھا، ہم لوگ شیخ کے گھر ''حی الاکراد'' گئے یہیں افطار وکھانا ہوا اور بیٹھ کر باتیں کرتے رہے پھر ہم نے ان سے اجازت لی اور جناب عبدالعزیز کنعانی کے ساتھ جو ''لاذقیۃ'' کے رہنے والے ہیں اور ان دنوں کسی ذاتی ضرورت سے دمشق آئے ہوئے ہیں، اپنی قیام گاہ آگئے ہمیں نیند آگئی اور عشاء بعد آنکھ کھلی تو معلوم ہوا کہ محمد توفیق کنجی آئے تھے جگانا مناسب نہیں سمجھا اور واپس ہو گئے۔

سہ شنبہ ۲۱/۹/۱۳۷۰ھ مطابق ۲۶/۶/۱۹۵۱ء

علامہ محمد بہجۃ البیطار

میں نے استاذ محترم شیخ تقی الدین ہلالی مراکشی سے علامہ محمد بہجۃ البیطار دمشقی کا نام سنا تھا ،کبھی کبھی دینی، علمی رسالوں میں بھی ان کا نام نظر آتا تھا، میں ان کو ایک بلند پایہ متبع سنت عالم کی حیثیت سے جانتا تھا پھر میں نے سنا کہ المنار کے اڈیٹر علامہ سید رشید رضا کے انتقال کے بعد اس کی ادارت شیخ بہجۃ البیطار کے حوالہ ہوئی ہے اور عنقریب تفسیر ''المنار'' کی تکمیل کا کام بھی شروع کریں گے، غرضیکہ شیخ جانی پہچانی اور ہم سے قریب کی شخصیتوں میں تھے، ہم پابندی سے المنار دیکھتے تھے، اس کے اصحاب فکر، المجمع العلمی اور اس کے اراکین سے واقف تھے، اسی لئے جب شیخ محمد نصیف (۱) نے ان کے نام تعارف کا خط لکھا تو مجھے خوشی ہوئی، آج ہمارے دمشق پہونچنے کا دوسرا دن تھا، میں نے چاہا کہ سب سے پہلے شیخ بہجۃ البیطار سے ملاقات کرلوں لہٰذا ہم میدان فوقانی کے لئے روانہ ہوئے جامع دقاق گئے اور شیخ کے متعلق دریافت کیا، معلوم ہوا کہ وہ شہر گئے ہیں، یہ پتہ نہیں کہ کب لوٹیں گے لیکن یہ معلوم ہوگیا کہ عصر بعد مسجد میں ان کا درس ہے، عصر پڑھ کر ہم نے لوٹنے کا فیصلہ کرلیا، اور شیخ احمد کفتارو کے مکان کا رخ کیا مگر وہ نہ ملے۔

شیخ ابوالخیر میدانی (۲) سے مُلاقات

لیکن جناب عبد العزیز کنعانی مل گئے اور انھیں کی رہنمائی میں ہم نے رابطۃ العلماء کے صدر مولانا شیخ ابوالخیر میدانی کے گھر جانے کا قصد کیا ہمارے ساتھ مفتی امین الحسینی کا تعارفی خط تھا، ہم ان کے گھر میں داخل ہوئے جو قدیم ترکی طرز پر بنا ہوا تھا معلوم

---

(۱) شیخ محمد نصیف جدہ کی ممتاز عمائدین میں تھے ان کے پوتے ڈاکٹر عبداللہ عمر نصیف عالم اسلام کی نامور شخصیتوں میں ہوئے عرصہ تک رابطۂ عالم اسلامی کے جنرل سکریٹری رہے دنیا بھر میں ان کے ذریعہ اسلام اور مسلمانوں کی انقلاب کا بڑا کام انجام پایا، اطال اللہ بقاءہ

(۲) دمشق کے اکثر علماء واساتذہ کے استاد، صوفی المشرب، علماء سلف کا نمونہ تھے، سلسلہ نقشبندیہ خالدیہ میں صاحب اجازت، اور شام کے جمعیۃ العلماء کے صدر

ہوا کہ وہ نماز پڑھ رہے ہیں، تھوڑی دیر میں شیخ باہر آئے، بڑے باوقار، پوری داڑھی، نورانی شکل وصورت، چہرے پر صلاح وتقویٰ کے آثار، میں نے ان کو مفتی امین الحسینی کا خط دیا بڑی خوشی سے خط لے لیا اور مفتی صاحب کی تعریف کی، ان کے اخلاص اور مستقل مزاجی کو سراہا، ہم تھوڑی دیر بیٹھے پھر ان سے اس وعدہ پر اجازت لی کہ عنقریب پھر ان سے ملیں گے، انھوں نے مہمان کے اکرام میں ہوٹل آنے کا اصرار کیا مگر ہم نے انھیں روک دیا، اس لئے کہ ہمارے اوقات غیر معین ہوتے ہیں ہوسکتا ہے کہ وہ آئیں اور ہم نہ ہوں۔

اخوان المسلمین کے مرکز میں

ہم لوگوں نے سنجقدار میں واقع اخوان المسلمین کا مرکز دیکھا، ہمارے ساتھ اخوان المسلمین کے نگران عام ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی کا نام مفتی امین الحسینی صاحب کا تعارفی خط تھا، میں نے ان کے متعلق جو کچھ سن رکھا تھا اور ان کی جو چیزیں پڑھی تھیں ان کی وجہ سے ان سے ملنے اور ملاقات وتعارف حاصل کرنے کا شوق تھا۔ ہم لوگ مرکز میں داخل ہوئے اور ان کے سکریٹری خالد الحسن سے ملے، جب ہم نے ان کو اپنا نام بتایا تو خوش آمدید کہا اور بتایا کہ انھوں نے ''ماذا خسر العالم'' پڑھا اور دمشق میں لوگوں کو اس کے مطالعہ اور خریدنے کی ترغیب دی، انھوں نے ہمارا رسالہ ''المد والجزر فی تاریخ الاسلام'' بھی پڑھا ہے، انھوں نے ذکر کیا کہ جب انھوں نے ماذا خسر العالم کا عنوان پڑھا تو شک اور ڈر کے ساتھ اس کو منگایا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کتاب اس عظیم الشان نام کے معیار پر نہ ہو، اس لئے کہ اس اخیر عہد میں عالم اسلامی میں تصنیف کا معیار خاصا پست ہوگیا ہے، ناموں سے بہت دھوکا ہوتا ہے..... مگر اس کتاب کو خرید کر انھیں افسوس نہیں ہوا، انھوں نے کہا کہ اس وقت وہ ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی صاحب کے مطالعہ میں ہے وہ اس کتاب کی بڑی تعریف کرتے ہیں اور اخوانی احباب کو اس کے مطالعہ کا مشورہ دیتے ہیں، میں اس حقیقت کو نہیں چھپاتا کہ مجھے مصنف کی حیثیت سے اس گفتگو سے خوشی ہوئی، البتہ یہ معلوم کر کے خاص طور پر مسرّت

ہوئی کہ کتاب میرے دمشق پہنچنے سے پہلے پہنچ گئی اور اہل علم وذوق نے اس کو قدر کی نگاہ سے دیکھا، یہ اللہ کا فضل وکرم ہے، اسی طرح کہ چیزیں شکستہ دل کو تسکین دیتی ہیں اور غم واندوہ کو کم کرتی ہیں۔

جامع الدّقاق میں

ہم لوگ علامہ بہجۃ البیطار کے یہاں گئے اور ان کے درس میں شریک ہونے کے لئے جامع الدّقاق پہنچے وہاں ہم کو اطلاع ملی کہ شیخ ابھی تک واپس نہیں آئے، ہم لوگ ان کے شاگرد شیخ عبدالرحمٰن طیبی کے درس میں حاضر ہوئے، درس کا موضوع امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر ابھارنا تھا، یہاں ہم لوگ شیخ زین العابدین تونسی سے ملے جو جمعیۃ الہدایۃ الاسلامیۃ کے صدر اور مصر میں ہیئۃ کبار العلماء کے رکن علامہ محمد الخضر حسین (سابق شیخ الازہر) کے بھائی ہیں، ہم نے مسجد میں رکنے اور شیخ بہجۃ البیطار کے انتظار کا فیصلہ کیا اس لئے کہ قیام گاہ دور ہے اور روزہ کی حالت میں جلد جلد آنا مشکل ہے، عبدہ المار دینی نامی ایک صاحب نے اپنے گھر میں آرام کرنے اور شیخ بہجت کے انتظار کرنے کی پیشکش کی، زین العابدین صاحب نے اس کی تائید کی اور ان کے اخلاص اور خوش خلقی کی تعریف کی، ان کی پیشکش کو منظور کر کے ہم ان کے مکان میں الحاج محمد صادق کے ساتھ داخل ہوئے جو عدالت میں ایک عہدہ پر ہیں، ہم نے دیکھا کہ عبدہ المار دینی صاحب افطار اور کھانے کی تیاری میں لگے ہوئے ہیں، ہم نے ان سے معذرت کرتے ہوئے اجازت چاہی مگر انھوں نے ایک نہ مانی، پردیسی مہمانوں کی آمد سے ان کی غیر معمولی خوشی وخوش خلقی کو دیکھ کر ہم نے ان کی خواہش پوری کی اور رک گئے اور انھیں کے گھر افطار وکھانا ہوا، خالص اسلامی جذبہ اور دینی تعلق کی بناء پر جس میں کسی اور غرض کا شائبہ نہ تھا، کھانا کھایا، اس لئے کہ یہ صاحب ہم سے واقف نہ تھے اور ایک مسلمان مہمان کی ضیافت واکرام کے سوا ان کا اور کوئی مقصد نہ تھا، یہ ضیافت خالص اکرام مسلم اور خدا واسطے محبت کی بناء پر تھی، وہ کوئی متمول اور رئیس آدمی نہ تھے، ان کے کھانے میں بڑی لذّت محسوس ہوئی وہ وقت

بھی ایسا ہی تھا، ہم روزے سے بھی تھے، اور تھکے تھکائے بھی۔

سوریہ کی پالیمنٹ میں

ہم ان کے گھر سے نکلے اور معلوم ہوا کہ علامہ بہجۃ البیطار ابھی تک نہیں آئے راستہ میں اتفاق سے اپنے بعض احباب کے ساتھ بھائی توفیق کنجی مل گئے، انھوں نے ہم کو بتایا کہ انھوں نے پارلیمنٹ کے اجلاس میں حاضر ہونے کے لئے ہمارے لئے دو پاس لے لئے ہیں، ہم اس سے خوش ہوئے اس لئے کہ ہم لوگ ابھی تک کسی عرب ملک کی پالیمنٹ کے اجلاس میں شریک نہیں ہوئے تھے اور نہ عربی زبان میں پارلیمانی بحث ومباحثہ سنا تھا، میں یہ چاہتا تھا کہ دستوری بحث ومباحثہ کے لئے عربی زبان کی صلاحیت ووسعت کا اندازہ کروں اور یہ دیکھوں کہ اہل زبان اس میں کہاں تک کامیاب ہیں، اگرچہ میں عربی زبان کی وسعت گنجائش اور ہر جدید وقدیم کو ادا کرنے کی صلاحیت پر پہلے سے یقین رکھتا تھا، تاہم یہ چاہتا تھا کہ عملی طور پر اس کو دیکھوں، کنجی صاحب کا یہ منشاء میری دلی خواہش اور دل میں چھپے ہوئے شوق کے عین مطابق تھا، موٹر پر کچھ نوجوانوں سے تعارف ہوا اور میں نے ان کو اپنے بعض رسالے ہدیہ کئے، انھوں نے بڑے شوق ورغبت سے لپک لپک کر ان رسالوں کو لیا، احمد جناوی صاحب سے بھی تعارف ہوا، وہ ''کلیۃ اصول الدین'' سے فارغ ہیں، تدریس میں تخصص کیا ہے اور اب فرات کے مدرسہ ثانویہ میں دینیات کے مدرس ہیں، انھوں نے ذکر کیا کہ وہ ''اسمعی یا مصر'' پڑھ چکے ہیں اور ان کے ساتھیوں نے اس کو بار بار پڑھا ہے۔

دوحۃ الآداب کا جلسہ

یہ ذکر کرنا یاد نہ رہا کہ جب میں دمشق پہونچا تو وہاں کے دینی حلقوں میں ایک خاص حادثہ کا چرچا تھا، یہی حادثہ مجلسوں کا موضوع گفتگو بنا ہوا تھا، حادثہ یہ تھا کہ مدرسہ دوحۃ الآداب نے قصر آل العظم میں ایک محفل منعقد کی جس میں شہر کا مقتدر وخوشحال طبقہ اور فوج کے لوگ شریک ہوئے، اس میں لڑکیاں بے پردہ آئیں اور رقص وسرور ہوا، یہ جلسہ

بداخلاقی اور بے حیائی کا مظہر تھا، مصر میں تو اس سے کہیں زیادہ یہ چیزیں پائی جاتی ہیں، شام کے لوگ اپنے دینی رنگ اور قدیم تہذیب کے اثرات کی بناء پر اس خلاف تہذیب جلسہ کو برداشت نہ کر سکے، اسلامی غیرت اور دینی شعور رکھنے والوں نے اس پر برملا اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا، ادھر یہ ہوا کہ استاذ علی طنطاوی (۱) (جو اس وقت رکن عدالت تھے) سوریہ یونیورسٹی کی مسجد میں جمعہ کا خطبہ دے رہے تھے اور شام کا ریڈیو اس کو نشر کر رہا تھا، انھوں نے اپنی تقریر میں اچانک اس موضوع پر بھی روشنی ڈالی اور حکومت پر تنقید کی، ریڈیو اس گفتگو کو بھی نشر کرتا رہا، اور ایتھر کی لہریں اس کو دنیا کے گوشہ گوشہ میں منتقل کرتی رہیں اس نے کچھ خیال نہیں کیا، اس تنقید نے اہل حکومت کو ناراض کر دیا انھوں نے خطیب سے سخت محاسبہ کیا اور ان کے معاملہ کو عدالت کے حوالہ کر دیا اور ریڈیو کے انچارج کو برخاست کر دیا (۲)، اس کی وجہ سے یہ واقعہ شہر کا موضوع گفتگو بن گیا، دمشقی صحافت نے استاذ علی طنطاوی پر طعن وتشنیع جرح وتنقید اور نکتہ چینی کرنا شروع کر دی، دیندار لوگ علماء اور دینی انجمنوں کے صدر حضرات نے علی طنطاوی کی طرف سے دفاع شروع کیا اور ان کے خیالات سے اتفاق اور اس کی تائید کی، بعض ممبروں نے اس قصے کے بارے میں سوال اٹھایا کہ آج اس پر بحث کا دن مقرر تھا لوگوں کو توقع تھی کہ آج بڑی گرما گرم اور زوردار بحث ہوگی، دینی انجمنیں اور خاص طور پر اخوان المسلمین کے لوگ یہ چاہتے تھے کہ ان غلط پالیسیوں کے خلاف عوام کی ناراضگی، اور شیخ کی موافقت کا اظہار ہو، لہٰذا دینی طبقہ نے یہ کوشش کی کہ اس اجلاس کے موقعہ پر سامعین کی گیلری میں علماء و دیندار حضرات کی بڑی تعداد موجود ہو، تاکہ ممبران کو پبلک کے جذبات کا اندازہ ہو (جن کا ہاتھ ہمیشہ عوام کی نبض پر ہوتا ہے اور ان کی تائید

---

(۱) شیخ علی طنطاوی دور حاضر میں عربی کے بلند پایہ ادیب وانشاء پرداز جو شام میں حالات کے خراب ہونے کے کے بعد سعودی عرب منتقل ہو گئے، عرصہ تک مکہ معظمہ میں کلیہ التربیہ کے استاد رہے، اب ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے مقبول ترین مقرروں اور مقالہ نگاروں میں ہیں، مصنف کے مخلص دوست اور ہندوستان کے علمی و دینی کارناموں کے سب سے بڑے معترف، کئی درجن کتابوں کے مصنف ہیں۔

(۲) یاد رہے کہ یہ زمانہ جنرل ادیب الششکلی کی صدارت اور دور حکومت کا تھا جو ایک طرح کی فوجی حکومت تھی۔

وتصدیق سے محرومی ان کو گوارا نہیں اور عوام کی رائے اخلاقی پہلو سے ہمیشہ اہمیت رکھتی ہے)اجلاس میں علامہ بہجۃ البیطار اور بعض علماء تشریف لائے ، ہم لوگوں نے دور سے ایک دوسرے کو سلام کیا۔ایک خوبصورت عمارت میں جو مشرقی طرز پر بنی ہوئی تھی ،اجلاس شروع ہوا، ڈاکٹر معروف الدوالیبی (۱) کرسیٔ صدارت پر بیٹھے اور بحث شروع ہوئی یہاں تک کہ یہ مسئلہ چھڑنے کا وقت آیا جس کا اوپر ذکر ہوا، اب گردنیں بلند ہوئیں اور کان لگ گئے ۔

استاد محمد المبارک کی تقریر

حلقہ دمشق کے پارلیمانی نمائندے استاد محمد المبارک (۲) آگے بڑھے جو جمعیۃ الاشتراکیۃ الاسلامیۃ کے رکن ہیں (جس کے صدر ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی ہیں)انھوں نے دلائل سے بھرپور بڑی زور کی تقریر کی جو پارلیمانی زبان کی علمی ادبی انداز میں عوام کی زندگی میں اخلاق کی اہمیت پر تھی ،عربی معاشرہ اور عرب جاہلیت کی اخلاقی مبادیات اور مسلمانوں کو اس کی ضرورت خصوصًا عرب قوموں کو جو صیہونی خطرہ کے سامنے اور میدان جنگ میں ہیں، ان اخلاق کو اپنانے اور اختیار کرنے ، پختہ تربیت حاصل کرنے اور ہر اس چیز کے مقابلہ کے لئے تیار رہنے کی دعوت پر مشتمل تھی جو جوانمردی وشرافت اور بہادری کی روح کو بیدار کرتی ہے یہ تقریر بڑی قدر وپسندیدگی سے سنی گئی ، پھر ڈاکٹر سباعی صاحب نے مختصر اور واقعہ مذکور کی صورتحال کو سامنے رکھتے ہوئے مناسب تقریر کی، حکومت کی طرف سے اس تقریر پر جس ردّعمل کا اندیشہ تھا وہ نہیں پیش آیا، لوگوں کا کہنا ہے کہ مخالفین نے سامعین ودینداروں اور علماء کو دیکھ کر اس قسم کے مظاہرہ سے قوم کی بیزاری کو بھانپ لیا اور شیخ طنطاوی کے موید ین

---

(۱) شام کی ایک سیاسی پارٹی کے صدر کلیۃ الشریعہ کے حلب فاضل اور کلیہ الحقوق (Low College) دمشق کے پروفیسر، کئی بار شام کے وزیر اعظم رہے، ملک فیصل مرحوم نے ان کو اپنا سیاسی وقانونی مشیر بنالیا تھا، ریاض میں مستقل طور پر مقیم رہے ، اور اہم سیاسی مہمات میں ان سے کام لیا جاتا تھا، ان کی کتاب ''المدخل الی اصول الفقہ'' دار العلوم ندوۃ العلماء اور مختلف درسگاہوں میں داخل نصاب ہے،

(۲) شام کے ایک مشہور عالم وادیب جو وزیر محنت (لیبر منسٹر) بھی رہے اور عرصہ تک کلیۃ الشریعہ دمشق کے پرنسپل بھی، حالات کے خراب ہونے کے بعد سعودی عرب آگئے تھے، جامعہ الملک عبدالعزیز کے مستشار تعلیمی رہے، کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔

ومعاونین کا اندازہ لگالیا تو یہ لوگ دبے اور خاموشی کو ترجیح دی، اجلاس کے صدر نے اپنی پارلیمانی ہوشیاری اور موقع شناسی کا ثبوت دیا، چنانچہ اشتعال میں سکون پیدا ہوا، انھوں نے حکومت کو نرمی اور حکمت عملی کا مشورہ دیا اور اجلاس کو مزید انتظار اور بحث کا وقت مقرر کرنے کی صلاح دی، اس طرح وہ فضا کچھ ٹھنڈی ہوئی جس میں غیظ وغضب کی بجلی کوندرہی تھی۔

پارلیمانی بحث کے لئے زور بیانی کی ضرورت اور اس کا اظہار

میں نے یہ مشاہدہ کیا کہ ممبران کے مباحثہ اور ان کے بیانات زور وقوت، اور زبان کی فصاحت میں کسی ایسے پارلیمنٹ سے کم نہیں جس کے ممبران انگریزی میں بحث کرتے ہیں، میں اپنے ملک کے بعض قانون ساز جلسوں میں حاضر ہوا ہوں، میں نے دیکھا کہ عربی زبان نے اپنی صلاحیت ثابت کردی اور عرب ممبران نے اپنی پارلیمانی قادر الکلامی اور لیاقت کا پورا ثبوت دیا، مجھے صدر جلسہ کی تقریر اور وزیر اعظم خالد العظم کے جوابات بہت پسند آئے، وہ بڑے ٹھوس، سنجیدہ اور ذہانت وقابلیت کے غماز تھے، خیال ہے کہ شام کے ممبران کی زبان فصاحت میں اور مقامی انداز کلام سے مبرّا ہونے میں مصری ممبران کی زبان کے مقابلہ میں بہتر ہے، اگرچہ مصر کے کسی پارلیمانی اجلاس میں حاضر ہونے کا مجھے موقع نہیں ملا تاہم میرا یہ اندازہ ہے، پارلیمنٹ سے ہم لوگ اجلاس ختم ہونے سے پہلے ہی نکل آئے، گیٹ پر شام کے چیدہ نوجوانوں کی جماعت ملی ان میں سے اکثر اخوان المسلمین سے تعلق رکھتے ہیں ان سے ہمارا تعارف "ماذا خسر العالم" کے ذریعہ تھا، میں نے دیکھا کہ اکثر پڑھے لکھے لوگ اس کتاب سے واقف ہیں، وہاں سیّد عبدالرحمٰن البانی صاحب سے تعارف ہوا وہ دمشق کے معهد التربية (ٹریننگ کالج) میں استاد ہیں، ازہر کے كلية اصول الدين اور قاہرہ یونیورسٹی کے گریجویٹ ہیں، اس طرح وہ قدیم وجدید دونوں علوم کے جامع ہیں، جناب عبدالنافع سباعی نے ان کے نام تعارفی خط لکھ دیا تھا، ان سے تعارف ایک بڑی کامیابی تھی، وہ دمشق میں ہماری کتاب "ماذا خسر العالم" کے مطالعہ کے اوّلین داعیوں میں ہیں۔

علمائے دمشق سے ملاقات

ہم لوگ یہاں سے نکلے اور راستے میں اتفاقاً شیخ بہجۃ البیطار مل گئے ان کے ساتھ الدراسات الاسلامیۃ کے صدر اور دمشق کے بڑے عالم شیخ محمد احمد دھمان اور ڈاکٹر ابوالیسر عابدین (جو مشہور فقیہ علاّمہ سیّد ابن عابدین (علاّمہ شامی) کے خاندان سے ہیں) اور شیخ محمد سعید برہانی تھے، میں علامہ محمد بہجۃ البیطار سے ملا، انھوں نے ایک دوسرے سے تعارف کرایا، انھوں نے کہا کہ شیخ محمد نصیف نے مجھے خط لکھا ہے کہ انھوں نے آپ کے ہاتھ ایک کتاب بھیجی ہے اور لکھا ہے کہ آپ حضرات عنقریب دمشق آئیں گے، میں عرصہ سے آپ کا انتظار کر رہا ہوں، میں نے کتاب ان کو پیش کردی، جناب محمد احمد دھمان نے اصرار کیا کہ ان کے گھر جائیں اور کچھ دیر نشست رہے، ہم نے ان کی دعوت قبول کرلی اور ان حضرات کے ساتھ کچھ دیر مجلس رہی، پھر یہ کہہ کر اٹھ گئے کہ شیخ بہجۃ البیطار صاحب سے کل ان کے گھر ہی پر ملیں گے۔

چہارشنبہ ۲۲/۹/۱۳۷۰ھ مطابق ۲۷/۶/۱۹۵۱ء

شیخ ناصر الدین البانی سے ملاقات اور علمی گفتگو

ہوٹل میں استاد عبد الرحمٰن البانی (۱) حدیث وسنّت کی خدمت وتحقیق کا کام کرنے والے شیخ ناصر الدین البانی آئے وہ البانیا کے اصل باشندے ہیں (۲) ہم لوگ بیٹھ کر ہندوستان میں علم حدیث اور اس موضوع پر کتابوں کے متعلق باتیں کرنے لگے پھر ہم لوگ علامہ بہجۃ البیطار کے گھر گئے اور ان کے پاس بیٹھ کر گفتگو و مذاکرہ کرنے لگے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے بارے میں باتیں

گفتگو شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے متعلق ہونے لگی، علامہ بہجۃ البیطار ان کی تصنیفات

(۱) شیخ عبدالرحمٰن البانی شام کے اہم علماء میں حضرت مولاناؒ کے مخلص محبین میں سے، آخر میں ریاض میں مقیم رہ کر وفات پائی (مترجم)

(۲) علامہ محدث شیخ ناصر الدین البانی کا نام اور کام عالم اسلام میں بالخصوص علم حدیث کے حلقوں میں محتاج تعارف نہیں ہے اچھی عمر پائی اور بڑا کام انجام دے کر وفات پائی، کچھ عرصہ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں تدریس کی خدمت انجام دی (مترجم)

ونظریات کے بڑے واقفین میں سے ہیں، انھوں نے ابن تیمیہ پر افتراء پردازیوں کا مجملاً ذکر کیا اور علمی وتاریخی دلائل سے اس کو غلط قرار دیا، منجملہ اور باتوں کے ابن بطوطہ کا وہ بیان بھی تھا جو اس نے اپنے سفرنامہ میں ذکر کیا ہے کہ اس نے دمشق میں جامع اموی کے ممبر پر ان کو خطبہ دیتے سنا وہ منبر سے ایک ایک زینہ اترتے جاتے تھے، اور فرماتے جاتے تھے کہ اس طرح اللہ تعالیٰ نزول فرماتا ہے، انھوں نے ثابت کیا کہ دمشق میں ابن تیمیہ سے ابن بطوطہ کی ملاقات ہی نہیں ہوئی، ابن بطوطہ رمضان ۷۲۶ھ میں دمشق آیا اور اسی سال شیخ الاسلام ابن تیمیہ شعبان ہی میں جیل جا چکے تھے اور ابن تیمیہ کبھی جامع اموی میں خطیب نہیں رہے تھے، ان کے زمانہ میں جامع اموی کے خطیب شیخ جلال الدین قزوینی تھے، ابن بطوطہ کا یہ بیان غلط یا وہم پر مبنی ہے، اس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ اس نے سفرنامہ املا کرایا تھا، خود نہیں لکھا تھا شیخ زاہد الکوثری کے اس قول سے علامہ بہجۃ البیطار کو تعجب ہوا کہ ابن تیمیہ کے تشدّد کی وجہ سے امیر خربندہ شیعہ ہو گیا، جس کا پس منظر یہ ہے کہ خربندہ نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دیں اس کے بعد شرمندہ ہوا اور علماء سے استفسار کیا کہ کیا اس کی کوئی صورت نکل سکتی ہے کہ وہ رجوع کر سکے سب نے یہ جواب دیا کہ یہ طلاق مغلظہ تھی، تمہاری بیوی ''بائن'' ہو چکی، اب حلالہ اور نکاح کے بغیر تمہاری زوجیت میں نہیں آسکتی، آخر میں امیر خربندہ مشہور شیعی فقیہ ابن المطہر الحلی سے ملا، اس نے کہا کہ ایک طلاق پڑی اور رجعی پڑی میں اس کو سنّت سے ثابت کروں گا، امیر خربندہ نے کہا کیا آپ علماء اہل سنت سے مناظرہ کر سکتے ہیں اس نے کہا ہاں ہم تیار ہیں، چنانچہ اس نے علماء اہل سنت کو جمع کیا اور ابن المطہر نے ان سے مناظرہ کر کے ان کو خاموش ولاجواب کر دیا، نتیجہ یہ ہوا کہ خربندہ شیعہ ہو گیا اس میں ابن تیمیہ کی کیا خطا ہے، اس نظریہ پر ہم دونوں متفق رہے کہ ابن تیمیہ کی کتابیں اس وقت بھی بڑا مواد فراہم کرتی ہیں، زمانہ کی پیش قدمی اور عقل کی ترقی کے باوجود وہ جدت اور زمانہ کا ساتھ دینے سے عاجز نہیں وہ عہد حاضر کے بہت سے اہل عقل لوگوں کو مطمئن اور خاموش کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں، ا مقبولیت وکامیابی کا راز یہ ہے کہ ابن تیمیہ نے اسلام کے اصول وکلّیات کو اچھی طرح سمجھا

اور انھیں کو اپنی بحث وتحقیق کا محور بنایا۔

علامہ بہجۃ البیطار نے فرمایا کہ ازہر کے بعض علماء نے مجھ سے کہا کہ جب ہم نے جامع ازہر میں توحید کے موضوع پر کتابیں پڑھیں تو بہت سے شکوک وشبہات پیدا ہو گئے، ہم اس خطرے میں پڑ گئے کہ کہیں اسلام ہی کے منکر نہ ہو جائیں مگر قسمت نے ساتھ دیا، ہم نے امام ابن تیمیہ کی کتابیں پڑھیں تو ان کتابوں نے از سر نو اسلام کو ہمارے دلوں میں راسخ کیا۔

میں نے ان سے کہا کہ دیکھنے والوں کو پہلے وھلہ میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ دین کو سمجھنے میں معتزلہ نے سب سے زیادہ باریک بینی اور ذہانت کا ثبوت دیا مگر تحقیق سے مطالعہ کرنے والے اور پختہ کار شخص کو اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ اسلام میں عقل کے دور طفولیت میں تھے، ان کا فکر خام وغیر پختہ تھا اور یہ پتہ چلتا ہے کہ محدثین کرام علم کے اندر حق تک پہونچنے ورسوخ فی العلم میں بہت فائق تھے، معتزلہ کے مقابلہ میں ان کی رائے عقل وتحقیق سے زیادہ قریب ہے، میں نے کہا کہ میں نے ڈاکٹر احمد امین بک سے بہت کھل کر کہا کہ آپ نے اپنی دونوں کتابوں ''فجر الاسلام'' اور ''ضحیٰ الاسلام'' میں معتزلہ کو ان کے مقام سے ..... زیادہ بڑھایا ہے، شیخ بہجۃ البیطار نے میری بات سن کر فرمایا کہ جب وہ دمشق آئے تھے تو میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کے نزدیک اسلامی فرقوں میں کون سا فرقہ حق سے زیادہ قریب ہے تو انھوں نے اعتزال اور معتزلہ کی تائید ونصرت اور ان کے ساتھ جانبداری فکری اور عقلی روشن خیالی کا رمز رہی ہے تا آنکہ یوروپ میں فلسفہ کے نئے مدرسے وجود میں آئے جنھوں نے عقل محض کی قیمت گھٹادی اس کے غلبہ کو کم کر دیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اعتزال نے اپنا اثر ورسوخ اور جاذبیت کھودی۔

دمشق میں فرانسیسی حکومت کی یادگاریں

کل کے طے شدہ پروگرام کے مطابق ہم لوگ المجمع العلمی (۱) کو دیکھنے نکلے، ٹرام

---

(۱) دمشق کے عربی اکیڈمی جو مشرق وسطی کی سب سے پہلی اور سب سے کارگذار اکیڈمی ہے اور اس کی رکنیت بڑا اعزاز سمجھی جاتی ہے اس کے بانی علامہ کرد علی تھے، اکیڈمی کے ایک بلند پایہ علمی رسالہ بھی نکلتی ہے اس کے ارکان میں مشرق وسطی ممالک اسلامیہ اور یورپ وامریکہ کے نامور فضلاء اور مستشرقین ہیں، راقم الحروف کو بھی ۱۹۵۷ء سے اس کی رکنیت کا شرف حاصل ہوا۔

پر سوار ہوئے پھر اتر کر دمشق کے بازار میں چلنے لگے، چلتے چلتے ہم لوگ ایک ایسے راستے سے گزرے جس کا نام الحریق تھا، شیخ بہجۃ البیطار نے ہم سے بیان کیا کہ یہ محلّہ دمشق کا سب سے بارونق وشاندار محلّہ تھا، دمشق کے امراء اور قوتلی خاندان کا مرکز تھا، یہ فرانسیسیوں کے حملہ اور گولیوں کا نشانہ بنا، جس سے بہت سی جگہوں پر آگ لگ گئی، سڑک مع مکانات کے تباہ ہوگئی، لوگ گھیرے میں پڑ گئے تھے۔

فرانسیسی مرد وعورت اور چھوٹے بڑے میں کوئی فرق نہیں کرتے تھے فرمایا وہ بالکل درندے اور جنگلی تھے انہوں نے ملک کی ترقی کو برسوں پیچھے ڈال دیا، وہ اپنی نوآبادیات میں ذرا بھی اس کی نمائندگی نہیں کرتے تھے کہ وہ فرانسیسی انقلاب، حریت ومساوات کے داعی ہیں۔

المجمع العلمی میں

ہم لوگ المجمع العلمی پہنچے وہاں ہم کو المجمع العلمی کے نائب صدر فاضل استاد شیخ عبد القادر مغربی اور استاد خلیل مردم بک ملے، میں ان دونوں حضرات سے ان کے مضامین ورسائل کے ذریعہ زمانہ طالب علمی سے واقف تھا، ہمارے دار العلوم ندوۃ العلماء کے طلبہ کی انجمن جمیعۃ الاصلاح اس کی خریدار تھی، ہم لوگ ان دونوں سے ملے اور بیٹھ کر ہندوستانی مسلمانوں کے بارے میں گفتگو کرنے لگے، میں نے المجمع العلمی کے کتب خانہ کو اپنے والد مرحوم مولانا سیّد عبدالحیٔ حسنی کی کتاب نزہۃ الخواطر کی پہلی جلد ہدیہ کی، کتب خانہ میں داخل ہوئے تو وہاں ابو العلاء المعری کا مجسمہ نظر آیا، ہمارے عرب بھائیوں پر بُت دوبارہ مسلّط ہوگئے ہیں اور وہ یادگار، علم اور تاریخ کے نام پر پھر عود کر آئے ہیں۔

کتب خانہ ظاہریہ میں

المجمع العلمی، المدرسۃ العادلیۃ الکبریٰ کی عمارت میں ہے، یہ بڑی بھاری مضبوط عمارت ہے، المجمع العلمی کے لئے اس کا انتخاب بڑا مناسب انتخاب تھا، المدرسۃ العادلیۃ الملک العادل ابن سلطان صلاح الدین کی طرف منسوب ہے، وہ مدرسہ کے اسی ہال کے

اندر مدفون ہیں جس میں کتب خانہ ہے، اسی مدرسہ عادلیہ میں قاضی ابن خلکان نے اپنا مشہور تذکرہ ''وفیات الاعیان'' لکھا ہے، ابن مالک نحوی یہیں کھڑے ہوتے اور لوگوں کو اپنے درس میں آنے کی دعوت دیتے تھے، کہتے تھے کہ کیا کوئی سیکھنے والا اور فائدہ اٹھانے والا ہے؟ (ابن خلدون بھی مدرسہ عادلیہ میں آیا ہے)(۱)

اس عمارت کے سامنے کتب خانہ ظاہریہ کی عمارت ہے جس کی نسبت السلطان الظاہر بیبرس کی طرف ہے جو اسی میں مدفون ہیں، یہ دمشق کا سب سے بڑا کتب خانہ ہے یہ کتب خانہ مشرق وسطیٰ کے کتب خانوں میں بڑے بڑے مصنّفین کی مخطوطات کے سلسلہ میں سب سے زیادہ ممتاز ہے، مثلاً حافظ ابن حجر عسقلانی، شیخ الاسلام ابن تیمیہ الحرانی حافظ ابن عساکر دمشقی، امام ذہبی وغیرہ۔

کتب خانہ کے نادر مخطوطات

کتب خانہ جن عمدہ کتابوں پر مشتمل ہے، ان میں سب سے اول قابل ذکر امام ابوداؤد سجستانی صاحب السنن کی کتاب مسائل الامام احمد ہے جو ۲۶۵ھ میں لکھی گئی، دوسری قابل ذکر کتاب مسند امام احمد کی ترتیب پر ''الکواکب الدراری فی ترتیب مسند الامام احمد علی ابواب البخاری'' ہے، کتاب کے نام سے جیسا محسوس ہوتا ہے، اس کے برخلاف وہ تقریباً ایک اسلامی انسائیکلوپیڈیا ہے جس کی اصل ۱۲۰ جلدوں میں ہے، کتب خانہ میں صرف ۴۴ جلدیں باقی ہیں، وہ بھی الگ الگ ہیں، اس کتاب سے ابن تیمیہ کے بہت سے رسالے نکال لئے گئے ہیں، وہ الگ شائع ہوئے ہیں، مثلاً کتاب الوسیلۃ، معوذتین سورۃ الفلق، سورۃ الناس کی تفسیر سورۂ اخلاص، سورۂ نور وغیرہ کی تفسیر، کتب خانہ میں دوسری منزل پر بہت وسیع دار المطالعہ ہے، ہم کتب خانہ کے مہتمم سے ملے وہ بڑے پڑھے لکھے باخبر اور علمی یادگاروں کی طرف توجہ رکھنے والے شخص ہیں۔

---

(۱) علامہ مؤرخ جامع العلوم والفنون ابن خلدون کی شخصیت محتاج تعارف نہیں ان کی تاریخ اور مقدمہ کو بڑی شہرت ملی (مترجم)

سلطان صلاح الدین کی تربت پر

کتب خانہ ظاہریہ سے نکل کر ہم لوگ جامع اموی کی طرف چلے اس میں داخل ہونے سے قبل اسلام ومسلمانوں کے لئے قابل فخر دین وملت کا علم بلند کرنے والے غازی سلطان صلاح الدین کی قبر پر گئے جس نے اسلام ومسلمانوں کی عزت رکھ لی، ان کا سر اونچا کر دیا اور صلیبیوں کے حملوں کا روکا اور ان کی طاقت ودبدبہ ختم کیا، ہم تھوڑی دیر مقبرہ کے دروازہ پر کھڑے ہوئے اور ان کے عظیم کارناموں اور ہمیشہ باقی رہنے والی جلیل القدر خدمات کو یاد کیا، ہم نے حطّین کا معرکہ یاد کیا جس نے صلیبیوں کا خاتمہ کیا اور وہ اسلام کی ایسی فتح ثابت ہوا جس کے سامنے بہت سی فتوحات قابل ذکر نہ رہیں، روح القدس وملائکہ نے ان کی تعریف کی، میں نے فلسطین مرحوم اور اس کے باشندوں کی زبان سے زرکلی کے شعر پڑھے۔

هاتی صلاح الدین ثانیة فینا
و جددی حطین أو شبّه حطینا
ہم میں تم صلاح الدین کو دوبارہ لاؤ
اور حطین یا حطین جیسے معرکہ کی یاد تازہ کرو

میں شروع سے سلطان شہید نور الدین زندگی اور غازی صلاح الدین ایوّبی کا ایسا قدرداں تھا اور ان سے ایسی عقیدت رکھتا تھا جو اسلامی بادشاہوں میں سے کسی بادشاہ سے نہ تھی، میں ان دونوں سے محبت کرنے اور ان کے لئے دعا کرنے کو اللہ کے یہاں تقرب کا ذریعہ جانتا تھا ہم اس زبردست مجاہد کے مقبرے میں داخل ہوئے، جس نے رسول اللہ سیدنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نصرت کا فریضہ انجام دیا، ان کی روح کو خوش کیا ان کے دین کے دفاع میں جوش وغضب کا مظاہرہ کیا، اسلام کی عزّت اور اس کے مقدّس گھر کی حفاظت کی، امّت مسلمہ کی عزّت وآزادی کو محفوظ کیا، میں نے ان کے لئے دعائے رحمت ومغفرت

کی، احباب نے مجھے بتایا کہ فرانسیسی جنرل غورو جب آیا اور اس نے سوریہ فتح کیا تو سلطان کی قبر پر ٹھوکر ماری اور کہا، صلاح الدین تم کب تک سوتے رہو گے، دیکھو ہم یہاں آئے اور سوریہ فتح کرلیا، یہ بات فرانسیسیوں کے غیظ وغضب اور اہل یورپ کے کبر اور گھمنڈ سے کچھ بعید نہیں، وہی مثل ہے ''مرے کو ماریں شاہ مدار'' بقول شاعر

كذاك الحي يغلب ألف ميت

(اسی طرح ایک زندہ ہزاروں مردوں پر غالب آجاتا ہے)۔

قبّۃ النسر

یہاں سے ہم نے جامع اموی کا قصد کیا اور وہیں ظہر پڑھی جب ہم قبۃ النسر کے نیچے سے گزرے تو شیخ بہجۃ البیطار نے ذکر کیا کہ اس ملک کا یہ معمول رہا کہ اس کے نیچے دمشق کا سب سے بڑا عالم ہی درس دیتا تھا، دمشق کے مشہور محدث سیّد بدر الدین حسنی (۱) اس کے قریب درس دیتے تھے اس کے نیچے نہیں درس دیتے تھے، بعد میں لوگ جری ہو گئے اور ہر کہہ دمہ اس کے نیچے درس دینے لگا۔

امام نووی کے دار الحدیث میں

ہم لوگ جامع اموی سے نکلے اور راستہ میں وہ دار الحدیث دیکھا جس میں امام نووی درس دیتے تھے، جس کے بارے میں علامہ تقی الدین سبکی فرماتے ہیں۔

و فی دار الحدیث لطیف معنی
الیٰ بسط لھا اصبو و آوی
لعلی ان امس بحر وجھی
مکانا مسہ قدم النواوی

---

(۱) علامہ سید بدر الدین حسنی برکۃ الشام وبقیۃ السلف اپنے اخلاص، زہد وتقوی، دنیا وما فیہا سے یکسوئی، درس وتدریس کے انہماک، اور علمی جامعیت میں نادرۂ روزگار اور علمائے سلف کی یادگار تھے ان کے تلامذہ میں جلیل القدر علماء شامل ہیں مناقب کے لئے ایک دفتر درکار ہے۔

استاذ بہاء الدین امیری کے ساتھ

راستہ میں بھائی عبدالرحمٰن البانی نے ہم سے ذکر کیا کہ مرجۃ میں واقع سمیرامسیس ہوٹل میں استاذ عمر بہاء الامیری سفیر سوریہ برائے پاکستان ٹھہرے ہیں (۱) ہم لوگ ان سے ملنے گئے اس حسن اتفاق سے خوشی ہوئی اس لئے کہ مجھے شام میں ان کے ہونے کی امید نہ تھی، چہ جائیکہ دمشق میں۔ ہم لوگ ان کے کمرے میں داخل ہوئے اور ان سے پوچھا کیا آپ نے مجھے پہچانا؟ تو وہ بولے کیسے نہ پہچانتا، مکہ معظّمہ میں ہم لوگ بار بار ملے ہیں، پھر ہم لوگ باتیں کرنے لگے، شیخ عبدالرحمٰن البانی نے تجویز پیش کی کہ میں سوریہ یونیورسٹی میں کوئی مقالہ پڑھوں، استاذ بہاء الامیری نے اس سے اتفاق کیا۔ اور کہا کہ میں اس کی تحریک کروں گا چنانچہ جناب امیری صاحب نے اسی وقت دمشق پارلیمنٹ کے صدر (اسپیکر) ڈاکٹر معروف الدوالیبی سے رابطہ قائم کیا اور میرا تذکرہ کرتے ہوئے اس خواہش کا اظہار کیا کہ دمشق یونیورسٹی میں ان کا پروگرام رکھا جائے اور اس سلسلہ میں وائس چانسلر قسطنطین زریق سے رابطہ قائم کریں، ڈاکٹر دوالیبی صاحب نے اس کا وعدہ کرلیا اور اگلے دن البانی صاحب کو بلایا تاکہ موضوع سمجھ لیں۔

ہوٹل میں ایک فلسطینی آئے، جو ہمارے تبلیغی دوست مفتی زین العابدین صاحب اور ان کی جماعت سے جو تبلیغ کے سلسلہ میں دو مرتبہ شام آچکی ہے، متعارف ہو چکے تھے، مولوی رشید اختر ندوی آئے جو ندوۃ العلماء کے شیخ الحدیث حضرت مولانا حیدر حسن خاں ٹونکی کے درس حدیث میں ہمارے رفیق رہ چکے تھے۔ (۲)

کبھی میرے وہم وگمان میں بھی یہ بات نہ آئی تھی کہ شام میں ان سے ملاقات ہوگی وہ ایک

---

(۱) استاد عمر بہاء الدین شام کے معروف ادیب وشاعر اور عالمی رابطہ ادب اسلامی کے بانی ارکان میں تھے دارالعلوم ندوۃ العلماء بھی تشریف لائے اور ان کی صدارت میں عالمی رابطہ ادب اسلامی کے ارکان نے اپنا کلام بھی سنایا، حضرت مولاناؒ سے بڑی عقیدت ومحبت رکھتے تھے (مترجم)

(۲) ندوی فاضل اور پاکستان کے معروف مصنف ومترجم اور افسانہ نویس وقصہ نگار ادیب ومؤرخ (مترجم)

عرصہ سے افسانہ نگاری میں لگے ہوئے ہیں اور ایک جدید افسانہ نویس کی حیثیت سے مشہور ہیں، ہم لوگ بیٹھ کر طالب علمی کے زمانہ کی باتیں کرنے لگے، اور اپنی عمر کے لپٹے ہوئے صفحات کھول دیئے جو اسی وقت کھلتے ہیں، جب پرانے ساتھیوں میں سے کوئی مل جاتا ہے، کنجی صاحب آ گئے ان کے ساتھ ہم ان کے گھر گئے، جہاں شیخ زین العابدین تونسی کی معیت میں افطار و کھانا ہوا، پھر ہم لوگ علامہ بہجۃ البیطار صاحب کے یہاں گئے، تھوڑی دیر بیٹھے پھر اپنی قیام گاہ واپس آ گئے۔

پنجشنبہ ۲۳/۹/۱۳۷۰ھ مطابق ۲۸/۶/۱۹۵۱ء

استاد محترم شیخ تقی الدین مراکشی یاد آئے

اپنے ایک دوست کے ساتھ برادرم محمد الفلسطینی آئے، اس کے بعد علامہ محمد بہجۃ البیطار آئے اور ہم لوگ باتوں میں لگ گئے، وہ ہیں بڑے شیریں بیان اور دلچسپ گفتگو کرنے والے، ایسے زندہ دل عالم جن کی باتوں سے جی نہیں اکتاتا، استاد محترم شیخ تقی الدین ہلالی کے بعد ان سے زیادہ صحیح و فصیح عربی بولنے والا میں نے نہیں دیکھا۔

استاد محمد المبارک کی نظر میں چار منتخب کتابیں

تھوڑی دیر میں بدھ کے دن سوریہ پارلیمنٹ کے جلسہ میں زوردار تقریر کرنے والے استاد محمد المبارک بھی آ گئے وہ کل بھی آئے تھے مگر ہم موجود نہ تھے میں نے ان کو ان کی پرزور و جرأت مندانہ تقریر پر مبارکباد دی، وہ بولے یہ تو آپ کی کتاب "ماذا خسر العالم" کا فیض تھا، یہ بات ان کی تواضع و خاکساری کو ظاہر کرتی ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ان کی تقریر مستقل قوت ایمانی کی مظہر اور اسلامی تعلیمات سے مستفاد تھی، شیخ بہجۃ البیطار کو مخاطب کر کے انھوں نے فرمایا، قریبی مدت میں موجودہ اسلامی کتب خانہ میں چار اچھی کتابوں کا اضافہ ہوا ہے، سید قطب کی "العدالة الاجتماعية" محمد اسد صاحب کی "الاسلام على مفترق الطرق" اور "ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمين" چوتھی

کتاب ان کے معیار کی تو نہیں ہے، لیکن اہم ہے، وہ ہے عبدالرحمٰن عزام باشا کی کتاب " الاسلام الرسالة الخالدة " ، " الاسلام على مفترق الطرق " بہت مختصر وٹھوس ہے، "العدالة الاجتماعية " ایک خاص پہلو پر مبسوط کتاب ہے، لیکن " ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمين " سب سے زیادہ بسیط وحاوی ہے، شروع میں ہم لوگ اسلام کے دفاع کے متعلق استاد فرید وجدی وغیرہ کی کتابیں پڑھتے تھے، جو یوروپین مصنفین کے استدلال وشواہد پر مبنی تھیں، لیکن " ماذا خسر العالم " نے تو خود مغربی تہذیب کے عیب کا پردہ چاک کیا اور اہل یورپ کے مفروضات وقیاسات کو کھوٹا ثابت کر دیا ، استاذ محمد المبارک صاحب تھوڑی دیر بیٹھے اور اجازت چاہی، اس لئے کہ ان کو پارلیمنٹ کی کسی ایک کمیٹی میں جس کے وہ ممبر ہیں شرکت کرنی تھی، جناب عبدالرحمٰن البانی آئے انھوں نے اس کا اہتمام کیا کہ دمشق کے روزنامے ہم تک پہونچا دیا کریں، خواہ وہ کسی بھی فکر ورجحان کے ہوں، تاکہ میں شام کی موجودہ صورت حال اور اس کی سیاسی زندگی کے بارے میں صحیح رائے قائم کرسکوں، اس سے قبل وہ ہم کو شام کے دستور (کانسٹی ٹیوشن) کی ایک کاپی دے گئے تھے۔

شیخ احمد کفتارو کے ساتھ (۱)

شیخ احمد کفتارو نے فون کیا اور مجھے اطلاع کی کہ وہ تھوڑی دیر بعد ہوٹل آرہے ہیں ، وہ مجھے تفریح کے لئے غوطۂ دمشق لے جانا چاہتے تھے، کثرت کار کے سبب ملاقات کے لئے نہ آسکنے کی معذرت کی، تھوڑی دیر بعد آگئے، ایک گھنٹہ بیٹھے اور اپنے نظام کار وخیالات اور اس ملک میں خدمت دین کا ذکر کرتے رہے، مفید گفتگو رہی اور خدمت دین کے موضوع پر ہم لوگوں نے تبادلۂ خیال کیا۔

---

(۱) شیخ احمد کفتارو علماء ومشائخ شام میں بڑی بلند قامت شخصیت کے حامل ہوئے سخت سے سخت حالات نے بھی ان میں جنبش نہ آنے دی اور درس وافادہ کا سلسلہ جاری رکھا (مترجم)

اصلاح کے بارے میں شیخ کفتارو کی رائے

شیخ احمد آفندی کی رائے ہے (میں حجاز ہی سے ان کی اس رائے سے واقف تھا، وہ اپنی اس رائے پر ابھی تک قائم ہیں) کہ بگڑے ہوئے حالات کے سدھارنے اور دین کو معاشرہ اور زندگی میں جاری ونافذ کرنے کا سب سے قریب راستہ اور کامیاب ذریعہ حکومت کے برسراقتدار طبقہ پر اثر انداز ہونا ہے، جن کے ہاتھ میں حکومت کا نظم ونسق اور احکامات کے نفاذ کا اختیار ہے، یہ ان سے انفرادی ملاقاتیں اور رابطہ قائم کرنے اور ان میں اعتماد پیدا کرنے کے ذریعہ ہی سے ہوسکتا ہے، عمومی دعوت کے ذریعہ جو کامیابی سال بھر میں ہوگی وہ ان کے ذریعہ سے ہفتہ بھر یا اس سے کم میں ہوگی، اصلاح کے متعلق ان کا خاص اصول وخاکہ ہے جس کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ اس کو نافذ کردیا جائے تو ملک کے ہر شعبہ میں دینی رجحان پیدا ہوجائے گا وہ طریقہ کار، نظام تعلیم کی اصلاح.....اور اس کو اسلامی نہج پر لانے، ریڈیو اور سنیما کی اصلاح کرنے اور فلموں کی نگرانی، مساجد کے ائمہ کی تربیت پر مشتمل ہے، قوم کی اصلاح کے لئے ان نئے وسائل کے استعمال کے بعد ان کو کامیابی کی بڑی امید واعتماد ہے، شیخ احمد صاحب نظر باخبر پختہ ذہن اور وسیع الفکر عالم ہیں، اپنے کام میں بڑے چست ہیں وہ عملی طور پر اس سے پہلے جو حکومت تھی اس کے صدر جمہوریہ سے مل کر پیشہ ور عورتوں پر پابندی لگانے میں کامیاب ہوگئے تھے، انھوں نے مجھ سے یہ بیان کیا کہ وہ فوج کے موجودہ سربراہ جو ملک کے فوجی ایڈمنسٹریٹر بھی ہیں ان سے ملے ایک گھنٹہ تک بات کی اور کہا کہ اگر آپ اپنے آپ اسلامی قیادت کے لئے آمادہ وتیار کریں اور خدمتِ اسلام کو اپنا مقصد زندگی بنائیں تو آپ پورے عرب ممالک بلکہ سارے عالم اسلام کے رہنما ولیڈر بن سکتے ہیں، اس گفتگو کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے ملک کے رجحان کو بدلنے اور اس کی اصلاح کے سلسلہ میں شیخ سے ان کی تجاویز واصلاح کا خاکہ طلب کیا اور اپنے نائب سے کہا کہ شیخ کو ہمہ وقت آنے کی اجازت دی جائے اور ان کی

رپورٹ کو آگے بڑھایا جائے لیکن یہ آخری واقعہ جس میں تمام علماء حکومت کے مقابلہ میں صف آرا ہوئے اس نے کچھ فضا خراب کردی اور اس کام میں رکاوٹ ڈال دی۔

دمشق کے غوطہ میں

اس کے بعد ہم لوگ شیخ احمد آفندی کی موٹر میں غوطہ کے لئے نکلے، یہ سادگی مجھے بہت بھلی معلوم ہوئی کہ شیخ تصوّف کے ایک سلسلہ کے شیخ اور شہر کے مشہور عالم ہونے کے باوجود اپنی موٹر خود چلا رہے تھے، غوطہ میں ہم لوگ ان کے گاؤں کی مسجد کے خطیب شیخ عبدالحکیم کے گھر میں اترے معلوم ہوا کہ غوطہ بہت وسیع ہے، پندرہ کلومیٹر طول وعرض میں پھیلا ہوا ہے، بیچ بیچ سے نہریں گزری ہیں، ہم جس گھر میں ٹھہرے ہوئے تھے اس کے اندر سے نہر بہہ رہی تھی اس کا پانی بڑا ٹھنڈا تھا، ہم نے اسی سے وضو کیا اور وہیں ظہر کی نماز پڑھی۔

اس کے بعد ہم ان کے گاؤں کی طرف نکلے اور شیخ کے ایک دوست کے بڑے باغ میں اترے اور زیتون، خوبانی، اخروٹ، انگور، انار، انجیر اور سنتروں کے درختوں میں گھوم پھر کر تفریح کی، اس سے پہلے میں نے زیتون اور خوبانی کا درخت نہیں دیکھا تھا، اس وقت خوبانی کا موسم تھا، اس کے بعد ہم پہلے سے بنے ہوئے پروگرام کے مطابق بہجۃ البیطار صاحب کے یہاں آگئے اور وہیں افطار وکھانا ہوا۔

سوریہ میں ردّ وبدل اور حادثات

یہاں سوریہ میں ہونے والے بعض واقعات کی طرف اشارہ کردینا بہتر ہوگا تاکہ ملک کے صحیح خدوخال سامنے ہوں، سوریہ کو تھوڑی سی مدت میں جو دو سال سے زائد نہیں، تین انقلابوں سے گزرنا پڑا، پہلا انقلاب شکری بک قوتلی کی حکومت کے خلاف حسنی الزعیم کا تھا، دوسرا انقلاب حسنی الزعیم کی حکومت کے خلاف سامی الحنّاوی کا تھا، تیسرا انقلاب سامی الحنّاوی کی حکومت کے خلاف آخری فوجی انقلاب تھا، ابھی تک سوریہ فوجی حکومت کے تحت ہے،

اگر چہ صدر جمہوریہ ہاشم بک اتاسی اور وزیر اعظم خالد العظم ہیں، لیکن اقتدار اصلاً فوجی سربراہ جنرل شیشکلی کے ہاتھ میں ہے، میں نے پہلی حکومتوں کے افراد اور اسباب بغاوت کے بارے میں معتمد علیہ لوگوں سے پوچھا تو ان لوگوں نے بتایا کہ شکری قوتلی دیندار شخص تھے مگر کمزور تھے، ان کی دینداری حکومت میں اثر انداز نہیں تھی، بغاوت کا سبب یہ تھا کہ انھوں نے حسنی الزعیم کو فوجی قیادت سے معزول کرنا چاہا لیکن معزولی کا حکم نافذ کرنے ایک دن قبل حسنی الزعیم نے انقلاب کر دیا، وہ بڑے قوی الارادہ اور صاحب عزم آدمی تھے، لوگوں نے ان سے بڑی بڑی امیدیں قائم کر لیں بعض لوگوں نے یہاں تک توقع قائم کر لی کہ انھیں جیسے شخص کی ضرورت تھی جو فلسطین کا نجات دہندہ اور سوریہ کی عزّت اور اس کے مقام کی حفاظت کرے گا ،لیکن اس کے بعد ان میں بھی تبدیلی آ گئی اور من مانی کرنے لگ گئے ،فضول خرچی اور عیش وتنعم میں پڑ گئے، پھر اسی طرح ان پر بعض غیر ملکوں سے ساز باز کا الزام لگا، لہٰذا فوج میں دوسرا انقلاب آیا، سامی الحنّاوی فوج کے ہاتھ میں کٹھ پتلی تھے، بغاوت کے بارے میں ان کے پاس کوئی سوچا سمجھا پلان نہ تھا، وہ اچھے آدمی تھے، دین اور دینداری کا احترام کرتے تھے شیخ احمد کفتارو فرماتے ہیں کہ وہ عید کے دن حی الاکراد میں اپنے گھر میں تھے، فوجی ایڈمنسٹریٹر سامی الحنّاوی اچانک دروازے پر آموجود ہوئے اندر داخل ہوئے اور آدھا گھنٹہ بیٹھے

ڈاکٹر محسن برازی جو حسنی الزعیم کی حکومت میں وزیر اعظم تھے ان کے کسی عزیز نے ان کو ان ہی گھر یا حالت جلاوطنی میں بیروت میں قتل کر ڈالا، اور تیسرا انقلاب پیش آ گیا، اس وقت اقتدار اصلاً فوج ہی کے ہاتھ میں ہے، وہی معزول کرنے اور عہدوں پر تقرری کی .....مختار ہے، ڈاکٹر ناظم قدسی وزیر اعظم تھے لیکن ان کی سیاست وزیر جنگ کے موافق نہ تھی، لہٰذا وزارت میں تبدیلی ہوگئی اور اس عہدے پر خالد العظم آ گئے، فوجی حکومت کی بقاء اور ملک کی سیاست میں اس کے عمل دخل نے انتظام اور معاملات کو غیر یقینی بنا دیا ہے اور اس ملک کے مستقبل کے لئے خطرہ ہے، ملک کے زوال اور اخلاقی بے راہ روی کا یہ بھی ایک سبب ہے۔

شام میں قضیہ فلسطین کے بارے میں احساس

میں نے شام میں مسئلہ فلسطین اور اس کے ہاتھ سے جاتے رہنے کے بارے میں لوگوں میں سخت اشتعال، ناگواری اور تکلیف دیکھی، عرب لیگ کے خلاف عوام میں عام ناراضگی، فلسطین کے بارے میں اس پر اور حکومت پر بے اعتمادی کی فضا دیکھی، شاید ہی کوئی مجلس المیہ فلسطین کے ذکر اور بارے میں عرب حکومتوں کی کوتاہی کے تذکرہ سے خالی جاتی ہو، اس کی وجہ سے عربوں کو جو ذلت ورسوائی، ندامت وشرمندگی اٹھانی پڑی اس کا تذکرہ ہر مجلس کا موضوع سخن ہے۔

جمعہ ۲۴/۹/۱۳۷۰ھ مطابق ۲۹/۶/۱۹۵۱ء

جامع اموی میں جمعہ

شیخ ناصر الدین، برادرم محمود احمد ابراہیم فلسطینی اور عبدالرحمٰن البانی آئے اور یہ طے ہوا کہ شرقِ اُردن کے سفارت خانہ ویزا لینے کے لئے بیروت جائیں، دمشق میں ان کا سفارتخانہ نہیں ہے، بیت المقدس کی زیارت کا ہم نے پختہ عزم کرلیا تھا اور یہ علاقہ اُردنی ہاشمی حکومت کے ماتحت ہے، جمعہ ہم لوگوں نے جامع اموی میں پڑھا، خطبہ بڑا جاندار تھا، خطبہ کا موضوع اخلاق کی حفاظت، اور غیرت اسلامی تھا، اس میں دوحۃ الآداب کے جلسہ کی طرف ہلکا سا اشارہ بھی تھا، استاذ محمد المبارک نے بھی جمعہ کے اس کے ہم معنی تقریر کی جو طلاقت اور موقعہ شناسی کا نمونہ تھی، ہمیں معلوم ہوگیا تھا کہ ہمارے محترم دوست سید محمود الحافظ مکّی (۱) دمشق گئے ہیں، لیکن ہمیں ان کے متعلق معلوم کرنے کا موقع نہ ملا ہم جمعہ کی نماز کے بعد عبدالرحمٰن البانی کے ساتھ ان سے ملاقات اور ان کے متعلق معلوم کرنے کے لئے نکلے، ہم لوگ محلّہ "حلبونی" پہونچے اور شیخ عبدالوہاب صلاحی کے مکان پر پہونچ کر ان کو دریافت کیا، ہم نے دیکھا کہ مجلس جمی ہے اور اس میں قصیدۂ بردہ پڑھا جارہا ہے۔ قصیدہ ختم ہونے کے بعد ہم ان سے ملے اور دونوں ایک دوسرے سے مل کر خوش ہوئے۔ انہوں نے بتایا کہ شیخ عبدالوہاب ہمارے انتظار

میں تھے، اپنے گھر میں ہمارے لئے ایک جگہ تیار کر رکھی ہے کل وہ حلب چلے گئے ہیں۔ انھوں نے ہوٹل سے اپنے گھر منتقل ہوجانے پر زور دیا۔ ہم نے ان سے کل کے لئے اس کا وعدہ کرلیا۔ وہ ہمارے ساتھ ساتھ قیام گاہ تک آئے اور تھوڑی دیر بعد لوٹ گئے۔

آج ہمارا افطار اور کھانا سیّد عبدالرحمٰن البانی کی مہمانی میں ایک شاندار ہوٹل میں ہوا، ہم نے روزہ داروں کی ایک بڑی تعداد کو ہوٹل میں افطار کرتے دیکھا، کسی دوسرے شہر میں ہم نے ایسا نہیں دیکھا، افطار میں ہمارے ساتھ استاد احمد مظہر العظمہ بھی تھے جو استاد البانی کے دوست ہیں۔ افطار کے بعد ہم لوگ اپنے حج کے ساتھی و دوست استاد کمال خطیب سے ملنے کے لئے نکلے۔

استاد محمد کمال سے ملاقات

ان کے گھر جاتے ہوئے راستہ میں ہم لوگ سلطان نور الدین شہید کی قبر کے پاس سے گزرے۔ ہم لوگ استاد خطیب سے ملے۔ انھوں نے ہم سے ایک گھنٹہ تک گفتگو کی، انھوں نے کل شیخ صلاحی صاحب کے گھر تشریف لانے کا وعدہ کیا، وہاں ہم اپنی قیام گاہ لوٹے، وہاں نئے اخبار ''المنار'' کے مالک جناب بشیر العوف صاحب سے ملاقات کے لئے آئے ہوئے تھے۔ پھر یہاں سے اخوان کے مرکز گئے۔ اخوان تراویح کے لئے جمع ہوئے، میں نے اس موقعہ پر تہجّد کے فضائل اور دن کے معمولات میں اس کے اثر، داعیوں کے نشاط وقوت میں اس کی تاثیر کے موضوع پر تقریر کی۔

چند دن کے لئے شرق اُردن کے سفر کا پروگرام بنا اور یہ خیال ہوا کہ رمضان کی آخری راتیں بجائے دمشق کے مسجد اقصیٰ میں گزاری جائیں، دوستوں نے اتفاق کیا اور ہم نے سفر کا فیصلہ کرلیا۔ مجھے بڑا افسوس ہے کہ شیخ مصطفیٰ سباعی صاحب سے ملاقات نہ ہوسکی۔ جب ان کو پوچھا معلوم ہوا کہ سفر میں ہیں، یا یہ کہ بہت مشغول ہیں۔ مجھے بہت افسوس ہوتا ہے بلکہ ندامت ہوتی ہے کہ کئی دنوں سے دمشق میں ہوں اور ان سے ملاقات نہ کرسکا۔

۲۵/۹/۱۳۷۰ھ مطابق ۳۰/۶/۱۹۵۱ء

استاذ عبدالوہاب صلاحی کے مکان منتقلی

آج کے اخبارات لئے ہوئے اپنے دوستوں کے ساتھ عبدالرحمٰن البانی آئے شیخ کفتارو صاحب نے فون پر گفتگو کی اور ہم لوگ جناب عبدالوہاب صلاحی کے مکان منتقل ہوگئے اور نہایت وسیع وکشادہ جگہ میں ٹھہرے وہیں ہندی نژاد جناب ابوذر صاحب سے ملاقات ہوگئی۔ ان کے والدان ہندوستانی علماء میں سے تھے جو ہندوستان سے شام ہجرت کرآئے تھے، یہ مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ کے مریدین میں تھے۔ محترم عبدالوہاب صلاحی شام کو تشریف لائے اور بڑی گرم جوشی سے ملے اور ہوٹل میں ہمارے ٹھہرنے پر شکایت کی، ہم نے ان سے معذرت کی، ہم لوگوں نے سیّد محمود الحافظ کے یہاں ہندوستانی طرز کا لذیذ کھانا کھایا، ڈاکٹر قوتلی آئے اور انھوں نے بیان کیا کہ ۴۷ء میں وہ اور محمد کمال الخطیب شیخ ابوذر اور دیگر حضرات مکّہ مکرّمہ میں ہمارے ایک جلسہ میں شریک ہوئے تھے، مجلسوں میں مسئلہ فلسطین ہی کا چرچا رہتا ہے۔ اور وہ ایک دلخراش موضوع ہے۔ عوام کو منظّم کرنے اور ان کو فوجی تربیت دینے میں حکومت کی کوتاہی اور ان خطرات کا علم ہوا، جو عرب حکومتوں کو گھیرے ہوئے ہیں۔

یکشنبہ ۲۶/۶/۱۳۷۰ھ مطابق ۱/۷/۱۹۵۱ء

عمّان و دمشق کے میدان

صبح نو بجے ہم لوگ عمّان کی طرف چلے۔ ہمارے میزبان شیخ عبدالوہاب صلاحی، استاذ عبدالرحمٰن البانی، استاذ ابوعزہ، اور سیّد محمود الحافظ (۱) ہم کو رخصت کرنے کے لئے آئے

---

(۱) سید محمود حافظ شام کے بلند مرتبہ شخصیت تھے ان کے صاحبزادے استاذ محمد الحافظ نے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تعلیم حاصل کی اور حجاز میں رہ کر دین کی اچھی خدمت کی صحافت کا بھی اچھا تجربہ تھا رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ سے بھی عرصہ تک وابستہ رہے (مترجم)

موڑ چلی اور ہم درعا (تاریخ میں مشہور مقام اذرعات ہے) رمثہ اور زرقاء سے گزرتے ہوئے ظہر کے وقت عمان پہنچ گئے اور ظہر وعصر کی نماز شہر کی مسجد میں پڑھی۔ مسجد پناہ گزینوں سے بھری ہوئی تھی وہاں ہم نے ایک عالم کو درس دیتے ہوئے دیکھا۔

عمان سے قدس

ہم لوگ خدا کے بھروسے پر ایک چھوٹی سی کار پر سوار ہوئے کار ہم کو لے کر سانپ کی طرح لہراتی، مڑتی اور پیچ کھاتی پہاڑی چڑھائیوں اور راستوں پر گزر رہی تھی۔

بحرالمیت

ہم لوگ بحرالمیت یا بحیرۂ لوط کے قریب سے گزرے، لوگ کہتے ہیں کہ وہ سدوم نامی بستی کے قریب ہے جس مین قوم لوط رہتی تھی۔ یہ جھیل اسی الٹی ہوئی عذاب یافتہ بستی سے بنی ہے، خدائے بزرگ وبرتر نے سچ فرمایا ہے۔

وانها لبسبيل مقيم وانكم لتمرون عليها مصبحين وبالليل افلا تعقلون.

(شیخ عبدالوہاب نجار نے اپنی کتاب قصص الانبیاء میں لکھا ہے " میرا خیال یہ ہے کہ ' بحرمیت جو اس وقت بحیرہ لوط کے نام سے مشہور ہے، اس واقعہ سے پہلے نہیں تھا۔ اس سخت زلزلہ کے سبب وجود میں آیا جس نے بستی کو الٹ دیا اور وہ سطح سمندر سے چار سو کلومیٹر نیچی ہوگئی، گذشتہ ۱۹۳۰ء و ۱۹۳۱ء میں ہم کو معلوم ہوا کہ قوم لوط کی آبادی کے آثار بحرمیت کے گرد نکلے ہیں) عمان وقدس کے درمیان کا علاقہ بعض بعض جگہ سطح سمندر کے برابر نشیب میں ہے۔

دریائے اردن

ہم لوگ دریائے اردن کے پاس سے گزرے جس کو اب نہر شریعہ کہا جاتا ہے، یہی نہر شرق اردن اور فلسطین کے درمیان حد فاصل ہے۔ ہم جیسے جیسے بیت المقدس سے

قریب ہوتے جاتے سطح زمین میں بلندی اور موسم میں تبدیلی محسوس کرتے۔ غروب آفتاب کے ساتھ ساتھ ہم اس زمین مقدس میں داخل ہوگئے۔ جس سرزمین اور اس کے نواحی حصّوں میں اللہ تعالیٰ نے برکت دی ہے۔

مسجد اقصیٰ میں

ہم لوگ باب الزہرۃ میں اترے اور زاویۃ الہنود کی طرف چلے وہاں ایک کمرہ میں اپنا سامان رکھ دیا اور مغرب کی نماز پڑھی۔ بازار میں رات کا کھانا کھایا اس کے بعد سرائے کے ایک خادم کی رہنمائی میں مسجد اقصیٰ کا رخ کیا۔ رات بہت تاریک تھی، روشنی بہت کمزور، آثار اچھی طرح نظر نہیں آتے تھے۔ صخرہ کے پاس سے گزرے اور مسجد کے جنوبی حصہ میں قبلہ کے رخ سے داخل ہوئے جس کو اس وقت مسجد اقصیٰ کہا جاتا ہے، حالانکہ چہار دیواری کے اندر پورا حصہ مسجد اقصیٰ تھا جس کے اردگرد اللہ تعالیٰ نے برکت دی، بہرحال ہم لوگ مسجد میں داخل ہوئے، عشاء وتراویح پڑھی، واپسی میں سنا کہ شیخ محمد صادق مجددی سفیر افغانستان برائے مصر مسجد کے ایک کمرہ میں مقیم ومعتکف ہیں۔ ہم ان کے پاس گئے۔ سلام کیا اور ملاقات کر کے قیام گاہ واپس آگئے۔ ہم خاصے تھکے ہوئے تھے۔

دوشنبہ ۲۷/۹/۱۳۷۰ھ مطابق ۲/۷/۱۹۵۱ء

ہم لوگ ہندوستانی خانقاہ کے شیخ، شیخ انصاری سے ملے پھر مسجد گئے اور دن بھر مسجد ہی میں رہے، بڑا لطف آیا، بہت سکون واطمینان محسوس ہوا۔

محترم شیخ محمد صادق کی ضیافت میں

جب ہم مغرب کی نماز پڑھ کر لوٹے تو کیا دیکھتے ہیں کہ افغانی سفیر شیخ محمد صادق مجددی کے پوتے برادرم صبغۃ اللہ مجددی ہمارے منتظر ہیں۔ (۱) انھوں نے ہم کو بتایا کہ

---

(۱) شیخ صبغۃ اللہ مجددی افغانی مجاہدین کے روس کے خلاف جہاد میں سرخیل رہے اور جب ان مجاہدین کی افغانستان میں حکومت قائم ہوئی تو یہ اس کے پہلے صدر بنے، مگر افسوس کہ زیادہ دن اسلامی اقتدار قائم نہ رہ سکا اور مغرب کی سازش کا شکار ہوگیا۔ (مترجم)

سفیر محترم کھانے پر ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔ان کے ساتھ ہم کھانے میں شریک ہوئے۔ سفیر محترم نے ہم سے کہا کہ ہم انھیں کے ساتھ قیام کریں۔اس لئے کہ سرائے مسجد سے دور ہے، رات کو وہاں جانے میں دشواری ہے، ہم نے اس کو رحمت خداوندی تصور کیا اور ان کے ساتھ آرام وکشادگی کے ساتھ رہے۔یہیں بیت المقدس کے کچھ لوگوں سے ہماری ملاقات ہوئی جو سفیر موصوف سے ملنے آئے تھے۔ان میں اوقاف کے منتظم امام سید فواد اور حرم کے انسپکٹر بھی تھے۔شیخ محمد صادق (۱) مجددی ہر سال بیت المقدس میں اعتکاف کرتے ہیں لہٰذا وہ سب میں محبوب ومشہور ہیں۔ان کی قیام گاہ ملاقاتیوں ودوستوں سے ہمیشہ بھری رہتی ہے۔

سہ شنبہ ۲۸/۹/۱۳۷۰ھ مطابق ۳/۷/۱۹۵۱ء

مولانا محمد علی جوہر کی قبر پر

ہم دن بھر مسجد ہی میں رہے، گھبرانے واکتانے کا کوئی سوال نہ تھا، مسجد کے ہر گوشے میں گھومے پھرے اور ہندوستان کے بڑے اسلامی لیڈر اور مشہور مجاہد مولانا محمد علی جوہر رحمۃ اللہ علیہ کی قبر پر حاضر ہوئے۔دعائے رحمت ومغفرت کی۔ہمیں ان کا وہ زمانہ یاد آ گیا جب وہ ہندوستان کے محبوب قائد اور ملک کے بے تاج بادشاہ تھے۔حیرت ہوئی کہ وہ کہاں ہندوستان میں پیدا ہوئے۔انگلینڈ میں پڑھا، لندن میں موت پائی اور قدس میں مدفون ہوئے۔یہ خدا کا فضل ہے جس کو چاہتا ہے نوازتا ہے، مولانا محمد صادق مجددی نے غیر معمولی محبت وعنایت اور عزت واکرام کا برتاؤ کیا۔

شیخ محمد صادق مجددی کے معتکف میں

ان کی جائے اعتکاف مغرب کے نماز کے بعد ایک بڑی بارونق وپُر بہار محفل بن

---

(۱) کابل کے مجددی خاندان کے گل سرسبد، اور نور المشائخ بملا شور بازار کے چھوٹے بھائی، افغانستان کے انقلاب میں ان کا بڑا ہاتھ تھا، عرصہ تک بیک وقت کئی عرب ملکوں کے سفیر رہے، اس عہدہ سے سبکدوش ہونے کے بعد مدینہ طیبہ میں خانہ نشین ہو گئے تھے، رابطہ کے مجلس تاسیسی کے ممبر رہے ۱۹۷۶ء میں وہیں انتقال ہوا، جنۃ البقیع میں آسودہ خاک ہوئے

جاتی ہے۔ شہر کے ہر طبقہ کے لوگوں پر مشتمل ایک مجلس ہوتی ہے جس میں مسجد شریف کے خدّام اور محافظ، اونچے درجے کے ملازمین وعلماء موجود ہوتے ہیں ان کا دسترخوان بڑا وسیع ہوتا ہے جس پر نوع بنوع کے کھانے اور قسم قسم کے مہمان جمع ہوتے ہیں، ایسا معلوم ہوا جیسے ہم کابل کی کسی افغانی دعوت میں ہوں، یہیں پر حرم کے شیخ سید توفیق الحسینی سے میرا تعارف ہوا۔ وہ بڑے باوقار وشائستہ شخص ہیں۔

مسئلہ فلسطین سے متعلق کچھ حقائق

ذکر المیہ فلسطین کا چل نکلا۔ ان سے ہمیں دردناک حقائق معلوم ہوئے فرمایا کہ عرب حکومتوں اور عرب لیگ کے ذریعہ یہود جہاں تک پہونچ گئے وہ اس کا خواب نہیں دیکھ سکتے تھے۔ وہ تو سرزمین فلسطین کی ایک بالشت زمین کو بھی غنیمت جانتے تھے مگر اس کو کیا کیجئے کہ عرب حکومتوں ہی نے ان کو موقع دینا شروع کیا اور ملک کے بڑے حصہ پر قابض کرادیا جو ان کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا۔ انھوں نے مناسب انداز میں عرب لیگ کو ملامت کی، جس سے مسلمانوں سے زیادہ یہود نے فائدہ اٹھایا۔

عرب رہنماؤں کی پستی کردار

انھوں نے بیان کیا کہ وہ ایک جلسہ میں گئے جس کو سفیر سوریہ برائے مصر نے منعقد کیا تھا۔ اس جلسہ میں بڑے بڑے ذمہ دار اور عرب کے وزراء شریک ہوئے، محفل میں شراب کا دور چلا۔ میں ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے یہ منظر دیکھتا رہا۔ وہ برابر جام پر جام چڑھاتے رہے یہاں تک کہ ان پر اچھی طرح نشہ طاری ہوگیا اور شراب رگ رگ میں دوڑ گئی، ان کی یہ حالت ہوگئی کہ وہ مردوں کی طرح اٹھا اٹھا کر موٹروں پر سوار کئے گئے اور اپنے ہوٹلوں کو پہنچائے گئے۔ بھلا ان عربوں اور مسلمانوں سے کسی خیر کی امید کی جاسکتی ہے؟

اس کے بعد انھوں نے عرب ملکوں کی فوج کے رسوا کن اخلاق، شراب نوشی وفسق

وفجور اور ایسے جرائم کے ارتکاب کا ذکر کیا۔ جو میدان جنگ اور سرحدوں کی حفاظت کی حالت میں بھی خدا کی ناراضگی اور اس کے غضب کا سبب ہیں، اس گفتگو سے میں عرب فوجوں کی شکست کے بعض اسباب سمجھ گیا۔

چہارشنبہ ۲۹/۷/۱۳۷۰ھ مطابق ۴/۷/۱۹۵۱ء

عید کا چاند نہیں ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے ماہ مبارک کا ایک دن اور بڑھا دیا۔

فلسطین ہی سے متعلق ایک بات

سفیر محترم شیخ محمد صادق مجددی نے الهيئة الدينية العلمية کے سکریٹری (جو مصر کے ہیئۃ کبار العلماء کی طرح ایک مجلس ہے) استاذ اسعد امام الحسینی سے تعارف کرایا، یہ کمیٹی حکومت کے دینی امور کی نگرانی کرتی ہے۔ استاذ اسعد عالم جو پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ المیۂ فلسطین کے زمانہ کا انھوں نے آنکھوں دیکھا حال بیان کیا۔

انھوں نے بتایا کہ بیت المقدس پر تابڑ توڑ بم برسائے جارہے تھے، مگر صخرہ پر کوئی بم نہ پڑ سکا۔ صخرہ اور مسجد دونوں محفوظ رہے۔

عالم اسلام بحر عروض کی طرح ہے

پھر انھوں نے کہا کہ بالآخر میں احمد حلمی باشا کے پاس گیا وہی قدس کے فوجی حاکم تھے میں نے ان سے صورتحال بیان کی، انھوں نے کہا کہ اس کا حل ہی کیا ہے میں نے کہا کہ یہ خبریں پورے عالم اسلام میں پھیلائی جائیں۔ یہ مقامات مقدسہ ہمارے ہی نہیں بلکہ سارے مسلمانوں کے ہیں۔ انھوں نے میری اس تجویز سے اتفاق کیا، اور اس کام کو میرے ہی سپرد کیا۔ پھر ہم ریڈیو کے ذریعہ مسلسل کئی گھنٹے تک ان حالات کو نشر کرتے رہے اور بیت المقدس کو ڈھانے کی جو مہم جاری تھی اس کی اطلاع کرتے رہے لیکن کسی کے کان پر جوں نہ رینگی۔ میں نے کہا محترم عالم اسلام ہے کہاں؟ وہ تو بحر عروض..... کے مانند ہے جس میں پانی کا ایک قطرہ نہیں۔

اخلاقی انحطاط بھی

استاذ اسعد نے مجھ سے وہ بعض باتیں بیان کیں جو مسلمانوں کے اخلاقی زوال کو بتاتی ہیں۔فرمایا۔ایک مرتبہ مسجد اقصیٰ کے امام حاضر نہ تھے تو خطبۂ جمعہ یا خطبۂ عید (صحیح یاد نہیں) میرے ذمہ کیا گیا،فرمایا میں نے خطبہ دیا تو اس میں المیۂ فلسطین کے اسباب بیان کئے اور حال و ماضی کا موازنہ کیا۔میں ابھی مسجد سے نکلا بھی نہ تھا کہ حکومت برطانیہ کے مقرر کردہ حاکم کو اطلاع پہونچائی جا چکی تھی اور مجھ سے جواب طلب ہوا، اسی طرح کی اور باتیں،استاذ اسعد نے مجھے بتایا کہ الہیئۃ العلمیۃ الاسلامیۃ کچھ دنوں میں اپنا ایک جلسہ منعقد کرے گی،اس کے .....اراکین ۵رشوال کو جمع ہوں گے،انھوں نے ہمیں بھی جلسہ میں آنے کی دعوت دی اور وعدہ کیا کہ مجلس کے صدر شیخ محمد الامین الشنقیطی سے تعارف کرائیں گے۔

مسجد اقصیٰ میں میرا احساس

آج میں مسجد ہی میں رہا اس کے وسیع صحن اور دور تک پھیلے ہوئے رقبہ میں چہل قدمی کرتا رہا اور اس کے اردگرد کے مناظر دیکھتا رہا،میں کوئی صاحب کشف وادراک تو نہیں مگر میں ایسا محسوس کر رہا تھا جیسے مسجد میں ایک افسردگی کی کیفیت طاری ہے اور وہ اپنے اصلی قدردانوں اور وفاداروں پر نظر لگائے ہوئے ہے جیسے وہ بڑے ہی برے اور پرخطر دنوں کا اشارہ دے رہی ہے،میرے دل میں رنج وغم کا طوفان امڈ آیا اور قلب کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔

فلسطینی مسلمان

میں نے فلسطینی مسلمانوں کو پردیسی اور یتیموں کے حال میں دیکھا نہ وہ کسی طرح کی عزت محسوس کرتے ہیں نہ مستقبل کے بارے میں ان کو کوئی اعتماد و بھروسہ ہے۔ان کے دل ٹوٹے ہوئے اور سر جھکے ہوئے تھے۔وہ قریب کے گاؤں اور قدس کے نواحی علاقوں

سے بڑی تعداد میں جمع ہوتے تھے۔ظہر وعصر کی نماز میں مسجد اقصیٰ میں نمازیوں کی بہت بڑی تعداد تھی۔وہ نماز بعد بیٹھ کر تلاوت میں مصروف ہو جاتے، یا وعظ وارشاد کی مجلسوں میں شریک ہو جاتے جو انھیں کی خاطر ہوتیں، میں جس کسی کے پاس بیٹھا اس کو شکستہ خاطر اور زخم خوردہ پایا، وہ ایسے ایسے واقعات بیان کرتا جو آنکھوں کو اشکبار اور دل کو غمزدہ بنا دیتے، وہ عرب زعماء وملک کے قائدین پر تنقید کرتا جیسے پورا فلسطین بزبان حال کہہ رہا تھا:۔

میرا دل زخمی ہے کوئی ہے جو صحیح سالم دل کے بدلے میں اس کو لے لے، بھلا یہ لوگ کیوں قبول کریں گے، اس کو کیوں لیں گے۔کیا اچھے مال کے بدلے کوئی کھوٹا مال لیتا ہے۔

میں وعظ وارشاد کے حلقوں میں پھرا کہ دیکھوں کہیں کچھ روح نظر آتی ہے۔کوئی دردمند اور انجام وعواقب کی گہرائیوں میں غوطہ زن دل نظر آتا ہے، کہیں اس ذلت ورسوائی کے حقیقی اسباب کا جویا ملتا ہے۔مگر یہ نایاب شے کہیں نہیں ملی۔ہاں ایک شخص کو دیکھا جو عام وسادہ لباس میں کہہ رہا ہے۔میرے بھائیو کیا میں تم کو خدا کی ان نافرمانیوں اور گناہوں سے ڈراتا نہیں تھا۔اس کے انجام وعواقب سے آگاہ نہیں کرتا تھا۔اس وقت تو تم یہ کہہ کر ٹال جاتے تھے کہ شیخ نیک آدمی وصوفی ہیں۔آخر تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔وہ گناہوں اور خدا کی نافرمانی کے بارے میں باتیں کر رہے تھے اور بتا رہے تھے کہ یہ خدا کی خدائی کے خلاف بغاوت وناشکری اور عارفین کی باتوں کی ناقدری کا نتیجہ ہے۔میں نے دیکھا کہ جب بھی وہ تقریر کے لئے کھڑے ہوتے لوگ ان کے گرد جمگھٹا لگا لیتے اور دوران تقریر کوئی وہاں سے نہ اٹھتا۔بظاہر وہ عالم نہیں معلوم ہوتے تھے، اگر کوئی ان سے علمی سوال کرتا تو پہلو میں بیٹھے ہوئے ایک عالم کی طرف اشارہ کرتے، جب یہ عالم بات کرنے لگتا تو لوگ تتر بتر ہونے لگتے۔

حقیقتاً اہل دل ہی لوگوں پر حکومت کرتے ہیں

میں نے ہمیشہ یہی دیکھا کہ حقیقتاً اہل دل ہی لوگوں پر حکومت کرتے ہیں۔میں نے دیکھا کہ علماء اتنا اثر نہیں ڈال سکتے جتنا ان کا اثر پڑتا ہے۔

فلسطین وسوریہ والوں کے حساب سے آج رمضان کی ۳۰ تاریخ تھی، ہم لوگوں نے چاند دیکھا۔ اور شیخ مجددی کے ساتھ رات کا کھانا کھایا۔ شہر کے بہت سے سربرآوردہ اور اعلیٰ افسران ان کو مبارکباد دینے اور سلام کرنے آئے میں نے موقع کو غنیمت جان کر عید کی مناسبت سے ایک تقریر کی۔

جمعرات یکم شوال ۱۳۷۰ھ۔ ۵/۷/۱۹۵۱ء

عید کی نماز مسجد اقصیٰ میں

عید کا اعلان کرنے کے لئے توپیں سر ہوئیں اور طلوع آفتاب کے بعد ہی سے لوگ کشاں کشاں مسجد اقصیٰ کی طرف آنے لگے فوج کا ایک دستہ اپنے فوجی لباس میں مسجد اقصیٰ کے دروازے پر کھڑا ہو گیا۔ ہم لوگوں نے مسجد اقصیٰ میں عید کی نماز پڑھی۔ خطیب نے مناسب خطبہ دیا اور ملک عبداللہ کے لئے دعا کی۔ یہ ایسی عید تھی جیسے اسلامی مملکت میں ہونے والی عید کی نقل ہو۔

پھیکی عید

میں نے محسوس کیا کہ جیسے عید پھیکی پھیکی سی ہے، لوگ صرف عید کا لباس زیب تن کئے ہوئے ہیں۔ طبیعتیں اندر سے پژمردہ اور غمزدہ ہیں اور وہ بہ تکلف خوش ہونے اور بناوٹی مسرّت ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور ایک دوسرے کو مبارکباد دیتے ہیں۔ حقیقت حال اس کے برعکس ہے، دردوالم، فرحت ومسرت کے جذبات سے ٹکراتے ہیں اور اس پر غالب آجاتے ہیں، میرا غم بھی آج تازہ ہو گیا، کوئی خوشی ونشاط نہیں محسوس ہوا۔ میں شیخ مجددی کے کمرے کی طرف لوٹا یہاں ہر طبقہ کے لوگ آتے اور شیخ کو مبارکباد اور سلام پیش کرتے۔

ایک اچھی دعوت

شیخ مجددی مجھے اپنے ساتھ لے کر مفتی امین الحسینی کے ایک عزیز، استاذ ابوسعید کے یہاں گئے جہاں ہم نے دوپہر کا کھانا کھایا۔

افغانی بغاوت کی کہانی شیخ مجددی کی زبانی

مجددی صاحب نے مجھ سے شاہ امان اللہ کے خلاف ہونے والی بغاوت، اس کے اسباب ومحرکات اور باشاہ کے سفر یورپ اور وہاں سے واپسی کے بعد ان کے ناعاقبت اندیشانہ رویہ کا قصہ بیان کیا۔ مثلاً عورتوں کی آزادی و بے حجابی اور ان کا ایک وفد بنا کر ترکی بھیجنا، خود ان کی حرم کا بے پردہ ہونا اور اس سے افغانی قوم میں اشتعال کا پیدا ہونا اور سیّد مجددی کا بادشاہ کو کابل جاتے ہوئے ان باتوں سے آگاہ کرنا اور ان کو اس بات کی نصیحت کرنا کہ ملکہ جس حال میں ملک سے گئی ہیں اسی حال میں واپس آئیں اور پھر بادشاہ کا ان کی باتوں پر کان نہ دھرنا اور ملکہ کا بے پردہ ہی ملک میں داخل ہونا اور بادشاہ کا مجددی صاحب سے ترک کلام کر دینا جبکہ اس سے قبل وہ شیخ کے گھر آ کر ملتے تھے اور اہل خانقاہ کے لئے جو کھانا پکتا اس میں بطور تبرّک کچھ کھاتے تھے۔ اس سے بڑھ کر ان کا شیخ کو قید کر دینا اور بغاوت کا ہو جانا پھر شیخ کے بعض ساتھیوں کو پھانسی دے دینا اور شیخ کو اس شرط پر رہا کرنے کا اعلان کہ شیخ بغاوت کو ختم کرائیں اور حبیب اللہ (بچہ سقہ) کو سمجھائیں پھر شیخ کا معذرت کر دینا کہ معاملہ ان کے ہاتھ سے نکل کر حبیب اللہ کے اقتدار میں آ گیا ہے جو بچہ سقہ کے نام سے مشہور ہے، شیخ نے پیرس سے ملک نادر خاں کے آنے اور بغاوت فرو کرنے کی آخری داستان کو بیان کیا۔ یہ معلومات صحیح مآخذ سے حاصل ہوئیں۔ عربی محاورہ کے مطابق حقیقت کو اس کے اصل واقف کار سے زیادہ بہتر کون بتا سکتا ہے۔

یہاں سے ہم لوگ مسجد اقصیٰ واپس آئے پھر میں اور برادرم مولانا عبیداللہ (بلیاوی) شیخ یعقوب بخاری کے پاس گئے جو بخاریوں کی خانقاہ کے شیخ ہیں۔ ہمارے ساتھ الحاج مفتی امین الحسینی کا ان کے نام ایک خط تھا۔ انھیں وہ خط دیا تو انہوں نے اس کو سر پر رکھا اور مفتی صاحب کی تعریف کی پھر ہم لوگ بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔

ملک شریف حسین کی حسرت وندامت

ان معمّر بزرگ نے یہ واقعہ سنایا کہ ایک مرتبہ وہ حضرت مفتی امین الحسینی صاحب

کے ساتھ شریف حسین کی عیادت کو عمان گئے، یہ ان کا مرض الموت تھا۔ میں مفتی صاحب اور شاہ عبداللہ بن شریف حسین کے ساتھ ان کے پاس گیا ملک کا یہ حال تھا کہ وہ..... زمین پر لگے ہوئے ایک بستر پہ لیٹے تھے اور ڈاکٹر ان کے پاؤں کے پاس کھڑا تھا۔ جب ہم لوگوں کو دیکھا تو اشارہ کیا کہ مجھے بٹھاؤ لوگوں نے ان کو بٹھایا جب چھوڑا تو بستر پر چت گر پڑے کچھ دیر بعد آواز دی عبداللہ! انھوں نے فرمایا حاضر ہوں، تب انھوں نے کہا کہ یہ میرے جرم کی سزا ہے تم عبرت ونصیحت حاصل کرو۔ یہ فرمایا اور سب کی آنکھیں بھر آئیں۔ ملک عبداللہ تو رو پڑے اور ان کے رونے کی آواز بلند ہوگئی۔ پھر ہم نے ان سے رخصت ہو کر لوٹنے کا ارادہ ظاہر کیا تو ملک عبداللہ نے مفتی صاحب سے رکنے اور کھانا کھانے کا اصرار کیا۔ مفتی صاحب نے بڑے اصرار سے معذرت کی اور دعوت قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ رات کا وقت تھا سخت ٹھنڈک تھی میں نے ان سے نہ رکنے کا سبب پوچھا تو فرمایا کہ ہم اپنے گھر کھانا کھائیں یہ اس سے بہتر ہے کہ ملک عبداللہ کی مہمانی میں کھانا کھائیں۔ یہ قصہ دو دفعہ..... پیش آیا۔

قدس اور الخلیل کے درمیان

ہم شیخ یعقوب کے پاس سے لوٹے اور مجددی صاحب کی معیت میں سیّدنا ابراہیم خلیل اللہ کے نام سے موسوم شہر الخلیل کی طرف گئے۔ راستہ میں معلوم ہوا کہ شہر قدس سے دور نہیں ہے۔ لیکن یہودی نو آبادی نے بیچ میں حائل ہو کر قدس اور الخلیل کے راستہ کو طویل کر دیا ہے۔ ہم لوگ پناہ گزینوں کے پاس سے گزرے، ان کو انتہائی خستہ و برے حال میں دیکھا۔ ہم لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جائے ولادت بیت اللحم سے گزرے اور خلیل کے پاس نماز پڑھی، پھر حیفا کے سابق مفتی اور الہیئۃ العلمیۃ الاسلامیۃ کے رکن شیخ یوسف طہبوب کے گھر پر رکے اور چائے پی۔

مسجد خلیل میں

پھر ہم لوگ مسجد خلیل کی طرف گئے اور سیدنا ابراہیم علیہ الصلاۃ والتسلیم کے مزار کی اوپر

سے زیارت کی۔ یہ وہ دوسری قبر ہے جس کے ثبوت پر مدینہ منورہ کے روضۂ اطہر کے بعد اتفاق ہے۔

شیخ محمد علی الجعبری کے دولت خانے پر

یہاں سے ہم لوگ بلدیہ خلیل کے میر شیخ محمد علی الجعبری کے گھر گئے اور ان کے یہاں قیام کیا۔ عید کی مبارکباد دینے والے مسلسل ان کے پاس آتے اور تھوڑی دیر بیٹھتے، صاحب خانہ کو مبارکباد دیتے پھر سیّد مجددی صاحب کو سلام کرتے اور واپس ہو جاتے پھر دوسرا گروہ آتا۔ رات گئے تک یہ سلسلہ جاری رہا، ملاقات کی کئی تقریبیں جمع ہوگئی تھیں، مثلاً عید، شیخ مجددی کی تشریف آوری جو خلیل میں بہت مشہور ہیں اور ان کی یہ آمد سالانہ ہوتی ہے، ان دونوں باتوں کے ساتھ میونسپلٹی کے انتخاب کا قریب ہونا چنانچہ شیخ کا گھر ملنے والوں اور مبارکباد دینے والوں سے بھرا ہوا تھا۔ ایک جماعت آتی، اور دوسری واپس جاتی، ان کو چائے، قہوہ، چاکلیٹ اور ٹافیاں پیش کی جاتیں ہم لوگوں نے رات کا کھانا کھایا اور سو گئے۔

جمعہ ۲/۱۰/۱۳۷۰ھ، ۶/۷/۱۹۵۱ء

مسجد کے بارے میں میرے تأثرات

ہم نے فجر کی نماز سیّدنا ابراہیم علیہ السلام کی مسجد میں پڑھی اور وہاں اشراق کے وقت تک رہے مجھے ان کے جوار میں ان آیتوں کے پڑھنے میں بڑا لطف آیا، جن میں اللہ تعالیٰ نے اپنے خلیل ابراہیم علیہ السلام کا قصہ اور والد وقوم سے ان کی گفتگو، نیز بتوں کے توڑنے، دعوت توحید و ہجرت، اور.....ان کی مقبول دعاؤں اور کعبہ کے بنانے کا ذکر کیا ہے اور ان کے اخلاق و کردار پر روشنی ڈالی ہے، مجھے شوق ہوا کہ میں ان سب کو پڑھوں اور غور کروں از سر نو ان کا جائزہ لوں، میں نے ان آیتوں کے پڑھنے میں ایک نئی لذّت محسوس کی اور جمعہ کے بعد اپنی تقریر میں لوگوں کو اس کی طرف متوجہ کیا میں نے ان کو مشورہ دیا کہ وہ ان آیات پر غور کریں اور ان کو پھر سے پڑھیں، وہ ان میں نئے نئے مضامین پائیں گے۔

شیخ جعبری نے ہمارے تعارف کی غرض سے شہر کے علماء کی ایک معتد بہ تعداد کو جمع کیا ان لوگوں نے ہمارے ساتھ ان کے گھر میں دوپہر کا کھانا کھایا اور کھانے کے بعد ہم سے گفتگو کی، ان کے گھر میں شہر کے لکھے پڑھے اور دیندار لوگ برابر آتے جاتے رہے۔ یہ سلسلہ تقریباً نصف شب تک جاری رہا۔ ہم لوگ خلیل شہر میں چلے پھرے سیر کی، یہ ایک خوبصورت اور فلسطین کے گرمی گزارنے والے مقامات میں سے ایک مقام ہے۔ لوگوں نے بتایا کہ وہ سطح سمندر سے ۴/ہزار فٹ بلندی پر ہے۔ بلد خلیل کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ وہاں کی آبادی میں عیسائی بالکل نہیں ہیں، شہر والوں نے ایک سال ہنگامہ کر کے شہر کو یہودیوں سے خالی کروایا تھا، جو مارے گئے وہ تو مارے گئے، باقی چلے گئے، بلد خلیل کے رہنے والوں میں ایک رعب و دبدبہ اور طبیعت کی بلندی ہے جو ان کا امتیاز ہے۔ اور اس پر ان کو فخر بھی ہے، اللہ اس کو اسلام کی خاطر محفوظ رکھے، یہاں سے ہم بیت المقدس واپس آئے۔ اخوان المسلمین کے احباب نے ہم کو (وامعتصماہ) کے قصہ کا ڈرامہ دیکھنے کی دعوت دی ہم نے معذرت کر دی۔

شنبہ ۳/۱۰/۱۳۷۰ھ مطابق ۷/۷/۱۹۵۱ء

مسجد اقصیٰ

ظہر بعد ہم لوگوں نے شہر خلیل کو خیر باد کہا اور عصر زاویۃ الہنود (۱) میں پڑھی اور شیخ اسعد حسینی سے ان کے مکان پر ملاقات کی۔ پھر شیخ یعقوب بخاری کی ملاقات کو گئے ہم پہونچے تو وہ بخاریوں کے ساتھ کھانا کھا رہے تھے، انھوں نے ہم کو بھی کھانے میں شریک کیا اور عشاء بعد مسجد اقصیٰ گئے پھر زاویۃ الھنود واپس آ گئے۔

یکشنبہ ۴/۱۰/۱۳۷۰ھ مطابق ۸/۷/۱۹۵۱ء

زاویۃ الہنود میں

آج اشراق کے بعد میں مسجد اقصیٰ گیا تا کہ جن دنوں کی ڈائری نامکمل ہے۔ اس

(۱) یہ ہندوستانیوں کے قیام کے لئے کسی صاحب خیر نے ایک سرائے تعمیر کر کے وقف کی تھی۔

کی تکمیل کروں، مسجد جاتے ہوئے راستہ میں ایک معزز بزرگ کے پاس سے گزر ہوا۔ تھوڑی دیر ان کے پاس ٹھہرے اور گفتگو کی ۔ وہ بڑی دلچسپ گفتگو کرنے والے اور انگریزوں سے سخت غصہ رکھتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ دنیا کی کوئی ایسی برائی نہیں جس کا انگریزوں سے تعلق نہ ہو۔ اگر کسی دن آپ کو معلوم ہو کہ سمندر کی مچھلیوں میں جنگ چھڑ گئی تو سمجھ جایئے کہ اس جنگ کے بھڑکانے والے انگریز ہیں ۔ اگر آپ میاں بیوی میں ناچاقی دیکھیں تو تصور کریں کہ اس کا سبب بھی انگریز ہیں۔ فلسطینی بلاشبہ یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ مقدس شہروں کو اجاڑنے اور ویران کرنے عربوں کو جلاوطن کرنے اور ادھر ادھر ان کو منتشر کرنے کے اصل سبب انگریز ہی ہیں۔

ان آوارہ گرد یہودیوں کو فلسطین پر مسلط کرنے کے مجرم انگریز ہی ہیں فلسطین کے مسلمانوں پر مصائب لانے والی یہی قوم ہے، اس میں شک نہیں کہ دنیا کے اندر فساد، بگاڑ اور تباہی لانے کا سب سے بڑا سبب انگریز قوم ہی ہے ۔ یہ شیخ مفتی امین الحسینی کی بڑی تعریف کرتے رہے ان کی پاکبازی اور دست وشکم کے اعتبار سے احتیاط ونزاہت کی شہادت دیتے رہے۔ مسجد اقصیٰ اور قدس کے جن لوگوں سے ہم ملے سب کو مفتی صاحب کی تعریف کرتے سنا اور ان کا مشتاق وفریفتہ پایا، میں مسجد اقصیٰ گیا اور ظہر کے وقت تک لکھنے میں مشغول رہا۔

مسجد اقصیٰ کے آثار کی زیارت

عصر کی نماز کے بعد ہم شیخ توفیق الحسینی سے ملے انھوں نے ہم کو ان دیواروں کے پاس گھمایا جن کو ''المبکی'' (یہودیوں کی دیوار گریہ) کہا جاتا ہے، انھوں نے ہم کو بتایا کہ یہود کے ہاتھوں تورات کے جو دس احکام ضائع ہوئے ان کا عقیدہ ہے کہ وہ مسجد اقصیٰ کے کسی حصہ میں کھوئے ہیں اور کہیں دب گئے ہیں چونکہ اندر ان کا داخلہ منع ہے اس لئے وہ اس دیوار کے پاس کھڑے ہو کر روتے ہیں یہ دیوار قدیم فصیل کا ایک باقی ماندہ جز ہے۔

ہم لوگ شیخ کے ساتھ بڑے تہ خانے میں اترے جہاں عظیم الشان عمارتیں اور اونچے

اونچے ستون ہیں، لوگ بیان کرتے ہیں کہ وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے اصطبل تھے ہم لوگ مسجد اقصیٰ کی چہار دیواری کے اردگرد گھومے اس کا اکثر حصہ رہنے والوں سے خالی اور ویران اور سنسان ہے۔ یہ منحوس وظالمانہ تقسیم سے پہلے عربوں سے آباد اور رہنے والوں سے بھرا ہوا تھا۔

ہم لوگ مسجد کے جنوبی کونے میں واقع اخوان المسلمین کے مرکز میں داخل ہوئے یہ مؤتمر عالم اسلامی کا مرکز تھا۔ ہم لوگ ان احباب کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کرنے لگے، مغرب کی نماز مسجد صخرہ میں پڑھی اور مسجد کے امام جناب اسعد کے پاس گئے اور ایک پارٹی کے ساتھ جس کو انہوں نے ہمارے ساتھ رات کے کھانے پر بلایا تھا۔ کھانا کھایا۔ مسجد صخرہ ہی میں عشاء پڑھی اور خانقاہ آ گئے۔

دوشنبہ ۵/۱۰/۱۳۷۰ھ مطابق ۹/۷/۱۹۵۱ء

الھیئۃ العلمیۃ الاسلامیۃ کے اجتماع میں

صبح نو بجے ہم لوگ الہیئۃ العلمیۃ الاسلامیۃ کے جلسہ میں شرکت کے لئے مرکز اوقاف میں حاضر ہوئے وہ اس المجلس الاسلامی الاعلیٰ کی عمارت ہے جو پورے فلسطین کی اسلامی زندگی کی نگرانی کرتی تھی اور مفتی امین الحسینی کی زیر صدارت اوقاف اور دینی معاملات کو چلاتی تھی، وہی عمارت اس وقت اوقاف کا دفتر ہے اور اسی میں مجلس کے جلسے ہوتے ہیں، یہ کیسی سچی تصویر ہے اس آیت کی تلک الایام نداولھا بین الناس (ہم ان دنوں کو لوگوں میں الٹتے پھیرتے رہتے ہیں) استاذ اسعد الحسینی نے مجھے مجلس کے صدر الشیخ محمد الامین الشنقیطی کی طرف بڑھایا وہ اردنی مملکت کے وزیر کے رتبہ کے آدمی ہیں اور جلالۃ الملک عبداللہ کے سکریٹری ہیں اس سے قبل وہ وزیر تعلیم اور چیف جسٹس تھے۔

جلسہ میں میری تقریر

شیخ شنقیطی مجھ سے بشاشت وخیر مقدم کے الفاظ کے ساتھ ملے اور ہندوستان

وہاں کے علماء، ان کی کوششوں اور جذبہ کی تعریف کی اور مجھے مجلس کے اراکین کی طرف بڑھایا اور مجھ سے فرمایا کہ جو میرے دل میں آئے اور ان کے لئے مفید سمجھوں گفتگو کروں، چنانچہ میں نے پناہ گزینوں کے مسئلہ میں ان کو توجہ کرنے، علماء سے ربط قائم کرنے، اور ان میں دینی دعوت پھیلانے اور دینی روح بیدار کرنے اور غیرت اسلام کا جذبہ پیدا کرنے کو کہا، تاکہ وہ ان سخت حالات کا مقابلہ کرسکیں، وہ عیسائیت وکمیونزم کی تحریک کا مقابلہ کرسکیں جو پناہ گزینوں کی مدد کے نام سے ان میں بڑی سرگرمی کے ساتھ جاری ہے۔ تاکہ وہ اس مصیبت کو جھیل سکیں اور مومنانہ ومجاہدانہ شان کے ساتھ اس منزل ابتلاء سے گزر سکیں، میں نے ان سے کہا کہ یہ حالات وقتی ہیں زیادہ دنوں تک نہ رہیں گے، جن کا مقابلہ ایسے قوی ایمان، سرگرم دعوت، نشاط وذوق ہی سے کیا جاسکتا ہے جس کے اپنانے والے کو مجنوں وپاگل کہا جائے۔ میں نے ان سے ہندوستان کے دعوتی مراحل کا ذکر کیا جو میرے رسالہ (الدعوۃ الاسلامیۃ فی الہند وتطوراتہا) کا خلاصہ تھا، شیخ شنقیطی نے مناسب جوابی تقریر کی اور میرا شکریہ ادا کیا اور اس پہلو کی طرف توجہ کرنے کا وعدہ کیا۔

الہیئۃ العلمیۃ الاسلامیۃ کے متعلق کچھ معلومات

مناسب ہوگا کہ میں الہیئۃ العلمیۃ الاسلامیۃ کا تعارف کرادوں، جیسا کہ مجھ کو استاذ اسعد الحسینی سے معلوم ہوا ہے، اس مجلس کی تشکیل ۱۹۵۱ء مارچ کے مہینہ میں ہوئی، اس کے مقاصد اور فرائض جیسا کہ اس کے بنیادی قانون میں درج ہے (۱) حکومت میں علماء کا مقام بلند کرانا (۲) فضائل وحسن اخلاق کی دعوت پھیلانا (۳) وعظ وارشاد کے کاموں کو منظم کرنا (۴) لفظ عالم کے مفہوم کو متعین کرنا اور جن پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ ان کا تعین کرنا، اس کا بجٹ ۵۱-۵۲ء کے لئے ۱۵۸۸۲ اردنی دینار ہے جو ۷۰۵۹۶ روپیہ کے برابر ہوتا ہے، اس کے گیارہ رکن ہیں جو عالم ہیں اور اردنی مملکت کے بڑے علماء میں سے ہیں۔

میں نے سنا کہ بادشاہ اس مجلس کا خصوصی خیال رکھتے ہیں، جس جلسہ میں مجھ کو

حاضری کی سعادت حاصل ہوئی اس میں مجلس کے آٹھ رکن موجود تھے۔عصر بعد ہم اخوان المسلمین کے مرکز گئے اور ان سے ہم نے اخوان کے اسکاوٹ اور تربیتی کیمپ کے احوال سنے جس کو انھوں نے شہر الخلیل میں قائم کیا تھا، وہ اس کے نتائج اور احباب کے جوش ونشاط اور ان کے حسن انتظام سے بہت خوش تھے، ہم لوگوں نے شیخ اسعد حسینی صاحب سے ان کے گھر پر ملاقات کی پھر زاویۃ الہنود واپس آ گئے اور آرام کیا۔

قدس کی زیارت ختم ہوئی اور ہم نے عمان واپسی کی تیاری کی تا کہ وہاں چند دن گذاریں، پھر دمشق لوٹیں۔

سہ شنبہ ۶/۱۰/۱۳۷۰ھ مطابق ۱۰/۷/۱۹۵۱ء

عمّان میں

ہم نے عمّان کے سفر کی تیاری کی اور زاویۃ الھنود کے نگراں مولوی ناظر حسن انصاری سے ملاقات کی، ان کے ساتھ کچھ دیر صحبت رہی، پھر مسجد اقصیٰ گئے، اور مولانا محمد علی جوہرؒ کی قبر پر فاتحہ پڑھی اور ٹیکسی پر سوار ہو گئے، اور ظہر کے وقت عمّان پہونچ گئے۔ایک ہوٹل میں کھانا کھایا، اس کے بعد سوق السعادۃ میں واقع الحاج قاسم الامعری کے مکان کے لئے روانہ ہوئے، ہم نے اپنے دمشق کے میزبان شیخ عبدالوہاب الصلاحی سے تعارفی خط لے لیا تھا۔اس کی بناء پر انہوں نے ہمیں خوش آمدید کہا اور بہت آرام سے رکھا۔بازار میں کھانا کھانے پر شکایت کی، ہم پورے اعزاز واکرام کے ساتھ رہے۔عصر بعد اخوان کے صدر عبداللطیف ابوقورہ سے ملنے کے لئے ہم لوگ اخوان کے مرکز کی طرف گئے قاہرہ میں ان سے ہمارا تعارف ہو چکا تھا، وہ نہ ملے تو ہم ٹہلتے ہوئے جامع کبیر کی طرف چلے اچانک کیا دیکھتا ہوں کہ مجددی صاحب مسجد کی طرف نماز پڑھنے آ رہے ہیں۔

مجددی صاحب کی ملاقات

جب وہ اپنی نماز پوری کر چکے تو ہم لوگ ان سے ملے اس بے وہم وگمان ملاقات

سے ہم سب کو خوشی ہوئی۔

الحاج ابوقورۃ کے مکان پر

استاذ عبداللطیف ابوقورہ مسجد کے دروازہ پر ان کا انتظار کر رہے تھے، وہ ہم سبھوں کو پہاڑ پر واقع اپنے اس گھر لے گئے جہاں سے پورا شہر نظر آتا ہے، وہاں ہم لوگوں نے کچھ خشک میووں سے لطف لیا اور چائے پی، یہاں سے ہم نے عمان کی طرف نظر ڈالی تو وہ روشنی سے اس طرح جگمگا رہا تھا جیسے وہ ایک انار ہے جس کے دو ٹکڑے کر دیئے گئے ہیں اور اس کے سرخ دانے بکھرے نظر آرہے ہیں، رات کو جن مناظر کے دیکھنے کا اتفاق ہوا ان میں یہ بہترین منظر تھا، ہم لوگ اپنی قیام گاہ واپس آگئے اور مجددی صاحب ملک عبداللہ سے ملنے قصر غدان گئے۔

ملک عبداللہ کی طرف سے بلاوا

تھوڑی دیر کے بعد شیخ محمد الامین شنقیطی نے الحاج قاسم کی دوکان سے فون ملایا اور ان کو اطلاع دی کہ جلالۃ الملک آپ کے مہمان کا انتظار کر رہے ہیں وہ فوراً بغیر کسی تاخیر کے آجائیں، ہم لوگ رات کے کھانے پر بیٹھ چکے تھے الحاج قاسم نے مزاح کے انداز میں کہا کہ اب تو آپ جلالۃ الملک کے ساتھ خاصا تناول کریں گے، میں نے عرض کیا کہ آپ کا بے تکلف کھانا مجھے خاصہ شاہی سے زیادہ مرغوب ہے، اسی وقت ہم قصر رغدان روانہ ہو گئے۔ محافظ پہریدار کو ہمیں دعوت دیئے جانے کی اطلاع کر دی گئی تھی وہ ہم سے راستہ میں ملے اور ڈرائیور کو بتایا کہ سیّدنا (وہاں کا عملہ اپنے شاہ کے لئے یہی لفظ بولتا ہے) خیمہ میں ہیں۔ ہم لوگ اس خیمہ میں پہونچے جس میں ملک اپنے عملہ اور حاشیہ کے ساتھ تشریف فرما تھے۔ راستہ میں شیخ شنقیطی نے ہمارا استقبال کیا۔ ہم لوگ آگے بڑھے تو ملک عبداللہ نے سادگی وخوش دلی کے ساتھ ہمارا خیر مقدم کیا۔ ہم کو معلوم ہوا کہ مجددی صاحب نے ان سے ہمارا ذکر کیا تو انھوں نے کہا کہ آپ ان حضرات کو اپنے ساتھ کیوں نہ لائے اور فوراً ہم کو بلوا بھیجا۔

ملک کے ساتھ باتیں

میں نے ملک کو سلام مسنون کیا اور مصافحہ کر کے ان کے سامنے بیٹھ گیا، مجددی صاحب نے میرا اور میرے ہندوستان کے حسنی خاندان کا تعارف کرایا تو میں نے نسبی اتحاد اور موجودہ حیثیتوں کے عظیم فرق کی طرف لطیف اشارہ کرتے ہوئے سید شریف رضی کے وہ شعر پڑھے جو انھوں نے عباسی خلیفہ کو مخاطب کر کے کہے تھے۔

ما بيننا يوم الفخار تفاوت
ابدا كلانا فى المعالى معرق
الا " الامارة (۱) " ميزتك فإننى
أنا عاطل منها وانت مطوق

(شریف عہد عباسی کا ایک قادر الکلام ممتاز شاعر گزرا ہے نسبًا سید تھا۔ اور کردار کے لحاظ سے نہایت غیرت مند اور خوددار تھا اس نے ایک موقع پر خلیفۂ وقت کی مدح میں شعر کہتے ہوئے ہاشمی النسب ہونے کی بلند مقامی میں اپنے کو خلیفہ کا ہمسر قرار دیا اور صرف یہ فرق بتایا کہ آپ کے سر پر خلافت کا تاج ہے اور میں اس سے محروم ہوں) چونکہ شاہ عبد اللہ حسنی سادات اور شرفاء مکّہ کے خاندان کے فرد ہیں اس لئے یہ شعر موزوں رہے۔ میں نے دیکھا کہ ملک ان اشعار کو دوہرا رہے ہیں اور آگے کے اشعار پورے کر رہے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوا کہ ان کو یہ قصیدہ یاد ہے۔ ملک نے مجددی صاحب سے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ ان کا حلیہ یمن کے حسنی سادات کا سا ہے۔

شاہی دسترخوان پر میری گفتگو

ادھر ادھر مختلف باتیں ہوئیں پھر ملک کھانے کے لئے اٹھے اور مجھ کو اپنے پہلو میں بٹھایا، میں نے دسترخوان پر ان سے کہا کہ وہ حکومت جو اسلامی احکام کو نافذ کرتی ہے، دین

(۱) اصل شعر میں ''الخلافۃ'' کا لفظ تھا میں نے اسکو مقتضاء حال کے لحاظ سے ''الامارۃ'' کے لفظ سے بدل دیا۔

کو سیاست ونظم ونسق میں جاری کرتی ہے، وہ ساری دنیا کی توجہ اپنی طرف مبذول کرالیتی اور اتنا عزت واحترام حاصل کرسکتی ہے جو دنیا کی بڑی سے بڑی حکومت نہیں حاصل کرسکتی، خواہ اس حکومت کے حدود کتنی ہی محدود وتنگ ہوں اور آمدنی تھوڑی ہی کیوں نہ ہو۔ شاہ نے میری باتوں کو غور سے سنا اور بڑی لیاقت اور ذہانت سے جواب دیا۔ پھر اٹھ کر نشست گاہ میں گئے، میں نے سلسلۂ گفتگو جاری رکھا اور کہا۔

تحصیل مال وتبلیغ کا فرق

حکومت کی دو الگ الگ بنیادیں ہیں، تحصیل وصول، یا ہدایت ورہنمائی، اسلامی حکومتوں کو اصلاح وہدایت کی بنیاد پر قائم ہونا چاہئے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہادی وداعی بنا کر بھیجے گئے تھے، نہ کہ تحصیل وصول کے لئے، آپ کے جد امجد سیّدنا حضرت علی اور سیدنا امیر معاویہ میں یہی اختلاف تھا، حضرت علی چاہتے تھے کہ خلافت اپنے صحیح ڈھانچے پر قائم رہے بادشاہت میں نہ تبدیل ہوجائے۔

شاہ اردن کا جواب

شاہ نے میری باتوں کو غور سے سنا، پھر اس راہ کی مشکلات بتائیں اپنی نیک تمناؤں، حکومت کو مضبوط، اور فوج کو قوی بنانے کے منصوبے کا ذکر کیا، اور حکومت کے ترقیاتی پروگرام بتائے، انھوں نے یہ کہا کہ یہ حکومت ایک چھوٹے سے شہر سے (جس کی آبادی سات ہزار سے زائد نہ تھی) ترقی کرکے ایک بڑی حکومت بن گئی ہے، ان دونوں میں کوئی نسبت نہیں، اس کے بعد انھوں نے میرا پروگرام پوچھا، میں نے جواب دیا کہ کل انشاء اللہ ہم سفر کریں گے، یہ سن کر فرمایا میرے محترم یہاں چند دن ٹھہرنے میں بخل نہ کیجئے، کم سے کم تین دن تو رہیں، پھر انھوں نے شیخ شنقیطی سے کچھ باتیں کیں جس کو میں نے نہیں سنا، میں نے ان کو ''ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین'' کا ایک نسخہ پیش کیا، کتاب شائع ہونے سے پہلے میری یہ خواہش تھی کہ ان کو بھی پہونچ جائے، اللہ تعالیٰ نے اپنے

ہاتھوں ان کو پیش کرنے کا موقع عنایت فرمایا اور انھوں نے شکریہ کے ساتھ قبول فرمایا۔ پھر ہم لوگوں نے اجازت چاہی اور واپس ہوئے، مجلس میں مجددی صاحب اور شیخ شنقیطی کے علاوہ جناب فوزی باشا الملقی اور جناب ابراہیم ہاشم باشا بھی تھے۔

چہار شنبہ ۷/۱۰/۱۳۷۰ھ مطابق ۱۱/۷/۱۹۵۱ء

فلسطین کے بارے میں کچھ حقائق

فجر کے نماز کے بعد ہم افغانستان کے سفیر محترم شیخ محمد صادق مجددی سے ملنے اور رخصت ہونے کے لئے ہوٹل گئے اور پھر قیام گاہ واپس آ گئے، محترم جناب شیخ محمد امین الشنقیطی تشریف لائے، کچھ دیر مجلس رہی، اور فرمایا کہ جلالۃ الملک (ملک عبداللہ) گذشتہ رات کی ملاقات سے بہت خوش تھے۔ انھوں نے عصر بعد اپنے گھر بلایا، استاذ الحاج ابراہیم بن الحاج مسعود آئے۔ ایک فلسطینی دوست آئے وہ ایک پڑھے لکھے تاجر، صاحب ایمان، دین وامت کے بارے میں غیور اور اشخاص کے حالات سے خوب واقف ہیں، یہ ان لوگوں میں سے ہیں جن میں میں نے بڑی غیرت، قوی ایمان اور صحیح بیداری محسوس کی، وہ شاہ اور ان کے بعد ہونے والے شاہ امیر طلال سے ذاتی طور پر واقف ہیں اور آخر الذکر کے اچھے دوستوں میں ہیں، فلسطین میں جو مضحکہ خیز و مایوس کن صورت پیش آئی وہ اس کے عینی شاہد ہیں، عرب لیگ، عرب بادشاہوں اور حکومتوں نے فلسطین کے اسٹیج پر جو مضحکہ خیز اور رلا دینے والا ڈرامہ کھیلا یہ اس سے خوب واقف ہیں۔ ان سے مجھے بہت سے حقائق معلوم ہوئے، ان کی باتوں سے میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ مسئلہ فلسطین ایک ڈرامہ تھا جس کو انگریزوں اور ان کے پٹھوؤں نے پہلے سے تیار کر رکھا تھا جنگ وجدال کا کوئی پلان نہیں تھا، یہ ایک بڑی سوچی سمجھی اور شاطرانہ اسکیم تھی، اس ڈرامہ کے آلۂ کار عرب بادشاہ اور قائدین تھے ان سبھوں کی گردن پر فلسطین کے خون بے گناہی کا وبال ہے، فلسطین کی ذلت ورسوائی کے معاملہ میں سب سے زیادہ بے خطا آزاد فلسطین قوم ہے (جس کو کچھ خبر نہ تھی کہ اندر اندر

کیا کھیل کھیلا جا رہا ہے) جس کو صلح و جنگ کا اختیار نہ تھا، مجھے معلوم ہوا کہ گلب پاشا صرف انگریزوں کے مصالح کا وکیل نہ تھا، یہودیوں کا بھی وکیل تھا، وہ کبھی اردنی فوج کے نام سے کوئی شہر قبضہ میں لیتا پھر اس کو یہودیوں کے لئے چھوڑ دیتا اور کبھی عرب فوجوں کو پیچھے ہٹاتا یا رکاوٹ بنتا، یہودی آتے اور قبضہ کر لیتے، انھوں نے کہا کہ یہ انگریز بادشاہ رچرڈ شیر دل کی ''ٹروکاپی'' تھا، جس میں صلیبی روح کارفرما تھی، میرا جی چاہتا ہے کہ میں ایک بار اس کو مخاطب کروں اور اس کو صلیبی پیغام کی مہم میں کامیابی پر مبارکباد پیش کروں۔

محمد الامین الشنقیطی سے مُلاقات

ہم لوگ محترم شیخ محمد الامین الشنقیطی کے یہاں گئے اور ان کے خوبصورت مکان میں بیٹھے جو شان وشوکت میں امراء کے محلوں سے ملتا جلتا ہے، یہاں کچھ چائے ناشتہ کے بعد ہم لوگ ان کے ساتھ الحاج ناشد شیخ محمد یوسف عبد الرحمٰن البرقاوی اور شیخ محمد مالک الشنقیطی سے ملنے عمان اسٹیشن گئے، اول الذکر نہ ملے تو دوسرے صاحب کے یہاں گئے راستے میں پناہ گزینوں کے پاس سے گزرے اور ان شاندار محلوں کے پہلو میں جن سے عمان کی زینت ہے ان پناہ گزینوں کے جھونپڑوں اور خیموں کو دیکھا۔

پناہ گزینوں کی بدحالی ایک آگاہ کرنے والا خطرہ ہے

یہی وہ چیز ہے جو شدید خطرہ کا پتہ دیتی ہے اللہ تعالیٰ اس صورت حال کو قطعاً پسند نہیں کرتا، کچھ لوگ بھوکے مر رہے ہیں، کچھ لوتخمہ سے مر رہے ہیں، کچھ وہ لوگ ہیں جن کے پاس گھر نہیں وہ خیموں میں رہتے ہیں جو ان کو بارش، ٹھنڈک اور گرمی سے بچانے کے لئے ناکافی ہیں، اس کے مدمقابل ایسے لوگ بھی ہیں جو ایسے محلوں میں رہتے ہیں جو ان کی ضرورت سے فاضل ہیں۔ ایسے ہی جیسے کسی چھوٹے جسم پر بہت لمبا چوڑا ڈھیلا ڈھالا لباس ہو۔ ہم لوگ شیخ مالک شنقیطی سے ملے اور دیر تک ان کے ساتھ بیٹھے پھر اپنی قیام گاہ واپس

آ گئے، یہاں پہونچے تو معلوم ہوا کہ شاہ نے بار بار بلوایا، شیخ محمد الامین الشنقیطی نے دوکان سے رابطہ قائم کیا، وہ مصر کی مجلس شیوخ (ایوان بالا) یا وہاں کے (راجیہ سبھا) کے ممبروں کے ایک وفد کے ساتھ ہم کو رات کے کھانے پر بلا رہے تھے جو رات ملک ک مہمان تھے، ہم انھیں نہ ملے.....الحاج قاسم کے رفیق نے ان کو بتایا کہ مہمان شہر میں تفریح کو گئے ہوئے ہیں۔

جمعرات ۸/۱۰/۱۳۷۰ھ مطابق ۱۲/۷/۱۹۵۱ء

الکلیۃ العلمیۃ الاسلامیۃ کی سیر

شیخ محمد یوسف عبد الرحمٰن برقاوی اور اخوان کے صدر الحاج عبد اللطیف ابو قورۃ ہمارے پاس آئے اور عصر تک رکے اس کے بعد ہم لوگ الحاج عبد اللطیف کے ساتھ الکلیۃ العلمیۃ الاسلامیۃ کی سیر کو گئے۔ یہ کالج قوم کے اہل خیر حضرات کی امانت سے قائم کیا گیا ہے۔ اس کے قیام کا بڑا سہرا ہمارے دوست الحاج عبد اللطیف کے سر ہے۔ انھوں نے کالج کے لئے کئی ہزار رقم دی پھر تابڑ توڑ چندے آنے لگے۔ ہم نے اس کالج کے شعبوں اس کے کتب خانہ، مسجد اور ہال کو دیکھا، پرائمری کے ہیڈ ماسٹر استاذ محمود العابدی کے دفتر میں بیٹھے، ذکر نور الدین شہید رحمۃ اللہ اور صلاح الدین ایوبیؒ اور صلیبی جنگوں کے چل نکلا، استاذ عابدی نے فرمایا کہ صلاح الدین مصر سے صلیبی فوج کے مقابلہ کے لئے نکلے تھے۔

عرب لیگ کی سب سے بڑی غلطی

عرب لیگ اور عرب حکومتوں کی سب سے بڑی غلطی یہ تھی کہ انھوں نے فلسطین سے مصر کے برّی راستے کو کاٹ دینے کی اجازت دے دی اور یہودیوں نے راستہ پر قبضہ کر لیا اب اگر مصر فلسطین کی مدد کرنا چاہے یا اس کی فوجیں وہاں جانا چاہیں تو خشکی کے راستہ سے یہ ممکن نہ ہوگا۔

مقالہ کی تیاری

میں دمشق یونیورسٹی میں مقالہ پڑھنے کی تیاری کے بارے میں سوچ رہا تھا جس کا

وعدہ کر چکا تھا۔ بہت ممکن تھا کہ اس کا عنوان ہوتا (عرب اپنی قائدانہ حیثیت کو کس طرح واپس لے سکتے ہیں) لیکن جب میں نے فلسطین کا سفر کیا اور قدس میں کچھ دن گذرے تو فلسطین ہی میرے فکر پر غالب آ گیا اور میں نے سوچا کہ اس کی صورتحال بڑی نازک اور اس کا معاملہ اہم ہے چنانچہ میں نے فلسطین کے ضائع ہونے کے وجوہات اور اس کی رسوائی کے اسباب کو موضوع بنایا اور سوچا کہ سلطان صلاح الدین ایوبیؒ کی سیرت پڑھوں، جن صفات واخلاق کے وہ حامل تھے ان کو معلوم کروں اور صلیبیوں پر ان کے غالب آنے کا راز معلوم ہو، ان کے اور ان لوگوں کے فرق کو معلوم کروں جو آج مسئلہ فلسطین سے دلچسپی رکھتے ہیں۔

سلطان صلاح الدین ایوبی کی سیرت پر لکھی جانے والی کتابوں کے بارے میں پوچھا کہ کالج کے کتب خانہ میں بھی کچھ کتابیں ہیں؟ استاذ عابدی نے مجھے بتایا کہ ان کے پاس ابن شداد کی کتاب ''المحاسن الیوسفیۃ'' اور ابن عماد الکاتب کی ''الفتح القسی'' ہے۔ انھوں نے یہ دونوں کتابیں مجھے مستعار دیں، ابن شداد کی کتاب میں اہم دستاویزی مواد ملا، میں نے اپنے مقالہ میں جس کا عنوان (شہادۃ العلم والتاریخ فی قضیۃ فلسطین) تھا۔ اس کتاب سے بڑا فائدہ اٹھایا۔ عشاء بعد ہم لوگ الحاج قاسم کے ایک دوست کے یہاں گئے، ان کا نام الحاج بشیر ہے، وہ شہر کے معززین میں شمار ہوتے ہیں، وہاں کردی ادیب مل گئے، ترک بے دینوں کے خلاف کردوں کی بغاوت کے وقت وہ ترکی سے ہجرت کر آئے تے، وہ پڑھے لکھے اور اسلامی غیرت رکھنے والے شخص ہیں، مجھے بتایا کہ انھوں نے ایران کے وزیر اعظم ڈاکٹر مصدّق کو ان کی جرأت، ثابت قدمی اور کامیاب اقدام پر مبارکباد کا تار دیا تھا۔ تار کی عبارت یہ شعر تھا

لق فت عصاك عصيهم فتصايحوا

لا سحر بعد اليوم أنت مصدَّق

تمہاری چھڑی نے ان کی چھڑیوں کو نگل لیا، تو وہ چلا اٹھے اب اس کے بعد سحر کا کوئی اثر نہیں ہوگا تم اس بامسمّٰی مصدّق ہو۔

جمعہ ۹/۱۰/۱۳۷۰ھ مطابق ۱۳/۷/۱۹۵۱ء

شاہ عبداللہ کی ضیافت میں

ہم لوگ جمعہ کی نماز کے لئے جامع مسجد گئے۔ مسجد کے دروازہ پر فوجی دستہ نظر آیا۔ اس سے ہم کو اندازہ ہوگیا کہ شاہ نماز جمعہ یہیں پڑھیں گے، تھوڑی ہی دیر کے بعد شاہ تشریف لائے اور مقصورہ میں نماز پڑھی، نماز بعد ہم کو معلوم ہوا کہ شاہ نے ہم لوگوں کو شاہی محل میں اپنے ساتھ دوپہر کے کھانے پر بلایا ہے، ہمارے دوست ومیزبان الحاج قاسم المعری سنّت پڑھ رہے تھے اور دو سپاہی ان کے پاس کھڑے انتظار کر رہے تھے، جب انھوں نے سلام پھیرا تو چپکے سے ان سے کوئی بات کی جو یہ تھی کہ وہ ہم کو لے کر شاہ کے محل جائیں، شاہ ہمارے انتظار میں ہیں، لوگوں کو اس کے سوا اور کچھ نہ معلوم ہوا کہ سپاہی ان کا انتظار کرتے رہے اور نماز بعد ان سے کچھ باتیں کیں، بس شہر میں یہ افواہ پھیل گئی کہ الحاج قاسم مسجد میں گرفتار کر لئے گئے، ان کے دوستوں کو پریشانی ہوئی، معاملہ اس کا الٹا تھا وہ اپنے مہمانوں کے ساتھ کھانے پر بلائے گئے تھے، راجدھانی میں ہوتے ہوئے اس سے قبل الحاج قاسم ملک سے کبھی نہیں ملے تھے، لہٰذا انھیں جانے میں کچھ تردّد ہوا، ہماری وجہ سے ان کو تقویت ہوئی اور ہم لوگ محل کی طرف چلے۔ جب ہم لوگ پہونچے تو ملک عبداللہ نے الحاج قاسم سے کہا کہ آپ نے ہمارے مہمانوں کو تاخیر سے کیوں پہونچایا۔ الحاج قاسم نے انھیں کوئی جواب نہ دیا بس شاہ کو سلام کیا اور ان کی دست بوسی کی پھر ہم لوگ کھانے پر بیٹھ گئے، جمعرات کو حاضر نہ ہوسکنے کی ہم نے شاہ سے معذرت کی کہ ہم کو دعوت کا علم اس وقت ہوا جب ہم سیر سے واپس ہوئے، انھوں نے کہا کہ میں چاہتا تھا کہ مصری ایوان بالا کے ممبروں سے آپ کی ملاقات ہوجائے۔

ماذا خسر العالم کے بارے میں گفتگو اور شاہ کا تاثر

شاہ نے میری کتاب ماذا خسر العالم کا کچھ حصّہ پڑھ لیا تھا، انھوں نے ڈاکٹر احمد امین

کے بارے میں پوچھا۔ مجھ کو ان کے بارے میں جتنا علم تھا بیان کیا، انھوں نے ان پر تنقید کی اور فرمایا کہ انھوں نے مقدمہ میں اس کی قیمت کو گھٹایا ہے، اس مقدمہ نے اس کتاب کو نقصان پہونچایا۔ اس مقدمہ کا کتاب سے الگ رہنا ہی مناسب تھا، فرمایا کتاب کو مقدمہ کی ضرورت نہیں ۔ میں نے کہا کہ جس شخص کا یہ نظریہ ہو کہ صرف اسلام ہی کو دنیا میں حکومت وقیادت کا حق ہے اور انسانیت اسلامی حکومت وقیادت ہی کے سائے میں سرخرو ہو سکتی ہے، وہی شخص اس کا مقدمہ جی لگا کر نشاط کے ساتھ لکھ سکتا ہے۔ افسوس کی بات ہے کہ ہمارے بہت سے ادباء کا یہ نظریہ ہے کہ اسلام کا زمانہ لد گیا، دنیا کی تاریخ میں اس کا دور ختم ہو گیا، اب اس کا کوئی مستقبل نہیں، یہ طرز فکر اس کتاب کے مقاصد اور اس کی روح سے اتفاق نہیں کر سکتا۔ اب میں نے سید قطب صاحب سے گذارش کی کہ اس کتاب کا مقدمہ تحریر فرمادیں، وہ اس کے لئے زیادہ مناسب ہیں۔

مسجد اقصیٰ کے بارے میں شاہ سے تبادلۂ خیال

سلسلۂ گفتگو جاری رہا اور شاہ نے ایسی باتیں کیں جو ان کے مطالعہ اور قرآن کریم میں غور وخوض کا ثبوت دیتی ہیں پھر میں نے ان کی توجہ مسجد اقصیٰ کی طرف مبذول کرائی ۔ نیز پناہ گزینوں کی طرف زیادہ توجہ کرنے کا خیال دلایا۔ انھوں نے اس کا وعدہ فرمایا اور اپنی بعض معذوریوں کا ذکر کیا جو مسجد اقصیٰ کی طرف توجہ کرنے میں رکاوٹ بنیں، فرمایا کہ جو کمی آپ محسوس کر رہے ہیں وہ وقت کی تنگی، دشمنوں کی کثرت اور دوستوں کے حسد کی وجہ سے ہے۔ دوسرے سفر میں انشاء اللہ آپ ایسی چیزیں دیکھیں گے جن سے آپ کو خوشی ہوگی۔ میں نے ان کو اپنا رسالہ ''بین العالم وجزیرۃ العرب'' اور ''شاعر الاسلام الدکتور محمد اقبال'' پیش کیا اور ان سے میں رخصت ہوا۔

ماذا خسر العالم پر محاضرہ

اخوان المسلمون کے احباب نے اخوان المسلمین کے دفتر میں میری تقریر کا اعلان کر دیا تھا اس کا موضوع میری ہی کتاب ''ماذا خسر العالم'' کا عنوان تھا، پڑھے لکھے لوگوں اور

ادباء کی خاصی تعداد جمع ہوگئی تھی اور میں نے تقریر کی کوئی تیاری نہیں کی تھی، اس وقت جو کچھ ذہن میں آیا عرض کردیا، اس میں میں نے ''ماذا خسر العالم'' کا خلاصہ وروح پیش کی۔ اخوان کے دفتر سے ہم لوگ جناب عبداللطیف کے مکان پر گئے، عشاء کی نماز پڑھی اور کھانا کھایا۔

شنبہ ۱۰/۱۰/۱۳۷۰ھ مطابق ۱۴/۷/۱۹۵۱ء

شیخ عبدالوہاب صلاحی کے مکان پر

صبح عمان سے موٹر پر سوار ہوئے اور عصر کے وقت دمشق پہونچ گئے اور شیخ عبدالوہاب الصلاحی کے مکان واقع حلبونی میں قیام کیا، جیسا کہ اس سے پہلے طے ہوگیا تھا وہ ایک صالح بزرگ اور کریم النفس انسان ہیں، ہمارے قدیم کرم فرما سید محمود الحافظ کے خسر ہیں اور اپنے منصب سے صدر جمہوریہ کے امام ہیں، صوفی المشرب، رقیق القلب، اور عالی حوصلہ آدمی ہیں۔

یکشنبہ ۱۱/۱۰/۱۳۷۰ھ مطابق ۱۵/۷/۵۱ء

شیخ احمد کفتارو، شیخ محمد النمر اور شیخ بہجۃ البیطار سے ملاقاتیں

شیخ احمد کفتارو کے پاس گئے اور ان سے خطوط لئے، جو سب کے سب مدینہ منوّرہ کے تھے، اسی میں میرے خواہرزادہ عزیز محمد رابع ندوی سلمہٗ اور ان کے ساتھیوں کے خطوط تھے، یہیں موجودہ فلسطینی خطیب اور سابق خطیب حیفا '' من ہدی القرآن '' کے مصنف محمد النمر آگئے اور بیٹھ کر باتیں کرنے لگے، پھر ہم لوگ شیخ بہجۃ البیطار کے پاس گئے ان کی مجلس حسب عادت دلچسپ اور باغ وبہار تھی جو ادبی لطائف ظرائف تاریخی فوائد، تفسیر وحدیث کی معلومات پر مشتمل تھی۔

استاد سعید رمضان اور شیخ مصطفیٰ سباعی سے ملاقات

ہم نے سنا کہ استاد سعید رمضان امیّۃ ہوٹل میں مقیم ہیں ہم ان سے ملنے کے لئے

گئے تو یونیورسٹی کے طلبہ کا جم غفیر ان کے چاروں طرف موجود تھا، ہم دونوں دو بچھڑے ہوئے بھائیوں کی طرح ملے، اخوان المسلمین کے نگران عام شیخ مصطفیٰ سباعی بھی آ گئے میں نے ان کو پہلی بار دیکھا وہ بڑے تپاک ومحبت سے ملے، انھوں نے میرے سفر پاکستان کے بعض مقالات کا ذکر کیا جن کو ہمارے بعض پاکستانی احباب نے انھیں ہدیہ کیا تھا، پھر اخیر میں ماذا خسر العالم اور اس کے مصنف سے ملاقات کے اشتیاق کا ذکر کیا، ہم میں سے ہر ایک نے اپنے ساتھی سے روحانی اور فکری ملاقات اور خیالات میں یکسانیت کا ذکر کیا۔

دوشنبہ ۱۲/۱۰/۱۳۷۰ھ مطابق ۱۶/۷/۱۹۵۱ء

ریاض الصلح بک کا اچانک قتل اور شام میں اس کا ردّ عمل

شیخ احمد کفتارو کے یہاں ناشتہ کیا اور ان کے باغ کے اندر چشمہ کے کنارے درختوں کے سائے میں بیٹھے اور چائے نوشی ہوئی۔ شیخ عبدالفتاح الامام ہم سے ملنے آئے اور اپنی تالیفات میں سے کچھ رسائل مجھے عنایت فرمایا۔ یہ رسالے جدید اسلوب میں لکھے گئے ہیں اور بڑے پر از معلومات ہیں۔ آج اخبارات نے لبنان میں عرصہ تک وزیر اعظم رہنے والے ریاض الصلح بک کے اچانک قتل کی خبر شائع کی، ان کے قتل کا واقعہ عمان ہوائی اڈے پر اس وقت پیش آیا جب کہ وہ اپنے وطن واپس آ رہے تھے، آج یہی خبر محفلوں اور مجلسوں کا موضوع گفتگو بنی ہوئی تھی، کچھ لوگ تو ان کی بڑی تعریف کر رہے تھے اور ان کو عرب کے کمیاب قائدین میں شمار کر رہے تھے۔ بعض ایسے لوگ تھے جو عرب و یہود جنگ بندی کا ذمہ انھیں کو ٹھہراتے تھے، اہل سوریہ ان پر سوریہ کے تین صوبوں کے مسیحیت زدہ ملک لبنان میں شامل کرا دینے کا مجرم قرار دے رہے تھے، ان میں سے ایک تو شامی شہر طرابلس کا، مسیحی لبنان کے ماتحت کر دینا تھا، اس لئے کہ انھوں نے لبنان کے عرب لیگ میں داخل ہونے کے لئے یہ شرط لگا دی تھی کہ سوریہ ان اضلاع سے لبنان کے حق میں دست بردار ہو جائے اور سوریہ کے وزیر اعظم جمیل مردم بک کو اپنی مشہور چرب زبانی اور سیاسی

داؤں پیچ سے اس وقت مطمئن کر دیا تھا، بہر کیف مرحوم (خدا ان پر رحم فرمائے) عرب کے اس طرز کے لیڈروں اور عرب حکومتوں کے ان سربراہوں میں سے تھے، جنھوں نے مغربی سیاست کے مکتب فکر میں پرورش پائی ہے، اچانک قتل کا یہ واقعہ جس کو ہر سمجھدار نے ناپسند کیا تھا۔ قوم میں پھیلی ہوئی عام ناراضگی اور اس ملک کے حالات سے عوام میں گہری ناگواری اور ان کے لیڈروں وسربراہوں سے بیزاری کی غمازی کرتا ہے۔

استاد محمد المبارک کی گفتگو

آج دوپہر کا کھانا استاد ابوعزہ امین الغفری کے پاس کھایا اور عصر کے وقت مفتی حوران شیخ برکات احمد نے ملاقات کا شرف بخشا، ان سے میرے بارے میں استاد احمد عبدالغفور عطار نے بتایا تھا اور غائبانہ تعارف کرایا تھا، دمشق کے پارلیمانی رکن استاد محمد المبارک نے بھی شرف ملاقات سے نوازا اور بڑی اچھی مجلس رہی انھوں نے اس ملک کے سیاسی ودینی اتار چڑھاؤ کو بیان کیا، ان کی گفتگو بڑی فکر انگیز اور معلومات افزا تھی، میں نے اس گفتگو سے بہت سی معلومات حاصل کیں اور ملک کے سیاسی ودینی حالات کے رجحان کا اجمالی اندازہ لگایا۔

سہ شنبہ ۱۳/۱۰/۱۳۷۰ھ مطابق ۱۷/۷/۱۹۵۱ء

شیخ حسن حبنّکہ کی ملاقات (۱)

ناشتہ ہم نے برادر محترم سید محمود الحافظ کے پاس کیا اور انھیں کی معیت میں شیخ حسن حبنکہ سے میدان میں ملاقات کی جو دمشق کے بڑے علماء ومشائخ اور ماہرین تعلیم وتربیت میں سے ہیں۔ دمشق میں میدان کا علاقہ دینی علمی مرکز اور اسلامی آداب اور مشرقی طرز معیشت کا گہوارہ ہونے میں مشہور ہے، دمشق کے اکثر علماء میدان ہے کے رہنے والے

---

(۱) شیخ حسن حبنکہ میدانی مرحوم شام کے معروف وعالی مرتبت دینی وعلمی وروحانی شخصیت تھے، دارالعلوم ندوۃ العلماء بھی ۸۵ سالہ جشن تعلیمی ۱۹۷۵ء میں تشریف لائے تھے، شام میں ہی مدت حیات گزار وفات پائی۔ ان کے بیٹے شیخ عبدالرحمٰن حسن حبکہ میدانی معروف مصنف مفکر اور داعی تھے مکہ معظمہ میں مقیم رہ کر وفات پائی (مترجم)

ہیں یا زمانہ قریب میں وہاں سے منتقل ہوئے ہیں، وہاں اب بھی شیخ بہجۃ البیطار، شیخ حسن حبنکہ، شیخ زین العابدین اور شیخ مکی کتانی وغیرہ جیسی شخصیتیں موجود ہیں۔

دینی مدارس اور ان کے ردّ و بدل کے بارے میں گفتگو

ہم نے شیخ حسن سے دینی دعوت اور دعوت کے کام کو مدرسہ کی تعلیم سے جوڑنے، اور طلبہ کے اپنے اساتذہ کے ساتھ دیہاتوں میں نکلنے اور عوام میں دعوت اور دینی مبادیات کو پھیلانے کے تجربات بیان کئے اور اس تحریک نے طلبہ میں دینی روح پھونکنے دعوت کی مشق، قوم سے رابطہ و تعلق، اساتذہ و طلبہ میں رابطہ قائم کرنے اور ایک دوسرے کو سمجھنے میں جو فائدہ پہونچایا اس کا ذکر کیا، یہ بات ہمارے مدارس سے عرصہ سے ختم ہو چکی ہے، دینی مدارس تک میں تعلیم ایک صنعتی کام اور مشینی طریقہ بن کر رہ گئی ہے جس میں روح کا سوز و گداز ہے نہ دل کی تڑپ و بے چینی، نہ جذب اندروں ہے نہ احساس، نہ طلبہ و اساتذہ میں روحانی تعلق، لیکن یہ سفر اور دعوت کے لئے مدرسہ کی فضا سے باہر جمع ہونا اس سے روحانی تعلق کو پھر سے بیدار کرتا ہے اور ایک طرف طلبہ کو فائدہ پہونچاتا ہے تو دوسری طرف عوام کو۔

شیخ نے اس گفتگو کو بڑے غور سے سنا وہ ہندوستان اور شام کے مدارس میں تبدیلی اور ردّ و بدل میں مشابہت کا جائزہ لے رہے تھے۔ پھر فرمایا مدارس میں تغیر و ترقی بلکہ زیادہ صحیح الفاظ میں جدید نظام کے رنگ میں رنگنے سے پہلے ہم ایک خاندان اور ایک گھر کے فرد کی طرح تھے، ہر ایک دوسرے کے ساتھ زندگی گزارتا تھا اور ایک دوسرے کی خدمت کرتا تھا۔ کئی کئی دن دن کے بعد ہم گھر جاتے تھے۔ ہمارے وقت کا بڑا حصہ طلبہ میں گزرتا تھا، ہم باہر جاتے اور خود کھانا پکاتے اور کچھ وقت آزاد و ستھری فضا میں گزارتے مگر گردش ایام دیکھئے کہ ہمارے مدرسوں میں جدید نظام تعلیم و تربیت آ گیا اور طلبہ و اساتذہ دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے اور درمیان میں بہت سے پردے حائل ہو گئے اور بہت سے نئے اصول و قواعد بنا ڈالے گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہم اس پہلی روح سے خالی ہو گئے۔

دینی دعوت کا اثر عوام میں

پھر شیخ نے قوم میں دعوت کی تاثیر اور عوام میں مخلص وقومی شخصیت کے اثر کا ذکر کیا۔ انھوں نے شیخ علی الدقر اور عوام میں ان کا اثر ورسوخ اور لوگوں کا دین کی طرف اس شدت سے متوجہ ہونے کا ذکر کیا جس نے فرانسیسیوں کو گھبراہٹ میں ڈال دیا اور انھوں نے سمجھا کہ اس میں کوئی سیاسی چال وسازش ہے۔ اس دینی نشاۃ ثانیہ کے اثرات مستقبل میں کچھ اور ہوں گے چنانچہ وہ لوگوں سے پوچھتے تھے کہ داڑھیوں کے بڑھانے، سنّت کے اہتمام اور دینی آداب کو اپنانے کے بعد کیا ہوگا۔ ہونہ ہو اس کے پس پردہ بغاوت کا کوئی پلان اور تیاری ہے اور اسی طرح کی باتیں، شیخ نے دعوت کو پھیلانے اور قوم کو مخاطب کرنے، اس کے دینی شعور کو بیدار کرنے اور اس کام میں ان کو جو کامیابی ہوئی اور شامی عوام کی سلامت طبع اور دینی دعوت سے جلد متأثر ہونے کا جو خاص تجربہ ہوا اس کو بیان کیا۔

استاد محمد النمر الخطیب نے ہمارے لئے اپنے گھر میں شب میں ایک نشست کی جس میں پڑھے لکھے فلسطینی اور شہر کے بعض علماء شریک ہوئے۔

چہار شنبہ ۱۴/۱۰/۱۳۷۰ھ مطابق ۱۸/۷/۱۹۵۱ء

ایک اہم مشغولیت اور مقالہ کی تیاری

آج میں اپنے مضمون ''شہادۃ العلم والتاریخ فی قضیۃ فلسطین'' کی تیاری میں لگا رہا جسے آئندہ دوشنبہ کو دمشق یونیورسٹی میں پڑھنا تھا۔ جب سے میں دمشق پہنچا اسی وقت سے یہ مقالہ میرے ذہن وفکر پر مسلط رہا اور جب تک پڑھ نہ لوں گا مسلط رہے گا۔ جیسا کہ میرا حال عام مقالات کے بارے میں شروع سے رہا ہے۔ وہ ہمیشہ دل کا ٹکڑا اور فکر کا نچوڑ ہوتے ہیں، خواہ وہ لوگوں کو خوش کرسکیں یا نہ کرسکیں، بقول اقبال ع

ہے رگِ ساز میں رواں صاحب ساز کا لہو

استاد محمد علی الحومانی کے ساتھ باتیں

آج عصر بعد شام کے مشہور شاعر محمد علی الحومانی اس خاکسار کو پوچھتے ہوئے آئے، اس سے پہلے وہ ہم سے ملنے کے لئے تشریف لائے تھے ان سے میرا تذکرہ ہمارے دوست استاد احمد عبدالغفور عطار نے کیا تھا جس کی وجہ سے وہ میری ملاقات کے مشتاق تھے، مجھے اکثر اس وقت ندامت وکم مائیگی کا احساس ہوتا ہے، جب کوئی صاحب علم وادب میرے بارے میں سن کر یا میری کوئی کتاب پڑھ کر ملنے آتا ہے، استاد حومانی بیٹھ کر باتیں کرنے لگے اور اپنے اشعار سنانے، اور اپنے تجربات بیان کرنے لگے، عرب حکومتوں اور عرب قوم کے بارے میں اپنی معلومات بہم پہنچانے لگے۔ وہ ان کمزور پہلوؤں سے واقف اور اس کے ناقد ہیں۔ اخلاقی گراوٹ اور روحانی دیوالیہ پن اور مادیت کے غلبہ اور اس ملک کے برسر اقتدار طبقہ اور قیادت کو مقدم رکھنے کے عالم اخوان کے کھلے ہوئے اسلامی فکر اور دینی شعور کو نمایاں کرنے اور فلسطین کے میدان میں ان کے جذبۂ جہاد و جوانمردی کے بڑے معترف وثناء خواں ہیں۔ اس سے قبل میں نے عرب فوجوں کے نہ لڑنے اور فلسطینی شہروں کو خالی کر دینے اور وہاں سے ہٹ جانے کے بارے میں جو کچھ سنا اور تحقیق کی تھی ان کی باتوں سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ استاد الحومانی نے ایک مصری کا قول نقل کیا جو فلسطین میں موجود تھا کہ مصری فوج کو اعلیٰ کمان کی طرف سے پچھلی چوکیوں پر ہی آنے کے نہیں بلکہ اور پیچھے ہٹ آنے کے احکامات ملتے رہتے تھے اور تنہا اخوان ان سے لڑ رہے تھے۔ فرمایا کہ ہم برابر ان کے ساتھ تھے تاکہ وہ غصہ میں کوئی حماقت نہ کر بیٹھیں اور اپنے کو ایسی جگہ ڈال دیں جہاں سے واپس آنا ممکن نہ ہو۔

بزرگ عالم شیخ محمد علی ظبیان سے شرف ملاقات

استاد الحومانی اور استاد القلقیلی کے ساتھ مغرب بعد ہم لوگ شیخ بہجۃ البیطار کے گھر کی طرف نکلے انھوں نے بعض ممبران پارلیمنٹ صحافیوں، انجمن کے سکریٹری اور کچھ پڑھے لکھے

لوگوں کو ملاقات وتعارف کے لئے بلا رکھا تھا، وہاں ہم شیخ محمد علی ظہیان شامی عالم سے ملے جن کا مولانا شبلی نے اپنے سفرنامہ ''روم وشام'' میں ذکر کیا ہے۔ مولانا ان سے استنبول میں ملے تھے، ہم نے اہل علم حضرات کے ساتھ باتیں کیں، کچھ تفکہات اور قہوہ کے بعد لوٹ آئے۔

پنجشنبہ ۱۵/۱۰/۱۳۷۰ھ مطابق ۱۹/۷/۱۹۵۱ء

فلسطین سے متعلق میرے مقالہ کے عناصر

آج میں مقالہ کی تیاری میں لگا رہا۔ میں نے شیخ بہجۃ البیطار کے کتب خانہ سے ابن اثیر کی تاریخ الکامل اور ابن کثیر کی ''البدایۃ والنہایۃ'' مستعار لے لیا تھا اور ابن شداد کی کتاب کے کچھ اقتباسات میرے پاس پہلے سے موجود تھے۔

میرا یہ مقالہ فلسطین کے ضائع ہونے کے اہم وجوہ واسباب پر مشتمل تھا ان میں پہلا سبب اپنے اصول وعقیدہ پر مر مٹنے اور جان کی بازی لگا دینے والے جذبات واحساسات کا فقدان تھا، یہاں یہ بیان کرنا چاہتا ہوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے چھوٹے بڑے ہر مسلمان کے دل میں ایمان ویقین شہادت وحصول جنت کا شوق وطلب کس درجہ پیدا فرمایا تھا پھر یہ ایمان جو عربوں کی سب سے بڑی طاقت اور عظیم سرمایہ تھا کس طرح کمزور پڑ گیا، مختلف تہذیبوں اور مادیت نے کس طرح ان میں اثر کیا اور انھوں نے زندگی کی اس گنجی کو کھو دیا اور اپنی پونجی سے تہی دست وخالی دامن ہو گئے۔ دوسرا سبب عقل کا جذبات پر غلبہ اور خطرے وجانفشانی کے میدان میں اترنے کے جذبات کا فقدان، ضرورت سے زیادہ سوچ بچار اور انجام ونتائج سے خوف وہراس۔

یہاں میں مناسب سمجھتا ہوں کہ قوت روحانی اور خطرہ کے وقت سینہ سپر ہونے کے جذبات سے متعلق باتیں کروں جس کی قوت ایمان سے حاصل ہوتی ہے اور یہ واضح کروں کہ عربوں کی تاریخ میں اس کو کیا فوقیت وامتیاز حاصل ہے، میں ان اہم کارناموں کو بیان کرنا چاہتا ہوں جو عرب کے حق میں شاندار فتوحات اور نمایاں کامیابی اور انسانیت کے حق میں

باعث سعادت اور تہذیب وتمدّن کے لئے نقطۂ عروج کا سبب ثابت ہوئے اور ان بڑی بڑی عظیم الشان اسلامی حکومتوں کو وجود بخشا اور.....ایک شاندار تمدّن کی بنیاد ڈالی جس کے سایہ تلے مسلمانوں بلکہ سارے عالم نے مزے اور سکون وچین کی زندگی گزاری۔ میں یہ بھی بیان کردینا چاہتا ہوں کہ عربوں نے جرأت وجوانمردی اور بروقت اقدام کرنے اور عزّت وعقیدت کے پیچھے اپنے آپ کو خطرے میں ڈال دینے کے جذبہ کو کھودیا انھوں نے غور وفکر میں کس قدر غلو سے کام لیا اور غیروں پر بھروسہ کیا اور اپنے اوپر اعتماد اور خدا پر بھروسہ کرنے کی صفت کو ضائع کردیا اور اتنا پست ہوئے کہ اپنے مقدس مقامات تک کو ہاتھوں سے دے دیا اور اقوام عالم کی نظروں حتّٰی کہ ان میں سے پست تر وذلیل قوم کے مقابلہ میں کمزور ثابت ہوئے۔ تیسرا سبب عرب حکومتوں اور قوموں میں کسی ایسے شخص کی نایابی جس پر فلسطین اور اس کے مسئلہ کا اتنا غلبہ ہو جو اس کے فکر واحساسات پر چھا جائے اور یہی اس کا سب سے اہم فکر بن جائے۔ سوچے تو اسی کے بارے میں، زندہ رہے اس کی خاطر، کدوکاوش اور جدوجہد کرے تو اسی کے لئے۔ یہاں میں تاریخ اسلام سے اور سیّدنا ابوبکرؓ، وسُلطان صلاح الدین ایوّبیؒ کی کچھ مثالیں اور نمونے بیان کردینا چاہتا ہوں اور یہ وضاحت مناسب سمجھتا ہوں کہ ان دونوں حضرات پر اسلامی حمیت اور دین کے دفاع کا جذبہ کتنا غالب آگیا تھا، ان حضرات کے فکر واہتمام کا یہ عالم تھا کہ اس ماں کی طرح بیتاب ومضطرب رہتے تھے جس کا اکلوتا بچہ دنیا سے اٹھ چکا ہو۔

استاد تیسیر ظبیان

عشاء سے قبل عمان کے معہد العلوم الشرعیہ کے پرنسپل استاد تیسیر ظبیان نے شرف ملاقات بخشا، میں نے بچپن میں ''الفردوس'' کے نام سے بعض جدید مضمون نگاروں کے مقالات کا ایک مجموعہ پڑھا تھا، میں اس سے اتنا متأثر ہوا کہ اس کے اسلوب کی تقلید کی کوشش کی تھی اور اس کے طرز پر لکھنا چاہا۔ جب میں نے استاد تیسیر ظبیان کا نام سنا تو میرا ذہن فوراً اس کتاب کی طرف منتقل ہوگیا اور یاد آیا کہ وہ استاد تیسیر ظبیان ہی کی کتاب تھی،

میں نے ان سے اس کتاب کے متعلق پوچھا تو فرمایا، ہاں میری ہی ابتدائی کتابوں میں سے ہے، انھوں نے عمان سے اس کا ایک نسخہ بھیجنے کا وعدہ فرمایا۔

اس کتاب کی فکر وطلب میرے لئے اس کے سوا کوئی اور کشش نہ رکھتی تھی کہ وہ بچپن کی ایک یادگار تھی اور بچپن کی یادیں انسان کو بہت محبوب ہوتی ہیں۔

جمعہ ۱۶/۱۰/۱۳۷۰ھ مطابق ۲۰/۷/۱۹۵۱ء

شاہ عبداللہ کے قتل کی خبر

صبح کو شیخ محمد علی ظبیان، استاذ القلقیلی، استاذ الحومانی اور علامہ بہجۃ البیطار نے شرف ملاقات بخشا، بڑی پرلطف مجلس رہی، نماز جمعہ ہم نے علامہ بہجۃ البیطار کے پیچھے مسجد دقاق میں پڑھی، عصر بعد جامع شیخ محی الدین گئے اور شیخ احمد کفتارو کے درس میں شریک ہوئے۔ شرکاء درس کی تعداد بہت زیادہ تھی، وہاں اچانک اردنی مملکت کے بادشاہ شاہ عبد اللہ ابن الحسین کے قتل کی خبر ملی، یہ خبر شیخ احمد کے بعض اہل تعلق نے ریڈیو سے سنی تھی، گذشتہ جمعہ کو ہم انھیں کی ضیافت میں انھیں کے دسترخوان پر تھے، پاک وبرتر ہے وہ ذات جو مارتی ہے اور مرتی نہیں اس کی ذات عالی کے سوا ہر شے فانی ہے، ان کا قتل عبرت ونصیحت ہے وہ اپنی چھوٹی سی حکومت میں جس کی آبادی چند ہزار سے زائد نہ تھی بڑی حکومت کے مالک بن گئے تھے، ان کی بڑی بڑی امیدیں اور بہت سے حسین خواب تھے، ان کے یہ خواب ابھی شرمندۂ تعبیر نہ ہونے پائے تھے، وہ اپنی امیدوں اور ارادوں ہی میں تھے کہ موت نے انھیں آدبوچا، انھوں نے اس طرح کی زندگی گذاری جس نے تنقید وتردید کے در کھول دیئے، بہت سے لوگ ان کے حقیقی مقاصد کو سمجھنے سے قاصر اور عرب کے مسئلہ میں ان کی پوزیشن اور موقف کے بارے میں میں مشکوک رہے۔

یہ مزید صدمے کی بات تھی کہ ان کے حادثے پر رنج وغم سینوں میں گھٹا ہوا، اور آنسو آنکھوں میں ڈبڈبائے ہوئے..... بہرحال ان کی شہادت ان کے حق میں تو بہتر ہے ہی،

رہا ملک کا معاملہ تو نہیں معلوم اس کے حق میں ان کی شہادت اچھی ہے، یا بری۔ ہمیں تو اندیشہ ہے کہ حالات ان کے بعد اور زیادہ بگڑ جائیں گے اور لوگ ان کو یاد کریں اور سلام و رحمت بھیجیں ۔ہمیں تو قدس کے بین الاقوامی بنا دیئے جانے کا اندیشہ ہے، جس کے معنی صہیونی اقتدار کے ہوں گے، ہمیں ڈر ہے کہ کہیں انگریز اس صورتحال سے فائدہ نہ اٹھائیں اس لئے کہ یہ قوم وفا شعاری اور اصول تو جانتی ہی نہیں، جو کچھ بھی ہو، جانے والے کو اللہ معاف کرے اور ان پر رحم فرمائے۔ فلسطین والوں پر خدا کی نظر کرم ہو اور ان کے بچے کھچے حصّے کی حفاظت کرے، شیخ احمد کفتارو کے درس سے ہم لوگ اٹھے تو ہماری طرف ایک لڑکا بڑھا جس کے چہرے بشرے سے ذہانت و ہونہاری ہویدا تھی، لڑکے نے سلام کیا اور کہا کہ میں نے ''اسمعی یا مصر'' پڑھا ہے اس کو میں نے بڑے اہتمام سے محفوظ رکھا ہے، اس نے اپنی خوشی کا اظہار کیا اتنے میں ایک صاحب میری طرف بڑھے اور کہا کہ یہ میرا لڑکا ہے اس لڑکے کی باتوں سے مجھے وہ خوشی ہوئی جو میری کتابوں پر بڑے لوگوں کے اعتراف و پسندیدگی کے اظہار سے نہیں ہوئی، اللہ تعالیٰ برکت دے اور اس کی صلاحیتوں کو پروان چڑھائے۔

مغرب بعد ہم لوگ القلقیلی صاحب کے یہاں گئے اور وہاں علماء اور ادباء کی ایک جماعت کے ساتھ نشست ہوئی جن میں علامہ بہجۃ البیطار، محمد النمر الخطیب، محمد کمال الخطیب، محمد علی الحوماني، اور امیر امان اللہ خاں کے سابق سکریٹری اور ان کی اہلیہ ملکہ ثُریّا کے عزیز جناب ادیب خاں شامل تھے وہیں عصرانہ عشائیہ ہوا۔

شنبہ ۱۷/۱۰/۱۳۷۰ھ مطابق ۲۱/۷/۱۹۵۱ء

کچھ معزّز احباب

ہم لوگوں نے شیخ احمد کفتارو کے یہاں ناشتہ کیا، پھر میں پورے دن مقالہ کی تیاری میں مشغول رہا، دوپہر کا کھانا برادر عزیز استاد عبدالرحمٰن البانی کے یہاں کھایا۔ وہاں اچانک ہم کو استاد عمر بہا الامیری سفیر سوریہ برائے پاکستان مل گئے، وہ سوریہ کی وزارت تعلیم

لجنة التعليم والتربية کے رکن استاذ امین المصری (۱) کے ساتھ آئے تھے، استاد امیری نے فرمایا کہ وہ اپنے کسی دوست کے یہاں مدعو تھے، جب استاد البانی کے گھر میں میری حاضری کا علم ہوا تو دوست سے معذرت کردی اور مجھ سے ملاقات کے شوق میں یہاں چلے آئے، مجھے ان کے اخلاص اور ظاہر پسندی کے طور وطریقہ سے مبرّا ہونے پر خوشی ہوئی، میزبان بھی ان کی آمد سے بہت خوش ہوئے، وہ ان کے مخلص دوستوں میں سے ہیں۔

استاذ ادیب خاں کے ساتھ

استاد البانی کے گھر سے ہم نے استاد ادیب خاں کے گھر کا قصد کیا اور وہاں ان کے پاس ایک گھنٹہ بیٹھے، اس نشست میں انھوں نے مجھ سے اس کتاب کا ذکر کیا جس میں انھوں نے ثابت کیا ہے کہ انگریزوں کی ملک گیری کا پلان اور جنگیں ہندوستان کی حفاظت کی غرض سے تھیں جو ان کی شہنشاہیت کے تاج کا موتی ہے۔

میں اس ادبی کتاب کے اسلوب، اس کی بلیغ عبارت اور استدلال کی سنجیدگی سے متأثر ہوا، استاذ ادیب خاں کی پرورش افغانستان وسوریہ میں ہوئی ہے۔ وہ دونوں ہی تہذیبوں کے جامع اور عربی وفارسی دونوں زبانوں سے واقف تھے۔ وہ ملکہ ثریّا (بیگم امان اللہ خاں) کے قریبی عزیزوں میں ہیں۔

یکشنبہ ۱۸/۱۰/۱۳۷۰ھ مطابق ۲۲/۷/۱۹۵۱ء

الجمعیۃ الغراء اور النادی العربی کی سیر

شیخ محمد علی ظبیان اور شیخ مصطفیٰ سباعی نے ملاقات کا شرف بخشا اور ہم لوگوں نے

---

(۱) ڈاکٹر محمد امین المصری قدیم وجدید ثقافت کے جامع غیور ودیندار مسلمان تھے، کیمرج یا آکسفورڈ سے حدیث پر ڈاکٹریٹ کی سند لی، کچھ عرصہ حکومت شام کی طرف سے عربی زبان کی نشر واشاعت کی غرض سے پاکستان میں مقیم رہے، اسی زمانہ میں حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوری سے تعلق پیدا کیا، شام کے حالات کے خراب ہوجانے کے بعد دوسرے رفقاء کی طرح سعودی عرب منتقل ہوگئے، آخر میں مدینہ یونیورسٹی میں تحقیقی کام کے نگراں مقرر ہوگئے تھے ۷۷ء میں جینوا میں ایک آپریشن کے دوران انتقال ہوگیا، رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ

الجمعیۃ الغراء دیکھا اور اس کے صدر شیخ احمد الدقر سے ملے اور النادی العربی (عرب کلب) گئے پھر بیٹھ کر تھوڑی دیر اس کے اراکین سے ہندوستان کے عرب سے دینی، ثقافتی تعلق اور وہاں کے علماء کے عربی علوم اور اس کے تصنیفی کاموں میں حصّہ لینے سے متعلق گفتگو ہوئی، میں نے ان سے کہا اس قومی روحانی رشتہ اور عربوں سے لاکھوں مسلمانوں کی دوستی کو نا قابل اعتنا نہیں سمجھا جا سکتا، بلکہ اس کو عرب ممالک میں رہنے والے مٹھی بھر عیسائیوں پر ترجیح حاصل ہے، جب یہ بات ہے کہ اسلامی وحدت کا رشتہ ایسے لاکھوں انسانوں کی دوستی پر قائم ہے جن سے روحانی، دینی اور ثقافتی تعلق ہے تو وہ اس قومیت عربیہ سے کہیں زیادہ قابلِ لحاظ اور قابل توجہ ہے جس کی بنیاد صرف زبان و وطن کی وحدت پر ہے، میں نے یہ نکتہ اس لئے بیان کیا کہ مجھے معلوم ہوا تھا کہ یہ کلب عرب کی بعث پارٹی اور اس کے افراد کے زیر اثر ہے۔

جمعیۃ التمدن الاسلامی میں

آج ہم کو ہمارے محترم دوست محمد کمال خطیب نے ''جمعیۃ التمدن الاسلامی'' کی دعوت دی تا کہ ہم اس کے اراکین و کارکنوں سے تعارف حاصل کریں، وہاں علامہ بہجۃ البیطار، اور محمد النمر الخطیب، احمد مظہر العظمۃ اور موقر جج حضرات بھی تشریف رکھتے تھے۔ استاد محمد کمال خطیب نے میرا تعارف کرایا اور فرمایا کہ اس مجلس کی مناسبت سے تقریر کروں چنانچہ میں نے اندرون عرب اور بیرون عرب، عربوں کی ذمّہ داری کے بارے میں کچھ باتیں کیں، اندرون طور پر تو یہ کہ عرب پیغام اسلام اور فکر اسلامی کے بارے میں ایسا یقین پیدا کریں جو نو مسلموں کا سا جوش و سرور رکھتا ہو، شرکاء نے اس تجدید و اصلاح کے ذرائع اور طریقوں کے بارے میں بات کی اور اپنے تجربات بیان کئے، اسی طرح عرب کے اندرونی حصّہ میں دینی دعوت پھیلانے کے بارے میں گفتگو کی اور میں نے جمعیۃ کے اراکین کے سامنے تجویز رکھی کہ وہ اس پہلو کی طرف توجہ دیں اور عوام سے رابطہ قائم کریں جو دینی رہنمائی کے ضرورت مند ہیں صرف علمی کاموں اور پڑھے لکھے لوگوں ہی کو مخاطب کرنے پر

اکتفانہ کریں، خارجی ذمہ داری یہ ہے کہ دیگر قوموں کو بھی اسلام کی دعوت دی جائے۔

دوشنبہ ۱۹/۱۰/۱۳۷۰ھ مطابق ۲۳/۷/۱۹۵۱ء

دمشق یونیورسٹی میں میرا مقالہ

آج کے مشاغل میں صبح کو علاّمہ بہجۃ البیطار صاحب سے ملاقات اور شیخ مصطفیٰ سباعی کے یہاں اخوانی بھائیوں کی ایک جماعت کے ساتھ دوپہر کا کھانا تھا، جن میں استاذ عمر بہاء الامیری سفیر شام متعینہ پاکستان، محمد المبارک، محمد النمر الخطیب، احمد الدقر اور جناب عبدالرؤف وغیرہ تھے، آج دمشق یونیورسٹی میں میرے مقالہ کا دن مقرر تھا، عصر بعد ہم لوگ وہاں گئے اور یونیورسٹی کے وائس چانسلر استاد قسطنطین زریق (۱) کے کمرہ میں تھوڑی دیر بیٹھے عجب اتفاق کہ استاد قسطنطین نے بھی اپنے رسالہ ''معنی النکبة'' میں فلسطین کے سیاسی مسئلہ کے بارے میں عربوں کی ناکامی اور شکست کے اسباب سے بحث کی ہے۔ قریبی مدّت میں استاد البانی نے مجھ کو یہ کتاب دکھائی تھی، یہ ایک فطری بات ہے کہ دو آدمیوں کے طرز فکر اور اس کے طریقۂ استدلال میں اختلاف ہو، وہ اس رسالہ میں کلیۃً نیا رُخ اختیار کرنے اور پرانے فکر کو چھوڑنے اور دین کی زندگی سے علحدہ رکھنے کی ہدایت کرتے ہیں، ہمارا ان سے اتفاق اس بات پر ہے کہ عربوں کو ایمانی جذبہ کی ضرورت ہے، لیکن جذبہ کی تشریح وتعیین کے بارے میں ہمارا اختلاف ہے، ہم تھوڑی دیر ان کے کمرہ میں بیٹھے اور ہندوستان میں عربی زبان کے مقام وقدردانی اور ان ملکوں میں مسلمانوں کی اس کی طرف توجہ، اور اس زبان کی انھوں نے جو خدمت کی ہے اس پر گفتگو کرتے رہے، علاّمہ بہجۃ البیطار نے ہندوستانی علماء کے عربی سیکھنے کے امتیاز ومہارت، اسلامی اتحاد، اور اسلام کو مضبوطی کے ساتھ تھامنے کے بارے میں گفتگو کی، استاذ قسطنطین ڈر رہے تھے کہ گرمیوں کی

---

(۱) ایک صاحب فکر عیسائی فاضل تھے جو اس زمانہ میں یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے عہدے پر فائز تھے ان کی کتاب ''معنی النکبه''، فلسطینی مسئلہ پر ایک پرمغز کتاب سمجھی جاتی تھی۔

چھٹی اوران دنوں کی شدید گرمی کی وجہ سے سامعین بہت کم نہ ہوں، چنانچہ انھوں نے اس کی تمہید پہلے ہی قائم کردی اور فرمایا کہ اگر حاضرین کم ہوں تو آپ معذور جانیں، ہم لوگ یونیورسٹی ہال کی طرف چلے، یہاں دیکھا تو سامعین کی بہت بڑی تعداد موجود تھی، اپنی وسعت کے باوجود ہال تھوڑی ہی دیر میں بھر گیا۔ حاضرین میں پارلیمنٹ کے اسپیکر ڈاکٹر معروف الدوالیبی استاد عمر بہاء الامیری یونیورسٹی کے وائس چانسلر استاذ زریق رجسٹرار استاد یوسف العش اور ممبران پارلیمنٹ میں سے استاد عبدالوہاب حومد(۱) استاد محمد المبارک، ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی، یونیورسٹی کے اساتذہ، پروفیسروں اور ماہرین تعلیم میں سے کلیۃ الآداب کے پروفیسران ڈاکٹر امجد طرابلسی اور استاد سعید افغانی اور شیخ بہجۃ البیطار مدرسہ دیر یاسین کے پرنسپل استاذ نمر مصری (جو پناہ گزینوں کے بچوں کے لئے قائم کیا گیا تھا) وزارت تعلیم میں تعلیم وتربیت کی کمیٹی کے رکن اور جمعیۃ التمدن الاسلامی اور اس کے رسالہ کے مدیر استاذ احمد مظہر العظمۃ تعلیم وتربیت کی کمیٹی کے ممبر استاد امین المصری جمعیۃ التمدن الاسلامی کے ممبر استاد محمد کمال خطیب اور علماء دین میں سے شیخ احمد کفتارو، شیخ مکی الکتانی اور شیخ احمد الدقر، الجمعیۃ الغراء کے صدر شیخ عبدالرؤف ابوطوق، دمشق کے علماء میں سے شیخ محمد علی ظبیان وغیرہ۔

علامہ محمد بہجۃ البیطار آگے بڑھے اور مقالہ نگار کا سامعین سے تعارف کرایا پھر میں نے مقالہ پیش کیا اور شیخ مصطفیٰ سباعی نے اس پر بڑے بلیغ انداز میں تبصرہ کیا اور اس مقالہ میں جو خیالات ونظریات پیش کئے گئے تھے ان کی تائید کی اور یہ توقع ظاہر کی اللہ تعالیٰ فلسطین کے لئے کسی ایسے شخص کو لائے گا جو اس مسئلہ کو اپنالے، اس کے لئے بالکل یکسو ہوجائے، اس شخص کی طرح رات رات جاگے جس کا اکلوتا لڑکا بیمار ہو، اس کے بعد جلسہ ختم ہوگیا۔ الحمدللہ مجلس کامیاب تھی۔

---

(۱) حسن حکیم کے کابینہ میں وہ وزیر تعلیم تھے

سہ شنبہ ۲۰/۱۰/۱۳۷۰ھ مطابق ۲۴/۷/۱۹۵۱ء

شیخ محمد علی ظبیان کی دعوت میں مشائخ دمشق کا تذکرہ

شیخ علی ظبیان کے یہاں ناشتہ ہوا، ناشتہ پر ہمارے ساتھ علامہ بہجۃ البیطار ہمارے میزبان شیخ عبدالوہاب الصلاحی، شیخ موسیٰ الطّویل اور ان کے صاحبزادے تھے، ناشتہ پر شام کے جلیل القدر محدث سید بدرالدین حسنیؒ اور شیخ عبدالحکیم افغانی نیز دعوت اہل اللہ کے طریقوں اور اس کی حکمت سے متعلق گفتگو رہی(۱)، اس موقع پر شیخ عبدالوہاب الصلاحی نے جو باتیں کیں منجملہ ان کے ایک یہ بات تھی کہ شیخ بدرالدین حسنیؒ نے رمضان المبارک میں ایک دن دمشق کی طوائفوں کو کہلا بھیجا کہ..... یہ مبارک مہینہ ہے اس میں دعا قبول ہوتی ہے اور رحمت خداوندی کا نزول ہوتا ہے۔ بدرالدین تم لوگوں سے درخواست کرتا ہے کہ تم لوگ غسل کرو اور خدا کے واسطے دو رکعت نماز پڑھ کر مسلمانوں اور بدرالدین کے لئے دعا کرو عین ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہاری دعا کی برکت سے اس کی مغفرت فرمادے ''۔ یہ طرز گفتگو بڑا ہی مؤثر ثابت ہوا اس طریقہ سے دس سے زائد طوائفوں نے توبہ کی اور ان کے حالات بہتر ہوگئے، شیخ بہجۃ البیطار نے بتایا کہ:

'' ایک مرتبہ شیخ بدرالدین کے والد نے سنا کہ ایک مسجد کے عین بغل میں ایک شراب خانہ کھلا ہے تو وہ سیّد عبدالقادر الجزائری(۲) کے پاس آئے اور ان کو آمادہ کرنا چاہا کہ وہ شراب خانہ کو بند کرادیں، شیخ عبدالقادر نے یہ کہہ کر کہ ان کو کچھ اختیار و قابو نہیں ہے معذرت

---

(۱) علامہ محدث بدرالدین حسنی بڑے عالم محدث اور عالی مرتبت شیخ عظیم مربی و مصلح تھے جن کا ارباب حکومت و اقتدار پر بھی رعب و داب تھا ان پر تحقیقی مقالہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے استاذ مولانا عتیق احمد بستوی صاحب نے تحریر کیا تھا جو الفرقان لکھنو میں کئی قسطوں میں شائع ہوا اور پھر کتابی شکل میں ایک اور شخصیت کے اضافہ کے ساتھ ''چند اصحاب عزیمت'' کے نام سے شائع ہوا۔ (مترجم)

(۲) الجزائر کے مشہور مجاہد، عالی نسب امیر جنھوں نے حکومت فرانس کے مقابلہ میں علم جہاد بلند کیا صوفی المشرب، ذاکر، شاغل بزرگ تھے، ناکامی کے بعد دمشق آگئے اور وہیں توطن اختیار کرلیا راقم حروف نے ان کے صاحبزادہ کی زیارت کی ہے۔

کردی ان کا یہ جواب سن کر وہ ان کے سامنے کھڑے ہوئے اور فرمایا کہ: ' میں اس مردے کی نماز جنازہ پڑھتا ہوں ' اور اللہ اکبر کہہ کر ان کی نماز جنازہ پڑھنے لگے، انھوں نے کہا کہ یہ کیا ہے؟ جواب میں فرمایا کہ نماز جنازہ ہے اس لئے کہ آپ مردہ ہیں۔ مسجد کے پاس کھلے ہوئے شراب خانہ کو بند نہیں کرا سکتے۔ اس کے بعد انھوں نے معذرت کی اور اس دوکان کو خرید کر وقف کر دیا، شیخ موسیٰ الطویل نے اپنے شیخ بدرالدین الحسنیؒ اور شیخ عبدالحکیم افغانی، کے اخلاق وعادات اور علم ودین کی خدمت کے لئے ہر طرف سے یکسو ہو کر کام کرنے کے متعلق بہت سے حالات سنائے بہت سی باتیں بتائیں، بڑی اچھی مجلس رہی۔

سیدنا زید بن ثابت اور سیدنا زید بن ارقم رضی اللہ عنہما کے مرقد پر

محمد علی ظبیان کے گھر جاتے ہوئے ہم لوگوں نے سیدنا زید بن ثابت اور سیدنا زید بن ارقم رضی اللہ عنہما کی قبر کی زیارت کی، یہ پتہ نہیں کہ ان دونوں کی طرف ان قبروں کی نسبت کہاں تک صحیح ہے۔ شیخ مصطفیٰ سباعی نے ملاقات کی عزت بخشی اور ہمارے حلب، حمص وحماۃ کے سفر اور اخوان کے مرکزوں میں تقریریں کرنے کا پروگرام بنایا، ڈاکٹر سعید رمضان نے دوپہر کے کھانے پر مدعو کیا، ہم لوگ ''فندق اموی'' گئے اور ان کے ساتھ ان کے دوست جناب ھدی الطباع کے ساتھ کھانا کھایا۔

الجمعیۃ الغراء میں میری تقریر

الجمعیۃ الغراء میں جامع تنکز کے اندر علماء اور دینی انجمنوں کے صدر حضرات جمع ہوئے اہل علم اور مدارس کے لوگوں کی ایک بڑی تعداد اکٹھا ہوئی میں نے دعوت اور عوام میں اس کی اشاعت نیز مدارس میں اس کام کی ضرورت کے موضوع پر تقریر کی اور اس سلسلے میں اپنے تجربات بیان کئے اور ان خطرات کی نشاندہی کی جو عوام سے الگ تھلگ رہنے اور ان سے رابطہ نہ قائم کرنے نیز ان کی دینی شعور کو بیدار نہ کرنے کی صورت میں مدارس کو لاحق ہیں۔ ہم نے ان

کے سامنے دعوت کے اس طریقہ کو بیان کیا جس کو ہم اپنے شہر لکھنؤ اور دار العلوم ندوۃ العلماء میں چلاتے ہیں، اس طریقۂ دعوت سے مدرسہ اور شہر کو جو فائدہ پہونچا اس کا میں نے ذکر کیا، منگل کے پروگرام کی مناسبت سے اسی طرح میں نے اخوان المسلمین کے مرکز میں بھی تقریر کی۔

چہار شنبہ ۲۱/۱۰/۱۳۷۰ھ مطابق ۲۵/۷/۱۹۵۱ء

شرق اردن کی خبریں

شرق اردن اور بیت المقدس کے بارے میں ہم جس بات سے ڈر رہے تھے، آج اخبارات نے اسی کی خبر دی۔ حالات بگڑے اور گلب باشا نے موقع کو غنیمت سمجھا اور فلسطین کے بے گناہوں کی سخت سرزنش کر ڈالی اور اہلِ قدس کو ستا کر اپنے جذبات کو تسکین دی، ان کی بڑی تعداد کو سازش کا الزام لگا کر جیل میں بند کر دیا، اب بیت المقدس اردنی فوج کے رحم و کرم پر ہے۔ انگریزوں کی سازش..... کے سبب فلسطین کے بزدل بھی شیر ہو گئے۔ عرب حکومتیں اور پارٹیاں سب الگ تھلگ رہیں، انھوں نے زندگی کا کوئی ثبوت نہ دیا، نہ کسی ظالم کو روکا..... بیت المقدس کی حمایت میں کسی نے بھی آواز نہ اٹھائی، بس ایک مفتی امین الحسینی کا دم ہے ان کا جتنا بس چلا کوشش کرتے رہے

عالم جلیل شیخ حسن حبنکہ کی ضیافت

آج ہم شیخ حسن حبنکہ سے ملے ان کا مدرسہ دیکھا اور انھیں کے ساتھ دوپہر کا کھانا کھایا۔

استاد محمد عزۃ دروزہ سے مسئلہ فلسطین پر گفتگو

ہم لوگ کتاب عصر النبی علیہ السلام و بیئتہ قبل البعثۃ (۱) کے مصنف استاد محمد عزۃ دروزہ سے ملنے گئے میں نے ۱۹۴۷ء میں ان کی یہ کتاب مکّہ معظّمہ میں پڑھی تھی، میں نے اپنی کتاب ماذا خسر العالم کی تصنیف میں اس سے فائدہ بھی اٹھایا ہے۔

بات فلسطین کے بارے میں ہونے لگی۔ استاد محمد عزۃ فلسطینی ہیں، عرصہ سے مسئلہ فلسطین پر کام کررہے ہیں، اس سے متعلق ان کی کئی کتابیں ہیں، انھوں نے ہم کو بعض ایسے حقائق سے واقف کیا جو ہماری ان پہلی معلومات کی تائید کرتے ہیں جو عرب حکومتوں کی کمزوری وپستی اور عرب قائدین کی بے حمیتی اور بے عملی کے متعلق مختلف ذرائع سے معلوم ہوئے تھے۔ انھوں نے کہا کہ مسئلہ فلسطین کے بارے میں عرب حکومتیں سنجیدہ نہیں تھیں اور نہ جنگ کا پختہ ارادہ رکھتی تھیں۔ مسئلہ کے ایک مرحلہ میں ان حکومتوں سے کہا گیا کہ وہ اپنی طاقت مجتمع کرلیں اور اسرائیل کو بالکل ہی سے مٹادیں اور یہ اس وقت بہت ممکن تھا۔ لیکن انھوں نے کہا کہ ہم جنگ میں اس توقع پر شریک ہوئے ہیں کہ امریکہ اور برطانیہ بالآخر مداخلت کریں گے اور مسئلہ کا تصفیہ کرادیں گے اسی لئے عرب حکومتوں نے سنجیدگی وپختگی کا مظاہرہ نہیں کیا اور نہ فلسطین کے بارے میں مرمٹنے پر آمادہ ہوئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اسرائیل زندہ رہا اور ایک حقیقت بن گیا، امریکہ نے دخل دیا نہ برطانیہ نے بلکہ ان دونوں نے اسرائیل کی مدد کی۔ یہ حقیقت ہے کہ..... جنگ دوسرے کے بل بوتے پر نہیں لڑی جاسکتی۔ کوئی بھی قوم وحکومت کسی تیسرے کی مداخلت پر اعتماد کرکے جنگ نہیں لڑسکتی، جنگ ہمیشہ بلاقید وقانون ہوتی ہے جو بہادری وجوانمردی اور دشمن کے خاتمہ کے عزم کے بغیر نہیں حاصل ہوسکتی، عرب حکومتوں سے یہ کہنا ممکن ہے کہ ؎

اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

پنجشنبہ ۲۲/۱۰/۱۳۷۰ھ مطابق ۲۶/۷/۱۹۵۱ء

''مضایا'' میں

آج بھائی عبدالرحمٰن البانی ہم لوگوں کو گرمی گزارنے کے مقام ''مضایا'' لے گئے جہاں وہ اپنے خاندان کے ساتھ گرمی گزارتے ہیں، یہ گرمی گزارنے کی پرسکون جگہ ہے۔

راستہ میں ہم لوگ بہت خوبصورت.....قدرتی مناظر.....اور دریائے بَردَی کے دہانے سے گزرے۔ اس میں شک نہیں کہ ملک شام عمومًا اور دمشق خصوصًا قدرتی مناظر سے مالا مال ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو بڑا قدرتی جمال، دلفریب منظر، پانی کی مٹھاس اور ہوا کی لطافت عطا کی ہے۔ ہم نے دن مضایا ہی میں گزارا۔

بلودان کانفرنس کی یاد

میں نے دور سے شام کا مشہور گرمائی مستقر بلودان کو دیکھا تو میں نے سیّد عبدالرحمٰن البانی سے کہا کہ جیسے میں..... یہ نام پہلے کبھی سن چکا ہوں، انھوں نے کہا۔ جی ہاں! فلسطین کی مشہور کانفرنس مؤتمر بلودان یہیں ہوئی تھی، اس میں عرب حکومتوں کے سربراہ وقائدین شریک ہوئے تھے، انھوں نے خوب شرابیں پیں اور خوب بیبا کی اور عیش وطرب میں وقت گزارا اور یہ سب کچھ مسئلہ فلسطین پر غور کرنے کے نام سے ہوا وہ جمع ہوئے اور منتشر ہو گئے، کوئی فیصلہ نہ کیا، ستم یہ کہ بعضوں نے اعلان کیا کہ ہم ایسے نتائج تک پہنچ چکے ہیں جو دنیا کو ہلا کر رکھ دیں گے مگر ہوا کچھ بھی نہیں، ایک پتہ بھی نہیں ہلا۔

مرکز اخوان میں میری تقریر

آج مرکز اخوان میں میری تقریر تھی، میں نے اس سفر کے تاثرات اور جن نتائج تک میں پہونچا تھا ان کو سامعین کے لئے دو لفظوں میں میں نے جمع کر دیا۔ پہلا نقطہ تو یہ کہ جس طبقہ کے ہاتھ میں ملکوں کی زمام کار ہے، اسلام پورے طور سے اس کے حلق سے اترا نہیں نہ اس نے اس کو تعلیم وتربیت کے اعتبار سے اچھی طرح ہضم کیا ہے اور نہ وہ اسلام پر ایک دین وضابطۂ حیات کی حیثیت سے ایمان رکھتا ہے جیسا کہ مغربی تہذیب کے اصولوں اور اس کی افادیت پر رکھتا ہے یہ لوگ اسلام کے اتنے مخلص نہیں جتنے اپنے فوائد ومقاصد کے، ان میں سے اکثر لوگوں کی فکری صلاحیت بری طرح بگڑ چکی ہے وہ اس کو قبول نہیں کرتی کہ اسلام حکومت وفرمانروائی کر سکتا ہے۔ اور انسانیت کی فلاح وکامرانی اسی سے وابستہ ہے۔

دوسرا نقطہ یہ کہ ان تمام ملکوں کی مسلم عرب آبادی سیاسی شعور کے اعتبار سے بہت کمزور یا اس سے یکسر محروم ہے۔ وہ زندگی کے ابتدائی و بنیادی اصولوں کو بھی نہیں سمجھ سکتی، نہ دوست و دشمن میں فرق کر پاتی ہے، بدخواہ و بہی خواہ کو نہیں پہچانتی نہ دشمن کو برا سمجھتی ہے نہ دوست سے گہرا تعلق رکھتی ہے وہ بالکل جانوروں کی طرح ہے۔ جو ڈنڈوں سے ہانکے جاتے ہیں۔ بکریوں کی ریوڑ کی طرح بے سوچے سمجھے کسی بھی رُخ پر چل پڑتے ہیں، جب تک ان قوموں میں صحیح فہم کی کمی رہے گی اس وقت تک وہ پروپیگنڈوں کا شکار رہیں گے اور ان کے افراد ہر آواز لگانے والے کے پیچھے دوڑتے رہیں گے۔

اس کے برعکس یورپین قومیں اپنی ساری خرابیوں اور بہت سے عیوب کے باوجود بیدار مغز ہیں، دوست دشمن میں فرق کرتی ہیں، کوئی غیر مخلص ان کو زیادہ دنوں تک دھوکہ نہیں دے سکتا۔ قوم کے مصالح کے ساتھ زیادتی کرنے اور قوم کے منصوبہ کو پورا کرنے کے بعد قوم کے اعصاب کو معطل کر کے کرسیٔ حکومت نہیں حاصل ہوسکتا، یہی وہ قوم ہے جس نے پہلی جنگ عظیم کے ہیرو لوئیڈ جارج اور دوسری جنگ عظیم کے ہیرو ونسٹن چرچل کو وزارت عظمیٰ کے منصب پر باقی نہ رہنے دیا نہ جنگ کے آخری مرحلہ میں ان کی کامیابی، ان کی سفارش کر سکی اور نہ منصب قیادت پر قائم رہنے دیا..... اسی طرح فرڈن، میسو، اسپین سے اقتدار چھین لیا گیا اور اس پر قومی خیانت کا الزام لگایا گیا اس لئے کہ اس نے جرمنی کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ ہمارا حال یہ ہے کہ زمامِ حکومت کو سنبھالنے والا ملک تک کو بیچ ڈالتا ہے اور مقدس سے مقدس اور قیمتی سے قیمتی چیزوں میں قوم کی خیانت کرتا ہے اور..... اختیارات حکومت کا بے جا استعمال کرتا ہے، قوم نہ اس کا محاسبہ کرتی ہے نہ سزا دیتی ہے۔ یہ اس لئے کہ قوم کا اجتماعی ضمیر بیدار نہیں ہے۔ بادشاہ جو چاہتے ہیں کرتے ہیں، وزراء اور قوم کے نمائندے من مانی کرتے ہیں، ان کی حکومت رجسٹرڈ اور عزت محفوظ رہتی ہے۔ ان کو نہ کوئی خوف ہے نہ خدشہ، لیکن قوم کا ضمیر بیدار ہو جائے گا تو کسی کے لئے حکومت سے فائدہ اٹھانا اور خیانت کرنا ممکن نہ

ہوگا اور نہ دوبارہ اس کی امید قائم کی جاسکے گی۔ لہٰذا عوام میں اس بیداری کا پیدا کرنا، عمومی طور پر دل وضمیر کو جگانا، اور عوام سے رابطہ قائم کر کے دلوں میں دینی دعوت کا بیج بونا اور اس کو اس لائق بنا دینا کہ وہ اپنے نفع ونقصان، دوست ودشمن، مخلص ومنافق میں فرق کرنے لگے بہت ضروری ہے۔ اے کاش کہ ہمارے بھائی قوم کے مختلف طبقوں میں دینی دعوت کو پھیلانے، اس کے دینی شعور کو بیدار کرنے، اور صحیح شعور پیدا کرنے کے لئے دو سال یا پانچ سال کا پروگرام بناتے اور وہ بستی بستی اور دیہات دیہات پھیل جاتے مسلمانوں کا کوئی گھر نہ بچنے پاتا جس میں دعوت نہ پہنچ گئی ہو نہ کسی غریب کا جھونپڑا نہ کسی امیر کا محل، کوئی ایسا فرد نہ بچتا جس کو دعوت کا پیغام نہ پہنچا ہو اور اس پر اسلامی دعوت کی حجت تمام نہ ہوگئی ہو، یہی وہ حقیقی قوت ہے جس سے وہ اللہ کا کلمہ بلند کر سکتے ہیں اور قوم کو نئی قوت وتوانائی بخش سکتے ہیں اور حالات کا رخ موڑ سکتے ہیں۔

جمعہ ۲۳/۱۰/۱۳۷۰ھ مطابق ۲۷/۷/۱۹۵۱ء

دمشق یونیورسٹی کی مسجد میں خطبۂ جمعہ اور حدیث سوال کی تشریح

کل ہمیں معلوم ہوا کہ حجاز مقدس کے ادیب ہمارے دوست احمد عبد الغفور عطار دمشق میں ہیں، الرشید میں ان کا قیام ہے۔ لہٰذا رات کو ہم ان کے پاس گئے، انھیں سوتا پا کر تعارفی کارڈ چھوڑ کر ہم لوگ واپس آ گئے، صبح وہ خود تشریف لائے اور ہمارے ساتھ ناشتہ کیا ان سے مل کر ہم لوگ بہت خوش ہوئے، دمشق یونیورسٹی کے طلباء نے یونیورسٹی کی مسجد میں مجھ سے خطبۂ جمعہ دینے کو کہا میں نے بڑی معذرت کی اس لئے کہ جمعہ خطبہ مجھ پر بہت بار ہوتا ہے، حالانکہ میں اپنے شہر میں محلّہ (۱) کی مسجد کا امام ہوں۔ اور الحمد للہ منصب امامت میرا پشتینی منصب ہے، میرے والد ودادا دونوں نماز پڑھایا کرتے تھے۔ اسی طرح میرے

---

(۱) بازار جھاؤلال، امین آباد کی مسجد نوازی کی امامت والد صاحب مرحوم مولانا حکیم سید عبد الحی صاحب کے وقت سے اس تک ہمارے ہی سلسلہ میں چلی آ رہی تھے، ان کے بعد بھائی صاحب مرحوم ڈاکٹر سید عبد العلی صاحب اور ان کی زندگی ہی میں میں نے یہ ذمہ داری سنبھالی تھی۔

بڑے بھائی بھی امامت فرماتے تھے مگر مجھ کو اس کی عظمت واہمیت کا برابر احساس رہتا ہے۔ یہ سب سہی مگر ان لوگوں نے میرا کوئی عذر قبول نہیں کیا۔ بالآخر چار و ناچار ان کی دعوت قبول کرلی، خطبہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث سے شروع کیا (قیامت کے دن بندے سے جب تک چار چیزوں کے بارے میں نہ پوچھ لیا جائے گا اس کے پاؤں اپنی جگہ سے نہیں ہٹ سکتے۔ اس کی عمر کے بارے میں سوال ہوگا کہ اس کو کہاں کھپایا، جوانی کے بارے میں کہ اس کو کہاں لگایا، مال کے بارے میں سوال ہوگا کہ کہاں سے حاصل کیا اور کہاں خرچ کیا، اس کے علم کے بارے میں سوال ہوگا کہ اس علم سے اس نے کیا کام لیا) میں نے اس حدیث کی تشریح کی اور کہا کہ جامعہ کے طلباء تمہیں بتاؤ کہ وہ طالب علم کتنا خوش نصیب ہے جس کو امتحان سے پہلے سوالات بتادیئے گئے ہوں پھر وہ طالب علم کتنا بدنصیب ہے جس کو امتحان سے پہلے سوالات معلوم ہوگئے، اور اس نے وقت ضائع کیا نہ تیاری کی اور نہ صحیح جوابات مرتب کئے یہی سوالات ہیں جن سے عنقریب تم کو.....سابقہ پڑے گا۔ اور حضور اکرمؐ نے ہم کو بتادیا ہے جو مسلمانوں کے حال پر حد درجہ شفیق اور مہربان تھے اس لئے کہ ان کو معلوم ہے کہ دنیا تیاری وجدّ وجہد کی جگہ ہے اور آخرت انعام اور کئے کا پھل پانے کی جگہ ہے۔ پھر حدیث کے جزو ''جوانی کے بارے میں سوال ہوگا کہ جوانی کہاں صرف کی''۔ کو میں نے تفصیل سے بیان کیا، میں نے بعض صحابۂ کرامؓ اور ان کے بعض صاحب عزیمت لوگوں کا ذکر کیا اور بتایا کہ ان کے نزدیک جوانی کا کیا مفہوم تھا، انھوں نے جوانی کے موقع سے کس طرح فائدہ اٹھایا، میں نے ان سے حضرت مصعب بن عمیر اور ان کے بعد حضرت عمر بن عبدالعزیز کا قصہ بیان کیا اور بتایا کہ وہ عیش وتنعم، نفاست اور نستعلیقی زندگی سے زہد وتقشّف کی زندگی کی طرف کس طرح منتقل ہوئے اور رہن سہن میں سادگی اور کھانے پینے میں موٹے جھوٹے کا استعمال کس طرح شروع کیا اور پھر اس کے نتیجہ میں ایمان کی لذت محسوس کی اور ایثار وقربانی کا مزہ چکھا، انھوں نے ان حسی لذّتوں کو حقیر سمجھا

جس میں جانور و چوپائے بھی ہمارے شریک ہیں۔

اشرفیہ کے گرمائی مستقر میں شیخ مصطفیٰ سباعی کے ساتھ

آج شیخ مصطفیٰ سباعی ہم کو اشرفیہ کے مصیف لے گئے جہاں وہ گرمی گزارتے ہیں، استاد محمد المبارک اور کچھ اخوانی جوان بھی ہمارے ساتھ ہو لئے، شیخ سباعی صاحب نے لب دریا ایک خوبصورت جھونپڑا ڈلوادیا ہے، وہ بڑی ہی پرفضا جگہ ہے اس میں بیٹھنے اور ان دونوں حضرات سے گفتگو کرنے میں بڑا لطف آیا، گفتگو تحریک اخوان المسلمین اور سیاست میں دخل دینے کے موضوع پر ہو رہی تھی۔ سباعی صاحب نے دعوت کے بعض تجربات سنائے اور بتایا کہ کس طرح لوگ تحریک کی طرف تیزی سے بڑھتے تھے اور پتنگوں کی طرح ٹوٹتے تھے، پھر معمولی سی بات پر اس سے الگ ہو جاتے تھے، انھوں نے کہا کہ آخر یہ بھیڑ چھٹ گئی اور وہی مخلص لوگ باقی رہ گئے جنھوں نے دعوت کو اچھی طرح جذب کر لیا تھا، انھوں نے پھر مصر میں بانی تحریک شیخ حسن البناء کے ساتھ جو کچھ پیش آیا اس کو بیان کیا۔ پوری دنیا ان کی اور ان کی دعوت کی دلدادہ بن گئی۔ سیاسی پارٹیاں بھی ان کے ساتھ ہو گئیں، اخوان کے جلسے بے مثال و یادگار ہوتے تھے، جبکہ وفد پارٹی کے کارکن اپنے جلسہ میں لوگوں کو کھینچ کھینچ کر لے جاتے تھے۔ لیکن جب حکومت اخوان کی مخالف ہو گئی اور مقابلہ میں آ گئی، لوگ جماعت سے الگ ہو گئے۔ مصری اخبارات نے ان کا مذاق اڑایا۔ ظاہراً ان کی دوستی کا دعویٰ کرنے والوں نے ان کو بے سہارا چھوڑ دیا۔ جماعت کے بانی شیخ حسن البناء نے اس تبدیلی کو محسوس کر لیا تھا اور حج سے واپس آنے کے بعد یہ طے کر لیا تھا کہ اب صرف تربیت اور افراد تیار کرنے پر اصل توجہ صرف کریں گے، تحریک کو وسعت دینے کی کوشش نہیں کریں گے، مگر اس سے پہلے ہی مصر میں حادثات پیش آ گئے معاملہ ہاتھ سے نکل گیا، اخوان قید کر دیئے گئے، دعوت ممنوع قرار دے دی گئی اور وہ ان حوادث کے مقابلہ اور اس مشکل کو حل کرنے میں لگ گئے پھر اچانک ان کی شہادت کا واقعہ پیش آ گیا۔ اسی طرح دمشق میں بھی علماء اور دینی

شخصیتوں کی طرف اوّل اوّل بڑا رجوع ہوا۔ حتّٰی کہ شکری بک قوتلی " الجمیعة الغراء " میں آئے اور وہیں انھوں نے انتخاب کے لئے امیدواروں کے نام کا اعلان کر دیا، علماء اس سے دھوکے میں آ گئے اور ان کو ووٹ دے دیا اور صدر کے پاس جاتے اس کو مشورہ دیتے، معاملات میں دخل دیتے، برسر اقتدار طبقہ نے اس دخل اندازی اور علماء کے تسلط کو پسند نہ کیا چنانچہ ایک معمولی سے واقعہ کو بہانہ بنا کر اخبارات کو ان کے خلاف ابھار دیا جس کے نتیجہ میں لوگ علماء سے دور ہو گئے اور ان کا ساتھ چھوڑ دیا، عوام ان پر جری ہو گئے پھر تو یہ حال ہو گیا کہ علماء کی پوشاک میں لوگ بازار جاتے ہوئے شرمانے لگے۔

دینی جوش وخروش بوڑھوں سے زیادہ جوانوں میں

ہم لوگ اشرفیہ سے لوٹے اور بھائی عبدالرحمٰن البانی کے ساتھ ان کے گھر گئے تاکہ یونیورسٹی کے ان طلبہ سے ملیں جن کی آج وہاں نشست ہے اور ان سے داعی کی خصوصیات وصفات اور نفس کی تربیت کا طریقہ بیان کریں۔ ہم نے ایسا منظر دیکھا جو عبرت کا باعث تھا اور جو ایک عظیم تبدیلی کی نشاندہی کر رہا تھا۔ شام کے وزیر دفاع یوسف العظمۃ کا مجسّمہ نصب کرنے کے موقع پر جو میسلون (۱) کی جنگ آزادی میں شہید ہوئے تھے، مجسّمہ سازی کے بارے میں گرما گرم بحث ہو رہی تھی، عبرت کی بات یہ تھی کہ ایک معمر عالم جن کے سر پر عمامہ بھی تھا، مجسمہ سازی کے حق میں تھے اور اس طرز فکر کی طرف سے دفاع کر رہے تھے اور ان کی سب سے بڑی دلیل یہ تھی کہ اگر ہم اس مجسّمہ کو جو شام کے دوستوں کی طرف سے ہدیہ کیا گیا ہے، نصب نہ کریں گے تو ترقی یافتہ اور متمدن قومیں ہمارا مذاق اڑائیں گی اور کہیں گی کہ شام کے رہنے والے پس ماندہ اور غیر متمدن ہیں اور یہ بڑے شرم کی بات ہے۔

دوسری طرف یونیورسٹی کے طلبہ تھے جن کی تعلیم یونیورسٹی کی تھی اور ڈر تھا کہ وہ مجسّمہ

---

(۱) امیر فیصل ابن حسین کی مختصر حکومت میں جب فرانسیسی فوجیں دمشق میں داخل ہو رہی تھیں۔ میسلون کے مقام پر دمشق کے شہریوں سے ان کی پہلی ٹکر ہوئی، اس مدافعانہ مقابلہ کی قیادت یوسف العظمہ کر رہے تھے وہ اس موقع پر شہید ہوئے، دمشقی ان کا جنگ آزادی کے ایک ہیرو کی طرح احترام کرتے تھے۔

نصب کرنے کے نظریہ کی تائید وموافقت کریں گے مگران کواس پر طیش آ گیا، اور وہ بڑے جوش کے ساتھ اس کی تردید کررہے تھے۔ ان میں سے بعض تو شدت غیظ وغضب سے بے قابو ہورہے تھے۔ اور آزادیٔ رائے اور شیخ کے احترام میں ان کے ساتھی ان کو دبا رہے تھے۔

بلاشبہ نوجوان اسلام کو زیادہ صحیح سمجھ رہے تھے، اس ماحول میں احساس کمتری سے بہت بلند تھے۔ اس صورت حال سے میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ اہل دین اپنا مقام چھوڑ چکے ہیں اور وہ مغربی فکر وتہذیب سے مرعوب وخوف زدہ ہیں اور شاید اب اسلامی قیادت ان نوجوانوں کے ہاتھ میں جارہی ہے جنھوں نے اس مادہ پرست تہذیب کی گود میں پرورش پائی ہے اور عہد حاضر کی ثقافت میں پلے بڑھے ہیں۔ ممکن ہے کہ آزر کے بیٹے اور بت خانوں میں پلنے والے اسوۂ ابراہیمی پیش کریں۔

شنبہ ۲۴/۱۰/۱۳۷۰ھ مطابق ۲۸/۷/۱۹۵۱ء

مشہور صاحب قلم علاّمہ محمد کرد علی سے ملاقات

آج ہم لوگوں نے ناشتہ جناب بہجۃ البیطار صاحب کے یہاں کیا۔ ہمارے ساتھ جناب احمد عبد الغفور عطار بھی تھے۔ پھر ہم لوگ نامور عرب فاضل اور شام کے عظیم مؤرخ وادیب استاذ محمد کرد علی سے ملاقات کے لئے گئے، ہم ان کے دولت خانہ پر ان سے ملے، انھوں نے ہمارا خیر مقدم کیا اور ایسی بشاشت وگرم جوشی سے استقبال کیا کہ پڑھے لکھے لوگوں میں چند ہی لوگ اس طرح ملے ہوں گے، میں نے ان سے کہا کہ میں نے آپ کی سب سے پہلے جو چیز پڑھی وہ آپ کی کتاب ''حاضر الاندلس وغابرھا'' کا ایک باب تھا، اس نے مجھ پر بڑا اثر ڈالا، میں نے اس کی بعض عمدہ ترکیبوں اور اچھی عبارتوں کو ذہن نشین کرلیا انھوں نے فرمایا، میں نے سنا ہے کہ اس کتاب کا ہندوستان میں ترجمہ ہوگیا ہے، میں نے عرض کیا، جی

---

(۱) مولانا عبد السلام قدوائی ندوی سابق معتمد تعلیم دار العلوم ندوۃ العلماء وشریک نظامت دار المصنفین اعظم گڈھ اور ''ہماری بادشاہی'' ہندوستان کی کہانی'' اور متعدد کتابوں کے مصنف، افسوس ہے کہ اس کتاب کا ترجمہ ضائع ہوگیا اور زیور طبع سے آراستہ نہ ہوسکا۔

ہاں! ہمارے رفیق درس، اور شریک کار، مولانا عبدالسلام صاحب قدوائی ندوی(۱) نے اس کا ترجمہ کیا ہے پھر انھوں نے بتایا کہ میں نے اندلس دیکھا ہے اور میرے وہاں پہنچنے کا اتفاق اس دن ہوا جس دن عرب وہاں سے نکلے ہیں۔ ملک میں ہر سال اس کی یادگار منائی جاتی ہے اس سوئے اتفاق سے طبیعت بہت مکدّر ہوئی اور میں دن بھر پژمردہ رہا۔

اس کے بعد انھوں نے علماء ہند کی علمی روح اور اس ملک میں علم وتصنیف کی تحریک کی تعریف کی اور فرمایا کہ آپ کو معلوم ہے کہ علامہ ابن عابدین (علامہ شامی) کے علمی کاموں میں ہندوستان کا بڑا حصہ اور احسان ہے۔ وہ اس طرح کہ ان کے والد ایک تاجر تھے، ہندوستان سے ان کے بڑے تعلقات تھے، چنانچہ ہندوستان سے اپنے لڑکے کے لئے فقہ کی کتابیں لایا کرتے تھے اور سیّد عابدین ان کتابوں کا مطالعہ کیا کرتے تھے، اس طرح ان کی شخصیت کو بنانے اور فقہ پر عبور حاصل کرنے میں ہندوستان کا بھی حصّہ ہے۔

انھوں نے مجھ کو اپنی کتاب ''کنوز الاجداد'' ہدیہ کی جو ان کو اپنی تصانیف میں سب سے زیادہ پسند ہے، اس کے بعد ہم لوگوں نے المجمع العلمی دیکھا اور استاذ خلیل مردم بک سے دوبارہ ملاقات کہ انھوں نے مجھ کو ''دیوان علی ابن جہم'' ہدیہ کیا، جس کی انھوں نے تصحیح کی ہے، اور اس پر حاشیہ لکھا ہے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ، علامہ ابن قیم اور علامہ ابن کثیر کے مرقد پر

ہم لوگ دمشق یونیورسٹی گئے اور اس کے وائس چانسلر استاد قسطنطین زریق سے ملے۔ اصلاً ہمیں شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی قبر کی زیارت کرنی تھی، ان کی قبر میڈیکل کالج کے قریب ہے، یہی مقابر صوفیہ ہے جس کا کتب تراجم میں بڑا ذکر آتا ہے، ''سلک الدرر'' میں مرادی، اور خلاصۃ الاثر میں محبی بارہا فرماتے ہیں کہ وہ مقابر صوفیہ میں دفن کئے گئے، یہیں پر تاریخ دمشق کے مصنّف ابن عساکر اور ابن الصلاح صاحب مقدمہ اور ''البدایۃ والنہایۃ'' اور تفسیر ابن کثیر کے علامہ ابن کثیر الدمشقی صاحب کی قبریں تھیں، ایک ہی رات میں یہ سب قبریں

زمین کے برابر کردی گئیں، یونیورسٹی کے عملہ نے راتوں رات حملہ کر کے ان کو بے نشان کر دیا، تا کہ اس پر یونیورسٹی کی کوئی نئی عمارت تعمیر کریں، قریب تھا کہ ان کے ساتھ امام ابن تیمیہ کی قبر بھی مٹ جاتی لیکن اس وقت کے صدر جمہوریہ شکری قوتلی نے جو ملک سعود کے دوست ہیں مداخلت کی اور امام ابن تیمیہ کی قبر کے باقی رکھنے کا حکم دیا۔

لوٹتے وقت ہم نے میدان تحتانی میں حافظ ابن قیمؒ کی قبر کی زیارت کی، اللہ تعالیٰ اسلام اور مسلمانوں کی طرف سے ان دونوں کو وہ بہتر سے بہتر صلہ عطا فرمائے جو اس دین میں غلو کرنے والوں کی تحریفات اور اہل باطل کی دسیسہ کاریوں اور جاہلوں کی تاویلات کو ختم کرنے والوں کو عطا کرتا ہے، شیخ زین العابدین، شیخ حسن حبنکہ، جناب بہجۃ البیطار، احمد عبد الغفور عطار، اور بعض اخوانی احباب کے ساتھ محمد توفیق کنجی کے یہاں دوپہر کا کھانا کھایا۔ پھر جناب کامل قصاب صاحب سے ملے، ان سے میں اخبار الفتح کے ذریعہ پندرہ سال قبل واقف ہوا تھا، انھوں نے اگلے دن صبح کو تشریف لانے کا وعدہ کیا۔

یکشنبہ ۲۵/۱۰/۱۳۷۰ھ مطابق ۲۹/۷/۱۹۵۱ء

ملوکِ عرب پر شیخ کامل قصاب کا تبصرہ

جناب شیخ عبدالوہاب الصلاحی، محمد نمر الخطیب کے ساتھ ابوعزہ صاحب کے یہاں ناشتہ کیا نیز عبدالوہاب صلاحی صاحب کے گھر پر جناب بہجۃ البیطار، کامل قصاب اور جناب عبد الفتاح امام نے شرف ملاقات بخشا اور ہم کو رخصت کیا اس لئے کہ آج حمص کے سفر کا دن تھا اور حماہ پھر حلب اور وہاں سے ترکی جانا تھا، روانگی سے پہلے شیخ کامل قصاب سے ملاقات ہوئی اور انھوں نے موجودہ عرب بادشاہوں سے اپنے تعلقات کا ذکر کیا اور عرب حکومتوں پر سیر حاصل تبصرہ کیا اور بتایا ان سے جو امیدیں تھیں وہ کس طرح ناکام و پامال ہوئیں..... تلخ تجربات اور دین کی مدد اور اسلام و مسلمانوں کی حمایت و نصرت کے سلسلہ میں ان کو مطمئن کرنے کی بہت سی تدبیریں اختیار کرنے کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچے اور یہ رائے قائم کی کہ ان سے کسی خیر

کی توقع نہیں ان کو اپنے پیٹ اور خواہشات کے سوا کوئی فکر نہیں، شیخ نے مسلمانوں کے جن حالات کا مشاہدہ کیا اور اسلام کی رسوائی کا جو منظر دیکھا اس سے وہ بڑے غمگین اور شکستہ دل تھے لیکن وہ بڑے صاحب ایمان اور دین کے لئے پر جوش و سرگرم عمل ہیں، وہ اس بات سے رنجیدہ تھے کہ ہمارے دمشق میں ہونے کا ان کو علم نہ ہوا اور ہم لوگوں کی ملاقات آخر وقت میں ہوئی، انھوں نے بہت سے حقائق پر روشنی ڈالی اور ہم سے اپنا درد دل، دل کھول کر بیان کیا۔

دمشق سے حمص کو

شیخ مصطفیٰ سباعی اور دوستوں کی ایک جماعت نے ہمیں شرف ملاقات بخشا اور ہم لوگ حمص کی موٹر پر سوار ہو گئے، شیخ مصطفیٰ سباعی نے ہمارے پہونچنے سے پہلے ''اخوان'' کو ہماری آمد کی اطلاع دے دی تھی۔ ہم نے حمص و دمشق کے درمیان کی مسافت اس طرح طے کی کہ شامی فتوحات کی تاریخ کا نقشہ نگاہوں میں گھوم رہا تھا اور صحابہ کرام اور ان کے علاوہ دیگر مجاہدین اسلام کے پیدل اور گھوڑوں پر سوار لشکروں کی تصویریں نگاہوں میں پھر رہی تھیں، یہ وہی سرزمین ہے جس کو کبھی ان کے شہسواروں نے اپنے گھوڑوں کی ٹاپوں سے پامال بلکہ نہال اور مالا مال کیا تھا، آج ہم اس سرزمین کو امریکہ کی بنی ہوئی تیز رفتار، عمدہ اور آرام دہ موٹر پر طے کر رہے تھے، کل اور آج میں کتنا فرق ہے، ماضی اور حال کے لوگوں میں کتنا بُعد ہے۔

ہم لوگ ۴ر بجے حمص پہونچ گئے اور اخوان المسلمین کے مرکز میں داخل ہوئے وہ ایک شاندار وصاف ستھرا محل ہے اس میں باغ اور پانی کا حوض ہے، وہاں اپنے محترم دوست شیخ مصطفیٰ سباعی کے بھائی استاذ نصوح السباعی اور استاذ عبد المجید طرابلسی سے ملے عصر کی نماز کے بعد یہ حضرات ہم کو نہر عاصی کی تفریح گاہ لے گئے، جہاں ہم نے مغرب کی نماز پڑھی اور نہر کے کنارہ شام کا کھانا کھایا۔ وہاں ہم نے موسم میں تبدیلی اور سردی میں زیادتی محسوس کی۔

بچپن کی یادیں اور صمصام الاسلام کا تذکرہ

پھر ہم مرکز اخوان واپس آ گئے، عشاء بعد میری تقریر کا پروگرام تھا، جلسہ گاہ

حاضرین سے کچھا کچھ بھر گیا۔ جلسہ میں شہر کے معزز وسر برآوردہ اور پڑھے لکھے طبقہ کے لوگ نمایاں تھے۔ استاد عبدالمجید کے خیر مقدمی اور پرجوش تعارفی کلمات کے بعد میں اٹھا، اور اپنے تعلق اور بچپن سے، حمص کی محبت کا ذکر کیا، ہمارے خاندان میں یہ معمول تھا کہ خاندان کی عورتیں جمع ہوتی تھیں۔ خصوصاً کسی حادثہ کے وقت اور سب کے یکجا جمع ہو جانے کے بعد کتاب صمصام الاسلام پڑھا کرتی تھیں جو ہمارے خاندانی بزرگ سید عبدالرزاقؒ کلامی مرحوم(۱) کے قلم سے واقدی کی فتوح الشام کا اردو نظم میں ترجمہ ہے، وہ بڑی مؤثر ومربوط تھی، جب یہ اشعار پڑھے جاتے تو دل سینوں میں مچلنے لگتے اور آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی اور اس وقت کی فضا گویا بزبانِ حال یہ کہتی ؎

کوئی جا کر کے کہہ دے ابر نیساں سے کہ یوں برسے
کہ جیسے مینھ برستا ہے ہمارے دیدۂ تر سے

ہم نے سیدنا خالدؓ اور دوسرے مجاہدین صحابہؓ اور سپاہیوں اور ان کی بہادری اور جان پر کھیل جانے، ان کے شوق شہادت اور اس فانی زندگی کو حقیر سمجھنے کے حالات کو اسی کتاب سے جانا، ان کی محبت دل کی گہرائیوں میں اتر گئی تھی، اور وہ مزاج وعقیدہ بن گئی تھی۔

شامی فتوحات کی تاریخ اور عالم اسلام پر اس کے اثرات

میں نے کہا کہ اے شام وحمص کے رہنے والو! یہ تاریخ جو تمہارے ملک میں تیار ہوئی ہے، اسی نے ہندوستانی مسلمانوں کو وہاں کی اکثریت میں (جو چہار جانب سے ان کو گھیرے ہوئے ہے) جذب وتحلیل ہو جانے سے روکا اور اس تیزاب میں فنا ہو جانے سے ان کو باز رکھا جو اسلام کے خلاف ہے۔ یہ وہی تاریخ ہے جو اس وقت سے اس وقت تک برابر زندگی وطاقت

(۱) مرحوم حضرت سید احمد شہیدؒ کے حقیقی بھانجہ منشی سید حمید الدین صاحب کے پوتے اور دوسرے بھانجے سید عبدالرحمٰن سپہ سالار افواج ریاست ٹونک کے نواسہ تھے وہ میرے والد مرحوم کے حقیقی پھوپھا تھے قادر الکلام شاعر تھے، اردو میں شاہنامہ اسلام کی بنیاد انہوں نے ڈالی، سیرت کے واقعات وغزوات کو "گوہر مخزن" اور حسام الاسلام کے نام سے فتوحات صحابہ کو صمصام الاسلام کے نام سے نظم کیا جس کا ماخذ واقدی کی فتوح الشام ہے، یہ ۲۵ ہزار اشعار پر مشتمل ہے، یہ مطبع نول الکشور پریس لکھنو سے چھپ کر مقبول خلائق ہوئی ایک زمانہ میں گھر گھر پڑھی جاتی تھی۔

اور باطل کے خلاف نبرد آزمائی کا سرچشمہ ہے، دینی جذبات کے بقاء وتحفظ، مسلم قوم میں اس کے جاری رکھنے میں اس کا بڑا دخل ہے، اس سے بڑھ کر حیرت ناک اور باعث رنج وغم کوئی اور بات نہیں ہوسکتی کہ ہم حمص والوں کو اس شاندار تاریخ سے غافل اور اس کے پیغام سے لاپروا اور اس کی شخصیتوں اور جانبازوں کی طرف سے صرف نظر کرتے دیکھیں۔

عالم اسلام کو کسی سیف اللہ کی ضرورت ہے

میں نے کہا آج عالم اسلام مادی اسباب ووسائل کے اعتبار سے بہت بڑھا ہوا ہے لیکن اس کے پاس اللہ کی تلواروں میں سے کوئی تلوار نہیں ہے اور یہی اس کی محرومی اور کمزوری کا اصل سبب ہے۔ حمص والو! یہ تلوار تمہارے ہی ملک میں مدفون ہے، کیا تم میں یہ حوصلہ ہے کہ تم عالمِ اسلام کی مدد کرو اور اس کی کھوئی ہوئی تلوار یا قبر میں سویا ہوا بہادر اس کو مستعار دے دو، پھر میں نے ان سے کہا کہ عالم اسلام کی صرف صورت باقی رہ گئی ہے حقیقت اس میں نام کی نہیں ہے، روح وحقیقت سے اس کے خالی ہونے ہی نے اس پر ستم ڈھایا ہے اور دشمنوں کو اس پر شیر بنادیا ہے۔ اس وقت عالم اسلام میں جو کمزوری وذلت پیدا ہوگئی ہے وہ اس وقت تک دور نہیں ہوسکتی جب تک کہ وہ حقیقت کا جامہ نہ پہن لے اور اس کو صحیح اسلامی روح سے بھر نہ دے، میں اس نکتہ کو بڑی تفصیل سے بیان کیا اور روزمرہ کی زندگی سے اس کی بہت سی مثالیں بیان کیں، معلوم ہوا کہ تقریر سامعین کو بہت پسند آئی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تقریر میں حاضرین میں سے ایک..... بڑی تعداد کے احساس کی ترجمانی تھی اور اس کے تجربات اور عالم اسلام کے حالات ان باتوں کی تصدیق بھی کرتے تھے گویا وہ تصویر واقعہ اور بیان حقیقت تھا۔

دوشنبہ ۲۶/۱۰/۱۳۷۰ھ مطابق ۳۰/۷/۱۹۵۱ء

سیدنا خالد بن ولیدؓ کے مرقد پر

آج صبح ہم لوگ سیدنا خالد بن ولیدؓ کی زیارت کو گئے اور اس مسجد میں داخل ہوئے جو ان کی طرف منسوب ہے، ان کی تربت کے سامنے کھڑے ہوئے اور ان کی تاریخ

جہاد و جوانمردی اور اللہ تعالیٰ نے ان کو جو مافوق الفطرت ہمت ورعب اور گھبراہٹ بٹھادینے والی قوت وصلاحیت، اخلاص وجذبۂ ایثار عطا فرمایا تھا، اس کو یاد کرنے لگے، اس قیام نے دل میں بہت سے احساسات ومعانی کو بیدار کردیا اور ان کی تاریخ کی یادیں تازہ کردیں اور اس زبردست مجاہد کی عظمت، محبت اور قدر و قیمت کو اور بڑھادیا جن کا نام حضورؐ نے سیف اللہ رکھا تھا۔

ایک مخلص دوست کی ملاقات

ہم لوگوں نے معہد علمی دیکھا جو سیدنا خالدؓ کی مسجد کے ایک گوشہ میں ایک دینی مدرسہ ہے، پھر ہم نے حمص کے اپنے ایک مخلص دوست شیخ عبدالعزیز عیون السود سکریٹری دارالافتاء کے یہاں کا رخ کیا ہم دونوں کا تعلق سال گذشتہ کے حج میں قائم ہوا تھا، اور انھوں نے مجھ کو حمص آنے کی دعوت دی تھی، پانچ ہی دن قبل ان کے والد کا انتقال ہوا تھا "رحمۃ اللہ علیہ" ان کے گھر پر ان سے ملے اور ان کی تعزیت کی، مرحوم کی بڑی خواہش تھی کہ ہم انھیں کے یہاں ٹھہرتے انھوں نے ہمارے لئے ایک کمرہ تیار کر رکھا تھا اور ہماری آمد کے منتظر تھے، مگر حکم خداوندی آپہنچا اور انھوں نے لبیک کہا، انھوں نے "اللہ تعالیٰ برکت دے" اپنے پیچھے اپنے متعلقین اور ہمارے دوست شیخ عبدالعزیز جیسے بہترین جانشین اور یادگار چھوڑی۔

مفتی حمص سے ملاقات

ہم لوگ شیخ عبدالعزیز کے ساتھ شیخ محمد توفیق ابوالحسن اتاسی سے ملنے گئے جو حمص کے مفتی اعظم اور صدر جمہوریہ ہاشم بک اتاسی کے چچازاد بھائی ہیں، اتاسی خاندان علم ودین میں شام بھر میں مشہور ہے، محترم مفتی صاحب کی عمر زیادہ ہے، بال سفید ہیں، وہ صلحاء اور علماء کا نمونہ ہیں، نہایت خوش خلق، خندہ جبیں، ہمارے ملک کے بڑے علماء سے مشابہ ہیں۔

مسجد دحیہ کلبیؓ اور مسجد نورالدین زنگی میں

ہم لوگوں نے نماز ظہر ملک نورالدین شہید کی مسجد میں پڑھی، وہی شہر کی جامع مسجد

ہے، پھر ہم نے اخوان المسلمین کا دفتر دیکھا، پھر لوٹ آئے اور جناب عبدالعزیز عیون السود کے گھر کھانا کھایا، تھوڑا سا آرام کیا، پھر دوبارہ مفتی حمص سے ملے اور سیّدنا دحیہ کلبی کی طرف جو مسجد منسوب ہے اس میں نماز عصر پڑھی اور پھر محترم مفتی صاحب کے ساتھ تھوڑی دیر ان کے گھر پر بیٹھے اور پھر جناب عبدالعزیز عیون السود کے والد کی قبر پر گئے۔

مرکز اخوان المسلمین میں شیخ عمر بہاء الامیری سے ملاقات

اخوان المسلمین کے مرکز میں علماء اور اخوانیوں کی ایک جماعت اکٹھا ہوگئی ہم بیٹھ کر ان سے باتیں کرنے لگے۔ حلب سے شیخ عمر بہاء الامیری صاحب آئے جو پاکستان میں شام کے سفیر ہیں وہ تھوڑی دیر ہمارے ساتھ بیٹھے پھر دمشق کے لئے روانہ ہوگئے راستہ میں ہم کو کچھ فلسطینی ملے جنھوں نے گذشتہ رات، ہم نے اخوان المسلمین کے مرکز میں جو تقریر کی تھی، اس پر بڑی پسندیدگی کا اظہار کیا اور کہا کہ اس تقریر نے ان کے ایمان کو تازہ کر دیا انھوں نے ہم سے مطالبہ کیا کہ آج رات ہم اس جلسہ میں شریک ہوں جس کو وہ کسی گھر میں منعقد کریں گے اور اس میں اپنے احباب اور شہر کے کچھ لوگوں کو بلائیں گے ہم نے ان کی دعوت قبول کر لی اور عشاء بعد اس جلسہ میں شریک ہوئے، دیکھا تو یہ اجتماع شہر کے سربرآوردہ لوگوں اور بڑے بڑے عہدیداروں پر مشتمل تھا، ہم نے ان لوگوں سے خطاب کیا انھوں نے بڑی توجہ، خاموشی اور سکون کے ساتھ ان باتوں کو سنا پھر رات کا کھانا کھایا اور اپنی قیام گاہ واپس آگئے۔

سہ شنبہ ۲۷/۱۰/۷۰ح مطابق ۳۱/۷/۱۹۵۱ء

سیّدنا عمر بن عبدالعزیز کی قبر پر

اخوان المسلمین کے مرکز میں اخوانی احباب، شہر کے علماء اور محترم مفتی محمد توفیق اور شیخ عبدالعزیز عیون وغیرہ نے شرف ملاقات بخشا اور میں ان حضرات کے ساتھ سیدنا عمر بن عبدالعزیز کی قبر کی زیارت کے لئے دیر سمعان گیا، یہ حمص کے نواحی علاقوں میں ایک

علاقہ ہے، قبر ایک ایسے ٹیلہ پر ہے جس کے اردگرد انگور کے باغات ہیں، میں خلافت راشدہ کے پانچویں مسند نشین اور مجدّد دین اسلام میں سے ایک بڑے مجدّد کی قبر کے پاس بیٹھا اور ان کے غیر معمولی زہد وورع، قوت ایمانی اور خلافت راشدہ کے طور وطریق سے بھرپور ان کی تاریخ کو یاد کیا اور ان کے لئے دعائے خیر کی اور بارگاہ ایزدی میں اس بہادر جوان پر رحمت ومغفرت کی جھڑی لگی رہنے کی دعاء ودرخواست کی اور اس زمانہ میں اسلام اور دُکھ کی ماری انسانیت وزخم خوردہ قوموں کے لئے ان جیسے حاکم وفرماں روا کی آرزو وتمنا کی۔

هيهات أن يأتي الزمان بمثله

ان الزمان لمثله لبخيل

" افسوس اب زمانہ ان جیسے لوگوں کو نہیں لاسکتا "

" زمانہ ان جیسے لوگوں کو پیدا کرنے سے بخل کرتا ہے "۔

شہر حماہ(۱) کو روانگی

ہم لوگ شہر حماہ کی طرف روانہ ہوئے جہاں عصر کی نماز کے وقت پہونچے۔ دوستوں کی ایک جماعت نے ہمارا استقبال کیا اور قصر آل العظم میں ٹھہرایا جو یہاں کا ایک تاریخی محل، اور اب کئی انجمنوں کا صدر دفتر ہے۔

گیلانی خاندان(۲)

ہم لوگ اخوان المسلمین کے مرکز میں ٹھہرے جو قصر آل العظم کے ایک گوشہ میں قائم ہے۔ مجھے بخار کی حرارت محسوس ہوئی، اخوان المسلمین کے صدر اور اخوان المسلمین کے سکریٹری جناب عبدالغنی الساعاتی ہمارے پاس آئے اور اخلاق ومحبت کے ساتھ ملے، میں نے

---

(۱) عرب بولتے وقت صرف حما کہتے ہیں 'ۃ' صرف لکھنے میں استعمال ہوتی ہے۔

(۲) یہ خاندان پیران پیر حضرت سیدنا عبدالقادر جیلانی سے نسبی وروحانی نسبت رکھتا ہے اور اسی وجہ سے گیلانی کہلاتا ہے، بغداد اور حماۃ اس کے دو بڑے مرکز ہیں۔

گیلانی خاندان کے متعلق پوچھا۔ ہم نے اپنے شہر لکھنؤ میں اس خاندان کے ایک فرد سید علی گیلانی کی زیارت کی تھی جو فرنگی محل میں قیام فرماتے تھے، اور وہاں کے علماء ان کے بڑے معتقد تھے، اور بہت سے لوگ ان کے حلقۂ ارادت میں شامل تھے، احباب نے ہمیں اس خاندان کے سید نزار گیلانی نامی ایک شریف نوجوان کو بتایا، معلوم ہوا کہ وہ سید علی گیلانی کے بھتیجے ہیں، ان حضرات نے مجھ سے شیخ محمد مرتضیٰ گیلانی کا ذکر کیا جو اس وقت نقیب الاشراف ہیں، استاد عبدالعزیز الساعاتی نے ہمیں سید مرتضیٰ سے ملنے کا مشورہ دیا میں نے کہا بسر وچشم، اگرچہ مجھے اس وقت حرارت محسوس ہو رہی تھی تاہم میں سید صاحب سے ملا، تھوڑی دیر ان کے پاس بیٹھا، پھر مرکز اخوان کے جلسہ میں شریک ہوا، جلسہ بہت سے علماء واساتذہ پر مشتمل تھا۔

جلسہ میں میری تقریر

میں اس جلسہ میں تقریر کی اور کہا کہ شام کے اسلامی جہاد نے ہندوستانی مسلمانوں کو کس طرح اس پر آمادہ کیا کہ وہ اسلام کی خاطر جدّ وجہد اور اپنے دین کا دفاع کریں۔ اس نے ان میں کس طرح دینی روح کو ابھارا اور اسلامی غیرت کو بھڑکایا۔

اہل شام کی ذمّہ داری

اس کی پیروی کی ذمہ داری سب سے زیادہ خود شام والوں پر عائد ہوتی ہے ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی تاریخ سے سبق لیں اب اگر شام کے لوگ آسانی کے ساتھ قومیت کے اصولوں کی طرف مائل ہو جائیں گے اور عربی قومیت کے نعرہ سے مدہوش ہو جائیں گے تو ہندوستانی مسلمان بدرجۂ اولی اپنے ملک کی اکثریت میں گھل مل جائیں گے جو چاروں طرف سے ان کو گھیرے ہوئے ہے۔ اگر وہ ایسا کریں تو اکثریت اس کا استقبال کرے گی اور ان کو سر پر بٹھائے گی۔ مگر اے عربو! جس چیز نے ان کو ایسا ان کرنے سے باز رکھا، وہ محض وہی اسلامی عقیدہ ہے جس کی دعوت ان کو تمہارے ہی باب دادا نے دی، یہ تاریخ

جو شام اور دوسرے عرب ممالک میں ڈھلی اور بنی ہے جب شام کے لوگ آسانی سے اس سے دست بردار ہو جائیں گے اور اس عقیدہ سے الگ ہو جائیں گے تو دوسرے لوگ جن کا اس سے کوئی نسبی تعلق نہیں ہے بہت آسانی کے ساتھ اس کو خیر آباد کہہ دیں گے، اگر ایسا ہوتا ہے تو پھر ان پر بھی لازم ہے کہ وہ ہمارے ان شہیدوں اور زخمیوں کو واپس کر دیں۔ ان قربانیوں اور اس پاکیزہ خون کو لوٹا دیں جو اسلام کے لئے بے دریغ بہایا گیا تھا۔

میں نے چاہا کہ ان کی غیرت کو بیدار کروں اور دلوں کے سب سے نازک تار پر ضرب لگاؤں مجھے ان کے چہروں پر اس کا اثر نظر آیا، تقریر سخت اور چبھتی ہوئی تھی، میں نے قصداً ایسا کیا اس لئے کہ جذباتی اور تقلیدی انداز میں ''پاکستان زندہ باد'' کے کھوکھلے نعروں سے میں اکتا گیا تھا۔ جلسہ ختم ہونے کے بعد ہم لوگ مرکز کے ہال میں بیٹھے وہاں حماہ کے کچھ علماء اور مشائخ سے تعارف ہوا، وہیں شیخ محمد حامد سے تعارف ہوا جو حماہ کے بڑے غیور و مصلح عالم ہیں جو منکرات وخلاف شریعت چیزوں پر سختی کے ساتھ احتساب کرتے ہیں، استاد محمد منیر لطفی سے بھی تعارف ہوا، انھوں نے اپنی تصنیفات میں سے ''حقائق عن الشیوعیۃ'' مجھے ہدیہ کیا، کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف عہد حاضر سے باخبر اور اس کے فکری واجتماعی مسائل سے واقف ہیں۔

چہار شنبہ ۲۸/۱۰/۱۳۷۰ھ مطابق ۱/۸/۱۹۵۱ء

حماہ کے رہٹ

گزشتہ رات شیخ محمد آفندی گیلانی نے ہم کو ناشتہ کی دعوت دی، ہم لوگوں نے راستہ میں حماۃ کے نواعیر کو دیکھا جو اس شہر کی خصوصیت اور آبپاشی کا ایک قدیم طریقہ ہے، یہ بڑے بڑے پہیے اور پنکھے ہیں جو تالاب کے پانی کو مختلف بلندیوں پر پہنچاتے ہیں، ان پہیوں سے ڈبے بندھے ہوئے ہیں وہ پانی سے بھر جاتے ہیں اور چکر لگاتے ہوئے ..... پانی گراتے جاتے ہیں۔ اس طرح سے پانی شہر کی تمام بلند جگہوں کو پہنچ جاتا ہے، پہیوں کے گھومنے سے

مسلسل ایک آواز پیدا ہوتی ہے جس سے فضا گونجتی رہتی ہے، رات میں یہ آواز اور تیز ہو جاتی ہے، پردیسیوں کی تو نیند اڑا دیتی ہے، شہر والے اس کے عادی ہو چکے ہیں، رہٹ کا نظام سنچائی کا پرانا نظام ہے جو رومیوں کے عہد سے چلا آرہا ہے گیلانی خاندان کے سب سے پرانے تاریخی گھروں کے پاس سے گزر ہوا جس کے بعض لوگ بغداد سے حماہ منتقل ہو گئے ہیں۔

شاید یہ لوگ ابوالفداء کے عہد میں یہاں منتقل ہوئے، ہم لوگ اپنے میزبان جو اس وقت کے نقیب الاشراف ہیں ان کے گھر پہنچے اور ناشتہ کیا۔

حماہ کے تاریخی آثار

ہم لوگ شہر دیکھنے اور اس کے تاریخی آثار کے مشاہدہ کی غرض سے نکلے، چنانچہ جامع ابوالفداء دیکھا جس کو جامع الحیّات کہا جاتا ہے، اس کو جامع الحیات کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کے ستونوں پر ایسی لکیریں بنی ہوئی ہیں جو سانپوں کے مشابہ ہیں، اس وقت یہ مسجد فلسطینی پناہ گزینوں کا ٹھکانہ ہے اس میں ان کے خاندان اور متعلقین اس طرح رہتے ہیں، جس طرح لوگ گھروں میں بے تکلف رہتے ہیں، اسی میں بچوں کی ولادت تک ہوتی ہے اسی طرح ہم نے دمشق میں دیکھا کہ مسجد میں پناہ گزینوں کی رہائش گاہ بن گئی ہیں اور یہ حکومت کے حکم سے ہوا ہے، لوگوں کے پاس ضرورت سے زائد محل اور مکانات ہوتے ہوئے بھی اس کا جواز اب تک سمجھ میں نہیں آیا۔

ابوالفداء حموی

ہم نے ابوالفداء کی قبر دیکھی جو تاریخ کی مشہور کتاب تاریخ ابی الفداء کا مصنّف ہے جو اسی کے نام سے مشہور ہے، یہ ان چند گنے چنے بادشاہوں میں سے ہے جو نظام حکومت چلانے کے ساتھ ساتھ صاحب علم و قلم بھی تھے، وہ ایک بادشاہ ہوتے ہوئے جلیل القدر عالم اور بڑا باخبر مصنّف تھا اس کے عہد میں حماۃ چمک اٹھا اور ترقی کے بام عروج کو پہنچ گیا۔ اور وہ مستقل ایک حکومت، ایک الگ ملک ہو گیا۔

ثانویۂ ابن رشد میں

اسی طرح ہم نے الملک المظفر کی مسجد دیکھی وہ بڑی شاندار مسجد ہے، پہلے وہ کنیسہ تھا پھر مسجد میں تبدیل کر دیا گیا۔ ہم ثانویۂ ابن رشد بھی گئے وہ نئے طرز کی عمارت ہے ہم اس کے بعض اساتذہ سے ملے یہ گرمیوں کی چھٹی کے دن تھے ان میں سے بعض حضرات گزشتہ جلسہ میں آئے تھے، انھوں نے تقریر پر اپنے تأثر کا اظہار کیا۔

آل العظم کا محل

ہم لوگوں نے آل العظم کا محل بھی دیکھا جس کے ایک حصّہ میں ہم لوگ ٹھہرے ہوئے ہیں، ہم نے اس کو بڑا شاندار محل پایا، وہ اس امیرانہ اور رئیسانہ زندگی کی تصویر پیش کرتا ہے جو ترکی کے عہد میں وزراء و حکام گزارا کرتے تھے اور بری طرح غریبوں کسانوں کا مال حکام، اور مالداروں کی خواہشات کی تکمیل پر صرف ہوتا تھا، ہم نے اس محل میں ضرورت کی ہر وہ شے دیکھی جس کی محل کے مکین کو ضرورت پڑتی ہے اور جس کی ضرورت نہیں بھی پڑتی، وہ محض اس اندیشہ سے رہی ہے کہ شاید اس کی ضرورت پڑ جائے اور وقت پر نہ ملے، اس وقت اس میں ایک مدرسہ، ایک انجمن اور ایک دفتر قائم ہے۔ اس کے ایک حصّہ میں اخوان المسلمین کا مرکز قائم ہے، آج دوپہر کا کھانا کچھ اخوانی احباب کے ساتھ جناب عبداللہ حلاق کے یہاں کھایا انھوں نے کھانے میں بڑا تکلّف و اہتمام کیا تھا، اخوان المسلمین کے لوگ خصوصًا نوجوان ہماری قیام گاہ پر برابر ملاقات کے لئے آتے رہے وہ ہم سے مختلف علمی و دینی سوالات کرتے ہم جواب دیتے، ان کا بڑا جلسہ شام کو تھا وہ دیر تک وہیں رہیں گے۔

پنجشنبہ ۲۹/۱۰/۱۳۷۰ھ مطابق ۲/۸/۱۹۵۱ء

مولانا عبیداللہ بلیاوی اور میری حرارت

مجھے اور میرے ساتھی مولانا عبیداللہ بلیاوی کو باری باری بخار آتا رہا، اخوانی

احباب اور خاص طور پر عبدالغنی الساعاتی اور سیّد نزار گیلانی ہماری عیادت کو آتے رہے اور ہماری دیکھ بھال کرتے رہے، اخوانی احباب نے ہماری ایسی تیمارداری کی کہ اس سے زیادہ ممکن نہیں، ایسا محسوس ہوا جیسے ہم اپنے اعزاء کے درمیان گھر میں ہیں۔

نقیب الاشراف (۱) سیّد مرتضیٰ گیلانی وقتاً فوقتاً ہماری ملاقات ومزاج پرسی کو تشریف لاتے رہے، دینی تعلق اور اسلامی اخوت کا نقشہ سامنے آگیا، ہم نے اپنے ساتھ ایسی توجہ وگرمجوشی دیکھی جس کی کوئی پردیسی یا بڑے سے بڑا صاحب وجاہت وثروت توقع نہیں کرسکتا۔ اللہ تعالیٰ ان سب دوستوں کو جزائے خیر عطا فرمائے اور ان کی کوششوں کو قبول فرمائے۔

القلعۃ الخیریۃ میں

آج ہم لوگوں نے عبدالغنی صاحب کے ساتھ القلعۃ الخیریۃ اور اس کے آثار کی سیر کی، میں نے سنا کہ ایک غیر ملکی کمپنی نے اس میں کھدائی کا کام کیا اور اس سے قیمتی چیزیں نکالیں حکومت شام نے اس کمپنی سے یہ طے کیا تھا کہ کھدائی سے نکلنے والے آثار آدھے کمپنی کے ہوں گے اور آدھے حکومت شام کے، لیکن نگرانی میں حکومت چوکس نہ تھی، اس لئے اس معاملہ میں دھوکا کھا گئی اور اچھے اچھے آثار غیر ملک میں منتقل ہوگئے۔ ہم لوگ قلعہ سے شہر کی طرف آئے اور عیسائیوں کے ایک محلّہ سے گزرے۔

دوسرے آثار

ثانویۂ ابوالفداء دیکھا اور کچھ وقت استاذ حلاق کے دفتر میں گزارا اور اسی کے قریب ہی ایک مسجد میں مغرب کی نماز پڑھی وہ بڑی ستھری، اور آباد مسجد ہے۔ ہم ابوالفداء ہوٹل کے سامنے سے گزرنے والی سب سے اچھی سڑک پر ٹہلے اور نہر کے کنارے کنارے کچھ دور چلے اور حماہ میونسپلٹی کی عمارت اور گورنمنٹ ہاؤس دیکھا، حماہ کے مناظر رات میں بڑے دلفریب ہیں۔

---

(۲) خاندان سادات کے کسی سربرآوردہ بزرگ کو نقیب الاشراف کا لقب دیا جاتا ہے۔

جمعہ ۳۰/۱۰/۱۳۷۰ھ مطابق ۳/۸/۱۹۵۱ء

ناشتہ کیا اور ایک چھوٹی سی موٹر پر سوار ہو کر حلب کی طرف روانہ ہوئے ہم نے معرۃ نعمان دیکھنے کا پختہ ارادہ کر لیا تھا لیکن میں نے ایک سرسری نظر ڈالنے پر اکتفا کی جو اس کے حق وتقاضہ سے بہت کم تھا، اس لئے کہ وقت کی تنگی نے وہاں رکنے کی اجازت نہ دی میں نے عمر کا ایک حصہ اس کے شعر وادب کے مطالعہ میں گزارا ہے، میں نے یہاں کے نامور شاعر ابو العلاء المعری دیوان سقط الزند بڑی محنت سے پڑھا تھا اتنا کہ تقریباً زبانی یاد ہو گیا تھا۔

معرۃ النعمان میں

معرۃ نعمان میں داخل ہوئے تو ابو العلاء ہی کے شعر ذہن میں گردش کر رہے تھے اور میں کہہ رہا تھا کہ یہی معرۃ نعمان ہے جس کے بارے میں اس کے سپوت نے کہا ہے۔

فیا برق لیس الکرخ داری و إنما
رمانی إلیه الدهر منذ لیال
فهل فیك من ماء المعرة قطرة
تغیث بها الظمآن لیس بسال

اے بجلی کرخ (۱) میرا وطن نہیں بلکہ گردش زمانہ نے مجھ کو وہاں چند دنوں سے ڈال دیا ہے کیا تجھ سے میرے وطن معرۃ کے پانی کا کوئی قطرہ مل سکتا ہے جس سے تو ایسے پیاسے کی مدد کرے، جس کو سکون نہیں مل رہا ہے۔

ابو العلاء معری کی قبر پر علامہ میمنی کی یاد

موٹر ابو العلاء کی قبر کے پاس رکی، ہم لوگ اترے اور اس کے مقبرہ میں داخل ہو گئے میں گھوم پھر کر وہ شعر دیکھنے لگا جس کو اس نے اپنی قبر پر لکھنے کی وصیت کی تھی۔

---

(۱) بغداد کا ایک محلہ اور نصف شہر جہاں شاعر اسوقت مقیم تھا۔

هـذا جـنـاه ابـي عـلـيّ
و مـا جـنيـت عـلـى أحـد

ترجمہ:۔(میں اپنے باپ کی غلطی اور زیادتی کا نتیجہ ہوں لیکن میں نے کبھی اس غلطی کا ارتکاب نہیں کیا) لیکن میں نے اس شعر کو اس کی قبر پر کندہ نہیں پایا وہاں ایک کاغذ پر لکھا ہوا دیکھا جس کو کسی ستم ظریف نے لکھ کر وہاں لٹکا دیا تھا، ابوالعلاء کی قبر کے پاس ایک کتب خانہ ہے، جس کو حکومت نے معرۃ کے حکیم اور عرب کے فلسفی کی یادگار میں قائم کیا ہے، میں نے بہت غور سے کتب خانہ کو دیکھا، اس میں شاعر کی سب تصنیفات اور علمی یادگاریں نہیں ہیں اس کے متعلق جو کتابیں لکھی گئی ہیں وہ بھی سب نہیں ہیں حالانکہ جو کتب خانہ اسی کی یادگار میں قائم کیا گیا ہو اس سے اس کی توقع نہ ہونی چاہئے کہ اس کی تصنیفات اور اس پر لکھی جانے والی سب کتابیں نہ ہوں گی، اس کتب خانہ میں فخر ہندوستان علامہ عبدالعزیز المیمنی کی کتاب " ابوالعلاء وما إلیہ " ضرور ہونی چاہئے تھی جو اس موضوع پر سب سے بڑی محققانہ کتاب ہے۔

سیف الدولہ کے پایۂ تخت میں

ہم لوگ حلب پہونچے جو سیف الدولہ کا پایۂ تخت اور متنبّی اور ابوفراس الحمدانی اور حمدانی حکومت کے شعراء کا مرکز تھا جس میں ادب وشعر کی حکومت قائم تھی اور عربی زبان کا بڑا دور دورہ تھا یہی وہ جگہ ہے جس کے بارے میں ابوبکر خوارزمی کہتا ہے کہ " میرے دل کو کھولنے، فہم کو بڑھانے، ذہن کو چمکانے اور زبان کو تیز کرنے اور اس ادبی مقام تک مجھ کو پہنچانے میں شامی لطیف باتوں اور حلب کے نکتوں ہی کا دخل ہے جو میرے حافظہ اور دل کے گوشہ گوشہ میں سما گئے تھے، جب جوانی کی شاخ تر وتازہ اور ہری بھری تھی "۔

یہ شہر آج کل دمشق کا ہمسر ہے اور آبادی اور عمارتوں کے شان وشوکت میں اس کی ٹکر کا ہے اور اس خطۂ شام کا سب سے بڑا صنعتی شہر ہے جو کبھی لبنان وفلسطین اور شرق اردن پر مشتمل تھا، ہم اخوان المسلمین کے مرکز گئے، مرکز کے صدر جناب عبدالقادر سیسی بڑے

انبساط وگرمجوشی سے ملے، جمعہ کی نماز پڑھ کر ہم ان کے گھر گئے، کھانا کھایا، اور آرام کیا۔

استاذ مصطفیٰ الزرقاء

آج میری تقریر کا دن تھا جس کا موضوع تھا (عرب اپنی عالمی حیثیت کو کس طرح واپس لے سکتے ہیں؟) اخوان کے مرکز نے دو تقریروں کا اعلان کیا تھا، پہلی تقریر میری تھی دوسری دمشق کے کلیۃ الحقوق (LAW COLLEGE) کے استاذ مصطفیٰ احمد الزرقاء(۱) کی تھی، موصوف نے اپنے ساتھی ڈاکٹر معروف الدوالیبی کے ساتھ ۱۹۵۱ء کی جولائی میں منعقد ہونے والی پیرس کی کانفرنس میں شام کی نمائندگی کی تھی جو فقہ اسلامی کے موضوع پر ہفتہ بھر جاری رہی تھی، ان دونوں حضرات نے اسلامی شریعت اور اسلامک ملک سوریہ کی بڑی اچھی نمائندگی کی تھی، ان کے آج کے مقالہ کا موضوع یہی ہفت روزہ کانفرنس تھی۔ میں دمشق میں ان سے ملنے کا خواہاں رہا مگر یہ ملاقات وتعارف حلب اور شیخ کے وطن میں ہونا مقدر تھا، حسن اتفاق کہ ہم دونوں اس جلسہ کی تقریب میں ملے، استاذ عمر الکرکوکی آگے بڑھے اور ایک تقریر کی جس میں آج رات کے دونوں مقرروں کا خیر مقدم کیا اور حاضرین سے ان دونوں کا تعارف کرایا یہ ایک یادگار جلسہ تھا جو اعیان شہر، علماء کالجوں کے طلبہ اخوانی نوجوانوں اور پڑھے لکھے لوگوں پر مشتمل تھا۔

حلب کے جلسہ میں میری تقریر

استاذ عمر الکرکوکی کی تقریر کے بعد میں نے برجستہ تقریر کی، بہتر تو یہ تھا کہ تقریر پہلے سے لکھی ہوئی ہوتی، اس لئے کہ موضوع علمی وسنجیدہ تھا، لیکن صحت کی کمزوری اور مسلسل سفر کی وجہ سے اس کے لکھنے کا موقع نہ ملا۔

عہد ماضی میں اس وقت کی دنیا پر عربوں کے غلبہ کا راز

بہر کیف میں نے موضوع پر روشنی ڈالی اور قرن اول کی موجودہ دنیا پر عربوں کے غلبہ کے اسباب بیان کئے جن میں سب سے اہم سبب قومی انانیت اور معاشرتی خودغرضی اور جنسی

وطنی رجحان وتعصب سے ان کا یکسر الگ رہنا اور صدق دل سے اس عقیدہ کو ماننا تھا جو تمام بنی نوع انسان کے لئے ہے اور کالے گورے کو یکساں مقام عطا کرتا ہے۔ ادنیٰ واعلیٰ، ایک قریشی سردار اور حبشی غلام کو ملاتا اور متحد کرتا ہے۔ قوم ونسل، ملک ووطن کے بارے میں سوچے بغیر پوری انسانیت کی فلاح وبہبودی، کا ان کا حریص وجویا ہونا، اس بات پر ان کا ایمان ویقین، کہ وہ اپنے ذاتی وقومی مصالح وفوائد کے لئے نہیں بلکہ ساری دنیا کے فائدے کے لئے نکلے ہیں، وہ خود سے نہیں نکلے بلکہ انھیں لوگوں کو تاریکی سے اجالے کی طرف لانے اور بندوں کی عبادت سے خدائے واحد کی عبادت واطاعت کی طرف نکالنے کے لئے بھیجا گیا ہے، ان کے اس اقدام کا محرک فقر وفاقہ، آمدنی کی کمی ومعاشی بدحالی نہ تھا بلکہ لوگوں کی اس مادی زندگی کی تنگی، ہوا وہوس کی غلامی، مذاہب اور حکومتوں کے ظلم وزیادتی پر رحم وترس کے سبب سے تھا جس میں وہ گھٹے جارہے تھے تاکہ ان کو دنیا کی تنگی سے اس کی وسعت کی طرف اور غلط مذاہب کے ظلم وجور سے اسلام کے عدل وانصاف کی طرف نکالیں اور لائیں۔ یہ ان کے اخلاص وبے غرضی ہی کا کرشمہ تھا جس نے برسر پیکار دنیا کو ان کے سامنے جھکا دیا اور ان کے اخلاص وبے غرضی کے سامنے ہر مشکل ودشواری پگھل کر پانی اور جل کر دھواں ہوگئی۔

عرب اپنے عالمی مرکز کی طرف کیسے لوٹ سکتے ہیں؟

اگر عرب اپنے عالمی مرکز کی طرف لوٹنا چاہتے ہیں تو اسلامی مزاج وذہن کی طرف لوٹنا اور اس کو اپنانا ضروری ہے، وہ اس اخلاص وبے غرضی اور دکھ درد کی ساری انسانیت کے ساتھ رحم وکرم کی طرف لوٹیں جس کو قومیت ووطنیت کے شیطان، اور خود غرضی وہوا وہوس کے بندے آپس میں بانٹ رہے ہیں اور ان کی قسمت سے کھیل رہے ہیں۔ یہ قومیت جس کا بہت سے عرب اور ان کے لیڈر نعرہ لگا رہے ہیں وہ بھی دوسری تمام قومیتوں کی طرح ہے جو لوہے کے سانچے اور فرمے کی طرح ہیں، ان میں وسعت ہے، نہ لچک، رحم ہے نہ عفو ودرگزر، یہ ممکن نہیں کہ وہ ایسا عالمی پرچم ثابت ہو جس کے گرد تمام لوگ جمع

ہو جائیں اور نہ وہ اصول وضابطۂ حیات ہی ہے جس پر افراد وقومیں قومیت و وطنیت میں اختلاف کے ساتھ ساتھ ایمان لائیں یہ سراسر فصل اور جدائی کا خط ہے نہ کہ وصل واتصال کا، افتراق وانتشار کا سبب ہے نہ کہ اتحاد ومحبت کا، عرب نعرۂ قومیت کے ساتھ روحانی قیادت اور عالمی مرکزیت کی توقع نہ کریں وہ تو دین ہی ہے جس نے انھیں عالمی قیادت کا مقام عطا کیا ہے۔ دین اور صرف دین ہی ان کو ان کے پہلے مقام ومرکز پر لاسکتا ہے۔

فقہ اسلامی ہفتہ کی تقریب میں اسلامی قوانین کی فوقیت وبرتری کا اعتراف

میرے بعد استاذ زرقاء آئے، انھوں نے میری تقریر کی بھرپور تائید کی اور اس کو سراہا۔ یہ بات ان کی عربی شرافت کی آئینہ دار اور میری ہمّت افزائی کے لئے تھی، ورنہ مجھے تو اس اہم موضوع کا حق ادا کرنے میں کوتاہی کا احساس تھا، اس کے بعد انھوں نے فقہ اسلامی ہفتہ کا ذکر کیا جس کا لوگوں پر بہت اچھا اثر پڑا، اس ہفتہ کے بحث ومباحثہ میں فقہ اسلامی کی برتری ثابت ہوگئی اور یہ بات عیاں ہوگئی کہ وہ قانون کا بہترین اور مالا مال سرچشمہ ہے، اور اس میں ان مشکلوں کی گرہ کشائی کی صلاحیت ہے جس سے اس وقت دنیا دوچار ہے اور وضعی قوانین اس کے حل کرنے سے قاصر ہیں، کانفرنس نے جو قرارداد پاس کی اس میں اس نے اس کا اعتراف کیا۔ قرارداد کا متن جس کو استاذ زرقاء نے فرنچ سے عربی زبان میں ترجمہ کیا ہے یہ ہے۔

ان علمی فوائد پر نظر ڈالتے ہوئے جو ''فقہ اسلامی ہفتہ'' میں زیر بحث آئے، اور جو بحثیں اس میں ہوئیں ان سے یہ بات کھل کر سامنے آگئی کہ فقہ اسلامی کے اصول وقواعد بڑی اہمیت کے مالک ہیں ان میں کسی اختلاف کی گنجائش نہیں اور اس عظیم نظام قانون کے ضمن میں دوسرے مختلف مذاہب نے فن فقہ کے اصول کا جو قابل قدر ذخیرہ پیش کیا، اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ موجودہ نظام حیات جن ضروریات کا متقاضی ہے فقہ اسلامی اس کے لئے مناسب قانون پیش کرسکتا ہے۔

استاذ زرقاء اور ڈاکٹر دوالیبی کی جامعیت

استاد مصطفیٰ زرقاء اسلامی تعلیمات کے بڑے علمبرداروں میں سے ہیں، حلب کی کلیۃ الشریعۃ کے فارغ ہیں، فرنچ زبان بھی پڑھی ہے، اس وقت دمشق یونیورسٹی میں استاد ہیں، دینی اور فقہی علوم کے اندر رسوخ و پختگی میں وہ دینی علماء اور پختہ طالبان علوم ہی کی طرح ممتاز ہیں، وہ جدید تعلیم اور عہد حاضر کے نئے مباحث و مسائل میں درک و واقفیت کے جامع ہیں، ڈاکٹر معروف الدوالیبی کا بھی یہی امتیاز ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس طرح کے فضلاء کمیاب ہیں اور یہ اس وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔

شنبہ یکم ذی قعدہ ۱۳۷۰ھ مطابق ۴/۸/۱۹۵۱ء

شیخ محمد نبہان سے ملاقات

آج کی قابل تحریر بات محترمی شیخ محمد نبہان سے ان کے دولت خانہ پر ملاقات تھی، وہ قوت ایمانی اور قرآن پر فکر و تدبر میں ممتاز شخص ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک خاص طرز کے آدمی ہیں پورے اعتماد و یقین کے ساتھ بات کرتے ہیں۔

علماء حلب کے ساتھ

آج دوپہر کا کھانا علماء حلب کی ایک جماعت کے ساتھ اپنے میزبان جناب عبدالقادر سیسی کے یہاں کھایا، ان علماء میں شیخ مصطفیٰ زرقاء، ابوالخیر زین العابدین اور حلب کے ایک بڑے شیخ عبدالوہاب التونجی شامل تھے، مصطفیٰ زرقاء صاحب سے میں نے بڑی فکری ہم آہنگی محسوس کی، ہم میں سے ہر ایک دوسرے کی ملاقات سے منشرح ہوا، اس میں شبہ نہیں کہ دلوں کے ملنے اور مانوس ہونے میں علم و فکر کی یکسانی کا بڑا اثر ہوتا ہے۔

مغرب کی نماز ہم نے جامع اموی میں پڑھی اور پرانے بازاروں میں گھومے پھرے یہ بازار ترکی دور کے مشرقی شہروں اور تمدن کی نمائندگی کرتے ہیں، ہم نے اپنے

میزبان عبدالقادر سیسی کی لائبریری اور دفتر دیکھا، وہ حلب کے چوٹی کے وکیلوں میں ہیں۔

یکشنبہ ۲/۱۱/۱۳۷۰ھ مطابق ۵/۸/۱۹۵۱ء

حلب کے کتب خانہ میں

آج ہم لوگوں نے دار الکتب الوطنیۃ دیکھا یہ کتب خانہ ابھی ابتدائی مراحل میں ہے اور ترقی کے دور سے گزر رہا ہے تاہم اس میں شبہ نہیں کہ وہ ایک بڑے کتب خانہ کی بنیاد ہے، یہ دمشق کے المجمع العلمی کے ماتحت ہے، کتب خانہ کے مہتمم نے ہم کو اس کے تمام شعبوں میں گھمایا، یہ کتب خانہ جدید طرز پر مرتب کیا گیا ہے۔

علوم شرعیہ کے ادارہ میں

ہم لوگوں نے شرعی عدالت دیکھی اور قاضی عبدالوہاب التونجی کے ساتھ تھوڑی دیر بیٹھے، پھر علوم شرعیہ کے شعبہ میں گئے، اور اس کے ناظم شیخ عطاء اللہ الصابونی کے دفتر میں بیٹھے، یہاں میں نے دعوت کو مدرسہ کی تعلیم کے ساتھ جوڑنے کے بارے میں گفتگو کی، کچھ وقت استاذ عبدالقادر سیسی کے دفتر اور اخوان المسلمین کے مرکز میں گزارا۔

دوشنبہ ۳/۱۱/۱۳۷۰ھ مطابق ۶/۸/۱۹۵۱ء

شیخ عبدالفتاح ابوغدہ کے ساتھ ناشتہ اور حارم گاؤں کی سیر

ہم نے شیخ عبدالفتاح ابوغدہ(۱) کے پاس ناشتہ کیا پھر اس کے بعد اپنے دوست استاذ سیسی کے ساتھ حارم گاؤں کا رخ کیا اور ترکی کی حدود سے گزرے جو ہمارے دائیں طرف اتنا قریب تھا کہ (خدا نہ کرے) اگر موٹر پہاڑ کی وادی میں گرتی تو ترکی کی حدود میں

(۱) جلیل القدر شامی عالم جو متعدد کتابوں کے مصنف اور کئی قدیم کتابوں کے محقق ہیں، فخر المتاخرین مولانا عبد الحی صاحب فرنگی محلی کی کتابوں سے ان کو خاص شغف ہے اور ان کی ایک سے زائد کتابیں بڑی تحقیق واہتمام سے شائع کر چکے ہیں علامہ محمد زاہد الکوثری کے خاص شاگرد ہیں، آج کل جامعۃ الامام محمد بن سعود میں کلیۃ اصول الدین کے پروفیسر ہیں۔ (افسوس کہ وہ بھی نہ رہے) ناشر

گرتی اور شام بائیں سمت ہوتا، ہم نے اس گاؤں میں کچھ وقت گزارا، یہ حلب کے گرمی گزارنے کے مقامات میں سے ہے، شیخ زرقاء، شیخ ابو الخیر اور علماء وتاجروں کی ایک جماعت کے ساتھ ہم نے شیخ عطاء اللہ الصابونی کے یہاں دوپہر کا کھانا کھایا، میزبان نے شامی طرز کے عمدہ کھانے تیار کرائے تھے، کھانے سے قبل ایک پرزہ ملا، جس میں لکھا تھا "کلوا واشربوا ولا تسرفوا" اس آیت کے بعد ان کھانوں کی ایک لمبی فہرست تھی، جو پیش کئے جانے والے تھے، کھانے والوں کو اختیار تھا جو چاہیں، منگوائیں۔

حلب کے قلعہ کی سیر

آج ہم نے استاذ عمر الکرکوکی اور کچھ اخوانی احباب کی معیت میں حلب کے قلعہ کی سیر کی، یہ پرانا رومی قلعہ ہے۔ السلطان المظفر اور اسلامی سلطنتوں کے دیگر بادشاہ اس کی نئی تعمیر کراتے رہے ہیں، ہم لوگوں نے قلعہ کے اس تہ خانہ کو دیکھا جس میں مجرمین قید کئے جاتے تھے اور دوسری یادگاریں بھی دیکھیں، اس کے بعد جامع فردوس کی سیر کی اور پھر جناب حسن الصابونی کے گھر میں تھوڑی دیر آرام کیا۔

سیف الدولہ کے یادگاریں مٹ گئیں

میں نے سیف الدولہ کی بھی کچھ یادگاروں کو دیکھنے کی خواہش کی لیکن ان یادگاروں میں سے کوئی چیز نہ ملی۔ وہ مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ مٹ گئیں، ابن خلدون نے اپنے اس قول میں مبالغہ اور زیادتی سے نہیں کام لیا تھا کہ عربوں کی یادگاریں اور عمارتیں بہت جلد مٹ جاتی ہیں۔

سہ شنبہ ۴/۱۱/۱۳۷۰ھ مطابق ۷/۸/۱۹۵۱ء

سفر ترکی کا ترک خیال

ہم نے سفر ترکی کا خیال ترک کر دیا حالانکہ حلب کی آمد اسی سفر کے خیال سے تھی

لیکن وقت کی کمی اور زمانۂ حج کے قریب ہونے کا خیال کر کے اس محبوب ملک کا سفر ملتوی کر دیا اور سفر کو کسی اور مناسب وسیع وقت کے لئے اٹھا رکھا، اس لئے کہ ترکی کی سیر، اور وہاں کی شخصیات سے ملاقات اور دینی علمی مراکز کو دیکھنے کے لئے دو ہفتہ کی مدت کافی نہیں، یہ تعارف اور ملاقاتیں تو ایک مہینہ سے زیادہ کی متقاضی ہیں، اور مدینہ منورہ جانے کے لئے (اس کے منور کرنے والے پر خدا کی ہزار رحمتیں اور سلامتی ہو) ہم نے دمشق واپس ہونے کا پختہ ارادہ کرلیا۔ حضرت علیؓ نے سچ فرمایا کہ عرفت ربی ، بفسخ العزائم جب ہم نے ترکی کی ٹرین کو حلب سے استنبول کو روانہ ہوتے دیکھا تو بڑی حسرت بھری نگاہ ڈالی اور کہا کہ انشاء اللہ پھر کسی اور وقت ملنا ہوگا۔

حلب سے دمشق

ہم صبح ساڑھے نو بجے حلب سے نکلے اور حمص میں دوپہر کا کھانا کھایا اور چند منٹ نبک (۱) میں گزارے، وہیں پارک میں ایک خادم آیا اور میرا نام لے کر مخاطب ہوا، فلاں صاحب آپ کو بلا رہے ہیں، میں ان صاحب کے پاس گیا، وہ جدید تعلیم یافتہ شخص ہیں، وزارتِ تعلیم میں ایک اچھے افسر ہیں، میں نے پوچھا کہ آپ مجھ کو کیسے پہچانتے ہیں؟ تو انھوں نے اپنے بیگ سے ''ماذا خسر العالم'' کا ایک نسخہ نکالا اور بولے میں نے دمشق یونیورسٹی میں آپ کی تقریر سنی ہے، یہ کتاب ہے، اس کتاب کو میں نے سفر میں مطالعہ کی غرض سے رکھ لیا تھا، پھر انھوں نے دوپہر کے کھانے پر بڑے اصرار سے مدعو کیا، میں نے ان سے معذرت کر دی اور لوٹ آیا، کھانا حمص میں کھا لیا تھا۔

دمشق میں

عصر کی نماز دمشق میں مسجد الحلبونی میں پڑھی، ہمارے میزبان حسب معمول بشاشت وخوش

---

(۱) مشرق وسطی کے چیدہ اور ممتاز ترین فقہ اسلامی کے عالم وماہر جو اپنی وسعت نظر، فقہ پر عبور اور عصری قوانین اور نظاموں کی واقفیت میں دور دور نظیر نہیں رکھتے، شام چھوڑنے کے بعد عرصہ تک کویت کے موسوعۃ الفقہ الاسلامی کے نگراں رہے، اب عمان میں یونیورسٹی میں فقہ کے استاد ہیں۔ (افسوس کہ ۱۴۲۰ھ/۱۹۹۹ء میں وفات پائی رحمۃ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ)

خلقی کے ساتھ ملے، ہمیں ایسا محسوس ہوا کہ جیسے ہم کسی طویل سفر سے اپنے گھر واپس آ گئے ہیں۔

ہم لوگ اخوان المسلمین کے مرکز گئے وہاں ہم نے دیکھا کہ استاذ عمر بہاء الامیری صاحب کی تقریر کی تیاری ہو رہی ہے ان کی تقریر سننے کے لئے ہم وہیں رُکے، ہمارے محترم دوست جناب شیخ مصطفیٰ سباعی نے اصرار کیا کہ میں بھی کچھ کہوں اور اس سفر کے تاثرات بیان کروں، میں نے ان کے حکم کی تعمیل کی اور سفر کے تاثرات بیان کئے، اپنے بعض خیالات و آراء پیش کیں۔

چہار شنبہ ۵/۱۱/۱۳۷۰ھ مطابق ۸/۸/۱۹۵۱ء

ہمارا مدینہ منورہ کا سفر طے ہو گیا چنانچہ ضروری دفتری کاروائی پوری کی اور اتوار کو ایک سعودی ہوائی جہاز سے سفر متعین ہو گیا، آج ہم نے اپنے دوست احمد عبد الغفور العطار اور مہمانوں کی ایک جماعت کے ساتھ شیخ محمد نمر الخطیب کی مہمانی میں دوپہر کا کھانا کھایا۔

یونیورسٹی کے کچھ نوجوان ہمارے پاس آ گئے، ان میں سے اکثر اخوانی تھے وہ ہمارے گرد بیٹھ گئے باتیں شروع کیں اور سوالات کرنے لگے۔

۶/۱۱/۱۳۷۰ھ مطابق ۹/۸/۱۹۵۱ء جمعرات

یونیورسٹی کے طلبہ کو ہمارے دمشق آنے کا علم ہوا، اور وہ ملنے آئے، باتوں سے ہمارا دل بہلایا، میں سب سے زیادہ چاق و چوبند اور باتوں میں حصہ لینے والے میڈیکل کالج کے طالب علم نبیہ غبرہ اور کلیۃ الآداب (آرٹس کالج) کے طالب علم احمد راتب نفاخ تھے۔

آج کی قابل ذکر باتوں میں سے علامہ بہجۃ البیطار سے ملاقات ہے بھائی عبد الرحمٰن البانی کو میرے دمشق میں ہونے کا علم نہیں ہوا تھا، ورنہ فوراً ملنے آتے، ہم نے ان کو اطلاع کرنا چاہا مگر ممکن نہ ہو سکا، اس لئے کہ وہ اپنے مصیف (گرمی گزارنے کے مقام) مضایا میں تھے۔

۷/۱۱/۱۳۷۰ھ مطابق ۱۰/۸/۱۹۵۱ء جمعہ

ہم نے سوچا کہ دمشق کا آخری جمعہ جامع اموی میں پڑھیں، اس طرح ہم نے جامع اموی کو الوداع کہا، جامع شیخ محی الدین میں ہم شیخ کفتارو کے درس میں حاضر ہوئے

اور عشاء تک ان کے ساتھ رہے۔

شنبہ ۸/۱۱/۷۰ مطابق ۱۱/۸/۱۹۵۱ء

استاد امین المصری کے ساتھ

آج صبح وزارت تعلیم کی انجمن تعلیم وتربیت کے رکن استاذ امین المصری نے شرف ملاقات بخشا، وہ سوریہ کے پاکستانی سفارتخانہ کی طرف سے پاکستان میں عربی زبان کی تعلیم، ونشر واشاعت کے منصوبے اور اس کی ذمہ داری کو انجام دینے کے لئے منتخب ہوئے تھے۔

غیر عرب ملکوں میں عربی زبان کی نشر واشاعت کے طریقۂ کار کے بارے میں میری رائے

انھوں نے اس موضوع پر مجھ سے مشورہ کیا، میں نے ان سے ایک ایسے استاد کے تجربات بیان کئے جس کو اس موضوع سے سابقہ رہا ہے، میں نے ان سے کہا کہ یہ مسئلہ میرے نزدیک دو نکتوں پر منحصر ومرکوز ہے، ایک تو ایسے تعلیمی طریقہ کو اپنانا وجاری کرنا جس سے عربی زبان کا سیکھنا آسان ہو اور وہ ان دشواریوں وپیچیدگیوں سے پاک ہو، جن پر اس ملک کا پرانا وبے سود طرز تعلیم مشتمل ہے، دوسرا ایسے اساتذہ کا تیار کرنا جو باصلاحیت، فن پر عبور رکھنے والے مخلص، تدریس کے شوقین اور ذمہ داری کو اچھی طرح انجام دینے والے ہوں، اس منصوبہ کا شرمندۂ تعبیر ہونا جس کو شام اور بعض عرب ممالک نے اپنایا ہے، انھیں دو نکتوں میں استاد کی کامیابی منحصر ہے، استاد امین المصری نے اس سے اتفاق کیا اور ان دونوں باتوں کو پورا کرنے کے لئے آمادگی ظاہر فرمائی، میں نے ہندوپاک میں عربی طرز تعلیم کے نمونہ کے طور پر **قصص النبیین للاطفال** اور **القرأۃ الراشدۃ** کا ایک ایک سٹ ان کو ہدیہ کیا۔ جناب امین المصری کے ساتھ ہمارے دوست جناب عبدالرحمٰن البانی، نصار البانی آئے، مفید وپرلطف مجلس رہی، جناب بہجۃ البیطار صاحب نے شرف ملاقات بخشا۔

مدرسہ دیر یاسین کی سیر

ہم لوگوں نے مدرسہ دیر یاسین دیکھا۔ یہ فلسطینی پناہ گزینوں کے لئے قائم کیا گیا ہے، دیر یاسین وہی بدنصیب شہر ہے جس میں زبردست قتل وخوں ریزی ہوئی ہے۔

اس میں عربوں کو بھیڑ، بکریوں کی طرح ذبح کیا گیا، مدرسہ کا نظام استاد نمر مصری چلاتے ہیں ہم لوگوں نے درجوں کو دیکھا اور مدرسہ کے شعبوں اور کمروں میں بیٹے، آج دوپہر کا کھانا شیخ عبدالرحمٰن البانی کے ساتھ اپنے محترم دوست مصطفیٰ سباعی کے یہاں کھایا، علاّمہ بہجۃ البیطار، شیخ نمر الخطیب، شیخ القلقیلی، رخصت کرنے کے لئے تشریف لائے۔

نبیسہ غمرہ، عبدالرحمٰن البانی، اور احمد راتب، بھی آئے، عبدالرحمٰن البانی اور نبیسہ غمرہ تو کافی رات گئے تک ہمارے پاس ٹھہرے اور ہمارا مقالہ " کیف توجّہ المعارف فی الاقطار الاسلامیۃ " نقل کرتے رہے اس لئے کہ ان کو اس کی نقل رکھنے کا بہت شوق تھا اور سفر بہت قریب تھا اس کے سوا مقالہ حاصل کرنے کی کوئی اور صورت نہ تھی۔

شام پر ایک اجمالی نظر

اس سے قبل کہ ہم شام کو وداع کہیں، ہرقل کی طرح نہیں بلکہ اس مسلمان کی طرح جس کی اس ملک کے شہروں کی طرف بار بار آمد ورفت رہتی ہے، ہمارے لئے مناسب ہوگا کہ اس ملک پر ایک اجمالی نظر ڈال لیں اور اس کے متعلق بعض معلومات کا ذکر کردیں۔

رقبہ وآبادی

جب سے عظیم تر شام کا یہ ٹکڑا الگ ہوکر سوریہ "Syria" کہلانے لگا بلکہ زیادہ صحیح الفاظ میں جب سے اس سے لبنان وفلسطین اور شرق اردن کو الگ کردیا گیا، صرف جمہوریہ سوریہ کا رقبہ (۱۸۱۳۳۷) کلومیٹر ہے اور اس کی آبادی جیسا کہ ۱۹۴۸ء میں شائع کی گئی۔ (۳۰۴۳۰۰۰) ہے اور ۱۹۵۱ء کا اندازہ (۳۱۰۰۰۰۰) ہے ان میں مسلمان (۲۵۴۵۰۰۰) ہیں

یعنی آبادی کا ۸۵% حصہ مسلمان ہیں، ان میں اہل سنّت اکثریت میں ہیں، ان کی تعداد مسلمانوں میں ۸۲ء۵% ہے، شیعہ ۱۸ء۵% سے زائد نہیں اور دروز ۸۷ ہزار سے کچھ زائد ہیں یعنی ان کا تناسب ۳ء۵% ہے، یہاں یزیدیوں کا بھی ایک خوشحال فرقہ ہے جس کے ماننے والوں کی تعداد ۲۷۰۰ سو ہزار ہے اور مسیحی ۱۵ء۵% ہیں یعنی چار لاکھ ساٹھ ہزار۔

سوریہ کی انتظامی تقسیم

انتظامی طور پر سوریہ کئی صوبوں میں منقسم ہے، صوبہ ضلعوں میں اور ضلع تحصیلوں میں تقسیم ہے، تحصیلیں گاؤں میں بٹی ہوئی ہیں، سوریہ میں نو صوبے ہیں، دمشق، حلب، حوران، حمص، حماہ، الفرات، الجزیرۃ، اللاذقیہ، جبل الدروز، اور چھتیس ضلعے ہیں، بانوے تحصیلیں ہیں، ان سے متعلق ۲۷۰۳ گاؤں ہیں۔

تعلیم یافتہ طبقہ کا تناسب اور اقتصادی حالت

لبنان کے علاوہ (کہ جس میں تعلیم یافتہ طبقہ کا تناسب اسّی فیصد ہے) تعلیم کے اعتبار سے سوریہ کا تناسب دیگر تمام عرب ممالک سے زیادہ ہے، یہاں تعلیم یافتہ طبقہ کا تناسب ۴۵% ہے۔ یہاں کے خوشحال اور اوسط طبقہ کی تعداد بھی مصر و حجاز سے کہیں زیادہ ہے، سوریہ کا کسان عام طور پر اتنی زمین کا مالک ہوتا ہے جس سے وہ اطمینان کی زندگی گزار سکے وہ مصر و ہندوستان کے اکثر کسانوں کی طرح پریشان کن فقر و فاقہ سے دوچار نہیں ہوتا۔ اسی لئے سوریہ اقتصادی ضروریات کو اچھی طرح پورا کرتا ہے (اگر حکام عقلمند و ہوشیار اور مخلص ہوں اور وہ ظالم سرمایہ دارانہ نظام اور انتہا پسند کمیونزم کے درمیان معتدل نظام قائم کرنے میں کامیاب ہوسکیں)

نظام تعلیم

رہا اس وقت سوریہ کا نظام تعلیم تو اس کو میں اپنی سابقہ کدوکاوش جو اس موضوع

سے لگاؤ کی بناء پر تھی، نیز موضوع کی اہمیت کی وجہ سے تفصیل سے بیان کرنا چاہتا ہوں۔

سوریہ کی تعلیم تین مراحل پر منقسم ہے

(ا) ابتدائی (ب) ثانوی اور اس کے متعلقات (ج) اعلیٰ تعلیم۔

ابتدائی سے پہلے کی تعلیم یعنی نرسری قانونی و بنیادی نہیں ہے، یہاں بچّوں کی کچھ نرسریاں ہیں جو چاہتا ہے اپنے بچّوں کو وہاں بھیجتا ہے۔

ابتدائی تعلیم مفت اور جبری ہے اس کی کل مدّت تعلیم پانچ سال ہے جو ابتدائی تعلیم کی سند حاصل کرنے کے بعد ختم ہو جاتی ہے، اس کا مقصد بنیادی مضامین میں ضروری معلومات کا حاصل ہو جانا ہوتا ہے، گویا یہ وقت کے اندر اندر بعد کی منزل کی تیاری ہے۔

اس کے پہلے سال وہی بچّہ داخل کیا جاتا ہے جس کی عمر سات سال ہو یہ نظام وسیع پیمانہ پر پھیلا ہوا ہے اس میں کوئی تنوع نہیں پایا جاتا چہ جائیکہ کوئی خصوصیت برتی جائے سوائے اس گنجائش کے جو اس طریقۂ تعلیم نے ماحول کے پیش نظر رکھی ہے۔

تحریر و عبارت کے علاوہ جو اسباق پہلے سال میں پورے ہو جائیں حسب ذیل ہیں:

(ا) دینیات و تربیت (۲) حساب و جامیٹری (۳) تاریخ و جغرافیہ (۴) سائنس کی جنرل معلومات (۵) عربی زبان (جس میں عربی قواعد عبارت خوانی بعض عبارتوں کو زبانی یاد کرنا، مفرد الفاظ گفتگو و انشاء شامل ہے) (۶) وطنی تربیت (جس میں اخلاق و شہری معلومات شامل ہیں) پانچویں اور آخری درجہ میں۔

دوسرا مرحلہ ثانوی اور اس سے متعلق تعلیم ہے

اس مرحلہ میں تعلیم کی مختلف شکلیں ہیں اور وہ سب ابتدائی تعلیم کے سرٹیفکٹ کے بعد شروع ہوتی ہیں، اس کو ہم دو جزوی مرحلوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

(ا) درمیانی مرحلہ۔ اس کی مدّت چار سال ہے (۲) دوسرا مرحلہ اعلیٰ تعلیم اس کی

مدّت دوسال۔کل چھ سال ہوئے۔

درمیانی مرحلہ کی مختلف قسمیں ہیں وہ یہ ہیں

(۱) عام متوسط اسباق (۲) متوسط تجارتی تعلیم (۳) صنعتی متوسط تعلیم (۴) زراعت کی تعلیم ، ہر قسم کی تعلیم ایک عام امتحان کے بعد ختم ہوتی ہے۔کامیابی کے بعد طالب علم کو اسی نوع کی سند ملتی ہے۔

دینیات کے علاوہ جو مضامین پڑھائے جاتے ہیں وہ یہ ہیں

(۱) عربی زبان (۲) انگریزی یا فرانسیسی (طالب علم جس کو منتخب کرے)

معلوم ہوتا ہے کہ سوریہ نے ابتدائی مرحلہ میں غیر زبان کو نہیں رکھا۔یہ بات عربی زبان کی ترجیح اور دوسرے تربیتی نظام کے خیال سے ہے۔

ا (۳) حساب اور الجبرا (۴) جامیٹری علوم ریاضی۔

ب (۵) فزیکل (۶) کیمیکل (۷) سائنٹفک تاریخ (سائنس میں)

ج (۸) تاریخ وجغرافیہ (اجتماعی علوم میں)

د (۹) وطنی تربیت (خود کفیل ہونے کی غرض سے)

درمیانی تعلیم کا مقصد

(۱) مشقت والے کاموں کے لئے طالب علم کو تیار کرنا (صنعت وتجارت اور زراعتی کاموں کے لئے)

(۲) اعلیٰ اور وسیع تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے بطور تمہید عمومی تعلیم وثقافت کا حاصل کرنا جیسا کہ عمومی تعلیم میں ہوتا ہے۔

اعلیٰ تعلیم کی منزل (یہ ثانوی تعلیم کا دوسرا جزو ہے)

یہ پہلی دونوں منزلوں سے اونچی ہوتی ہے، اس کی مدت تعلیم دوسال ہے جو علوم

وآداب یا زراعت میں ثانویہ کی سند حاصل کرنے پر ختم ہوتی ہے، اس تعلیمی منزل میں وہ شخص داخل ہوتا ہے، جو ضرورت بھر کی تعلیم حاصل کر چکا ہو وہاں عام ثانوی طریقہ پر یونیورسٹی میں داخلہ کی تیاری بھی کرائی جاتی ہے (کلیة العلوم یا کلیة الآداب یا انجینیر نگ کالج یا کلیة الحقوق یا اسی طرح کے کسی اور کالج)

مضامین وہی پڑھائے جاتے ہیں، جن کا اوپر ذکر ہوا۔ معیار اونچا ہوتا جاتا ہے۔

یونیورسٹی کی تعلیم

سوریہ یونیورسٹی، اس میں متعدد کالج ہیں اور ہر کالج کی مدت تعلیم تین سال ہے جو ان علوم کے سارٹیفکٹ پر ختم ہوتی ہے جن کو طالب علم نے کالج میں پڑھا ہے مثلاً (قانون میں لسانس یا لٹریچر میں لسانس اور سائنس میں لسانس وغیرہ) بعض کالجوں مثلاً کلیۃ الحقوق میں کالج میں پڑھے ہوئے علوم میں سے کسی ایک علم میں تخصص کرنے کے لئے ایک خصوصی درجہ ہے جہاں ایک تحقیقی مقالہ (تھیسس) بھی پیش کرنا پڑتا ہے۔

سوریہ یونیورسٹی کے کالج درج ذیل ہیں

(۱) کلیة الحقوق (۲) کلیة الطب (۳) کلیة العلوم (۴) کلیة الهندسة (۵) کلیة الآداب۔

اور ہر کالج میں ایک خاص شعبہ ہے جو طلبہ کو ثانوی تعلیم پڑھانے کی ٹریننگ دیتا ہے طلبہ اس شاخ میں وہ چیزیں پڑھتے ہیں جو (یونیورسٹی کی تعلیم کے ساتھ ساتھ) طریقۂ تعلیم وتربیت سے تعلق رکھتی ہیں، اس شعبہ کا نام دار المعلمین العلیا ہے، طالب علم یونیورسٹی کی تعلیم کے ساتھ ساتھ اس ادارہ کے اسباق میں بھی شریک ہوسکتا ہے۔

خلاصہ

نرسری (سات سال کی عمر سے قبل)

ابتدائی تعلیم (جس کی مدت پانچ سال ہے) جو ابتدائی تعلیم کی سرٹیفکٹ حاصل کرنے کے بعد ختم ہو جاتی ہے۔ ثانویہ کی متوسط تعلیم جس کی مدت چار سال ہے۔ یہ تیاری کی سند حاصل کرنے کے بعد ختم ہو جاتی ہے۔

ثانویہ کی اعلیٰ تعلیم، اس کی مدّت دو سال ہے جو بکالوریا کی سند پر ختم ہوتی ہے۔ یونیورسٹی کی تعلیم جو لسانس کے بعد ختم ہوتی ہے۔

كلية الحقوق ، كلية الآداب ، كلية الطب اور اس کے شعبہ كلية الهندسة ، كلية العلوم (ان سب کی مدّت تعلیم تین سال ہے)

پھر بعض درجوں میں تخصص کا مرحلہ آتا ہے۔(۱)

سوریہ کے ادیان اور پارٹیاں

سوریہ کو اللہ تعالیٰ نے قدرتی حسن و جمال، موسم میں اعتدال، سرسبزی و شادابی اور قوم کو ذہانت سے نوازا ہے نیز جنگی نقطۂ نظر سے اس کا جائے وقوع بہت اہم ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کے لئے دو بڑی مشکلیں ہیں۔ ایک تو کثرتِ ادیان اور نت نئے عقائد، ان مذاہب اور جدّت طراز عقائد کا، ملک شام میں پروان چڑھنے کا سب سے بڑا سبب شاید ملک کی مخصوص طبعی نوعیت (Geo-Physicl background) کا یہاں پہاڑوں کا سلسلہ ہے اور پہاڑ ہمیشہ مختلف ادیان و عقائد کے لئے جائے پناہ ہے۔ اکثر باغی اور غلو پسند فرقے چٹانوں، پہاڑوں اور دشوار گزار وادیوں میں پناہ لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ مختلف ادیان مصر سے زیادہ شام میں بڑھے اور پروان چڑھے، علاوہ ازیں ان فرقوں اور اقوام کو جس بات نے شام کی طرف متوجہ کیا وہ ملک کی خوبصورتی، کشش و دلفریبی، ملک والوں کی کشادہ دلی اور سادگی، و بھولا پن ہے، مزید برآں شمال

سے آنے والے فاتحین کے گزرگاہ ہونے کے سبب شام ادیان وتہذیبوں اور مختلف رجحانات وخیالات کا میدان وآماجگاہ رہا ہے، اس صورت حال نے قوم کا ایسا مزاج بنادیا کہ وہ ہر آنے والی شے کے سامنے جھکتی اور ہر جدید سے متاثر ہوتی ہے اس لئے باطنیہ اور دروزیہ اور بہائیہ وغیرہ فرقوں اور ادیان نے اس خوبصورت ملک میں بڑی گنجائش پائی۔

دوسری مشکل جو پہلی سے بھی زیادہ خطرناک اور اس سے کہیں زیادہ مشکل اور سوریہ کے معاملات میں جاری وساری ہے وہ ہے سیاسی پارٹیوں اور نظریات کی کثرت، جو سوریہ کی قیادت اور اقتدار کے لئے لڑتی رہتی ہیں، جماعتوں کی اس کشاکش اور نظریات کے ٹکراؤ سے سوریہ کے اتحاد وآزادی کو اس سے زیادہ خطرہ ہے جتنا کہ مذاہب اور دینی فرقوں سے جو اپنی روحانی قوت اور سیاسی اثر ونفوذ کو کھو چکے ہیں، ان پارٹیوں کا مختصر تعارف ہدیہ ناظرین ہے۔

ملکی سیاسی پارٹیاں

(۱) حزب البعث العربی : اس جماعت کا طرۂ امتیاز (عرب ایک قوم ہے اور ایک ابدی پیغام رکھتی ہے) یہ جماعت وطن عربی زمین کے اس حصّہ کو سمجھتی ہے جس میں عرب قوم رہتی ہے، جو جبل طوروس، جبل بشتکو یہ، خلیج بصرہ، البحر العربی، جبال حبشہ، صحرائے اعظم، بحر اوقیانوس، بحر روم پر مشتمل ہے، عرب قوم ایک ایسے ابدی پیغام کی حامل ہے جو پردۂ تاریخ پر بھرپور مسیحائی کی شکلوں میں ظاہر ہوتا رہا ہے اور انسانی قدروں کو حیاتِ نو بخشتا رہا ہے اور ان میں نظم وضبط اور تعاون کی اسپرٹ کو بڑھاتا رہا ہے۔ یہ ایک روحانی، اور ثقافتی دعوت ہے، بنی نوع انسان کے تمام فرق وامتیاز عارضی ہیں اور اس پیغام کے حامل ہونے سے یکسر مٹ جاتے ہیں۔ حزب البعث العربی اشتراکی پارٹی ہے، اس کا نظریہ ہے کہ اشتراکیت خالص قومیت عربیہ سے نکلی ہے، مختصراً یہ کہ وہ دین سے الگ ایک قومی اور اشتراکیت کی داعی پارٹی ہے جس کا سربراہ میشل عفلق ہے۔ یہ پارٹی تعلیم گاہوں کے اساتذہ ومعلمین اور پڑھے لکھے لوگوں پر مشتمل ہے۔

(۲) الحزب العربی الاشتراکی : یہ پارٹی اشتراکی رجحان رکھتی ہے۔ اس کی قیادت اکرم حورانی کرتا ہے، اس کا وجود بعث پارٹی کے بہت بعد ہوا۔

(۳)الحزب القومی السوری: یہ سوری مزاج کی داعی ہے،اس کا دعویٰ ہے کہ سوریا سوریوں کے لئے ہے۔اہل سوریہ ایک مستقل قومی حیثیت رکھتے ہیں، یہ عربی قومیت کے نظریہ کو ابھارتی ہے اور دین کو سیاست سے الگ رکھنے کی دعوت دیتی ہے، وہ کچھ خاص اصولوں پر بھی زور دیتی ہے جو دینی اصولوں سے میل نہیں کھاتے اسی کے اکثر ممبر مسیحی اور غیر عرب اقلیتیں ہیں،خصوصًا لبنان میں اس کا زیادہ زور ہے۔

(۴)الحزب الشیوعی : اس کے ممبران جو بہت پڑھے لکھے لوگ ہیں،اپنے اصولوں کو مضبوطی کے ساتھ تھامنے اور اس پر اچھی طرح عمل پیرا ہونے میں ممتاز ہیں۔

(۵)الحزب التعاونی الاشتراکی :یہ اشتراکی رجحان رکھنے والی پارٹی ہے اور اپنے اصولوں میں اسلام سے قریب ہے،اس کے بعض لیڈر اپنے ذاتی اخلاق وعمل میں اسلام سے دور ہیں، یہ جماعت ڈکٹیٹرانہ طریقہ پر چلتی ہے،لیڈر ہی اس میں سب کچھ ہے۔ اس وقت اس کا قائد فیصل العسلی ہے۔

خالص سیاسی پارٹیاں

(۶) الحزب الوطنی :یہ پارٹی بعض ایسے افراد پر مشتمل ہے،جنھوں نے شروع میں وطنی پارٹی کی قیادت کی تھی۔ پھر عوام میں اس کی عدم صلاحیت وخودغرضی کے سبب اس سے الگ ہوگئے تھے۔

(۷) حزب الشعب: یہ ان افراد پر مشتمل ہے جنھوں نے الحزب الوطنی کی مخالفت کی تھی۔اس کے بعض اشخاص پاکیزہ خیالی اور علم وثقافت میں قدرے ممتاز ہیں،تاہم ان میں زندگی اور ملکی حالات کے بارے میں متفقہ رائے اور یکساں نقطۂ نظر نہیں پایا جاتا، ممبران پارلیمنٹ میں اس جماعت کے لوگوں کی اکثریت ہے۔اس کے روح رواں رشدی الکخیا.....اور ڈاکٹر ناظم القدسی ہیں۔

سوریہ کی خوبیاں اور خامیاں

اب میں بعض ان چیزوں کا ذکر کروں گا جس میں سوریہ اور سوری قوم ممتاز ہے

سوریہ کی زندگی ومعاشرت میں جو خوبیاں نظر آتی ہیں ان کا بھی ذکر کروں گا اور وہاں کی بعض ان خامیوں کا بھی تذکرہ کروں گا جس کا شمار کمزور پہلوؤں میں کیا جا سکتا ہے۔

سوریہ میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے جس چیز نے مجھے اپنی طرف متوجہ کیا وہ دینی زندگی اور اسلامی قدروں کا بچا کھچا وہ حصہ ہے جو دوسرے عرب ممالک کے مقابلہ میں سب سے زیادہ سیاح کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے، سوریہ کی مسجدیں دوسرے ممالک کے مقابلہ میں زیادہ آباد ہیں، لوگوں میں نماز و جماعت کا زیادہ اہتمام ہے علماء اور دیندار لوگ دوسرے ممالک کے علماء و دیندار لوگوں کے مقابلہ میں بعض دینی شعائر کو زیادہ خیال رکھتے ہیں۔ تاجر وکسان اور دوسرے طبقہ بمقابل دوسرے ملکوں کے، دینداری میں زیادہ بڑھے ہوئے ہیں، اگرچہ مصری روح وجذبات میں زیادہ قوی، زندگی وزندہ دلی اور دینی دعوتوں اور اسلامی تحریکوں کی طرف بڑھنے میں سوریوں سے فائق ہیں، یہاں کی عورتوں میں پردہ کا بھی رواج ہے، گو وہ بدلتے ہوئے زمانہ کے ساتھ کمزور اور کم ہوتا جا رہا ہے۔ مگر سوریہ کے اکثر طبقوں میں اس کا رواج ابھی تک باقی ہے جبکہ مصر میں تقریباً ختم ہو چکا ہے۔

دوسری چیز جس میں سوری قوم ممتاز ہے۔ وہ صفائی وستھرائی ہے، دمشق خاص طور سے اور سوریہ میں عام طور سے مسلمانوں کے شہروں میں تقریباً سب سے صاف ستھرا اور دلکشی میں اگر ترکی کو مستثنیٰ کر دیا جائے تو یہی شہر سب سے بڑھا ہوا ہے۔ دمشق کی سڑکیں اور اس کے محلے قاہرہ کی سڑکوں اور محلوں سے صاف ستھرے ہیں، سوائے جیزہ، مصر جدیدہ اور قاہرہ کی بعض سڑکوں کے۔

تیسری چیز جس میں سوری قوم ممتاز ہے وہ سنجیدگی، حسن اخلاق، ذکاوت حس اور نرم مزاجی ہے، اس میں شبہ نہیں کہ ان اخلاق کو بنانے میں موسم اور ملک کے قدرتی حالات کا بڑا دخل ہے۔

سوریہ میں دینی زندگی کے باقی رہنے کا شاید سب سے بڑا سبب وہاں اہل ذکر اور دعاۃ الی اللہ کا وجود ہے۔ ان لوگوں کے وجود نے مادی سرگرمی اور اس کی زیادتی کو روک دیا۔ اور ایک عرصہ تک خواہشات کی بے راہ روی، اخلاقی انارکی، اور بے لگام مادیت کی راہ میں روک بنا رہا اور اس نے ایک دستہ کا کام کیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ جن ملکوں میں یہ ''دستہ''

ٹوٹ چکا ہے وہ ممالک مادیت اور مغربی تہذیب کی طرف بے تحاشہ دوڑ پڑے، نہ ان میں اعتدال باقی رہا اور نہ غور وفکر کی صلاحیت۔

سوریہ کی روحانی زندگی جو اس وقت جانکنی کے عالم میں ہے، اس کا سہرا تیرہویں صدی کے بزرگ مولانا خالد رومی کے سر ہے جنھوں نے دہلی کا سفر کر کے مولانا عبداللہ دہلوی (معروف بہ شاہ غلام علی صاحب خلیفہ حضرت مرزا مظہر جانجاناں) سے تربیت حاصل کی اور خرقۂ خلافت حاصل کر کے واپس آئے اور شام وروم، کردستان وعراق کو اپنے مسترشدین اور مریدین سے بھر دیا۔(۱) شام وعراق وترکی میں ان کی یادگاریں ابھی تک باقی اور زندہ ہیں۔

ظاہری چیزوں میں جو چیز میں نے سوریہ میں دیکھی وہ امویوں اور اموی خاندان سے وفاداری ہے، اہل سوریہ ان کے ناموں اور یادگاروں کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں، کتنی ہی دوکانوں اور ہوٹلوں پر میں نے امویوں کے نام کی لگی ہوئی تختیاں اور بورڈ دیکھے، آپ دمشق میں چل رہے ہوں تو (المطعم الاموی) (ہوٹل بنی امیہ) (تجلید بنی امیہ) (مدرسہ بنی امیہ) (مدرسہ مروان) جیسے ناموں کے بورڈ آپ کی نگاہوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیں گے، ایک مرتبہ تو میرے ساتھ دلچسپ لطیفہ پیش آیا، قریب تھا کہ میں مشکل میں پڑ جاتا، مگر خدا نے فضل فرمایا۔ ہوا یہ کہ ایک دن صبح سویرے چہل قدمی اور تفریح کی غرض سے نکلا، جب میں ''الجامعۃ السوریۃ'' اور ''کلیۃ الحقوق'' کی عمارت کے پاس پہونچا تو ایک بورڈ نے جس پر ''ثکنۃ(۱) معاویۃ ابن ابی سفیان'' لکھا ہوا تھا، میرے قدم پکڑ لئے اور میں رُک کر ان الفاظ کو لطف لے کر پڑھنے لگا، جنھوں نے عہد ماضی کی یاد تازہ کر دی اور میں اس زمانہ کو یاد کرنے لگا جس میں حضرت معاویہ پورے عالم اسلام کے خلیفہ اور بادشاہ تھے اور دمشق ہی نہیں بلکہ پورا سوریہ ان کا مرکز تھا، ان خیالات میں میں اتنا محو ہوا کہ گرد وپیش کی خبر نہ رہی، میرے اس طرح کھڑے ہونے اور غور سے بورڈ کو دیکھنے سے گیٹ پر فوجی لباس میں پہرہ دینے والے چوکیدار کو شک ہوا اور وہ میرے

---

(۱) مولانا خالد رومی کے حالات کے لئے ملاحظہ ہو علامہ شامی کی کتاب **سل الحسام الهندی فی مناقب سیدنا خالد الکردی** ''اور شاہ غلام علی صاحب کے ملفوظات ''**در المعارف**'' مرتبہ شاہ رؤف احمد صاحب مجددی

(۲) ثکنہ یعنی چھاؤنی Cantonment

پاس آیا اور پوچھا تم کون ہو؟ میں نے بتایا کہ میں مسلمان ہوں، پھر اس نے کہا تم اس فوجی مرکز کو اتنے غور سے کیوں دیکھ رہے ہو؟ میں نے کہا کوئی بات نہیں۔ اس بورڈ نے مجھے اپنی طرف متوجہ کرلیا اور عظیم المرتبت شخص کے اس نام نے مجھ کو خیالات کی دنیا میں گم کر دیا لیکن اس نے اس تاریخی ذوق کو نہیں سمجھا اور میری بات نہیں مانی، شاید اس نے مجھ کو کوئی یہودی جاسوس سمجھا۔ میرا ہندوستانی لباس اس کے شک کو مزید بڑھا رہا تھا اس نے کہا" ایـــن هـــويتك " یعنی تمہارا پاسپورٹ کہاں ہے؟ میں نے کہا وہ تو گھر پر ہے، اس نے کہا تم اس کو اپنے ساتھ کیوں نہیں رکھتے ہو؟ میں تم کو پولیس چوکی لے چلوں گا، میں نے کہا: "ارے بھائی میں مسلمان ہوں"۔ بعض آیتیں پڑھ کر میں نے اس کو سنائیں اور بعض دوسرے دلائل سے اپنے مسلمان ہونے کا ثبوت پیش کیا مگر وہ مطمئن نہ ہوا مجھے پولیس چوکی کی طرف لے چلنے لگا، اللہ تعالیٰ نے میرے دل میں یہ بات ڈال دی کہ میں اس سے کہوں کہ مجھے مکّہ جانا ہے، حاجیوں کی ایسی زبان کو امّی بھی سمجھتے ہیں، تمام اسلامی ممالک خصوصًا مصر وشام میں اس نام کا بڑا احترام ہے، چنانچہ حاجی بتاتے ہی اس نے مجھ کو چھوڑ دیا اور جانے کی اجازت دے دی۔

سوریہ اور یہاں کے لوگوں کی جو بات مجھے پسند نہیں آئی وہ معیار زندگی کا حد سے بڑھ جانا اور زندگی کی ہر شے میں تکلّفات کا داخل ہو جانا، سادگی اور موٹی جھوٹی زندگی گزارنے اور مشقت برداشت کرنے سے دوری واحتراز ہے، وہ قوم جو اسرائیل جیسی ایک نوخیز اور طاقت ور حریف کے مقابلہ میں کھڑی ہو، اسے تو اپنے کو سرحد کا محافظ سپاہی سمجھنا، اور فوجی زندگی گزارنا، مشقت و بہادری، اور رہن سہن میں اعتدال کا عادی بنانا ضروری ہے نہ کہ عیش وعشرت میں پڑنا، جرمنی کے مقابلہ میں فرانس کی شکست وزوال کا سب سے بڑا سبب فرانسیسی قوم کی عیش پرستی اور تن آسانی تھی، جس کی فرانسیسی قوم آخر زمانہ میں شکار ہوگئی تھی، سوریہ کی کیفیت اس وقت (اپنی ذمہ داری اور ان خطرات کے مدنظر جو اس کے وجود کو چیلنج کر رہے ہیں) مصر کی سی ہے، جس کو فاتح مصر حضرت عمرو ابن العاص نے ہدایت کی تھی کہ:

"بلاشبہ تم لوگ گردوپیش کے دشمنوں کی کثرت کے سبب ہمہ وقت جنگ کی پوزیشن

میں ہو جن کی نگاہیں تم پر لگی ہوئی ہیں''۔

دوسری بات جس میں سبھی ممالک شریک ہیں، وہ ہے بے جا تکلفات، تعریف، القاب میں مبالغہ اور خیر مقدم اور استقبال میں الفاظ کا اسراف، اس میں شک نہیں کہ وہ اس تمدّن کی ان ظاہری چیزوں میں سے ہے جو طبعی ترقی وکمال سے آگے بڑھ چکی ہیں اور غیر ضروری چیزوں کو سنوارنے اور ان میں نکتہ آفرینی میں پڑی ہے مگر جس طرح اقتصادی زندگی میں اعتدال کی ضرورت ہے، اسی طرح اجتماعی زندگی میں اعتدال اختیار کرنے کی ضرورت ہے، ہر وہ معاشرہ جو اسلامی زندگی کی تصویر پیش کرنا چاہتا ہے اور وہ حکومت جو نئی تنظیم کرنا چاہتی ہے، اس کے لئے ضروری ہے کہ ان باریک پہلوؤں کا اتنا ہی خیال رکھے کہ جتنی توجہ ورہنمائی کے وہ مستحق ہیں۔

یکشنبہ ۹/۱۱/۱۳۷۰ھ مطابق ۱۲/۸/۱۹۵۱ء

اموی پایہ تخت دمشق سے مرکز وحی خلافت مدینہ منورہ کی طرف

فجر کی نماز کے بعد ہم لوگ مزہ ہوائی اڈّہ کو روانہ ہوئے، ہمارے معزّز میزبان شیخ عبدالوہاب الصلاحی اور شیخ ابوعزت غفری نے ہم کو ایرلائن کے آفس سے رخصت کیا اور برادر عزیز عبدالرحمٰن البانی وغیرہ ہمارے ساتھ سوار ہوئے۔ ہوائی اڈّہ پر اپنے ایک ساتھی کے ساتھ محترم دوست شیخ مصطفیٰ سباعی ملے۔ ہوائی اڈّہ پر تھوڑے سے توقف وانتظار کے بعد ہم لوگ سعودی ہوائی جہاز پر سوار ہوئے اور تھوڑا سا رک کر مدینہ طیّبہ کے لئے روانہ ہو گئے۔

اس طرح یہ سفر جو مکّہ سے شروع ہوا اور مصر وسوڈان، سوریہ وفلسطین، شرق اردن پر مشتمل تھا خدا نے چاہا کہ مکّہ ہی اس سفر کی انتہا بھی ہو جیسا کہ ابتداء اسی سے ہوئی تھی۔

جزیرۃ العرب کے سامنے

مصر وشام وسوڈان کے سفر کی روداد

جدّہ سے روانہ ہوتے وقت میں نے جزیرۃ العرب کو خطاب کرتے ہوئے یہ الفاظ لکھے تھے:

"رخصت اے جزیرۃ العرب چھوڑ کر نہ اکتا کر، یہ سفر تیری ہی خاطر اور بحر احمر، اور بحر ابیض (بحر روم) پر پھیلے ہوئے تیرے ہی عزیز خاندان سے ملنے کی غرض سے ہے میں اس کو تیرا اسلام پہنچاؤں گا اور تجھ سے جدا ہونے کے بعد زمانے کی دست برد نے اس کے ساتھ جو برتاؤ کیا اس کو دیکھوں گا، تو نے اس خاندان کو عالم کے لئے جو پیغام سونپا تھا اور س پر جس امانت کی ذمہ داری ڈالی تھی اس کے ساتھ اس نے کیا معاملہ کیا، اس کو دیکھوں گا، دوبارہ پھر میں انشاء اللہ تیرے پاس لوٹ کر آؤں گا اور عرب اور اسلامی ملکوں میں اچھا برا جو کچھ بھی دیکھوں گا تیرے فرزندوں میں وفاداری و بے وفائی کی جو بھی حالت دیکھوں گا اس کو پوری امانت داری کے ساتھ بے کم وکاست صاف صاف بیان کروں گا کہ قافلہ کا پیش رو اپنوں سے جھوٹ نہیں بولتا، واقعات کو بیان کرنے میں مداہنت اور مبالغہ آمیزی وخوش گمانی، تباہ کن جھوٹ اور بربادی کا پیام دینے والی خیانت ہے"۔

اب یہ وعدہ پورا کرنے کا وقت ہے۔ اے عزیز ومحبوب جزیرۃ العرب! مجھے تجھ سے یہ بیان کرتے ہوئے خوشی ہوتی ہے کہ تیرا عرب خاندان اب تک اسلام ہی سے اپنا رشتہ جوڑتا ہے اور اپنی عربیت پر فخر کرتا ہے، وہ اپنا تعلق برابر تجھ ہی سے جوڑتا ہے اور اپنے دین وزبان کو تیرے ہی ارض پاک کے دونوں چشموں (مکہ ومدینہ) سے منسوب کرتا ہے، وہ اپنی

نئی تاریخ کا سہرا اس مبارک دن کے سر باندھتا ہے جس دن غار حرا سے رشد و ہدایت کی پہلی روشنی چمکی اور ظلمت کی ماری دنیا کی صبح صادق نمودار ہوئی اور ان ملکوں نے تیرے ادبی اور ثقافتی ورثہ کو اپنے دامن میں جگہ دی، تیری زبان کو اپنایا اور اس کو سینے سے لگالیا اور ان دونوں سرمایوں میں اتنا زبردست اضافہ کیا جو تیرے تصور میں بھی نہ تھا اور نہ تیرے جاہلی شعراء کے وہم وگمان میں تھا۔ تجھے اس پر شکر واعتراف کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں۔ یہ ملک تیری زبان وقومیت کے وفادار ہیں، تیری ثقافت وتاریخ کے وفادار ہیں۔

تیرے عرب خاندان نے اس دین سے ایک دن بھی اپنا ناطہ نہیں توڑا جس کا تو نے اس کو رخصت کرتے وقت عہد لیا تھا اور ہدایات دے کر دنیا کو فتح کرنے اور جاہلیت کے پھندوں سے اسے آزاد کرانے کے لئے بھیجا تھا، حاسدوں اور بدخواہوں نے اسلام سے اس عزیز خاندان کے تعلق کو توڑنے اور پہلی جاہلیت کی طرف لوٹنے یا نئی جاہلیتوں کو اپنا لینے کی کتنی ہی کوششیں کیں، اسلامی عقیدہ سے الگ ہوجانے اور اتحاد اسلامی سے کٹ جانے کو کتنا ہی اس کے سامنے بنا سنوار کر پیش کیا کہ وہ کمزور قومیت اور تنگ نظر وطنیت کو اختیار کرلے، مگر ہر وقت اور ہر شہر میں اس کی روح بھڑکی اور دینی غیرت جوش میں آئی اور اس دین پر اس کا ایمان ویقین اور بڑھ گیا، اور مفسدین کی تمام کوششیں ناکام رہیں۔

میں نے قوموں اور قبیلوں کے کسی خاندان کو اس عرب خاندان سے زیادہ باوفا، امانت دار، ماضی سے گہرا تعلق رکھنے والا اور زبان کے معاملہ میں غیرت مند نہیں پایا جو مشرق وسطیٰ میں رہتا ہے جو تہذیب کے دھاروں اور سیاسی کشمکش کے دہانہ پر ہے، ہر چیز بدل گئی، یہ خود بھی اپنی تہذیب وثقافت، ادب وزندگی میں بہت کچھ بدل گئے لیکن وہ برابر اپنے دین پر قائم اور زبان پر سختی سے جمے ہوئے ہیں۔

اے جزیرۃ! تیرے فرزندوں کی یہ وفاداری واستقامت تجھے مبارک ہو، عالم عربی میں یقیناً بہت سی ایسی خوبیاں ہیں جو تجھ میں اگر دوبارہ زندہ ہوجائیں تو تیری پہلی نسل کو خوش کریں گی۔

اذان سے فضائیں اب بھی گونجتی ہیں، مناروں سے توحید ورسالت محمدی کا اعلان اب

بھی برابر ہوتا رہتا ہے، نمازیں ادا کی جاتی ہیں، قرآن کریم کی تلاوت ایسے دلکش عربی لہجہ میں ہوتی ہے کہ اگر تو سنے تو جھوم اٹھے اور تجھے یہ خیال ہو کہ وہ صرف انھیں ملکوں میں پڑھا گیا ہے، اگر تو علماء کو اس کی تفسیر بیان کرتے ہوئے اور دینی موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے سنے تو بلاشبہ تجھ کو یہ گمان ہو کہ قرآن صحیح معنوں میں اسی زمانہ میں سمجھا گیا، وہاں علم کی خدمت ہو رہی ہے، اس کی نشر و اشاعت جاری ہے، وہاں ہر روز دینی کتابوں کا ایک ایسا سیلاب امنڈتا ہے جو تیل کے اس سیلاب سے کم نہیں جس کا دھارا تیرے مشرقی علاقہ (نجد) سے مغربی دنیا کی طرف چلتا ہے، میں ان تمام باتوں کی شہادت دیتا ہوں اور تجھے اس پر مبارکباد دیتا ہوں اے عالمِ عربی کے مرکز! تو اپنی آنکھ ٹھنڈی کر اور خوش ہو، تجھ سے بڑھ کر اس بات پر خوشی کا مستحق کون ہو سکتا ہے؟ تجھ سے بڑھ کر مبارکبادی کا حقدار کون ہے؟

لیکن جدّہ بندرگاہ پر تجھ کو الوداع کہتے ہوئے میں نے تجھ سے وعدہ کیا تھا کہ تجھ سے کوئی بات نہ چھپاؤں گا اور واپسی میں میٹھی اور کڑوی ہر بات تجھ کو سناؤں گا اور تجھ سے اپنے سفر کا ہر تأثر خواہ وہ باعث غم ہو یا باعث مسرّت، تجھ سے بیان کروں گا، تیری زبان کی پرانی کہاوت ہے کہ ''شریف آدمی جو وعدہ کرتا ہے اس کو پورا کر دکھاتا ہے''۔

محبوب جزیرۃ العرب! سمجھ میں نہیں آتا کہ اپنے ملے جلے احساسات کی تعبیر کس طرح اور کس انداز میں کروں، اس طویل سفر میں جو کچھ میں نے پایا اور جو کچھ کھویا اس کو کن الفاظ میں بیان کروں، دو متضاد صورت حال کی عکاسی کیوں کر کروں، امید کی روشنی اور اندیشوں کی کیفیت کو کس زبان میں ادا کروں۔

اپنے مافی الضمیر کو ادا کرنے کے لئے میں پہلے اپنے ملک کے ایک مسلم شاعر کے الفاظ مستعار لیتا ہوں جس نے مجھ سے پہلے عالم عربی کو دیکھا اور اس سے غمزدہ و رنجور واپس ہوا تھا وہ دو شعروں میں اپنے سفر کا خلاصہ بیان کرتا ہے، یہ شاعر ڈاکٹر محمد اقبال ہیں جو کہتے ہیں ع

سنی نہ مصر و فلسطین میں وہ اذاں میں نے
دیا تھا جس نے پہاڑوں کو رعشۂ سیماب

وہ سجدہ روح زمیں جس سے کانپ جاتی تھی
اسی کو آج ترستے ہیں منبر و محراب

اے جزیرۃ العرب! تجھ سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ اس اذان کا سرچشمہ جس سے پہاڑ لرزتے اور تھراتے تھے اور وہ سجدہ جس سے زمین پر کپکپی طاری ہو جاتی تھی، ایمان سے بھرپور شوق ومحبت سے لبریز، موت پر جری، شہادت کا شائق، دنیا سے بے نیاز اور مادہ سے مستغنی دل تھا، ایک زمانہ سے یہ دل کمزور ہو چکا ہے، مغربی مادیت ومادہ پرستانہ تعلیم نے اس کو سخت نقصان پہونچایا، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ زندگی کی تپش اور حرارت، بے باکی وجرأت اور سوز دروں بہت کھو چکا، اس تبدیلی سے زندگی کا ہر شعبہ اور ڈھانچہ متأثر ہوا، وہ مسجد ومدرسہ، گھر اور بازار ہر کہیں عام ہو گیا اور اسے ہر شخص نے جو احساس سے عاری نہیں ہوا ہے محسوس کیا، حتّٰی کہ کل دمشق میں امیر الشعراء شوقی کو یہ کہتے ہوئے سنا گیا کہ

فلا الأذان اذان فی منارته
اذا تعالی و ولا الآذان آذان

(مناروں سے بلند ہونے والی یہ اذانیں وہ نہیں جو پہلے ہوا کرتی تھیں۔ نہ یہ سننے والے کان وہ ہیں جو پہلے اذان کو سن کر مست ہو جاتے تھے)

اس تبدیلی پر میں نے ان شہروں سے جن میں تیرے ہی خاندان کے لوگ آباد ہیں بہت کھری کھری اور دوٹوک باتیں کیں بالکل اس طرح جیسے ایک مخلص وبہی خواہ کسی سے خصوصی ونجی گفتگو کرتا ہے، لیکن مجھے یہ جواب ملا کہ اس تبدیلی کا ذمہ دار تو جزیرۃ العرب ہی ہے، وہی سارے عالم کی زندگی وتوانائی وروح کا سرچشمہ تھا، وہ عالم عربی ہی میں نہیں بلکہ پورے عالم کی نسوں اور اس کی رگوں کو نیا خون تقسیم کرتا تھا، مگر اخیر زمانہ میں ایمانی زندگی کا خون عطا کرنے کے بجائے وہ پٹرول تقسیم کرنے میں لگ گیا اور دنیا کو ایمان کا سامان اور روح کی غذا دینے کے بجائے بدیسی مال حاصل کرنے پر قانع ہو گیا۔

اے محبوب جزیرۃ العرب! میں نے تیری طرف سے بہت صفائی پیش کی بفضلہٖ تعالیٰ مجھے بحث ومباحثے کا ملکہ حاصل ہے، مگر اس نے دلائل وحقائق سے میری زبان بند کر دی، اب تو

ہی جس طرح چاہے اس کو مطمئن وخاموش کرے اور اپنی دلیلوں سے اس کو لاجواب کردے کہ وہ تیرا خاندان ہے اور تجھ سے سب سے زیادہ قریب ہے۔

خواہ تیری کوتاہی ہو یا نہ ہو، اس افسوسناک تبدیلی کا ذمہ دار تو ہو یا کوئی اور! بایں ہمہ میں تجھے خوش خبری دیتا ہوں کہ میں نے عالم عربی میں تیز اور وسیع اسلامی نشوونما کے آثار اور صبح کے طلوع کے خوش کن علامات دیکھے ہیں، اب وہاں کی رائے عامہ بیدار ہونے لگی ہے، دلوں میں بے چینی اور بگڑے ہوئے حالات کے خلاف غیظ وغضب سرگوشیاں کرنے لگا ہے اور ملکوں میں اس کے اثرات بھی پڑنے لگے ہیں۔ مغربی تہذیب اور اس کی قدروں کے خلاف ردّعمل کی تحریک نمودار ہوگئی ہے۔

اب مغرب کی قیادت اور اس کی عالمگیر سیادت کے خلاف جس کو اس نے دنیا پر مسلط کردیا ہے اور عربوں پر اس کو لابدی قرار دے دیا ہے بلکہ اس کے مال اور خزانوں، اور پیداوار پر اس کی اس طرح فرمانروائی رہی ہے، جیسے وہ بے وقوف، بے شعور یا کم سِن بچّہ ہے اب اس کے خلاف سیاسی وفکری بغاوت کے آثار ظاہر ہورہے ہیں۔

اب عرب ممالک حقائق کو سمجھنے لگے ہیں اور انھوں نے ایک ایسے شریف انسان کی طرح جو اپنی عزّت وانسانیت پر یقین رکھتا ہے، اپنی عزت وشخصیت کا وزن محسوس کرتا ہے۔ ایک ایسے زندہ انسان کی طرح جو غصہ کرنا بھی اسی طرح جانتا ہے جتنا خوش ہونا وہ رفاقت بھی کرتا ہے اور بوقت ضرورت بغاوت کا علم بھی بلند کرتا ہے، اب عالم عربی مغرب کے سامنے عرصۂ دراز تک جھکنے اور اس پر اعتماد کرنے اور اپنے آپ کو اس کی گاڑی سے جوڑے رہنے کے بعد کبھی کبھی اس کو آنکھ دکھانے لگا ہے، چنانچہ اب وہ اپنے آپ کو مستقل بالذات اور دنیا کے خاندان کا ایک کارآمد باعزت فرد سمجھنے لگا ہے، وہ خیر وشر کو جانتا اور دوست ودشمن میں فرق کرتا ہے، صلح وجنگ، عہد وپیمان اور کسی سے دوستی کرنے میں اپنے حق کو محفوظ رکھتا ہے۔

عرب ممالک سچی لگن کے ساتھ صحیح ترقی اور آزادی کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اب وہ وطنی مصنوعات وپیداوار، خود کفالتی اور ضروریات زندگی میں غیر ممالک سے بے نیازی کی

اہمیت کو سمجھنے لگے ہیں، ان میں سے بعض ممالک تو اس مقصد کی طرف قدم بھی بڑھا چکے ہیں اگر چہ یہ رفتار عرصہ تک بوجھ سے دبے ہوئے ہانپتے وکراہتے شخص کی طرح سُست ومحدود ہے لیکن وہ اس بچّہ کی طرح جو عرصۂ دراز کے بعد دھیرے دھیرے چلنا شروع کرتا ہے، چلنے لگے ہیں جب کہ اس سے پہلے وہ مغرب کے دیئے ہوئے عطیات، سامان وآلات سے بہل جاتے تھے، اب ممالک عربیہ عرصہ تک موت کی لذّت سے ناواقف رہنے اور اس کو چھوڑے رہنے کے بعد موت سے کھیلنا سیکھ رہے ہیں۔ اب وہ یہ سمجھنے لگے ہیں کہ زندہ وہی رہ سکتا ہے جو مرنے کے لئے تیار ہو اب وہ یہ کہنے لگے ہیں کہ

جسے جینا ہو مرنے کے لئے تیار ہو جائے

سب سے بڑی چیز جو دلوں میں امید کی کرن پیدا کرتی ہے اور خوش کن اسلامی مستقبل کی خوشخبری دیتی ہے وہ عالم عربی میں نئے ایمان کے آثار کا ظہور پذیر ہونا ہے، جزیرۃ العرب تجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ تیرے معزز خاندان بلکہ پورے عالم اسلام کو کسی نئے ایمان یا عقیدہ کی ضرورت نہیں ہے وہ دین جسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے تھے، وہی ابدی دین، اور آخری پیغام ہے اور آج بھی زندہ جاوید، قوی وتوانا ہے، گو زمانہ بہت آگے بڑھ چکا ہے، تاہم وہ سارے عالم کی رہنمائی اور ہر زمانے کا ساتھ دینے کی صلاحیت رکھتا ہے، مگر تیرا وہ خاندان جو اس دین کو اپنائے ہوئے ہے اس کو اس ابدی اور ہر زمانے اور نسل کے لئے آئے ہوئے دین پر اپنے ایمان ویقین کو پھر سے تازہ کرنے کی اشد ضرورت ہے، اس کا ایمان کمزور ہو چکا ہے اور اب نئے نئے فتنے پیدا ہو گئے ہیں، نت نئی دعوتیں سرگرم عمل ہی نہیں ہیں بلکہ وہ جڑ پکڑ چکی ہیں، مشکلات بہت بڑھ گئی ہیں، عالم عربی ان فتنوں، مشکلات اور دعوتوں کا مقابلہ کمزور ایمان سے نہیں کر سکتا بلکہ اس ایمان سے تو وہ کسی معمولی صدمہ کو بھی برداشت نہیں کر سکتا، کسی خواہش پر غالب آنا، انانیت پر قابو پانا، مشکل کو برداشت کرنا یا کسی دعوت کے مقابلہ میں کھڑا ہونا تو بڑی بات ہے..... یہ ٹوٹا پھوٹا ایمان ایسے زمانہ میں جبکہ معاملہ بہت آگے بڑھ چکا ہے، زندہ نہیں رہ سکتا نہ سنبھل سکتا ہے۔

لیکن اس سفر میں میں جن ممالک سے گزرا ہوں ان میں میں نے ایمان کی صبح نو کے آثار دیکھے ہیں، یقیناً میں نے تازہ دم بھڑکتا ہوا ایمان دیکھا ہے، میں نے ایسے نوجوان دیکھے ہیں جن کی ان کے رب نے ان الفاظ میں تعریف کی ہے:۔

" انهم فتية آمنوا بربهم وزدناهم هدى وربطنا على قلوبهم اذ قاموا فقالوا ربنا رب السموات والارض لن ندعو من دونه الها لقد قلنا اذا شططا. هولاء قومنا اتخذوا من دونه الهة لولا ياتون عليهم بسلطان بين فمن اظلم ممن افترى على الله كذبا ".

(وہ لوگ چند نوجوان تھے جو اپنے رب پر ایمان لائے تھے اور ہم نے ان کی ہدایت میں اور ترقی کر دی تھی اور ہم نے ان کے دل مضبوط کر دیئے جب کہ وہ (دین میں) پختہ ہو کر کہنے لگے کہ ہمارا رب تو وہ ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے ہم تو اس کو چھوڑ کر کسی معبود کی عبادت نہ کریں گے، کیونکہ اس صورت میں ہم نے یقیناً بڑی ہی بے جا بات کہی، یہ جو ہماری قوم ہے انھوں نے خدا کو چھوڑ کر اور معبود قرار دے رکھے ہیں، یہ لوگ ان معبودوں پر کوئی مکمل دلیل کیوں نہیں لاتے، تو اس شخص سے زیادہ کون غضب ڈھانے والا ہوگا جو اللہ پر جھوٹ تہمت لگاوے)۔

یہ نوجوان اگرچہ عمر میں زیادہ نہیں، مگر ایمان میں قوی و توانا ہیں، وہ اپنے مسلمان ہونے کا احسان نہیں جتلاتے بلکہ خدا کی تعریف کرتے ہیں کہ اس نے ان کو ایمان کی ہدایت سے نوازا اور اسلام کی دولت سے سرفراز کیا، وہ ہر چیز سے زیادہ اپنے دین پر فخر کرتے ہیں، وہ لوگ اس دین کی طرف پرانے ورثہ اور "آثار قدیمہ" کی طرح نہیں دیکھتے یا اس درخت کی طرح نہیں سمجھتے جس کا نمو ختم ہو گیا ہو اور اس نے پھل دینا چھوڑ دیا ہو، وہ اس کو ابلتے ہوئے چشمے کی طرح دیکھتے، اور اس سے قوت و زندگی حاصل کرتے ہیں، وہ اسے تابندہ و درخشاں سورج کی طرح دیکھتے اور اس سے روشنی و حرارت حاصل کرتے ہیں، اسلام ان کی زندگی میں

سرسری اور کیف ما اتفق نہیں ہے بلکہ قلب وجگر اور عقل وروح کی طرح ان کی رگ رگ میں رچا بسا ہوا ہے، وہ اس کو بہت سے دینوں کی طرح ایک دین نہیں سمجھتے یا مختلف نظامہائے حیات کی طرح اس کو بھی ایک نظام نہیں سمجھتے، بلکہ تنہا اسی کو دین حق اور اس کے ماسوا کو ضلالت وگمراہی سمجھتے ہیں، ان کے نزدیک اس سے وہی شخص صرف نظر کرسکتا ہے جو کھوٹی عقل کا ہو، یہ وہی لوگ ہیں جن کے ذریعہ عہد اوّل میں اسلام نے ترقی کی، اس زمانہ میں بھی انھیں سے ترقی اور بقاء ودوام حاصل کرے گا۔

عالم اسلام وعالم عربی کی نشاۃ ثانیہ ایک حقیقت ہے جس میں شک اور بحث ومباحثہ کی گنجائش نہیں۔

لیکن مجھے جس بات کا ڈر ہے وہ یہ کہ یہ تمام ممالک تجھ سے بڑھ جائیں اور تیرا دور بہت پیچھے رہ جائے، تیرا یہ حق ہے کہ تو ان سے آگے بڑھے اور اس مبارک نشاۃ ثانیہ کی قیادت کرے کہ تو ہی اسلام کی اصل روح ومرکز اور بلد امین ہے۔

بہر کیف اے جزیرۃ العرب! نہ میں عالم عربی سے مایوس ہوں اور نہ تجھ سے، میں شاعر اسلام اقبالؔ کے زبان سے کہتا ہوں۔

نہیں ہے ناامید اقبالؔ اپنی کشت ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

جزیرۃ العرب یہ تیرا ہی حق ہے کہ اس زرخیز مٹی کو زمزم کے پانی سے سیراب کرے یا آنسو اور خون سے، تو جس طرح چاہے کرے، جیسا کہ تو نے ابتداء اسلام میں اس کو سیراب کیا تھا پھر زمین سرسبز وشاداب ہو جائے گی۔

اللہ عالم الغیب ہی کو صحیح علم ہے کہ کل کیا ہونے والا ہے، لیکن اس کی دی ہوئی بصارت یا عطا کی ہوئی بصیرت سے ہم کوتاہ نظر بھی یہ دیکھ رہے ہیں کہ۔

جہان نو ہو رہا ہے پیدا وہ عالم پیر مر رہا ہے
جسے فرنگی مقامروں نے بنا دیا ہے قمار خانہ

ضمیمہ

تین دن لبنان میں

۱۹۵۶ء

سوریہ کا سفر

۱۹۵۱ء میں میرا مشرق عربی کا سفر ہوا جو حجاز کے علاوہ (کہ یہیں سے سفر شروع بھی ہوا اور ختم بھی) مصر، سوڈان اور فلسطین پر مشتمل تھا، پروگرام یہ تھا کہ مصر سے شام کا سفر سمندری راستہ سے ہوگا اور بیروت میں اتر کر لبنان کی بھی سیر کرتا چلوں گا، مگر بعد میں بحری سفر کا خیال ترک کر کے فضائی سفر کا فیصلہ کر لیا اس لئے کہ یہ رمضان المبارک کا زمانہ تھا اور دل میں جلد واپسی اور پرسکون جگہ قیام کرنے کا شدید تقاضا تھا، چنانچہ لبنان کا سفر رہ گیا اس سفر میں لبنان کی سیر مقدر نہ تھی۔

سوریہ سے لبنان

پھر جب اللہ تعالیٰ نے ۱۹۵۶ء سوریہ یونیورسٹی میں وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے سوریہ جانا مقدر فرمایا تو خیال ہوا کہ لبنان کی بھی سیر کرلوں اور یہ خواہش رہی کہ رمضان سے قبل یہ سفر ختم ہو جائے، اس بات کی ضرورت تھی کہ کوئی اچھا ساتھی ملے جس کی اس مختصر سفر میں رفاقت حاصل ہو، اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے میرے پرانے دوست استاذ سعد الدین الولیلی (۱) کو منتخب فرمایا جنھوں نے رفیق سفر ہونے کی عزت بخشی، وہ اچھے ساتھی اور بہترین رہبر

---

(۱) وہ اخوان کے ایک سرگرم کارکن اور بڑے مستعد اور فہیم تعلیم یافتہ نوجوان ہیں ۱۹۵۱ء میں قاہرہ میں ان سے تعارف ہوا تھا ۵۶ء میں جب دمشق میں قیام ہوا تو وہ وہاں ایک کمپنی کے منیجر تھے انہوں خود رفاقت کی پیش کش کی اور ساتھ ہو گئے۔

تھے۔ہم ۲۶ رشعبان ۵/اپریل ۱۹۵۶ء دمشق کے فُندق یرموک سے جہاں میں ٹھہرا ہوا تھا روانہ ہوئے، محبّ گرامی استاذ سعید رمضان اور سوریہ یونیورسٹی ''کلیۃ الشریعۃ'' میں پڑھنے والے ندوی بھائیوں نے ہم کو رخصت کیا، ہم مغرب کی سمت روانہ ہوئے، موٹر ہمیں ایسی عمدہ اور پختہ سڑک پر لے کر روانہ ہوئی، جس پر دورویہ درخت سایہ فگن تھے اس کے پہلو بہ پہلو دریائے بردیٰ کی موجیں اٹکھیلیاں کرتی چل رہی تھیں جس کے بارے میں بنو جفنہ کی تعریف کرتے ہوئے حضرت حسّان بن ثابتؓ نے فرمایا ہے:

یسقون من ورد البریص علیھم

یروی یصفق بالرحیق السلسل

''مقام بریص پر جوان سے ملے اس کی بردیٰ کے خالص شراب ملے ہوئے پانی سے ضیافت کرتے ہیں۔شہر ہرے بھرے باغات کی کثرت کے سبب جنت نشاں معلوم ہوتا ہے، دمشق کے نواحی علاقوں اور شہر میں داخل ہونے والے راستہ کا منظر ایسا دلکش وجاذب نظر ہے کہ کسی اور شہر کا منظر ہم نے ایسا نہیں دیکھا، راستہ میں ہم ربوہ، دُمّر، ہامہ اور دمشق کے گرمی گزارنے کے مقامات اور پُر رونق وپُر بہار پارکوں کو دیکھتے ہوئے گزرے، یہاں تک کہ ہم مغربی سوریہ پہونچے اور لبنان میں داخل ہوگئے اور پولیس چوکیوں، سیکورٹی کے دفاتر اور کسٹم آفسوں کے مراحل طے کئے، وہاں میں نے دیکھا کہ ظالم استعمار نے اس حسین وجمیل ملک کے ساتھ کیسا مذاق کیا ہے، انھوں نے اس کو ٹکڑے ٹکڑے کرکے اس کی غیر طبعی تقسیم کی ہے۔یہاں سوریہ ختم ہوتا ہے اور چند ہی قدم کے بعد حدود لبنان شروع ہوجاتے ہیں، یہ پورا علاقہ ایک اسلامی ملک تھا جو شام کہلاتا تھا، اے مغرب! خدا تجھے بھی اسی طرح پارہ پارہ کردے، جس طرح تو نے مشرق اسلامی کے ٹکڑے کئے ہیں، اور تجھ پر ایسے بے رحم کو مسلّط کردے جو تیرے ہر ہر حصّے کے ٹکڑے کردے۔

لبنان میں

ہم لبنان میں داخل ہوگئے۔ یہاں ہمیں نہ موسم میں کوئی فرق محسوس ہوا نہ زمین کی طبعی حالت میں اور نہ یہاں بسنے والی قوم کے رنگ وروپ ہی میں، وہی سرزمین وہی قوم وہی

زبان، وہی عقیدہ اور وہی تہذیب وثقافت، مگر لوگوں نے کہا اور ہمیں تسلیم کرنے سے چارہ کار نہ تھا کہ میں ایک ملک کی حدود سے نکلا دوسرے ملک کی حدود میں داخل ہوگیا، ایک حکومت کو رخصت کیا، دوسری کا استقبال کیا، سفر کے کاغذات و پاسپورٹ اس کی شہادت دے رہے تھے اور یہ ایسا ثبوت ہے کہ اس کو کوئی جھٹلا نہیں سکتا، پاسپورٹ کے صفحات، دستخطوں، مہروں اور قسم قسم کے ٹکٹوں سے بھر گئے۔ ہم متعدد آباد و ہرے بھرے خوبصورت گاؤں سے گزرے جن کی عمارتیں جدید ترین طرز پر بنی ہوئی تھیں اور وہاں شاندار ہوٹل تھے، ان میں سے ظہر البیدر، رویسات صوفیر، بحمدون اور عالیہ کا ذکر کرتا ہوں، ہمیں بتایا گیا کہ گرمی گزارنے والے لوگ انھیں میں ٹھہرتے ہیں اور ان کو عیش وعشرت کے سارے سامان ومواقع مہیّا کئے جاتے ہیں ہر وہ شے جس کی وہ خواہش ظاہر کرتے ہیں، خواہ شراب ہو یا رقص وسرود سب ان کو مہیّا کی جاتی ہے، ان میں بعض ہوٹل پاکیزگی، ستھرائی اور حفاظتی انتظامات میں ممتاز ہیں (جیسا کہ اس وقت کے لوگ بیان کرتے ہیں) ہم لبنان کے پہاڑوں کو دیکھ رہے تھے جو ہم سے بہت قریب تھے، ان کی چوٹیاں برف سے ڈھکی ہوئی تھیں اور پورے سال ان کا یہی منظر ہوتا ہے، بڑا دلکش ودیدہ زیب منظر تھا، عصر کے وقت ہم حدود بیروت میں داخل ہوگئے، بیروت ودمشق میں ایک سو پانچ کلومیٹر کی مسافت ہے ہم شہر میں داخل ہوگئے مگر طبیعت منشرح نہ ہوئی۔ ہم ہوٹل امریکہ میں ٹھہرے، عصر کی نماز پڑھی اور قریب کے ہوٹل میں کھانا کھایا۔ ہمارے دوست سعد صاحب نے شہر کے بعض دوستوں سے فون پر بات کی اور ''تحریک عباد الرحمٰن الاسلامیۃ'' کے رہبر اور اس کے بانی محمد عمر داعوق کو بھی اطلاع دی جن کو ان کے دوست اور شاگرد ابوعمر کے نام سے مخاطب کرتے ہیں، تھوڑی دیر بعد استاذ ابوعمر نے ملاقات کی عزت بخشی ان کے ساتھ ایک لبنانی مسلم نوجوان بھی تھے۔ ہمارا ایک دوسرے سے تعارف ہوا، استاذ ابوعمر نے بڑی گرمجوشی اور تپاک سے ہمیں خوش آمدید کہا اور فرمایا کتابوں اور مضامین کے ذریعہ علمی وفکری طور پر وہ ہم سے واقف، ہم خیال ومتفق تھے صرف ملاقات کی کسر تھی۔ آں محترم نے میرے بھتیجے محمد الحسنی ایڈیٹر البعث کو یاد فرمایا۔ البعث الاسلامی کا ذکر کیا اور ایڈیٹر کی خیریت پوچھی، میں نے کہا کہ لبنان میں ان کے ایک

دوست ''ہانی فاخوری'' ہیں جو برابران سے خط وکتابت رکھتے ہیں، استاذ ابوعمر نے نوجوان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہانی فاخوری یہی ہیں۔

ایک پیکر دعوت شخصیت شیخ ابوعمر لبنانی: کچھ تعارف

اب کچھ ابوعمر کے بارے میں بھی سنتے چلئے۔ ابوعمر لبنان کے وہ مخلص داعی ہیں جس نے دعوت اسلامی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا ہے، وہ پیکر دعوت ہیں، ہمہ وقت یہی فکران پر غالب رہتی ہے۔ پیکر دعوت کہہ کر میں نے سب کچھ کہہ دیا۔ لبنان وہ شہر ہے جس کو بعض اہل نظر (لبنانی دوستوں سے معذرت کے ساتھ) مشرق عربی میں فحاشی کا اڈہ کہتے ہیں، لبنان ہی وہ شہر ہے جس کو مغرب نے اپنے زہر وغلاظت کو بلاد عربیہ میں پھیلانے کا مرکز بنایا ہے، یہاں دعوت اسلامی استقامت وحسن اخلاق کی کتنی شدید ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس دعوت کو پھیلانے نوجوانوں کی تربیت ان کا ذہن بنانے اور یہاں کے فساد وبگاڑ کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک ایسے شخص کو منتخب فرمایا جو نہ عالم ہے نہ دینی ماحول کا پروردہ، وہ ایک ماہر میکانک انجینیر ہے جو ایک بڑی کمپنی میں کام کرتا ہے، اس مرد صالح کو لوگ عمر داعوق کے نام سے یاد کرتے ہیں، داعوق لبنان کا ایک خوشحال مسلم گھرانہ ہے، دعوت کے اس عظیم کام کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایک انجینیر کو منتخب فرمایا کسی عالم کو نہیں'' وربّك يخلق ما يشاء ويختار ''(تمہارا رب جو چاہے پیدا کرتا ہے اور منتخب فرماتا ہے)'' ولا يُسأل عمّا يفعل وهم يُسألون ''وہ جو کچھ بھی کرے اس کا کوئی محاسبہ نہیں کرسکتا اس کے ماسوا سے محاسبہ ہوگا، استاذ ابوعمر ہم کو اپنے گھر لے گئے وہیں عشاء پڑھی اور رات کا کھانا بھی کھایا۔ ہم '' جماعۃ عباد الرحمٰن '' کی عملی سرگرمی ورزشی مشقوں اور ان کے کیمپوں کی تصویروں سے باخبر ہوئے، میں نے سمندر میں ان کے فن پیراکی وجمپنگ کو دیکھا، دوڑنے اور ہائی جمپ اور دیگر قسم قسم کی ورزشوں اور اسکاؤٹنگ کو دیکھا جو ہمت وخطر پسندی اور نظم وڈسپلن میں کسی بڑی سے بڑی اسکاؤٹنگ تنظیم سے کم نہیں۔ یہ سب کچھ نماز باجماعت کی پابندی اور اپنی ڈیوٹی کی انجام دہی اور کیمپوں میں دینی درس ومقالات کے ساتھ ساتھ ہوتا ہے۔ ہمیں معلوم ہوا کہ اس سرگرمی میں شرکت کرنے اور کیمپوں میں وقت

گزارنے والے نوجوانوں کی تعداد کبھی کبھی پانچ سو تک پہونچ جاتی ہے، اس جماعت کی اپنی مخصوص موٹریں ہیں جو اس کے اراکین کو ان مقامات پر جہاں کیمپ لگتا ہے پہنچاتی ہیں۔ ہم نے جو کچھ دیکھا وسنا اس سے مسرور وشادماں ہوٹل واپس آئے اور پورا دن بلکہ رات کا بھی کچھ حصہ چلنے پھرنے اور ملاقات میں گزارنے کے بعد اطمینان کی رات گزاری۔

۲۷ رشعبان ۱۳۷۵ھ ۲۰ راپریل ۱۹۵۶ء

استاذ توفیق حوری سے ملاقات

۲۷ رشعبان آج ہم بخیر وعافیت اور نشاط کے ساتھ اٹھے۔ ہم نے قریب کی مسجد میں نماز فجر پڑھنے کی کوشش کی مگر وہاں پہنچے تو مسجد مقفل نظر آئی۔ معلوم ہوا کہ یہ غیر مسلموں کا محلہ ہے مسلمان تاجر رات کو اپنے گھروں کو چلے جاتے ہیں، چنانچہ نماز ہوٹل ہی میں پڑھی، نماز بعد تھوڑی دیر آرام کیا پھر ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں ناشتہ کیا اور استاذ توفیق حوری سے ملاقات ہوئی، جو جماعت عبادالرحمٰن کے سرگرم رکن اور استاذ ابوعمر کے سرگرم معاونین اور کام میں ہاتھ بٹانے والے لوگوں میں سے ہیں نوجوانی میں بیروت کی (الجامعة الامریکیة) میں تعلیم حاصل کی اور "جامعة لندن" میں اپنی تعلیم مکمل کی۔ ہم ان کی دوکان پر ان سے ملے اور انھیں کی موٹر پر شہر کی سیر کو نکلے ہم (کلیۃ العاملیۃ) کے پاس سے گزرے اس کالج کو لبنانی شیعوں نے قائم کیا ہے (جو عامل کہلاتے ہیں) ان کا ہندوستان سے تعلق رہا ہے اس میں ایسے علماء ہوئے ہیں جنھوں نے ہندوستان کا سفر کیا ہے اور وہاں رہے ہیں "نزهة الخواطر" میں ان کے حالات موجود ہیں، صنوبر کے درختوں کے سایہ میں ہم شارع سباق سے گزرے اور "الخرج" کا خوبصورت علاقہ دیکھتے رہے تا آنکہ ہم بیروت کے ہوائی اڈہ پہنچ گئے مشرق میں ہم نے جو ہوائی اڈے دیکھے ہیں ان میں یہ سب سے شاندار اور آراستہ ہوائی اڈہ ہے، اس ہوائی اڈہ کے راستے دنیا کے خوبصورت ترین راستوں میں سے ہیں۔ بائیں سمت ہمیں فلسطینی پناہ گزینوں کے جھونپڑے نظر آئے جو ہر عرب ملک میں اسلام وعرب کے اس ناقابل فراموش المیہ کو یاد دلاتے ہیں۔

مفتی جمہوریہ لبنان کے ساتھ

واپسی میں ہم محترم محمد علایا مفتی جمہوریہ لبنان سے ملے۔ ہم لوگ ایک وسیع خوبصورت اور بہت سجے ہوئے ہال میں داخل ہوئے جیسے وہ کسی حکومت کے صدر یا پرانے زمانے کے کسی رئیس ونواب کا دربار ہو ہم نے ان کو سلام کیا اور تھوڑی دیر باتیں کیں اس پوری صورتحال کے پیش نظر ہم کو اپنے ملک ہندوستان کے علماء کی سادگی اور ٹیم ٹام سے ان کی دوری یاد آئی اور ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہندوستانی علماء کا طرز معیشت زیادہ بہتر اور ان کے لئے باعث خیر وبرکت ہے۔ ہمیں معلوم ہوا کہ عیدین میں وزیر اعظم پارلیمنٹ کے اسپیکر اور صدر جمہوریہ کا عملہ ان کو سلام کرنے حاضر ہوتا ہے۔ ہم لوگوں نے ''کلیۃ الشریعۃ'' دیکھا اور اسباق میں حاضر ہوئے، اساتذہ ازہر کے فارغ شدہ ہیں، سب ایک ہی وضع قطع کے صاحب علم، اپنے موضوع پر تیار، مسائل مستحضر ویاد، بیان پر قابو ومہارت۔

چیف جسٹس شفیق یموت سے ملاقات

ہم لوگ شرعی اپیل کوٹ کے چیف جج شیخ شفیق یموت سے ملے، لباس اور طرز میں ازہری علماء کا پورا نمونہ ہیں، ہم نے تھوڑی دیر ان سے باتیں کیں پھر اجازت لی اور چلے آئے۔

لبنان کا موجودہ تمدن

واپسی میں خلیۃ ملک سعود سے (۱) گزرے، ہم نے جو عمارتیں دیکھیں ان میں یہ سب سے فائق وشاندار ہے، یہ ایسی عمارت ہے جو ایک مسجد اور کلب پر مشتمل ہے، یہ بیروت میں اسلامی موضوع پر مقالات وغیرہ پیش کرنے کا بڑا ہال ہے، اس سے ملحق ایک مدرسہ ودست کاری کا کارخانہ ہے۔ لڑکیاں گھریلو کام ودست کاری وخود کفالتی کے کام سیکھتی ہیں اس میں ایک شفاخانہ بھی ہے۔ ہم مسجد میں داخل ہوئے مسجد دوسری منزل پر ہے یہیں ہم نے ظہر کی نماز پڑھی مسجد بڑی پرشوکت اور سجی ہوئی ہے، دل میں خیال آیا کہ مسجد چاہے سادہ ومعمولی ہو مگر وہ دل میں

---

(۱) بیروت کا ایک اسلامی مرکز اور کلب جو شاہ سعود کی فیاضانہ امداد کی وجہ سے ان کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔

خشوع وخضوع کی کیفیت پیدا کرتی ہے، مگر کیا کیجئے کہ مال بے محل صرف ہوتا ہے ضرورتمندوں اور پناہ گزینوں کو نہیں ملتا، ٹپ ٹاپ وزیب وزینت ہی میں صرف ہوتا ہے اس ادارہ سے لڑکیوں کو نکلتے دیکھا تو تمیز نہ کرسکا کہ یہ مسلمان ہیں یا عیسائی ہیں۔ مگر تھیں وہ مسلمان ہی، جسم نیم عریاں، غیر ساتر لباس بے پردہ اور اعضاء کھولے ہوئے چل رہی تھیں۔

میرا تاثر

خدا کے بندو! یہ مذاق کب تک چلتا رہے گا، میرے عرب بھائیو! مغرب کی یہ بے حیا تقلید کب تک چلتی رہے گی اس ادارہ کا نام امیر سعود (ولی عہد) کے نام پر رکھا گیا ہے(۱) جس کا سبب یہ ہے کہ انھوں نے اس کی تعمیر میں لبنانی دولاکھ اکسٹھ ہزار لیرہ (۲) بطور اعانت پیش کیا ہے یہ ۱۹۵۰ء کی بات ہے، اس وقت وہ شاہزادہ تھے، اور خلیّہ آئے ہوئے تھے، بڑے ہال میں چار سو آدمی آسکتے ہیں اس میں قالین بچھے ہیں، المونیم کی کرسیاں لگی ہوئی ہیں، دیوار پر شاہ بلوط کی چمکدار لکڑیاں لگی ہوئی ہیں، جو سنگ مرمر کا فرش معلوم ہوتی ہیں اور کلب کی فنّی عمارتوں کا نمونہ پیش کرتی ہیں، ہال کے وسط میں بادشاہ کی بڑی سی تصویر لگی ہوئی ہے اور اس کے دونوں بازوؤں پر سعودی اور لبنانی جھنڈا لہرا رہا ہے، اس کے نیچے لکڑی کی ایک الماری ہے جو سادگی کے ساتھ ساتھ بہت نفیس بنی ہے اس میں ریڈیو، گراموفون، لاؤڈ اسپیکر اور ٹیپ ریکارڈ لگا ہوا ہے، اس وقت میں فنّی ذوق رکھنے والوں سے معذرت کے ساتھ یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ یہ کارخانہ جو خوبصورتی بڑائی اور حسن وجمال کی ایک تصویر ہے۔

ایک تہی دست وفقر وفاقہ کی ماری ہوئی قوم کے لئے زیب نہیں دیتا کہ جو نان شبینہ کی محتاج اور اپنی اہم ضروریات کو پوری کرنے سے قاصر ہے جس میں فکر وپریشانی اور بھوک وبرہنگی عام ہے مدرسوں کو ان کی ضروریات تک میسّر نہیں خدا انھیں عقل دے۔

امام اوزاعی کے مرقد پر

یہ ذکر کرنا تو رہ ہی گیا کہ محدّث اعظم امام کبیر امام اوزاعیؒ کے مزار کو دیکھا جن کا اسم گرامی جامع ترمذی میں مذاہب فقہاء بیان کرنے کے سلسلہ میں بار بار آیا ہے۔ وإليه ذهب الاوزاعي

وغیرہ وغیرہ، وہ پرانے بیروت کے دروازہ پر ایک گاؤں میں مدفون ہیں۔ قبر پر کھڑا ہوا اور ان کی علمی جلالت شان اخلاص اور مسلک کو یاد کرنے لگا گو وہ چیزیں اب ختم ہو چکی ہیں لیکن حدیث وفقہ میں ان کا نام زندہ وجاوید ہے اور ان کے فضل وکمال کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔

امام اوزاعیؒ کے مزار سے نکل کر امراء کے محلوں سے گزرے اور سمندر کی سیر کی۔ ساحل سمندر پر شاندار ہوٹل ہیں جن میں وہ تمام چیزیں مہیا ہیں جن کی نہ شریعت میں اجازت ہے نہ خدا کو پسند، خوشحال طبقہ اس سے دامن نہیں بچا سکتا، راستہ میں ہم روشہ چٹان کے پاس سے گزرے جو دراصل خودکشی کی چٹان ہے، اس چٹان کے پاس کثرت سے خودکشی کے حادثات ہوتے ہیں۔ خودکشی کرنے والوں کے نزدیک یہ چٹان مقدس ہے، میں اس چٹان کے پاس کھڑا ہو کر سمندر کا نظارہ کرنے لگا اور جس فضا میں زندگی کی جیسی نعمت کی ناشکری کرنے والے اور خدا کی رحمت سے مایوس یہ اقدام کرتے ہیں، اس کو عالم تصور میں دیکھنے لگا۔ میں اسی حال میں تھا کہ کیا دیکھتا ہوں کہ سپاہی مجھ کو جھانکنے سے روکتے ہوئے میری طرف بڑھ رہا ہے شاید ان کو معاذ اللہ خودکشی کا اندیشہ ہوا معلوم ہوا کہ خودکشی کرنے والے اکثر غیر مسلم ہوتے ہیں یہ تو طے شدہ بات ہے کہ خودکشی میں مسلمانوں کا تناسب (اپنی ایمانی کمزوری کے باوجود) غیر مسلم اقوام کے مقابلہ میں بہت کم ہے اور یہ اس ایمان کی دین ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے دلوں میں بٹھا دیا ہے، ہم لوگ ساحل سمندر پر واقع ''بحرین'' ہوٹل میں داخل ہوئے، سمندر کی سمت بیٹھے اور محترم توفیق صاحب کی ضیافت میں دوپہر کا کھانا کھایا، یہاں سے اٹھ کر ہم ایک مکتبہ میں گئے جس کا مالک جماعت عباد الرحمٰن سے تعلق رکھتا ہے جو ہوٹل کے پہلو میں واقع ہے وہاں مجھے اپنی تصنیفات میں ''ماذا خسر العالم'' اور مذکرات سائح(۱)، شاعر الاسلام'' ملیں، میں نے تینوں کتابوں کا ایک ایک نسخہ لیا اور وہاں سے نکل کر الجامعۃ الامریکیۃ (امریکن یونیورسٹی) کے پاس سے گزرے جو مستقل ایک شہر معلوم ہوتی ہے۔ واپس آکر ہوٹل میں آرام کیا، آج کی سیر کے رفیق ایگری کلچر کالج کے استاذ محترم عبدالودود تھے جو جماعت عباد الرحمٰن کے سرگرم رکن اور استاذ ابوعمر کے خاص لوگوں میں سے ہیں۔

---

(۱) کتاب کا پہلا ایڈیشن جو قاہرہ سے ۵۳ء میں شائع ہوا تھا۔

مشہور مغربی مصنف سابق لیوپولڈ ویس محمد اسد سے ملاقات

شام کو ''Islam at the Cross roads(۱)'' کے مشہور مصنف سابق Leopoldweiss محمد اسد صاحب سے ملنے گیا جو اپنی اہلیہ کے ساتھ ''عالیہ'' میں مقیم ہیں جہاں سے ہم بیروت جاتے ہوئے گزرے تھے، یہاں وہ اپنی کتاب Road to Mecca ''الطریق إلی مکة'' کی دوسرے حصّہ کی تالیف میں مشغول ہیں، تھوڑی دیر ان کے پاس بیٹھے۔ ۱۹۵۱ء میں ان سے مکہ مکرمہ میں ملاقات ہو چکی تھی وہ اس ملاقات کا ذکر کر رہے تھے، اب آسانی کے ساتھ عربی بول لیتے ہیں ہم ان کے پاس سے لوٹے اور ایک غیور مسلمان ڈاکٹر مصطفیٰ خالدی سے ملے، ان کے بارے میں اکثر سنا کرتا تھا، ان سے مل کر بڑی مسرّت ہوئی ڈاکٹر صاحب اسلامی غیرت سے سرشار اور اسلامی ادب کو انگریزی میں نہ پھیلانے پر مسلمانوں کی کوتاہی کے شاکی ہیں، مجھے اپنی بعض انگریزی مطبوعات عنایت فرمائیں اور فرمایا کہ میرے مقالہ ''کارثۂ فلسطین'' کو تقریباً پانچ ہزار کی تعداد میں بہت خوبصورت شائع کر کے تقسیم کیا ہے، الحاج حسن الکواء صاحب نے جو بیروت کے بڑے تاجر اور شہر کے ممتاز صاحب ثروت لوگوں میں ہیں شام کو اپنے گھر پر کھانے کی دعوت کی تھی، وہاں اتفاقاً الجزائر کے مشہور مجاہد استاد الفضیل الورتلانی (۲) سے ملاقات ہوگئی، یہ ہم لوگوں کی پہلی ملاقات تھی، گو علمی وفکری تعارف پہلے سے تھا۔ انھوں نے مجھ سے کچھ کہنے کو فرمایا، میں نے بروقت جو کچھ ذہن میں آیا عربوں کی ذمہ داری اور ہندوستان میں مسلمانوں کی مرکزیت پر روشنی ڈالی پھر فضیل صاحب نے بڑی بلیغ ومؤثر تقریر کی، جس سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ شیوہ بیان عرب مقررین میں سے ہیں، انھوں نے اپنی تقریر میں میری بڑی تعریف کی، ان کی محبت اور حسن ظن نے جو کچھ کہلوایا کہہ دیا پھر کھانا کھایا کھانے پر محسوس ہوا کہ ان ملکوں کا معیار زندگی بہت بلند ہو گیا ہے اور ہندوستان ان کے لحاظ سے بہت پس ماندہ اور سادہ ہے۔

کھانے سے فارغ ہو کر ہم لوگ واپس ہوئے اور ہمارے ہی ساتھ استاذ فضیل بھی

---

(۱) بیروت سے اس کا عربی ترجمہ ''الاسلام علی مفترق الطرق'' کے نام سے شائع ہوا تھا۔

(۲) مشہور الجزائری مجاہد اور مشرق وسطی کے ایک شعلہ بیان مقرر جو بیروت میں جلاوطنی کی زندگی گذار رہے تھے۔

واپس ہوئے اور بیٹھ کر باتیں کرنے لگے وہ اپنی میٹھی اور محبت سے بھری باتوں سے ہم کو خوش کرتے رہے اور دیر سے سونا ہوا۔

۳۰ رشعبان ۱۳۷۵ھ مطابق ۱۱ راپریل ۱۹۵۶ء

طرابلس الشام میں (۱)

کل طے ہو چکا تھا کہ اسلامی ملک لبنان کے شہر طرابلس کی مختصر سیر ہوگی ہم تیار ہوئے اور خدا کے بھروسے پر نکلے۔ کار ہم کو لے کر بحر روم کے ساحل پر گزرتی ہوئی روانہ ہوئی ہم لوگ خوشحال گاؤں اور سحر آفریں مناظر سے گزرے، پورے راستہ سمندر ہی کے کنارے پر چلتے رہے نہ سمندر ختم ہوتا تھا نہ راستہ بدلتا تھا۔ جبیل اور بترون گاؤں سے گزر ہوا۔ علامہ رشید رضا رحمۃ اللہ علیہ کا گاؤں قلمون بھی راستہ میں پڑا حتی کہ ہم طرابلس پہونچ گئے اور جماعت عباد الرحمٰن کے مرکز میں ٹھہرے، تھوڑی دیر میں مسلم نوجوان آگئے اور ہمارے پاس بھیڑ لگالی ہمیں ان میں بڑا ذہنی جوش اور مخلصانہ محبت کا جذبہ محسوس ہوا جو میں مصر کے اخوانی نوجوانوں کے اندر محسوس کر رہا تھا، اس میں شک نہیں کہ جماعت عباد الرحمٰن گویا مصر کی جماعت اخوان المسلمین کا لبنانی ایڈیشن ہے۔ طرابلس میں طبیعت کھلی اور انشراح رہا وہاں ہمیں وہ انشراح حاصل ہوا جو بیروت نے کھو دیا تھا۔ مجھے ان نوجوانوں سے تعلق خاطر ہوا ان میں کا ہر نوجوان بات کرنے اور قریب ہونے کا خواہشمند تھا۔ موقع کو غنیمت جان کر ہم سیر کو نکلے یاد نہیں کہ ہم نے کلیۃ الشریعۃ دیکھا یا مدرسۃ ثانویہ دیکھا۔ اس پر دینی اسلامی رنگ غالب تھا۔ وہ صفائی ستھرائی اور حسن انتظام میں ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ ہم اس کے ایک استاذ سے ملے وہ بوڑھے سے تھے نام یاد نہ رہا۔ انھوں نے علماء کے انداز میں ہمارا استقبال کیا۔ میرا نام سنا تو فوراً پہچان گئے اس لئے کہ وہ میری بہت سی کتابیں پڑھ چکے تھے، ان کتابوں کی پسندیدگی اور ان سے دلچسپی کا اظہار کیا، گفتگو سے معلوم ہوا کہ جدید اسلامی ادب کا اچھا مطالعہ ہے وہ صاحب فکر و عقیدہ ہی نہیں ان میں علماء کی سی

---

(۱) طرابلس دو ہیں ایک طرابلس الشام جو اب تقسیم شام کے بعد لبنان کا حصہ ہے اور دوسرا طرابلس طرابلس الغرب ہے جو لیبیا میں ہے

تواضع وخاکساری بھی پائی جاتی ہے۔ میں ان کی شخصیت وتواضع سے متأثر ہوا۔ لبنان اور سوریہ میں میں نے جتنے مدرسے دیکھے ان میں یہ مدرسہ مجھے سب سے زیادہ پسند آیا۔ ہم لوگوں کو شرعی قاضی سے بھی ملاقات کا شرف حاصل ہوا ہمیں ان میں ایسا فکری نشاط اور بیدری نظر آئی جوان کے دوسرے لبنانی رفقاء میں نہیں نظر آئی۔ ہم لوگ ابوسمرۃ کے خوبصورت وشاداب خطّہ گئے وہیں سے پانی نے جمع ہوکر سیلاب کی شکل اختیار کرلی اور شہر کو زبردست نقصان پہنچایا۔ ہم نے دریائے ابوعلی اور سیلاب کی تباہ کاریوں کو دیکھا۔ برباد شدہ محلے، بری طرح ٹوٹے اور گرے ہوئے گھر اور ٹوٹا ہوا پل دیکھا، اس معمولی وبے حقیقت دریا کو دیکھ کر یہ یقین کرنا مشکل ہوتا ہے کہ کیا یہ بھی یہ آفت ڈھا سکتا ہے۔ ہم لوگوں نے مرکز مولویہ جس کی نسبت مولانا جلال الدین رومی کی طرف ہے اور سرکاری مدرسہ ابن خلدون ومدرسہ غزالی دیکھا اور شہر کی جامع مسجد میں جمعہ پڑھا۔ پھر طرابلس کے بندرگاہ کی سیر کی۔ لوگوں سے معلوم ہوا کہ بندرگاہ کے تمام ہوٹلوں میں شراب عام ہے یہ ایسی مصیبت ہے جو لبنان میں عام ہوچکی ہے، شہر کی اس سیر میں احباب بڑے اخلاص ومحبت کے ساتھ برابر ہمارے ساتھ رہے۔ جماعت کے معتمد مالیات مدحت بلحوص اور داخلی امور کی تنظیم کے صدر فتحی شریف اور ازہر کے طالب علم سعید شعبان اور نوجوانوں کے لیڈر محمود عباس اور نجم مسلم قابل ذکر ہیں۔

نجم مسلم نے مجھے اپنی کاپی دکھائی جس میں میرا مضمون ''المسلمون فی الھند'' بھی تھا انھوں نے کہا کہ انھوں نے یہ مقالہ جماعت عباد الرحمٰن کے ایک جلسہ میں پڑھا تھا مجھے معذور سمجھا جائے اگر جماعت کے ارکان اور اس دورے کی رفقاء میں سے کسی کا نام چھوٹ گیا ہو۔ اس لئے کہ میں یہ روئیداد سفر لبنان پر ایک مہینہ گزر جانے پر لکھ رہا ہوں جماعت کے زیر اہتمام قھوۃ التل العلیا کے ہوٹل میں عمدہ فضاء اور خوشگوار ہوا اور پرلطف منظر میں ایسے دوستوں کی معیت میں کھانا کھایا جن کے دل محبت سے معمور اور خیالات میں یکسانی تھی، پھر ہم مرکز واپس آگئے اور احباب جمع ہوئے جن میں اکثر مدارس کے طلباء اور جواں سال لوگ تھے۔ استاذ سعد الدین الولیلی نے برجستہ تقریر کی وہ بھی مقرر ہیں، میں نے مختصر سی تقریر کی، وقت تنگ تھا اور بیروت واپسی ضروری

تھی۔اس لئے کہ آج ''خلیۃ الملک سعود'' میں میری تقریر کا پروگرام تھا۔صرف ملاقات سے نوجوانوں کے ارمان پورے نہ ہوئے۔ بیٹھنے اور بات کرنے کی آرزوئیں دل ہی دل میں رہ گئیں مہمان کا بھی یہی حال تھا۔ان نوجوانوں سے سلام وکلام اور اس محبوب اسلامی ملک میں کچھ وقت گزارنے کی حسرت باقی ہی رہی احباب نے رمضان بعد طرابلس واپس آنے کا پرزور مطالبہ کیا۔

کچھ طرابلس کے بارے میں

طرابلس ضلع کا صدر مقام ہے اور لبنان سوریہ کی طرح کئی اضلاع پر مشتمل ہے اور وہی شمال کا پایۂ تخت ہے، اس کی آبادی تقریباً ستر اسی ہزار ہے۔طرابلس میں مسلمانوں کا تناسب آبادی ۷۵% ہے گو وہ اب سوریا سے الگ ہوگیا ہے اور لبنان میں شامل کردیا گیا ہے ۔مگر وہ اب سوریہ ہی کی طرف مائل ومشتاق ہے۔ جو دینداری اور اسلام پسندی میں اس کا شریک ہے اور ابھی تک.....اس کو طرابلس الشام کہا جاتا ہے میں نے دیکھا کہ طرابلس میں جماعۃ عباد الرحمٰن بہت فعّال ہے اور شہر میں اس کا مستحکم مرکز ہے، دعوت کا کام پھیلا ہوا ہے، جوانوں میں اس کے گہرے اثرات ہیں۔ اسلامی موضوع پر اس وقت جو نیا لٹریچر شائع ہورہا ہے میں نے نوجوانوں کو اس سے بہت باخبر پایا۔ وہاں معمّر پڑھے لکھے لوگوں کو ندوۃ العلماء کی تحریک وسرگرمی سے واقف اور ندوی فضلاء اور ان کی تصنیفات کا قدرداں پایا۔وہ لوگ پاکستان کی جماعت اسلامی سے بھی دلچسپی رکھتے ہیں اور اس کے لٹریچر کو قدر کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔

عصر کی نماز پڑھ کر ہم بیروت کو روانہ ہوئے۔قلمون میں بھائی شفیع صاحب نے نوجوانوں کے ساتھ ہمارا استقبال کیا وہیں علاّمہ رشید رضا کے بھتیجے سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا، ان کو معلوم ہے کہ ندوہ کے جلسہ کی صدارت کے لئے مرحوم نے ہندوستان کا سفر کیا تھا۔دوستوں نے ''قلمون'' میں ٹھہرنے کا اصرار کیا لیکن تقریر کے پروگرام کی وجہ سے ہم نے معذرت کردی اور ان سے رخصت ہوئے۔

ہم لوگ بیروت پہنچے اور خلیۃ کی مسجد میں تاخیر سے مغرب کی نماز پڑھی، تقریر کا وقت

آ گیا اور ہم لوگ ہال میں داخل ہوئے۔ استاذ فضیل الورتلانی آئے اور نوجوانوں کی خاصی تعداد حاضر ہوگئی، استاذ سعد الدین الولیلی نے میرے لئے تعارفی کلمات کہے، پھر میں اٹھا اور تقریر شروع کی، میری اس تقریر کا لب لباب یہ تھا کہ قومیں تہذیبوں سے نہیں زندہ رہتی ہیں بلکہ وہ دعوت و پیغام سے بقاء و دوام حاصل کرتی ہیں، روح و ملّی خصوصیات سے ترقی کرتی ہیں، میں نے اس قوم کے پیغام کی تشریح کی اور روح اور ان ملّی خصوصیات کو بیان کیا جن سے یہ قوم دوسری قوموں پر فتحیاب ہوسکتی ہے۔ منجملہ ان خصائص کے ایمان بالغیب بھی تھا۔ میں نے ایمان بالغیب کی قوت و تاثیر اور وہ جو حیرت انگیز اور خرق عادت نتائج پیش کرتی ہے اس کو بیان کیا، اس سلسلے میں میں نے تاریخ اسلام کے عہد اوّل کی تابناک مثالیں پیش کیں اور زندگی کے اس طور طریق کو بیان کیا جو صحابہ کرامؓ نے اپنایا تھا پھر اس طرز زندگی نے جس طرح دلوں کو فتح کیا اسے بیان کیا اور اس کی مثالیں پیش کیں میں نے مادّہ پر ان کے غلبہ، دنیا سے بے تعلقی، خواہشات سے پرہیز، مادیت کے فریب اور اس کی چمک دمک سے اجتناب کو بتایا۔ میں نے وضاحت کی کہ یہی طرز زندگی دلوں کو فتح کرنے کی طاقت رکھتا ہے اور ذہنوں پر اسی کا جادو چلتا ہے۔ اسی طرح کی اور باتیں جو اللہ تعالیٰ نے اس وقت کہلوائیں پیش کیا۔

پھر استاذ ابو عمر اٹھے اور تقریر کا خلاصہ حاضرین کے سامنے پیش کیا اور مقرر کا شکریہ ادا کرنے کے بعد مجلس برخواست ہوئی۔

خلیہ سے ہم لوگ شیخ حسن الکواء کے گھر دوبارہ گئے وہاں محترم راشد الحوری اور علماء اور بہت سے معززین شہر سے ملاقات ہوئی۔ وہاں ایک خوش کن ناگہانی بات پیش آئی وہ تھی ماہ رمضان المبارک کی آمد، شرعی عدالت میں رویت ہلال کی تصدیق ہوئی اور توپیں سر ہونی شروع ہوگئیں۔ اس کے بعد ہم اپنی قیام گاہ واپس آئے اور بیروت میں آخری رات گزاری۔

یکم رمضان المبارک ۱۳۷۵ھ

بیروت کو الوداع اور تحریک عباد الرحمٰن سے متعلق رائے

بفضل خدا صبح کو ہم نے روزہ رکھ کر دمشق کا سفر کیا، میں پیچھے ذکر کر چکا ہوں کہ

بیروت میں میری طبیعت منشرح نہیں رہی چنانچہ میں شہر کی خوبی بیان کرنے اور اپنے احساسات کے اظہار سے قاصر رہا، استاد سعد الدین نے میری تائید کی اور بتایا کہ یہ شہر بجھا بجھا سا ہے اس میں مسیحی رنگ غالب ہے۔ جگہ جگہ گرجے اور صلیبیں نمایاں ہیں، اخلاقی انارکی عام ہے۔ اس اخلاقی قدروں سے آزاد نصرانی تہذیب سے متأثر شہر میں تنہا عباد الرحمٰن ہی ایک اسلامی تحریک ہے میں نے محسوس کیا کہ جماعت عباد الرحمٰن پہ اسکاوٹنگ اور عصر جدید کی تنظیم کا رنگ غالب ہے اس میں شبہ نہیں کہ موجودہ زمانہ میں تحریکوں کو پروان چڑھانے اور اس کے آگے بڑھنے کے یہی اہم عامل ہیں، خصوصاً لبنان کے ماحول میں، اس میں شک نہیں کہ تحریک عباد الرحمٰن اسلامی رجحان وخیال کو پھیلانے میں قابل قدر حد تک فعّال وسرگرم ہے، ہماری تمنا ہے کہ روحانی پہلو کی طرف توجہ میں اضافہ ہو کہ یہی دینی تحریکوں کی بنیاد اور اصل روح ہے، اگر اللہ تعالیٰ نے اس کے قائد اور تحریک کے چلانے والے سرگرم ومؤثر مربّی کو سنتوں کے زندہ کرنے اور پوری توجہ وقوت کے ساتھ اسلامی آداب کی طرف توجہ کی توفیق سے نوازا ہوتا (اور یہ بات قائد ورہبر کے اختیار وقابو میں ہوتی ہے اور وہ ایسا کرسکتا ہے، اسے اس کا موقع حاصل ہے، دعوت کا اثر ونفوذ ہے) تو زبردست اثرات رونما ہوں گے، اس شہر میں ایک زبردست طاقت اور زوردار اسلامی روح پیدا ہوتی، استاد ابوعمر کے اخلاص، ان کی اصلاح کی خواہش وسلامت فکر اور اللہ تعالیٰ نے اس جماعت کو جو توفیق عطا فرمائی ہے اس سے بڑی امیدیں قائم ہوتی ہیں، اور اللہ کے لئے کوئی مشکل کام نہیں۔

صحیح راہ پر چلانا خدا ہی کے بس میں ہے۔